انوارِ ہدایت

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

مکتبہ خدام القرآن لاہور

﴿ادْعُ اِلٰی سَبِیْلِ رَبِّکَ بِالْحِکْمَۃِ وَالْمَوْعِظَۃِ الْحَسَنَۃِ﴾

انوارِ ہدایت

دینی واخلاقی موضوعات پر سادہ لیکن مؤثر تحریریں

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

پیش لفظ

حافظ عاکف سعید

امیر تنظیم اسلامی

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36 کے، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون: 3-35869501

فہرست

❁ دیباچہ طبع دوم	4
❁ پیش لفظ (از حافظ عاکف سعید)	5
❁ تعارفِ مؤلف (از حافظ خالد محمود خضر)	7
1 ابتدائیہ	11
2 میرے ابا جان ایک سلیم الفطرت انسان	13
3 اسلام —— دینِ فطرت	26
4 اسلام —— ایک مکمل ضابطۂ حیات	37
5 اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ	42
6 اسلام اور شخصیت پرستی	51
7 مسئلۂ شفاعت	57
8 مَا سَلَكَكُمْ فِيْ سَقَرَ	64
9 وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ	77
10 كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ	82
11 مقامِ رسالت اور اس کے تقاضے	89
12 اخلاقِ نبویؐ	101
13 مساواتِ مرد وزن	105
14 عورت کا دائرہ کار	113

15	بدعات کیوں قابل مذمت ہیں؟	121
16	قرض کالین دین اور اسلامی تعلیمات	129
17	متاع الغُرور	137
18	غُرورُ الغَرور (بڑے دھوکے باز کا دھوکہ)	145
19	وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا	154
20	حقوقِ اولاد	158
21	نئی نسل کی بے راہ روی کا ذمہ دار کون؟	169
22	کیا چھوٹے گناہ معمولی ہوتے ہیں؟	179
23	چھوٹی چھوٹی نیکیوں پر اجرِ عظیم	187
24	تلبیس ابلیس، یعنی ابلیس کی چالیں	205
25	اسلامی اور غیر اسلامی تہوار	213
26	تعزیت کا اسلامی طریقہ	217
27	فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ	222
28	مقامِ صحابہؓ	227
29	علامہ اقبال اور پاکستانی قوم	249
30	اکلِ حلال کی اہمیت	273
31	صوفی اور مجاہد	278
32	نرمی اور ملاطفت	285
33	دکھ اور تکلیف کا امید افزا پہلو	293
34	حیاتِ دُنیوی ـــــ ایک انمول تحفہ	297
35	زبان کی حفاظت	305
36	آسودہ زندگی کا راز	311

37	مسواک کی اہمیت وفضیلت	317
38	حقوقِ ہمسایہ	321
39	خوش طبعی اور مزاح	327
40	عفوودرگزر	334
41	غصہ کے برے نتائج اور علاج	341
42	حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی سیرت وکردار	348
43	حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیرت وکردار	358
44	حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی سیرت وکردار	367
45	حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت وکردار	377
46	اصحابِ رسول ؐ کی استقامت	390
47	الجہاد فی الاسلام	400
48	اہل سنت والجماعت کون؟	407

دیباچہ طبع دوم

''انوارِ ہدایت'' کا پہلا ایڈیشن' جو میثاق میں شائع ہونے والے میرے 37 مضامین پر مشتمل تھا' ستمبر 2007ء میں شائع ہوا۔ پہلا ایڈیشن 1100 کی تعداد میں طبع ہوا تھا جو اواخر 2010ء میں ختم ہو گیا۔ دوسرے ایڈیشن کے لیے تمام مضامین کو دوبارہ پڑھ کر جہاں کہیں کمپوزنگ وغیرہ کی اغلاط تھیں وہ درست کر دی گئی ہیں۔ تین سال کے اس عرصہ میں میرے کچھ اور مضامین بھی میثاق میں شائع ہوتے رہے۔ اب خیال ہوا کہ دوسرے ایڈیشن میں ان مضامین کو بھی شامل کر دیا جائے' چنانچہ اب دوسرے ایڈیشن میں گیارہ مزید مضامین شامل کر دیے گئے ہیں۔ اب کتاب کی افادیت پہلے کی نسبت زیادہ ہو گئی ہے۔ قارئین اگر کسی خاص مسلک کے ساتھ وابستگی کو بالائے طاق رکھتے ہوئے کتاب کا مطالعہ کریں گے تو وہ ان مضامین کو قرآن وسنت کی بنیادی اور فطری تعلیمات کے مطابق پائیں گے۔ جہاں تاریخی واقعات کا ذکر ہوا ہے وہاں مستند کتب تاریخ سے استفادہ کیا گیا ہے۔ ڈھیلی ڈھالی بے سند اور کچی باتوں سے گریز کیا گیا ہے۔

محمد یونس جنجوعہ

جنوری 2011ء

پیش لفظ

محترم یونس جنجوعہ صاحب کا شمار اُن چنیدہ افراد میں ہوتا ہے جو تمام عمر شعبۂ تدریس سے وابستہ رہے اور اس مقدس کام کو جس کے تقدس کو مادہ پرستی کے بڑھتے ہوئے سیلاب نے بری طرح مجروح کر دیا ہے' ایک عبادت سمجھ کر سرانجام دیتے رہے۔ اسلامیات میں ایم اے کرنے کے بعد پنجاب کے مختلف کالجوں میں اسلامیات کی تدریس کچھ اس طور سے کی کہ ''قاری نظر آتا ہے' حقیقت میں ہے قرآن'' کے مصداق وہ اسلامیات کے فقط استاد ہی نہیں تھے' ان کی ذات طلبہ کے لیے اسلامی تعلیمات کا ایک جیتا جاگتا نمونہ بھی بنی رہی۔ گورنمنٹ ایف سی کالج لاہور سے جنوری ۲۰۰۱ء میں اسلامیات کے پروفیسر کی حیثیت سے ریٹائرمنٹ کے بعد قرآن اکیڈمی کے شعبہ تصنیف و تالیف سے وابستہ ہو گئے جہاں آج کل محترم جنجوعہ صاحب اعزازی طور پر خدمت دین کے کام میں سرگرمِ عمل ہیں۔

محترم جنجوعہ صاحب کے ساتھ میرا تعارف بہت پرانا ہے۔ آپ ۱۹۶۸ء سے لاہور میں مرکزی انجمن خدام القرآن کے صدرِ مؤسس اور تنظیم اسلامی کے بانی محترم ڈاکٹر اسرار احمد مدظلہ کے درس قرآن کے اوّلین سامعین میں سے ہیں۔ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے لاہور میں حلقہ ہائے دروسِ قرآن کا آغاز کیا تھا اور سمن آباد میں محترم ڈاکٹر صاحب کے پھوپھی زاد بھائی کے مکان پر ہر اتوار کی صبح ہفتہ وار درسِ قرآن کی نشست ہوتی تھی۔ محترم جنجوعہ صاحب اُس زمانے میں لاہور میں تھے اور باقاعدگی سے اتوار کا درسِ قرآن سنتے تھے۔ بعد ازاں اُن کا تبادلہ لاہور سے باہر ہو گیا تو پھر وہ دور دراز کا سفر کر کے ڈاکٹر صاحب کا درس سننے کے لیے اتوار کو لاہور آتے تھے۔ بعد ازاں ۷۰ء کی دہائی کے آخری سالوں میں ماہنامہ میثاق

کے ساتھ اُن کے قلمی تعاون کا بھی آغاز ہو گیا۔ میرا اُن سے ابتدائی تعارف اُسی دَور میں ہوا۔ بعد ازاں تنظیم اسلامی کے شریک قافلہ بھی بنے اور بحمد اللہ آج تک وہ غلبہ و اقامتِ دین کی جدوجہد اور خدمتِ قرآنی کے کام میں ہمارے شریک سفر ہیں۔

زیر نظر کتاب ''انوارِ ہدایت'' میں محترم جنجوعہ صاحب کے ۳۰ سے زائد مختصر مضامین شامل ہیں۔ آپ نے زیادہ تر اخلاقی تعلیمات' آدابِ زندگی اور دین کے اُن بنیادی موضوعات پر قلم اٹھایا ہے جو ہر مسلمان کے لیے ضروری علمی و عملی رہنمائی اور اصلاحِ معاشرہ کے اعتبار سے بنیادی اہمیت کے حامل ہیں۔ جس طرح محترم جنجوعہ صاحب ذاتی اعتبار سے نیکی و شرافت' سادگی و قناعت اور خلوص و اخلاص کا پیکر ہیں' اسی طرح ان کی تحریریں بھی قلم کی پاکیزگی اور سلاست کا مظہر ہیں۔ وہ اپنی تحریروں میں ایک عام مسلمان کی علمی ضرورت اور ذہنی سطح کا خصوصی لحاظ رکھتے ہیں۔ بھاری بھرکم اور ثقیل الفاظ و اصطلاحات سے بچتے ہوئے آسان فہم' سادہ الفاظ اور سلیس زبان میں اہم دینی موضوعات کو اتنی عمدگی سے بیان کرتے ہیں کہ پڑھنے والے کے ذہن پر ناروا بوجھ نہیں پڑتا اور دین کی دلنشین تعلیمات اس کے ذہن و قلب میں نقش ہو جاتی ہیں۔

این سعادت بزورِ بازو نیست تا نہ بخشد خدائے بخشندہ!

چنانچہ ''انوارِ ہدایت'' سے ہر خاص و عام اور ہر خورد و کلاں یکساں طور پر مستفید ہو سکتا ہے۔ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ یہ کتاب ہر مسلمان گھرانے کے لیے ایک ایسے قیمتی اثاثے کا درجہ رکھتی ہے جس کے انوار سے تمام افرادِ خانہ خواہ بچے ہوں یا بوڑھے' مرد ہوں یا خواتین' والدین ہوں یا اولاد' یکساں طور پر اپنے ذہن و قلب اور فکر و عمل کو منور کر سکتے ہیں۔

حافظ عاکف سعید
امیر تنظیم اسلامی
و ڈائریکٹر قرآن اکیڈمی لاہور

تعارفِ مؤلف

جنڈیالہ شیر خان ضلع شیخوپورہ کا ایک معروف قصبہ ہے جہاں قومی اور بین الاقوامی سطح کے مشاہیر نے جنم لیا۔ سید وارث شاہ اسی سرزمین کا سپوت ہے جس کی تخلیق ''ہیر'' شیکسپئر کے ڈراموں کی ہم پلہ سمجھی جاتی ہے۔ یہاں کے باشندوں نے ملک کے اعلیٰ سول اور فوجی عہدوں پر کام کیا۔ مؤلف کے برادر حقیقی محمد یعقوب ضیاء کئی اہم سرکاری عہدوں پر فائز رہے اور چند سال قبل صوبائی سیکرٹری کے عہدے سے ریٹائر ہوئے۔ سابق گورنر پنجاب غلام جیلانی خان کا تعلق بھی اسی گاؤں سے تھا۔ پروفیسر محمد یونس جنجوعہ بھی اسی گاؤں کے ایک علم دوست گھرانے کے فرد ہیں جس کے افراد نے محنت اور جہد مسلسل سے تعلیمی میدان میں قابل قدر خدمات انجام دیں۔

محمد یونس جنجوعہ ۱۹۴۱ء میں جنڈیالہ شیر خان میں پیدا ہوئے۔ وہ ناخواندہ ماں باپ کے سب سے بڑے بیٹے ہیں۔ اُن کے والد فیروز دین اگرچہ کسی سکول میں داخل نہ ہوئے مگر انہیں تعلیم کے ساتھ گہری دلچسپی تھی۔ انہوں نے اپنے طور پر کوشش کر کے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تھا۔ وہ صوم وصلوٰۃ کے پابند، اپنی شرافت، نیک نفسی اور خدا ترسی کے سبب علاقے میں مشہور تھے۔ اُن کا معمولی سا کاروبار تھا جس سے اپنے خاندان کی کفالت کرتے تھے۔ رزق حلال کمانا اور اس پاکیزہ روزی سے اپنے بچوں کی پرورش کرنا ان کی امتیازی خصوصیت تھی۔

چھ سال کی عمر میں محمد یونس جنجوعہ کو مقامی مڈل سکول میں داخل کرایا گیا۔ وہ شروع ہی سے ہونہار بچوں میں شمار ہونے لگے اور اپنے نیک نہاد اساتذہ کی خصوصی توجہ کا مرکز بنے رہے۔ اُس وقت چوتھی جماعت کے طلبہ وظیفے کے امتحان میں شامل ہوتے تھے اور

یہ امتحان ضلعی صدر مقام پر منعقد ہوتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے اس مقابلے کے امتحان میں شرکت کی اور وظیفہ کے حق دار ٹھہرے۔ بعدازاں مڈل سکول امتحان میں شامل ہوئے اور وظیفہ حاصل کیا۔ ہائی سکول کی تعلیم کے لیے شیخوپورہ شہر کے معروف تعلیمی ادارے گورنمنٹ ہائی سکول میں داخلہ لیا جہاں سے میٹرک کا امتحان اوّل درجے میں پاس کیا۔ ناگزیر وجوہات کی بنا پر کالج میں داخلہ نہ لے سکے۔ فارغ رہنے کی بجائے انہوں نے گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ کی ایس وی کلاس میں داخلہ لیا۔ یہ تربیت اساتذہ کا ایک سالہ کورس تھا۔ امتحان ہوا تو پنجاب بھر کے اساتذہ میں نمایاں پوزیشن حاصل کی اور گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ صاحب میں سینئر ورنیکلر ٹیچر تعینات ہو گئے۔ علم کی پیاس نے انہیں چین سے نہ بیٹھنے دیا اور انہوں نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرلیا۔ بعدازاں اُن کا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول باغبانپورہ لاہور ہوگیا' جہاں تدریس کے فرائض کی ادائیگی کے ساتھ ساتھ انہوں نے اپنی تعلیم بھی جاری رکھی اور پرائیویٹ امیدوار کے طور پر پہلے بی اے' پھر سی ٹی اور پھر بی ایڈ کے امتحانات پاس کر لیے۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم وتحقیق میں داخلہ لے کر ایم ایڈ کی ڈگری حاصل کی جس کی بنیاد پر سینئر انگلش ٹیچر کے طور پر ان کی تقرری ہوگئی۔ بعدازاں انہوں نے پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے ایم اے اسلامیات کا امتحان پاس کرلیا۔ ۱۹۸۴ء میں مقابلے کا امتحان پاس کر کے گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں لیکچرار مقرر ہوئے' جہاں سے اُن کا تبادلہ ایم اے او کالج لاہور میں ہوگیا۔ اپنی عمدہ تدریسی خدمات کے سبب ان کو یہاں سے ممتاز تعلیمی درس گاہ گورنمنٹ ایف سی کالج میں تعینات کر دیا گیا' جہاں سے وہ جنوری ۲۰۰۱ء میں بطور اسسٹنٹ پروفیسر ریٹائر ہو گئے۔

تعلیم وتعلّم کے ساتھ گہری وابستگی اور دینی تعلیم کے شوق نے انہیں عربی سیکھنے کی طرف مائل کیا اور انہوں نے بغیر کسی درس گاہ میں داخلہ لیے ازخود عربی زبان سیکھی۔ قرآن مجید سمجھ کر پڑھا اور مختلف مساجد میں اعزازی طور پر جمعہ کا خطبہ دیتے رہے۔ آج کل وہ جوہر ٹاؤن میں مقیم ہیں اور محلے کی مرکزی جامع مسجد کی انتظامی کمیٹی کے

صدر ہیں۔ اس مسجد میں روزانہ بعد نماز عشاء ان کا درسِ قرآن ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں وہ محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی قائم کردہ قرآن اکیڈمی میں وقت دے رہے ہیں۔ یہ تو تھا مؤلف کا ذاتی تعارف' اب آیئے ان کی اولاد کے حالات پر ایک نظر ڈالیں۔

محمد یونس جنجوعہ صاحب کے چار بیٹے اور ایک بیٹی ہے۔ بیٹی اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ امریکہ میں ہے۔ بیٹوں میں سب سے بڑے بیٹے محمود احمد محکمہ صحت میں ملازم ہیں۔ ان کے دوسرے بیٹے مسعود احمد ہیں جنہوں نے ۱۹۸۲ء میں میٹرک کا امتحان دیا اور لاہور بورڈ کے آرٹس گروپ میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ بعد ازاں گورنمنٹ کالج لاہور سے ایف اے اور بی اے کے امتحان اعزازی حیثیت سے پاس کیے۔ اسی کالج سے ایم اے انگلش کیا اور پنجاب پبلک سروس کمیشن کے مقابلے کے امتحان میں کامیاب ہو کر لیکچرار مقرر ہوئے۔ پہلے گورنمنٹ ایف سی کالج میں رہے اور جب گورنمنٹ ایف سی کالج مشنری کو واپس کیا گیا تو گورنمنٹ کالج ٹاؤن شپ لاہور میں تعینات ہوئے۔ آج کل اسی کالج میں پوسٹ گریجویٹ کلاسز کو پڑھا رہے ہیں۔ اپنے مضمون میں خصوصی مہارت کے سبب کالج کی فیکلٹی میں انہیں امتیازی حیثیت حاصل ہے۔ ایڈمنسٹریشن پر خصوصی لیکچرز کے لیے انہیں اسلام آباد' سیالکوٹ اور ملتان کے اعلیٰ تعلیمی اداروں میں مدعو کیا جاتا ہے۔

محمد یونس جنجوعہ صاحب کے تیسرے بیٹے داؤد احمد ہیں جنہوں نے گورنمنٹ کالج شیخوپورہ سے بی اے کا امتحان پاس کیا اور کالج میں اوّل پوزیشن حاصل کی۔ بعد ازاں پنجاب یونیورسٹی لاء کالج سے ایل ایل بی کیا اور پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے سیاسیات کے مضمون میں ایم اے کیا اور پنجاب پبلک سروس کمیشن کے ذریعے سلیکٹ (select) ہو کر گورنمنٹ کالج حافظ آباد میں لیکچرار تعینات ہوئے۔ آج کل گورنمنٹ کالج شیخوپورہ میں تعینات ہیں جہاں ایم اے سیاسیات کے طلبہ کو پڑھا رہے ہیں۔

محمد یونس جنجوعہ صاحب کے سب سے چھوٹے بیٹے ظفر احمد حافظ قرآن ہیں۔ انہوں نے حفظ کے بعد میٹرک کا امتحان پرائیوٹ امیدوار کی حیثیت سے دیا اور اتنے

اچھے نمبر حاصل کیے کہ گورنمنٹ کالج لاہور میں داخلہ مل گیا جہاں سے انہوں نے ایف اے کیا۔ پھر ہیلی کالج آف کامرس پنجاب یونیورسٹی سے بی کام اور ایم کام کے امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیے۔ پہلے پنجاب کالج آف کامرس میں لیکچرار مقرر ہوئے اور بعدازاں ان کا تقرر پنجاب یونیورسٹی میں ہوگیا۔ آج کل ہیلی کالج آف کامرس میں پڑھا رہے ہیں۔ اپنے مضمون میں خصوصی مہارت کے سبب کئی دوسرے معروف تعلیمی ادارے انہیں اپنے ہاں لیکچرز کے لیے بلاتے ہیں۔ اکاؤنٹنگ کے مضمون میں ایک مشہور اور مقبول کتاب کے مصنف بھی ہیں۔

خوش قسمتی کی بات ہے کہ اس گھرانے کے تمام چھوٹے بڑے افراد صوم وصلوٰۃ کے پابند، فرض شناس، محنتی، بلند کردار اور خدا ترس بھی ہیں۔ اپنے حلقۂ احباب میں انہیں عزت واحترام کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔

حافظ خالد محمود خضر

مدیر شعبہ مطبوعات، قرآن اکیڈمی

ابتدائیہ

مجھے لڑکپن ہی سے بڑے بڑے علماء کی تقاریر سننے کا شوق تھا۔ چنانچہ جہاں بھی معروف علماء کرام کے آنے کی خبر ملتی وہاں پہنچ جاتا تھا۔ یہ اسی شوق کا نتیجہ ہے کہ میں نے اپنے وقت کے بیشتر نامور علمائے دین کی تقاریر اور درس قرآن سامنے بیٹھ کر سنے۔ ان میں سے چند ایک کے نام درج ذیل ہیں: مفتی محمد شفیع دیوبندی' مولانا احتشام الحق تھانوی' علامہ دوست محمد قریشی' مولانا محمد ادریس کاندھلوی' سید ابوالاعلیٰ مودودی' قاری محمد طیب' مولانا احسان احمد شجاع آبادی' مولانا احمد سعید کاظمی' مولانا محمد عمر اچھروی' علامہ طاہر القادری' مولانا عنایت اللہ سانگلوی' مولانا محمد اجمل خان قلعہ گجر سنگھ' مولانا سرفراز صفدر' پروفیسر یوسف سلیم چشتی' امین احسن اصلاحی' عبدالقادر روپڑی' علامہ احسان الٰہی ظہیر' مولانا محمد حسین شیخوپوری' شیخ غلام اللہ خان' مولانا منظور احمد چنیوٹی وغیرہم۔ حتیٰ کہ گلبرگ میں غلام احمد پرویز کے لیکچر بھی سنے۔ اور حد تو یہ ہے کہ اپنے ایک قادیانی شریک کار کی دوعت پر ربوہ بھی گیا جہاں اُس وقت کے ان کے قائد سے ملاقات کی اور اُس سے ہم کلام ہوا۔

یہ ۶۶۔۱۹۶۷ء کی بات ہے میری رہائش اسلامیہ پارک میں تھی۔ اخبار میں اشتہار پڑھا کہ اتوار کے دن ڈاکٹر اسرار احمد A-211 این نیوسمن آباد میں درس قرآن دیں گے۔ میں اتوار کے دن وہاں پہنچ گیا۔ ایک کمرے میں چند لوگ بیٹھے تھے۔ عین وقت پر درس قرآن کا آغاز ہوا اور مقررہ وقت پر ختم ہوا۔ مجھے درس سن کر تعجب بھی ہوا اور حیرت بھی کہ ڈاکٹر صاحب کے درس کا انداز سب سے مختلف تھا۔ انہوں نے درس کے دوران کوئی غیر متعلق بات نہ کی۔ کسی پر خواہ مخواہ تنقید نہ کی بلکہ قرآن کے ذریعے اسلام سمجھانے کی کوشش کی۔ اب تو میں ہر اتوار کو درس میں شامل ہوتا اور اپنی علمی پیاس

بجھا تا۔ جلد ہی میرا تاثر یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ڈاکٹر صاحب کو قرآن فہمی کی خصوصی استعداد عطا فرمائی ہے اور گفتگو کا سلیقہ بھی انہیں خوب ارزانی ہوا ہے۔ سمن آباد کی کوٹھی میں جلد ہی سامعین کے لیے گنجائش نہ رہی۔ پھر لاہور میں کئی جگہ آپ کے درس ہونے لگے۔ مال روڈ کی مشہور مسجد میں مسجد شہداء میں کئی سال تک آپ کا درس قرآن چلتا رہا۔ پھر سالہا سال تک آپ نے مسجد دارالسلام میں جمعہ کے اجتماعات سے خطاب کیا۔ یہ اجتماعات لاہور میں ہونے والے بڑے اجتماعات میں سے ایک ہوتا تھا۔

ڈاکٹر صاحب کے ہاں سے ماہنامہ میثاق اور ماہنامہ حکمت قرآن جاری ہوئے جن کا میں مستقل قاری تھا۔ میں نے ہمت کی اور اپنی تحریریں اوّل میثاق میں اور بعد ازاں حکمت قرآن میں اشاعت کے لیے بھیجنی شروع کیں۔ قارئین کی طرف سے حوصلہ افزائی ہوئی تو میرے مضامین اکثر شائع ہونے لگے۔ دوست احباب کی طرف سے تقاضا ہوا کہ ان مضامین کو نظر ثانی کے بعد کتابی صورت میں یکجا کر دیا جائے۔ چنانچہ اُس کے نتیجہ میں شائع شدہ مضامین کو پرانی فائلوں سے نکالا گیا۔ ان کو پڑھا اور معمولی حکم و اضافہ کے ساتھ یکجا کر کے کتابی شکل میں شائع کر دیا۔ کتاب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ میرے تمام مضامین میں کسی اختلافی بات کو نہیں اچھالا گیا۔ بلکہ جو کچھ میں نے لکھا ہے اس پر قرآن و سنت اور سیرت صحابہؓ سے دلیل دی ہے کیونکہ اسلامی تعلیمات کے بنیادی ماخذ یہی ہیں۔

اس کتاب کی اشاعت سے مقصد نہ تو نام و نمود اور نہ پیسہ کمانا ہے۔ بلکہ یہ کوشش حصول رضائے الٰہی، دین کی خدمت اور صدقۂ جاریہ کی نیت سے ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ شرفِ قبولیت سے نوازے۔ میری لغزشوں، خطاؤں اور گناہوں سے درگزر فرمائے اور اس کتاب کو بہت سے لوگوں کے لیے نافع بنائے۔ قارئین سے گزارش ہے کہ اگر کہیں کوئی غلطی دیکھیں تو راقم کو مطلع کریں تاکہ اس کی اصلاح کر دی جائے اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کیا جائے۔ ﴿وَمَا اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ﴾۔

طالب دعا

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اگست 2007ء

میرے ابّا جان

ایک سلیم الفطرت انسان

نام فیروز دین تھا۔ والد کا نام فضل دین۔ ۱۹۰۲ء میں پیدا ہوئے۔ والد سکول ٹیچر تھے۔ ان کا سکول گھر سے میلوں دور تھا جہاں ہر روز پیدل آتے جاتے تھے۔ میرے والد دو بھائی تھے۔ بڑے بھائی کا نام مہتاب دین تھا۔ دو بہنیں بھی تھیں۔ میرے والد اپنے ماں باپ کی اولاد میں سے سب سے چھوٹے تھے۔ ابھی آپ عمر کے ابتدائی سالوں میں تھے کہ ماں اور باپ دونوں کا سایہ سر سے اٹھ گیا۔ ان کا ایک چچا تھا' اس کے زیر کفالت آ گئے۔ چچا بڑا سخت گیر تھا۔ والد صاحب انہیں دعائیں دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان کی سختی نے میرے جسم سے سستی اور کاہلی نکال دی۔ جب وہ صبح جگانے کے لیے آواز دیتے تو پہلی آواز پر ہی نہایت چستی کے ساتھ انہیں جواب دینا ہوتا تھا۔ عسرت اور ناداری کا دور تھا۔ چچا کی اپنی اولاد بھی تھی۔ حالات کی مجبوری کے تحت کسی کو بھی سکول نہ بھیج سکے' ہر ایک کو چھوٹے موٹے کام پر لگا دیا۔ یوں میرے والد صاحب بھی ناخواندہ رہ گئے۔ بعد ازاں جب جوان ہوئے تو پڑھنے لکھنے کا شوق ہوا۔ ابتدائی قاعدہ لیا اور جاننے والے دوست احباب سے سبق لے لیا کرتے۔ چنانچہ انہوں نے معمولی لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔ پڑھ تو خوب لیتے تھے مگر لکھنا صرف کام چلانے کی حد تک جانتے تھے۔ جب ہم نے بڑے ہو کر انہیں لکھتے دیکھا تو ہم ہنستے تھے کہ نصیر کو ''نسیر'' اور قیصر کو ''کیسر'' لکھتے تھے۔ ہمیں ہنستا دیکھ کر کہتے کہ میں نے کون سا سکول میں پڑھا ہے' میں تو بس اپنا کام چلا لیتا ہوں۔

میرے والد اور تایا کا باہمی اتفاق مثالی تھا۔ دونوں ایک ہی مکان میں رہتے تھے۔ دونوں صاحب اولاد ہوئے۔ بیٹیاں بڑی ہو گئیں۔ ان میں سے بعض کی شادیاں

بھی ہو گئیں۔ مگر دونوں ایک ہی جگہ رہتے اور کھاتے پیتے تھے۔ والد صاحب بتایا کرتے تھے کہ ہم دونوں بھائیوں کی بیٹیاں ہی تھیں۔ عزیزوں رشتہ داروں نے ہمیں مجبور کیا کہ دونوں بھائی الگ الگ رہائش کر لو' کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ تمہیں اولادِ نرینہ سے نوازے۔ چنانچہ دونوں بھائی بادلِ نخواستہ الگ ہوئے۔ بعد ازاں اللہ تعالیٰ نے دونوں کو اولادِ نرینہ سے نوازا۔ لڑکیوں کے بعد میرے تایا کے ہاں ایک لڑکا پیدا ہوا اور پھر تایا جان اللہ کو پیارے ہو گئے۔ میرے والد کے ہاں چار بیٹے ہوئے جن میں مَیں سب سے بڑا ہوں۔ بھائی کی وفات کے بعد میرے والد صاحب نے اپنی بیوہ بھابی اور اکلوتے بھتیجے کو زیر کفالت لینا چاہا مگر انہوں نے قبول نہ کیا۔ میرے تایا زاد کو تعلیم سے دلچسپی نہ تھی لہٰذا وہ معمولی تعلیم کے بعد کاروبار میں لگ گیا۔

میرے والد صاحب کو تعلیم کا بہت شوق تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میرے بچے اعلیٰ تعلیم پا کر سرکاری ملازمت میں آئیں' مگر وسائل کی کمی آڑے آ رہی تھی۔ میں اور میرے چھوٹے بھائی نے یکے بعد دیگرے گاؤں سے مڈل کا امتحان امتیازی حیثیت سے پاس کیا۔ گاؤں میں اُس وقت ہائی سکول نہ تھا [اب ڈگری کالج موجود ہے] میٹرک کرنے کے بعد شیخوپورہ آنا پڑا۔ چنانچہ ہم دونوں بھائیوں نے اوّل درجے میں میٹرک پاس کر لیا۔ ہم آگے پڑھنا چاہتے تھے مگر والد صاحب ہماری مزید تعلیم کا بوجھ برداشت نہیں کر سکتے تھے اور قرض لینے سے وہ انتہائی گریزاں تھے' لہٰذا ہمیں تعلیم کو خیرباد کہنا پڑا۔ مجھے تو انہوں نے گورنمنٹ نارمل سکول گکھڑ میں ایس وی ٹیچر کی تربیت کے لیے داخل کروا دیا جبکہ چھوٹا بھائی اے جی آفس میں جونیئر کلرک لگ گیا۔ میری تربیت مکمل ہوئی تو مجھے گورنمنٹ ہائی سکول ننکانہ صاحب میں ملازمت مل گئی۔ ۴ نومبر ۱۹۶۰ء سے میری ملازمت شروع ہوئی' جبکہ میری شادی اس سے چند ماہ پہلے ۲۰ سال کی عمر میں ہی ہو چکی تھی۔ میں نے ایف اے کی تیاری شروع کر دی۔ میری بیوی اور بعد ازاں میرے بچوں کی نگہداشت اور پرورش کا ذمہ میرے والد صاحب نے اٹھایا اور مجھے اس بوجھ سے آزاد کر دیا تاکہ میں سکون کے ساتھ حصولِ تعلیم میں لگ سکوں۔ چنانچہ اگلے سال ۱۹۶۱ء

میں مَیں نے پرائیویٹ طور پر بغیر کوئی اکیڈمی جائن کیے انٹرمیڈیٹ کا امتحان پاس کرلیا۔ [اُس وقت اکیڈمیوں کا رواج ہی نہ تھا' البتہ اپنے اساتذہ سے پرائیویٹ ٹیوشن تھی مگر وہ بھی خال خال] بی اے کی تیاری شروع کی تو انگلش خاصی مشکل تھی۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ ننکانہ میں رہ کر بی اے نہیں ہو سکے گا' چنانچہ لاہور تبادلے کی کوشش کی۔ لاہور تبادلہ بہت ہی مشکل تھا مگر والدین کی دعائیں اور تمنائیں رنگ لائیں کہ میرا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول باغبان پورہ میں ہو گیا۔ چھوٹا بھائی پہلے ہی لاہور میں تھا۔ ہم دونوں بھائیوں نے باغبان پورہ میں اکٹھی رہائش رکھ لی اور بی۔اے کی تیاری شروع کر دی۔ اس کے لیے ہم روزانہ شام کے اوقات میں سائیکل پر لکشمی چوک آیا کرتے تھے' جہاں پروفیسر نیاز محمد بی۔اے کی کلاس لیتے تھے۔ وہ بڑے لائق' محنتی اور ماہر استاد تھے۔ دور دور سے طالب علم ان سے پڑھنے کے لیے آتے تھے۔ اللہ کی مہربانی سے پہلے میں نے اور بعد ازاں میرے بھائی نے بھی بی۔اے کا امتحان پاس کر لیا۔ اس سارے عرصے میں میرے بیوی بچے اور بعد ازاں میرے چھوٹے بھائی کے بیوی بچے بھی ہمارے والدین کے پاس گاؤں میں رہے' وہی ان کی پرورش اور نگہداشت کرتے رہے۔ اگر وہ ایسا نہ کرتے تو ہمیں اپنے بیوی بچوں کو لاہور ساتھ رکھنا پڑتا اور ہم پرائیویٹ تعلیم کے لیے وقت نہ نکال سکتے اور اعلیٰ تعلیم سے محروم رہتے۔ لاہور میں رہ کر میں نے بی اے کے بعد سی ٹی' پھر بی۔ایڈ کے امتحان پرائیویٹ امیدوار کی حیثیت سے پاس کر لیے اور پھر پنجاب یونیورسٹی کے شعبہ تعلیم و تحقیق میں داخلہ لے کر ایم ایڈ بھی کر لیا۔ اس دوران چھوٹے بھائی کو وفاقی سیکرٹیریٹ اسلام آباد میں نوکری مل گئی۔ وہاں اس نے ایم اے انگلش کی پرائیویٹ تیاری شروع کر دی اور گارڈن کالج راولپنڈی کے شعبہ انگریزی کے مشہور ٹیچر پروفیسر مل کی اکیڈمی میں داخلہ لے لیا اور اللہ کی مہربانی سے ایم اے انگلش میں کامیابی حاصل کی۔ بعد ازاں پبلک سروس کمیشن پنجاب میں سیکشن آفیسر کا امتحان دیا اور کامیاب ہو کر صوبائی سیکرٹیریٹ لاہور میں سیکشن آفیسر کی پوسٹ پر تعینات ہوئے۔ ترقی کرتے کرتے سیکرٹری حکومت پنجاب کے منصب تک پہنچے۔

جب میں نے ایم ایڈ کر لیا تو مجھے سینئر ٹیچر کے طور پر لاہور سے باہر سرسبز و شاداب دیہاتی علاقے میں بھیج دیا گیا' جہاں چند ماہ گزارنے کے بعد میرا تبادلہ گورنمنٹ ہائی سکول شیخوپورہ میں ہو گیا جہاں سے میں نے میٹرک کیا تھا اور میرے اساتذہ بھی اسی سکول میں پڑھا رہے تھے۔ اب میں ان کا colleague بن گیا۔ یہ سارا کچھ اس لیے ہوا کہ والدین کی دعائیں شامل حال رہیں اور انہوں نے میرے بیوی بچوں کا ہر طرح کا بوجھ اٹھائے رکھا اور مجھے اطمینان اور سکون فراہم کیا جس کی وجہ سے میں دلجمعی کے ساتھ تعلیم حاصل کرنے میں لگا رہا۔

تقسیم ہند کے وقت میرے والد صاحب صوبہ بہار میں رانچی کے مقام پر تھے' وہاں وہ آرمی کو یونیفارم مہیا کرتے تھے۔ وہ علاقہ بھارت کے حصہ میں آیا تو وہاں سے پاکستان آنا تھا۔ کچھ لوگ تو پہلے ہی وہاں سے نقل مکانی کر آئے مگر میرے والد صاحب وہیں رہے اور جب آرمی کے وہاں سے شفٹ ہونے کا وقت آیا تو ان کے ساتھ ہی بذریعہ ٹرین وہ بھی لاہور پہنچے اور وہاں سے گوجرانوالہ ہوتے ہوئے اپنے گاؤں جنڈیالہ شیر خان پہنچ گئے۔ اس سفر کے دلدوز حالات وہ بعد ازاں سنایا کرتے تھے اور اسے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد سمجھتے تھے کہ وہ جان سلامت لے کر بہار سے پنجاب میں اپنے گھر پہنچ گئے۔ جبکہ راستے میں ٹرین پر کئی خونی حملے ہوئے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہوا۔ ٹرین خون آلود تھی۔ راستے میں جگہ جگہ لاشیں بکھری ہوئی تھیں۔ ٹرین آہستہ رفتار سے چلتی تھی اور سفر میں کئی دن لگ گئے۔ گھر پہنچ کر انہوں نے سجدۂ شکر ادا کیا۔ جو کچھ وہاں سے کما کر لائے تھے اس کا ایک حصہ غرباء اور مساکین میں تقسیم کر دیا۔ اس تقسیم کا انداز بھی نرالا تھا۔ ایک دن گلیوں میں پھر کر سروے کیا۔ بیواؤں اور ناداروں کے گھر معلوم کیے۔ اگلی رات تاریکی میں گھر سے نکلے۔ باری باری امداد کے مستحق کا دروازہ کھٹکھٹاتے اور اُس کے ہاتھ میں رقم رکھ دیتے اور چل دیتے۔ نہ اپنا تعارف کراتے اور نہ ہی نام بتاتے۔ تقسیم کے بعد جو رقم بچی اس کے ساتھ گاؤں میں ایک دکان کھول کر بیٹھ گئے۔ دکان میں روزمرہ کی اشیاء اور کپڑا بھی تھا۔ دکان کا مال کچھ شیخوپورہ

سے خرید کر لے جاتے اور کچھ دوسرا سامان کپڑا وغیرہ خرید نے کے لیے لاہور آتے۔ اس وقت گاؤں سے شیخوپورہ تک پختہ سڑک نہ تھی۔ تانگے چلتے تھے یا پھر سائیکل پر سفر ہوتا تھا۔ شیخوپورہ سے لاہور تک سڑک پختہ تھی لیکن کشادہ نہ تھی۔ بارش کے دنوں میں یہ سڑک بند بھی ہو جایا کرتی تھی۔

میرے والد صاحب کا دکان چلانے کا انداز بھی نرالا تھا۔ گاؤں کا ماحول تھا۔ لوگ غریب تھے۔ مہاجرین تھے تو وہ لٹ پٹ کر آئے تھے۔ میرے والد صاحب کو لوگوں کی کمزوری کا گہرا احساس تھا' چنانچہ وہ معمولی سے معمولی گاہک کو بھی واپس نہ لوٹاتے۔ ایک بابا مہاجر تیل لینے کے لیے دکان پر آیا' ہاتھ سے بوتل گر کر ٹوٹ گئی' اس نقصان پر وہ آنسو بہانے لگا۔ آپ نے اسے اپنے پاس سے بوتل دی اور اُس میں تیل بھی ڈال دیا۔ اس کی حالت زار دیکھ کر اس کی مالی امداد بھی کر دی۔ ہم نے وہ بابا دیکھا' جب تک زندہ رہا دعائیں دیتا رہا اور ممنون رہا۔

کوئی شخص دکان پر آتا اپنی ناداری کا اظہار کرتا اور ادھار مانگتا تو بلا ضمانت اسے ادھار دے دیتے۔ اس طرح ان کی اردگرد کے دیہاتوں میں بھی شہرت ہو گئی۔ چنانچہ ضرورت مند دور دور سے چل کر ادھار خریداری کے لیے آتے۔ والد صاحب کاپی میں ان کا نام' خریدی ہوئی چیز اور رقم درج کر لیتے۔ اُس وقت رواج تھا کہ دیہاتی دکاندار ادھار دیتے تھے' پھر فصل پکنے کے موقع پر وہ لوگوں سے قرض کی رقم وصول کرنے کے لیے ان کے گھروں میں پہنچ جاتے تھے۔ مگر میرے والد صاحب کبھی کسی کے ہاں وصولی کے لیے نہ جاتے' بلکہ لوگ خود ہی آ کر دیتے تو لے لیتے۔ اس طرح کئی لوگوں سے ادھار کی رقم واپس نہ ملتی۔ ہم بھائی اور والدہ ان کو کہتے کہ اگر آپ ادھار واپس نہیں لے سکتے تو دیتے ہی کیوں ہیں؟ دیکھیں آپ کی کاپیاں ادھار کے ناموں سے بھری پڑی ہیں۔ یہ ادھار کب وصول ہو گا؟ وہ کہتے جب کوئی ضرورت مند آ کر اپنی غربت کا اظہار کرتا ہے تو میں اُسے انکار نہیں کر سکتا' اللہ تعالیٰ مجھے روزی دے رہا ہے۔ ایک دن ہم نے ذرا زوردار انداز میں اُن کے اس طرح لوگوں کو ادھار سودا دینے پر اعتراض کیا تو

جلال میں آ گئے' ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ تمہارے خیال میں مَیں اپنا نقصان کرتا ہوں' ٹھیک ہے اپنا ہی نقصان کرتا ہوں' تم میں سے کسی کی کمائی تو ضائع نہیں کرتا' پس تمہیں اس معاملے میں مجھے سمجھانے کی ضرورت نہیں' آئندہ میں ایسی بات سننے کو تیار نہیں۔ اس کے بعد ہم نے انہیں منع نہ کیا۔ یوں ضرورت مندوں کی مدد کرنا گویا ان کا مشن تھا۔ جب آپ کی رحلت ہوئی تو ادھار والی کاپیاں ہمارے ہاتھ لگیں' ان میں لوگوں کے نام اور ادھار کی رقم لکھی ہوئی تھی۔ ہم نے چاہا کہ ان لوگوں سے رابطہ کر کے ان سے رقم کا تقاضا کریں۔ اس سلسلہ میں ابتدا کی اور ایک شخص کو کہا کہ کاپی میں تمہارے نام اتنی رقم لکھی ہوئی ہے' اس کی ادائیگی کر دیجیے۔ اس نے جواب دیا کہ میں نے تو رقم ادا کر دی تھی' وہ میرے نام کے آگے درج رقم کاٹنا بھول گئے ہیں۔ اس پر ہمیں شرمندگی سی ہوئی۔ رات کو والد صاحب مجھے خواب میں ملے۔ خوبصورت سفید لباس پہنے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ میں نے ملاقات کو غنیمت جانتے ہوئے پوچھ لیا کہ ابا جان! ہم نے فلاں شخص سے ادھار کی رقم واپس مانگی جو آپ کی کاپی میں لکھی ہوئی تھی مگر اس نے کہا کہ میں نے تو واپس کر دی ہے۔ یہ کیا معاملہ ہے؟ اس پر والد صاحب نے جواب دیا تمہیں کس نے کہا تھا کہ قرض کی رقم کا تقاضا کرو؟ یہ میرا معاملہ ہے۔ جو تمہیں خود گھر آ کر قرض کی رقم دے دے اس سے لے لو' مگر کسی سے تقاضا نہ کرو' میں جانوں میرا کام! چنانچہ اس کے بعد ہم نے کسی سے رقم نہیں مانگی۔ اگر کوئی خود آ کر دے جاتا تو لے لیتے۔

آپ پنجگانہ نماز باقاعدگی سے ادا کرتے۔ نماز کے وقت دکان بند کر دیتے۔ اگر مؤذن یا امام وقت کی پابندی میں کوتاہی کرتے تو ناراض ہوتے اور کہتے کہ جب وقت مقرر ہے تو اس کا لحاظ رکھنا ضروری ہے تاکہ بلاوجہ نمازیوں کو دقت نہ ہو۔ اسی طرح اگر کسی بڑے آدمی کے انتظار میں ایک دو منٹ تاخیر کی جاتی تو وہ ٹوک دیتے کہ مسجد میں کوئی بڑا چھوٹا نہیں' بلکہ "تیرے دربار میں پہنچے تو سبھی ایک ہوئے"۔

ایک دفعہ مسجد میں اعلان ہوا کہ میت کو قبرستان میں لے جانے کے لیے چارپائی کی

ضرورت ہے۔ دو تین دفعہ کے اعلان پر کسی نے حامی نہ بھری تو انہوں نے ہاں کر دی۔ چارپائی کا آرڈر دے دیا۔ بنانے والے نے عمدہ قسم کی چارپائی تیار کر دی جس کی قیمت والد صاحب کی استطاعت سے زیادہ تھی ۔تاہم انہوں نے بلا حیل و حجت قیمت ادا کر دی۔ اس کے تھوڑا عرصہ بعد اُن کا انتقال ہو گیا اور اُسی چارپائی پر انہیں قبرستان لے جایا گیا۔ گاؤں میں کسی غریب اور نادار کے کفن کے لیے کپڑا درکار ہوتا تو دے دیتے' رقم کا تقاضا نہ کرتے ۔کوئی دے دیتا تو لے لیتے۔

میرے والد اگرچہ ناخواندہ تھے مگر سلیم الفطرت تھے ۔ اچھائی' برائی' صحیح اور غلط میں تمیز کر لیتے تھے۔ دیہاتی ماحول میں ٹھوکریں کھاتے ہوئے پرورش پائی تھی ۔گاؤں کے جاہلانہ رسوم و رواج ان کے سامنے تھے مگر انہوں نے کبھی فضول رسموں کو قبول نہ کیا۔ میں جب بڑا ہوا' دین کا مطالعہ کیا تو جب بھی انہیں قرآن و حدیث کی بات بتائی اس کو انہوں نے اس طرح قبول کیا گویا ان کے دل کی بات ہو۔ غیر اللہ سے مدد مانگنا ان کے نزدیک انتہائی قابل نفرت بات تھی ۔ وہ کہتے تھے مخلوق کا ہر فرد اللہ تعالیٰ کا محتاج ہے' لہٰذا اُسی کی طرف سب کو رجوع کرنا چاہیے ۔ اس کے خزانے غیر محدود ہیں' اُس سے مانگنے میں کوئی عار نہیں۔ خاص طور پر اولاد کی خواہش میں مقبروں پر چڑھاوے چڑھانے کو حماقت اور نادانی جانتے ۔اس سلسلہ میں وہ ایک ہندو کا شعر پڑھا کرتے : ؎

دادو دنیا باوری مڑھیاں پوجن اُوت
جو دنیا تھیں لد گئے اُن تھیں مانگیں پوت!

[دادو شاعر کا نام ہے۔ دیکھو دنیا والے کتنے پاگل اور بیوقوف ہیں کہ قبروں کی پوجا کرتے ہیں اور فوت شدہ لوگوں سے بیٹے مانگتے ہیں۔]

ہم بھائی تعلیم میں اچھے تھے۔ مقامی سکول میں پڑھتے تو کلاس میں اوّل دوم رہتے ۔ گاؤں میں لوگ ہماری تعریف کرتے اور ہمارے والد صاحب سے پوچھتے کہ آپ کے بچے پڑھائی میں اتنے لائق کیوں ہیں؟ وہ جواب دیتے کہ میں تو خود اَن پڑھ ہوں' پڑھائی کے سلسلہ میں مَیں ان کی کوئی راہنمائی نہیں کر سکتا' نہ ہی کسی اور ذریعے سے انہیں کوئی مدد مل سکتی ہے' بس میں تو یہ جانتا ہوں کہ انہیں میں نے رزقِ حلال کھلایا ہے اور

ہمیشہ اس بات کی تلقین کی ہے کہ محنت کرو اور اپنا راستہ خود بناؤ۔ نہ میرے پاس کوئی سفارش ہے اور نہ ہی میں سفارش کو اچھا سمجھتا ہوں۔ میں انہیں کہتا ہوں آنکھیں کھول کر دیکھو گے تو تمہیں چپڑاسی بھی نظر آئیں گے اور آفیسر بھی۔ تم جو بننا چاہو بن جاؤ۔ جتنی محنت کرو گے اتنا پھل پاؤ گے۔

میرے والد صاحب کو ملازمت بہت پسند تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ملازم کی آمدنی مقرر ہوتی ہے۔ اگر وہ ذرا بھی سمجھ دار ہو تو اسے اپنا ماہانہ بجٹ بنانے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔ وہ اپنی آمدنی کے مطابق اخراجات کر کے ہر ماہ کچھ رقم بچا بھی سکتا ہے۔ پھر ملازم کی آمدنی میں ناغہ نہیں ہوتا اگر وہ بیمار ہو جائے یا کسی کام کی وجہ سے دفتر نہ جا سکے تو وہ چھٹی پر ہوتا ہے اور اسے تنخواہ تو ملتی ہے۔ اس کے برعکس دکاندار اگر کسی ناگزیر وجہ سے دکان نہ کھول سکے تو اُس کو اس دن کوئی آمدنی نہ ہو گی۔

وہ قرآن مجید نہیں پڑھ سکتے تھے' چنانچہ عمر کے آخری سالوں میں مجھ سے سبقاً سبقاً قرآن مجید پڑھا۔ پورا قرآن پڑھ لیا تو بہت خوش ہوئے اور لوگوں میں شیرینی تقسیم کی۔ میرے والد صاحب سلیم الفطرت تھے۔ گناہ اور برائی کے کاموں سے انہیں نفرت تھی۔ کسی کو بھی بری عادت میں گرفتار دیکھتے تو بڑے حکیمانہ انداز میں اُسے نصیحت کرتے اور سیدھی راہ اختیار کرنے کی ہدایت کرتے۔ محنت کو کامیابی کی کلید جانتے تھے۔ ان کے وجود میں سہل انگاری کا نام ونشان نہ تھا۔ اپنا کام خود کرتے' دوسروں کو کام کہنے سے گریز کرتے۔ سست اور کاہل بندے کو ناپسند کرتے۔ وہ کہتے کہ ہر کام کو محنت اور لگن کے ساتھ خوبصورت انداز میں کرنا چاہیے۔ اگر کوئی جھاڑو بھی دے تو دوسرے لوگوں کے مقابلے میں اچھا دے۔ کوشش کرنی چاہیے کہ اپنے ساتھیوں میں امتیازی پوزیشن حاصل ہو۔ ان کا اپنا حال یہ تھا کہ جہاں جہاں انہوں نے کام کیا وہاں اپنے ساتھیوں سے آگے آگے رہے۔

خدا ترسی کا مظہر تھے۔ کوئی ایک غریب آدمی ہمیشہ ان کا دوست ہوتا جس کی مشکل میں مدد کرتے تھے۔ ان کے ایک دوست کی بیٹی کی شادی تھی۔ وہ تنگ دست تھا۔ ہماری

والدہ کے زیورات میں سے کچھ اس کو دے دیے' پھر زندگی بھر واپس نہیں لیے۔ ہم کہتے کہ واپس مانگیں۔ وہ جواب دیتے کہ جب اس کے پاس ہوں گے خود ہی دے دے گا' کسی تنگدست کو پریشان کرنا گناہ کی بات ہے۔

ایک غریب کسان ان کا دوست تھا۔ اس کا بیٹا میرا ہم جماعت تھا۔ دوسری یا تیسری جماعت کی بات ہے میں پڑھائی میں اچھا تھا مگر وہ لڑکا انتہائی کند ذہن تھا۔ میرے والد مجھے کہتے کہ اس لڑکے کو ساتھ لے کر چلو' اسے پڑھایا کرو۔ جب میں اس کو سبق یاد کروانے میں ناکام رہتا تو مجھ سے ناراض ہوتے اور سخت سست کہتے۔ ایک دفعہ تو اس کوتاہی پر مجھے تھپڑ بھی رسید کیے۔

میرے والد صاحب بڑے دانا تھے۔ ہمدردی اور غمگساری ان کی طبیعت کا جزو تھی۔ جس کو پریشان دیکھتے اسے صحیح مشورہ دیتے۔ کام چوروں سے انہیں سخت نفرت تھی۔ ایک دفعہ ایک جوان بے روزگار تھا۔ ان کے پاس اٹھتا بیٹھتا تھا۔ ایک دن کہنے لگا مجھے نوکری مل گئی ہے۔ وہ سن کر بہت خوش ہوئے۔ کہنے لگے جاؤ اور ڈٹ کر محنت کرو۔ چند دنوں کے بعد اُس سے ملاقات ہوئی تو پوچھا سناؤ نوکری کیسی چل رہی ہے؟ وہ کہنے لگا میں نے وہ نوکری چھوڑ دی ہے۔ کہنے لگے کیوں؟ اس نے کہا نوکری بہت سخت تھی' گرم بھٹی کے آگے کھڑے ہو کر کام کرنا پڑتا تھا۔ کہنے لگے تم سے پہلے بھی وہاں کوئی کام کرتا تھا؟ کہنے لگا ہاں۔ پھر پوچھا تم چھوڑ آئے ہو تو اب بھی وہاں کوئی کام کرے گا یا نہیں؟ کہنے لگا کرے گا۔ پھر کہا افسوس تم پر کہ وہ کام تمہارے لیے مشکل ہے جو دوسرے بخوبی کر رہے ہیں۔ کوئی کام مشکل نہیں' انسان کا ارادہ مضبوط اور ہمت جواں ہونی چاہیے۔

میرے ابا جان حد درجہ متوکل تھے۔ اگرچہ وہ ناخواندہ تھے مگر سلیم الفطرت ہونے کے باعث وہ توکل کا مطلب خوب سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ انسان کو مسائل کے حل کے لیے شرعی حدود کے اندر رہتے ہوئے بھرپور محنت اور جدوجہد کرنی چاہیے اور وقت کی قدر و قیمت پہچانتے ہوئے اس سے پورا پورا فائدہ اٹھانا چاہیے۔ اپنی استطاعت کے

مطابق محنت اور خلوص سے کام کرنے کے بعد نتیجہ اللہ پر چھوڑ دینا چاہیے۔

وہ کردار و عمل میں بڑے راست رو تھے۔ فضولیات سے نفرت تھی۔ اخلاقی کمزوریوں سے نفور تھے۔ ایک دفعہ دکان میں بیٹھے تھے کہ سامنے سے ایک قلفی بیچنے والا گزرا جو آواز لگا رہا تھا ''کھوئے ملائی والی قلفی''۔ آپ نے اسے پاس بلایا اور بڑے پیار سے پوچھا ''سچی بات بتاؤ تم نے اس قلفی میں کھویا ڈالا ہے؟'' اس نے کہا نہیں۔ پھر پوچھا ملائی ڈالی ہے؟ کہنے لگا نہیں۔ اس پر انہوں نے کہا سارا دن جھوٹ بول رہے ہو جو بڑے گناہ کی بات ہے۔ اس طرح آواز لگاؤ کہ ''ٹھنڈی اور میٹھی قلفی'' اس نے یہ نصیحت قبول کی۔ اس طرح ایک بے خبر کو سیدھی راہ پر ڈال دیا۔

گاؤں کے خوشحال خاندان کا ایک فرد تھا۔ شریف آدمی تھا' پنجگانہ نماز ادا کرنے والا تھا۔ اُسے عادت تھی کہ جو خوانچہ فروش یا ریڑھی والا پاس سے آواز لگاتا ہوا گزرتا اُس سے چیز کا بھاؤ پوچھتا اور بیر یا کھجور وغیرہ کی قسم کا پھل ہوتا تو ایک دو دانے اٹھا کر کھا لیتا۔ میرے والد صاحب کو یہ انداز بہت ناپسند تھا۔ ایک دن اس کو کہنے لگے کہ بھائی آپ یہ کیا کرتے ہیں کہ غریب آدمی کی ریڑھی سے بلا اجازت اور بلا قیمت چیز اٹھا کر کھا لیتے ہیں' خریدتے نہیں! اس طرح آپ خواہ مخواہ اس کا نقصان کرتے ہیں۔ یہ عادت ٹھیک نہیں۔ ہمیشہ خرید کر چیز کھانی چاہیے۔ اس طرح اُس آدمی سے ایک بری عادت چھڑوا دی۔

کسی کے لیے تکلیف کا سبب بننا ان کو سخت ناپسند تھا۔ اُن کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ دوسروں کا چھوٹا موٹا کام جو اپنے اختیار میں ہو کر دیں مگر کسی پر کوئی بوجھ نہ ڈالیں' اور نہ ہی کسی کا دل رنجیدہ کریں۔ ایک دن اپنی بہو (میری بیوی) سے پوچھنے لگے کہ تمہیں گھر میں میرے رویے سے کوئی شکایت تو نہیں؟ وہ کہنے لگی ہرگز نہیں۔ اس پر کہنے لگے کہ شاید تم احترام اور مروت کی وجہ سے ایسا کہہ رہی ہو! مگر سنو اگر میرے رویے میں تمہیں کوئی بات ناپسند ہو تو اسے یاد رکھو' اور جب تمہاری بہو آئے تو اُس کے ساتھ وہ رویہ اختیار نہ کرنا۔

میرے والد صاحب حقہ بہت پیتے تھے۔ان کے ہاں اچھے سے اچھا تمبا کو مل جاتا تھا۔چوبیس گھنٹے ان کا حقہ تیار ہوتا تھا۔مگر ہمیں وہ سگریٹ اور حقہ نہ پینے کی ہدایت کرتے تھے۔ہم نے پوچھا کہ آپ ہمیں تو منع کرتے ہیں مگر خود اتنا زیادہ حقہ پیتے ہیں۔تو انہوں نے کہا کہ میرے ماں باپ بچپن میں فوت ہو گئے تھے' مجھے ماں باپ کی شفقت نصیب نہ ہوئی' میری پرورش مناسب نگرانی میں نہ ہوئی' دیہاتی ماحول تھا' حقہ پینا عام تھا' لہٰذا مجھے بھی اس کی عادت پڑ گئی' اب اس کی برائی کا گہرا احساس ہے مگر اب یہ عادت پختہ ہو گئی ہے' چھوٹتی نہیں۔پھر ہمیں کہا کہ تمہارا معاملہ بالکل مختلف ہے' تمہاری پرورش ماں باپ کے زیر سایہ ہو رہی ہے' ہم تمہیں اچھی باتوں کے اختیار کرنے اور بری باتوں سے رکنے کی نصیحت کرتے ہیں اور نگرانی بھی کرتے ہیں' اگر اس کے باوجود تم تمبا کو نوشی کرنے لگو تو پھر میرے اور تمہارے درمیان کیا فرق رہ گیا؟ تمہیں میں اس سے منع کرتا ہوں' پھر کتابوں میں تم تمبا کو نوشی کے نقصانات پڑھتے ہو۔اس سب کچھ کا تقاضا یہ ہے کہ تم ہرگز اس بری عادت کے قریب نہ جاؤ۔ چنانچہ ہم بھائیوں اور بھائیوں کے بچوں میں سے کوئی بھی سگریٹ نہیں پیتا' بلکہ ہم سب سگریٹ سے نفرت کرتے ہیں۔حقہ ہمارے گھروں میں نہیں ہے۔اگر سگریٹ کا عادی کوئی مہمان ہمارے ہاں آ جائے تو ہمارے رویے سے وہ خود اندازہ لگا لیتا ہے کہ یہ لوگ سگریٹ پینے کو پسند نہیں کرتے۔میرے والد صاحب ہمہ وقت حقہ پیتے تھے مگر انہوں نے نہ تو کبھی گھر کے کسی فرد کو حقہ تازہ کرنے کے لیے کہا اور نہ ہی حقے کے لیے کوئلے سلگانے کو کہا۔دن اور رات کے اوقات میں وہ خود ہی یہ سارے کام کرتے۔

میرے والد رقیق القلب تھے۔کسی کو دکھ اور تکلیف میں دیکھ کر پریشان ہو جاتے اور جہاں تک ہو سکتا اُس کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوششیں کرتے۔میرے ایک ہی ماموں تھے' ان کے ساتھ حقیقی بھائیوں جیسا سلوک کرتے۔ایک دفعہ ماموں جان ایک سفر سے پریشان واپس آئے۔معلوم ہوا کہ دورانِ سفر کسی نے ان کی جیب کاٹ لی ہے اور تمام رقم اڑا لی ہے۔والد صاحب نے ماموں جان کو بلایا اور ان سے صورت حال دریافت کی۔ان کو پریشان دیکھا تو مجھے کہا کہ اندر سے میرا بٹوہ لاؤ۔میں بٹوا لایا تو

نقصان کی پوری رقم جو غالباً پانچ سو روپے تھی' ان کے حوالے کی۔ انہوں نے لینے سے انکار کیا تو کہنے لگے کہ بھائی کا فرض ہے کہ وہ بھائی کی پریشانی دور کرنے کی کوشش کرے۔ چنانچہ انہیں رقم لینے پر آمادہ کرلیا۔

میرے ماموں جان کے ہاں اولاد نہ تھی۔ دوسرا نکاح بھی کیا مگر آرزو پوری نہ ہوئی۔ احساسِ محرومی انہیں ہمہ وقت آزردہ خاطر رکھتا۔ والد صاحب نے میری والدہ سے مشورہ کیا اور فیصلہ کیا کہ اپنا نومولود بیٹا ان کو دے دیں۔ اس فیصلے کا ماموں اور ممانی کو علم ہوا تو ان کی خوشی کی انتہا نہ رہی۔ وہ شیر خوار بچہ اپنے گھر لے گئے۔ انتہائی شفقت اور محبت سے اس کی پرورش شروع کردی۔ ادھر ہماری والدہ کا نومولود بچے کی جدائی میں برا حال تھا۔ اگرچہ انہوں نے بچہ برضا ورغبت دیا تھا لیکن ماں کی ممتا تو فطرت کا تقاضا ہے۔ از خود گود کو بچے سے خالی کر لینا انتہائی کرب کا باعث تھا۔ اس صورت حال میں والد صاحب انتہائی مضبوط رہے اور والدہ کو تسلی دیتے رہے اور کہتے رہے کہ اس بات کا احساس کرو کہ ہمارے اس اقدام نے تمہارے بھائی اور بھابی کے مرجھائے ہوئے چہروں پر خوشی کی لہر دوڑادی ہے۔ کیا ان کو خوشی فراہم کرنا اور اُن کا احساسِ محرومی ختم کرنا ہمارے لیے اطمینان کا باعث نہیں ہے؟ اس سب کچھ کے باوجود تصویر کا دوسرا رُخ بھی ان کے سامنے تھا۔ ایک دفعہ کہنے لگے کہیں ایسا نہ ہو کہ اللہ تعالیٰ مجھے کہے کہ جب میں نے انہیں اولاد نہ دی تو تم کون ہوتے ہو اولاد دینے والے؟ اس خیال سے ان پر خوفِ خدا کا غلبہ ہوا' رقت طاری ہوئی۔ یہ دیکھ کر میں نے انہیں تسلی دی کہ آپ نے بیٹا اس لیے تو نہیں دیا کہ اللہ نے نہیں دیا تو میں دیتا ہوں! آپ نے تو ایک بھائی کی آزردگی دور کرنے کے لیے بہت بڑی قربانی دی ہے۔ یہ تو ایسے ہی ہے کہ ایک بھوک سے نڈھال شخص کو کوئی اپنے کھانے میں شریک کرکے اس کی بھوک مٹادے' اگرچہ خود اس کی اشتہا باقی ہو۔ اس پر وہ قدرے مطمئن ہو گئے۔

میرے والد صاحب سادگی پسند تھے۔ سادہ لباس پہنتے۔ سادہ خوراک انہیں پسند تھی۔ اپنے بیٹے بیٹیوں کی شادیاں انتہائی سادہ انداز میں منعقد کیں۔ ان کو اس بات

سے ذرا عار نہ تھی کہ لوگ کیا کہیں گے۔ ان کا مقولہ تھا کہ ہمیشہ اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلاؤ۔ ان کا اندازِ زیست "مَا عَالَ مَنِ اقْتَصَدَ" [جس نے میانہ روی اختیار کی وہ محتاج نہ ہوا] کا مصداق تھا۔ یہی وجہ ہے کہ وہ مالدار نہ تھے مگر لوگ انہیں مالدار سمجھتے تھے۔

عزیز و اقارب اور برادری میں کوئی شخص فوت ہو جاتا تو جنازے میں شرکت کرتے۔ اگر گاؤں سے باہر کہیں ایسا واقعہ پیش آتا تو بس تعزیت کے لیے ایک ہی دفعہ جاتے' بار بار کے جانے کو پسند نہ کرتے' بلکہ لوگوں کو بھی تلقین کرتے کہ وہ رسم و رواج کی خاطر فوتگی والے گھر بار بار نہ جائیں' نہ خود تکلیف میں پڑیں اور نہ میت کے ورثاء کو مشکل میں ڈالیں۔

میرے والد صاحب مشقت کے عادی اور عزم و ہمت کا پیکر تھے۔ زندگی میں ایک دَور ایسا بھی آیا کہ انہیں شیخوپورہ شہر میں دکان کرنا پڑی۔ شیخوپورہ سے گاؤں جنڈیالہ شیر خان کا فاصلہ ۹ میل (چودہ کلومیٹر) ہے۔ اُس وقت کچی سڑک تھی جس پر تانگے چلتے تھے۔ تانگے سے یہ فاصلہ دو گھنٹے میں طے ہوتا تھا [اب یہ سڑک پختہ ہو چکی ہے]۔ والد صاحب کئی سال یہ دکان چلاتے رہے اور روزانہ کا معمول یہ تھا کہ صبح فجر کی نماز پڑھ کر پیدل چل پڑتے۔ شہر پہنچ کر دکان کھولتے۔ سارا دن کام کرتے۔ مغرب کی نماز شہر میں پڑھ کر واپس پیدل چل پڑتے۔ گاؤں پہنچ کر عشاء کی نماز پڑھتے۔ رات آرام کرتے اور صبح پھر بعد از نمازِ فجر شہر کے لیے چل پڑتے۔ اُن کا یہ معمول کئی سال تک رہا۔ پیدل چلنا صحت کے لیے بہت مفید بتاتے ہیں۔ میرے والد صاحب کی صحت اچھی رہی۔ جسم دبلا پتلا تھا۔ دانت اخیر تک صحیح سالم رہے۔ بڑھاپے میں بھی نوجوانوں کی طرح دانتوں سے گنا چھیلتے اور چوستے تھے۔ آخری عمر میں البتہ کھانسی شدت اختیار کر گئی۔ اس کھانسی نے ان کو بے بس کر دیا۔ معلوم ہوتا ہے اس کھانسی کی وجہ وہی حقہ نوشی تھی جس نے ان کے پھیپھڑوں کو شدید متاثر کر دیا تھا۔ اسی بیماری میں وہ ۷۲ سال کی عمر میں ۱۹۷۴ء میں اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ہم نے اُن کی جوانمردی' سخت کوشی اور مضبوط عزم و استقلال سے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اللّٰھم اغفر لہ وارحمہ!

اِسلام ــــ دینِ فطرت

اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے' وہ ہر مخلوق کی حدود اور صلاحیتوں کو خوب جانتا ہے۔ وہ الحکیم ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ انسان اس کی شاہکار تخلیق ہے۔ یہ اشرف المخلوق ہے۔ اس کی تخلیق بھی بامقصد ہے۔ سورۃ الملک میں ہے: ﴿لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا﴾ (آیت ۲) ''تاکہ اللہ تعالیٰ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کون اچھے اعمال کرتا ہے''۔ چنانچہ اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی سرشت میں اچھائی اور برائی میں تمیز کرنے کی صلاحیت بھی ودیعت فرما دی۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰىهَا﴾ (الشمس) ''پس اُس نے نفس کو برائیوں اور اچھائیوں کی پہچان سمجھا دی''۔ چونکہ دنیا میں اس قدر رنگینی اور دلکشی ہے کہ انسان برائیوں کو برائی جانتے ہوئے بھی ان سے مکمل طور پر بچ نہیں سکتا' اس لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے الہامی راہنمائی (Divine Guidance) کا انتظام کر دیا' جس کا مکمل' کامل اور آخری ایڈیشن قرآن مجید بنی نوع انسان کے پاس اپنی اصل اور خالص ترین صورت میں موجود ہے۔ اس میں انسان کو زندگی گزارنے کا سلیقہ بتایا گیا ہے' تاکہ وہ فسق وفجور سے بچ سکے اور تقویٰ کی روش اختیار کرنا اس کے لیے آسان ہو جائے۔ اس راہنمائی کے بغیر اس مزیّن اور لذیذ دنیا میں راہ راست پر چلنا ممکن نہیں ہے۔

چونکہ اللہ تعالیٰ نے خود ہی انسان کو تخلیق کیا ہے لہٰذا وہ اس کی صلاحیتوں اور کمزوریوں سے بخوبی واقف ہے۔ چنانچہ اس نے دنیا میں زندگی گزارنے کا جو ضابطہ دیا ہے وہ عین قابل عمل اور نتائج کے اعتبار سے خوشگوار ہے۔ اس کی راہنمائی میں زندگی گزاریں تو سکون واطمینان بھی نصیب ہوتا ہے' آزمائش میں کامیابی کا احساس بھی ہوتا ہے اور یہ چیز دنیاوی تکالیف اور مصائب کی برداشت کو سہل بھی بنا دیتی ہے۔ قرآن مجید

میں ہے:

﴿مَنْ عَمِلَ صَالِحًا مِّنْ ذَكَرٍ اَوْ اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَلَنُحْيِيَنَّهٗ حَيٰوةً طَيِّبَةً﴾ (النحل:۹۷)

''جس نے نیک عمل اپنایا' چاہے وہ مرد ہو یا عورت' اور ہو وہ مؤمن' تو ہم اسے ضرور (دنیا میں) پاکیزہ زندگی بسر کرائیں گے''۔

یہ پاکیزہ زندگی ہی کامیاب زندگی ہے۔ چنانچہ اس کے حصول کے لیے خالق کا تجویز کردہ انداز اختیار کرنا ضروری ہے جو کہ انسان کی فطرت کے قریب ترین ہے۔ اس تحریر کا یہی موضوع ہے۔

ہم دیکھتے ہیں کہ انسان کو زندہ رہنے کے لیے سب سے زیادہ ضرورت کھانے پینے کی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کھانے پینے سے نہیں روکا۔ زمین سے پیدا ہونے والی ہر شے بطور خوراک استعمال کی جاسکتی ہے۔ ہاں' حیوانات میں سے بعض کا گوشت کھانے سے منع کیا گیا ہے' اور وہ بھی اس لیے کہ ایک تو اُن کا گوشت صحت انسانی کے لیے مضر ہے اور دوسرے ان کے کھائے بغیر انسان کا گزارا ہوسکتا ہے۔ مشروبات میں ہر طرح کا مشروب استعمال کرنے کی اجازت ہے' صرف شراب حرام قرار دی گئی ہے جو عقل کو ماؤف کر دیتی ہے اور انسان اچھائی اور برائی کی تمیز سے عاری ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے ایسی چیز کے استعمال پر پابندی خود انسان کے اپنے مفاد میں ہے۔ پھر یہ کوئی ایسی شے نہیں ہے کہ جس کے بغیر گزارا نہ ہو سکے۔

روزی کے حصول کے لیے صاف اور شفاف اصول دیے گئے ہیں ۔ دھوکہ دہی' بددیانتی' رشوت' چور بازاری' ذخیرہ اندوزی وغیرہ جیسے کاموں کے ذریعے کمائی ہوئی دولت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ ان ذرائع سے دولت کمانے والا معاشرے کے دوسرے افراد کے ساتھ ظلم و زیادتی کا مرتکب ہوتا ہے' جس کے بُرا ہونے پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔

دنیا میں ہر شخص کی خواہش ہے کہ اسے زیادہ سے زیادہ سہولیات میسر ہوں۔ یہ

انسانی فطرت ہے۔ چنانچہ سہولتیں حاصل کرنے کی جدوجہد پر کوئی پابندی نہیں۔ اچھے سے اچھا کھاؤ' اچھے سے اچھا پہنو' پُر آسائش رہائش گاہ میں سکونت اختیار کرو' اچھی سواری رکھو' کوئی ممانعت نہیں۔ ممانعت صرف اس بات کی ہے کہ یہ سب کسب حلال سے حاصل کیا گیا ہو اور نمود و نمائش کا جذبہ اور دوسروں کے مقابلے میں اپنی برتری جتانا مقصود نہ ہو' بلکہ مقصود یہ ہو کہ دنیاوی نعمتوں کے استعمال کے ساتھ صحت وتندرستی حاصل رہے اور اللہ کی عبادت کے لیے زیادہ سے زیادہ موزوں ماحول میسر آ سکے۔

گناہوں سے بچنے کی تلقین کی گئی ہے لیکن اس کے لیے رہبانیت کی راہ اختیار کرنے سے روک دیا گیا ہے' کیونکہ یہ فطرت کے خلاف ہے۔ انسان معاشرتی حیوان ہے۔ اگر اسے معاشرے سے الگ تھلگ تنہائی میں رکھا جائے تو یہ اس کے لیے دنیاوی زندگی میں بدترین سزا ہے۔ لہٰذا اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ابنائے نوع کے اندر رہتے ہوئے اور فطری تقاضوں کو جائز راستے سے پورا کرتے ہوئے بھرپور زندگی گزارو۔ بیوی بچوں اور دوست واحباب سے کٹ کر زندگی گزارنا گناہ کی بات ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ وہ شخص جنت میں نہیں جائے گا جو رشتہ داروں کے ساتھ تعلقات منقطع کرلے۔

دنیا کی زندگی میں انسان کی کئی حیثیتیں ہیں۔ وہ بیٹا ہے تو اسے ماں باپ کی خدمت' اطاعت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کا حکم دیا گیا ہے۔ ظاہر ہے جن ہستیوں نے اس کی پرورش کی' اپنا آرام وراحت اس پر قربان کرتے رہے ان کی خدمت اور اطاعت تو عین فطری بات ہے۔ پھر کل کو آج کے بچے ماں باپ بنیں گے تو انہیں بھی یہ موقع حاصل ہوگا کہ ان کی اولاد اُن کی خدمت کرے۔

اگر انسان بڑی عمر کا ہے تو اسے ہدایت ہے کہ چھوٹوں پر شفقت کرے کہ وہ اس کے مستحق ہیں۔ بڑوں کا فرض ہے کہ وہ نرمی اور رفق ومحبت کے ساتھ چھوٹوں کو اچھی تعلیم دیں تاکہ وہ کامیاب زندگی کی راہ پر گامزن ہوں۔ ان باتوں پر عمل پیرا ہونے کی اہمیت اس حدیث سے واضح ہے:

((مَنْ لَمْ يَرْحَمْ صَغِيْرَنَا وَيَعْرِفْ حَقَّ كَبِيْرِنَا فَلَيْسَ مِنَّا)) (ابو داؤد)

''جس شخص نے ہمارے چھوٹوں پر رحم نہیں کیا اور ہمارے بڑوں کا حق نہیں پہچانا وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

گویا تمام اسلامی اخلاقی تعلیم انتہائی نتیجہ خیز ہے اور معاشرے میں امن وسکون کا باعث ہے۔ جو شخص ان تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے دوسروں کے حقوق کی ادائیگی کا خیال رکھتا ہے اس کا دل مطمئن اور روح پرسکون ہو جاتی ہے۔

دنیا کی زندگی میں خوشی کے مواقع بھی آتے ہیں اور غمی کے بھی۔ اسلامی تعلیمات خوشی کے موقع پر خوشی کے اظہار سے نہیں روکتیں کہ یہ فطری تقاضا ہے۔ بیٹے کی شادی کا موقع والدین اور عزیز واقارب کے لیے خوشی کا موقع ہے۔ اس موقع پر دولہا کی طرف سے دعوتِ ولیمہ کے انعقاد کی ترغیب دی گئی ہے تاکہ وہ اپنے عزیز واقارب اور دوست و احباب کو اپنی خوشی میں شریک کر سکے۔ البتہ اس موقع پر فضول رسومات کی حوصلہ شکنی کی گئی ہے جہاں صاف طور پر اسراف وتبذیر involve ہوتا ہے۔ شادی بیاہ کے موقع پر حلال وطیب کمائی کو نام ونمود اور شہرت کی خاطر خرچ کرنے سے منع کیا گیا ہے کہ اس سے ناداروں اور مفلسوں کی حق تلفی بھی ہوتی ہے اور دل شکنی بھی۔ یوں ایسا آدمی معاشرے میں اونچ نیچ پیدا کر کے نفرت کا بیج بوتا ہے جو ہرگز مستحسن نہیں۔

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ کسی گھر میں موت ہو جائے تو اہل خانہ پر صدمے کی کیفیت طاری ہونا ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ ایسے موقع پر غمگین ہونے اور غم کے آنسو بہانے سے نہیں روکا گیا' بلکہ نمازِ جنازہ کے ذریعے میت کی مغفرت کے لیے دعا کرنا مسنون قرار دیا گیا۔ اور یہ نہ صرف زندوں کے لیے صبر وسکون کا باعث ہے بلکہ فوت ہونے والے کے لیے بھی مفید ہے۔ البتہ اس غم کے موقع پر بھی نام ونمود کے لیے بڑی بڑی دعوتیں پکانا اور کئی دن تک سوگ کی حالت میں رہنا ممنوع قرار دیا گیا ہے۔ تعلیم یہ دی گئی ہے کہ کسی فرد کی وفات کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہوا۔ ﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ۗ﴾ (الانبیاء:۳۵) یہاں ہر نفس پر موت آئے گی' یہ اللہ کا اٹل فیصلہ ہے۔ صدمہ تو فطری امر

ہے‘اس کونہیں دبایا گیا‘البتہ حد سے بڑھنے یعنی بے صبری کے مظاہرے سے منع کیا گیا ہے۔اس صدمے کوصبر اور حوصلے کے ساتھ برداشت کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔تعزیت صرف تین دن تک ہے‘اس کے بعد لواحقین اپنے اپنے کام کاج میں مصروف ہو جائیں اور اللہ کی رضا پر راضی ہو جائیں۔اس طرزِعمل پر وہ بے حساب اجروثواب کے مستحق بھی ہوں گے۔میت کو سادہ سی قبر میں دفن کرنے کا حکم ہے‘ قبر کو پختہ کرنے سے منع کیا گیا ہے کہ اس میں پیسہ بھی خرچ ہوتا ہے جو ہر شخص برداشت نہیں کرسکتا۔ پھر اس سے میت کا کوئی نفع وابستہ نہیں ہوتا‘ کیونکہ قبر میں تو اس کے نفع ونقصان کا دارومدار اس کے اچھے برے اعمال پر ہے۔قبروں کو چونا گچ کے ساتھ خوبصورت بنانے اور قائم رکھنے کی اجازت نہیں۔اس سے کئی بدعات اور مفاسد جنم لیتے ہیں جوٹھوس اور پختہ عقائد سے روگردانی کا باعث بن کر گمراہی کے لیے راہ ہموار کرتے ہیں۔

دین میں عبادات کی اہمیت سے کسی کو انکار نہیں۔عبادات کا دوسرا نام حقوق اللہ ہے۔جہاں اسلام میں حقوق العباد کی ادائیگی پر زور دیا گیا ہے وہاں عبادات کی پابندی کا بھی حکم دیا گیا ہے۔اسلامی عبادات تمام کی تمام ایسی ہیں کہ وہ آدمی کے اخلاق وکردار کو اس درجہ سدھار دیتی ہیں کہ وہ ایک اچھا انسان بن جاتا ہے اور اس کے لیے حقوق العباد کی ادائیگی آسان ہو جاتی ہے۔اسلام میں عبادات کا نظام بھی اعتدال پر مبنی ہے۔ ایک دن میں پانچ نمازیں فرض ہیں۔ ہر نماز چند منٹ کی مصروفیت ہے جس میں انسان پاک صاف ہوکر اللہ کی یاد میں لگ جاتا ہے۔اپنے خالق و مالک کی حمد وثنا کرتا‘ اپنے نبی کریم ﷺ پر درود پڑھتا‘ اپنے اور اپنے اہل وعیال بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے بھلائی مانگتا اور گناہوں کی بخشش کی استدعا کرتا ہے۔دن میں پانچ مرتبہ وقفے وقفے سے اللہ کے حضور یہ حاضری اللہ کے ساتھ عبدیت کے رشتے کو مضبوط کرتی اور اسے ہر طرح کے گناہوں سے باز رکھتی ہے۔

سال میں ایک ماہ کے روزے فرض کیے گئے ہیں۔اس مہینے میں صبح سے شام تک بھوک پیاس برداشت کرنا اور شہوانی خواہش پوری کرنے سے رکنا ہوتا ہے۔چند گھنٹوں

کا یہ وقفہ کچھ مشکل تو ہوتا ہے مگر یہ تربیت انسان کے کردار میں بلندی اور جذبات میں توازن پیدا کرتی ہے۔ اس کے علاوہ روزہ بہت سی بیماریوں کے ازالے کا باعث بھی بنتا ہے' کیونکہ یہ انسانی معدے پر کام کا بوجھ کم کر کے اسے طاقتور اور توانا بناتا ہے۔ سال میں ایک ماہ کے روزے مشقت کا باعث نہیں' اور پھر بھوک و پیاس کا وقفہ بھی اتنا زیادہ لمبا نہیں کہ عام آدمی برداشت نہ کر سکے۔ نماز اور روزے کی اہمیت اپنی جگہ مگر مریض اور مسافر کے لیے حالات کے مطابق نرمی رکھی گئی ہے۔ لمبے سفر میں نماز قصر ہے جبکہ روزہ نہ رکھنے کی اجازت ہے اور بیماری کی حالت میں کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ کر' لیٹ کر یا محض اشارے کے ساتھ بھی نماز پڑھی جاسکتی ہے۔ اور روزہ نہ رکھنا جائز ہے جو بیماری یا سفر کی صعوبت کے بعد پھر رکھا جا سکتا ہے۔ یعنی اسلام کا کوئی حکم ایسا نہیں جو انسانی فطرت کے ساتھ متصادم اور تکلیف مَالَا یُطَاقُ کا مظہر ہو۔ نماز کے لیے وضو ضروری ہے ' لیکن اگر پانی میسر نہ ہو یا بیماری کے باعث پانی کا استعمال نقصان دہ ہو تو مٹی کے ساتھ تیمم کی اجازت ہے جو وضو کا قائم مقام ہے۔

انسان کے اندر شہوانی جذبات بڑے مُنہ زور اور شدید ہیں۔ چنانچہ اسلام ان جذبات کو نہ کچلتا ہے اور نہ دباتا ہے' بلکہ channelize کرتا ہے۔ ان جذبات کی تسکین کے لیے نکاح کا راستہ ہے جو مرد اور عورت دونوں کے سکون و اطمینان کا باعث ہے۔ نکاح سے فرار یعنی تجرد کی زندگی بعض دوسرے مذاہب میں قابل تعریف ہے مگر فطرت کے ساتھ متصادم ہونے کی وجہ سے اسلام میں جائز نہیں' بلکہ یہاں تو نکاح کو مسنون عمل قرار دیا گیا ہے اور بیوی بچوں کے جائز حقوق و مطالبات کا پورا کرنا اجر و ثواب کا باعث بتایا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا ہے اور جو شخص سنت سے اعراض کرے اس کے بارے میں آپ ﷺ نے فرمایا کہ اس کا میرے ساتھ کوئی تعلق نہیں۔

بعض اوقات جسمانی ضرورت یا اولاد کی طلب ایک سے زیادہ بیویوں کا تقاضا کرتی ہے جو ایک فطری امر ہے۔ چنانچہ ایک مَرد کے لیے چار تک بیویاں رکھنے کی

اجازت ہے۔ ہاں اُن سب کے حقوق برابری کے اصول پر ادا کرنے ہوں گے اور یہ بات عدل وانصاف پر مبنی ہے۔ جس معاشرے میں صرف ایک ہی بیوی کی اجازت ہے وہاں بعض افراد جو غیر معمولی جذبات کے حامل ہوتے ہیں' عدم تشفی کا شکار ہو کر اِدھر اُدھر مُنہ مارتے' داشتائیں رکھتے اور فحاشی و بے حیائی پھیلاتے ہیں' مگر اسلام اس کا مثبت حل پیش کرتا ہے اور فطری تقاضوں کو غیر ضروری حد تک دبانے کی اجازت نہیں دیتا۔

اسلام مالداروں سے تقاضا کرتا ہے کہ وہ زائد از ضرورت مال وزر میں سے ایک مقررہ حصہ غرباء و مساکین' نادار اور ضرورت مندوں کو دیں تاکہ ان کی گزر بسر ہو سکے اور وہ نہ تو بھوک کے ہاتھوں مجبور ہوں اور نہ وہ بھیک مانگیں۔ زکوٰۃ اُس مال پہ ہے جو سال بھر کسی کے پاس فارغ پڑا رہے۔ پھر اس میں سے صرف چالیسواں حصہ مستحقین اور ضرورت مندوں میں تقسیم کرنا ہے جو کوئی بڑی رقم نہیں ہے۔ اگر نصف یا چوتھائی مال دینے کا حکم ہوتا تو انسانی طبیعت پر بوجھ ہوتا' لیکن چالیسواں حصہ تو اتنی قلیل مقدار ہے جس کا خرچ کرنا آسانی کے ساتھ قابلِ برداشت ہے۔ پھر اس میں بھی یہ تعلیم ہے کہ اپنے قریبی رشتہ داروں کو فوقیت دی جائے۔ گویا ہر صاحب مال اپنے عزیز و اقارب کی ضروریات کا خیال رکھے۔ اگر ایسا ہوگا تو کوئی ضرورت مند بے بسی اور بے چارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور نہ ہوگا۔

اسلام کا ایک رکن حج بیت اللہ ہے جو ہر اُس مسلمان پر فرض ہے جو خانہ کعبہ تک سفر کی مشقت اور اخراجات برداشت کر سکتا ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ اس کی عدم موجودگی میں اس کے گھر کی اندرونی اور بیرونی ضروریات پوری کرنے کا بھی انتظام ہو۔ ایسے آدمی پر زندگی میں ایک مرتبہ چند دن کے لیے مکہ مکرمہ جانا اور مناسکِ حج ادا کرنا لازم ہے۔ جہاں یہ عبادت تقربِ الٰہی کا موجب ہے وہاں حج کے موقع پر لاکھوں فرزندانِ توحید کا یہ اجتماع شانِ اسلام کا مظہر ہی نہیں ہوتا بلکہ دنیا بھر کے مسلمانوں کو باہم مصاحبت اور مشاورت کا موقع بھی فراہم کرتا ہے۔ اس مقدس فریضے کی ادائیگی میں غیر معمولی مشقت اور بھاری اخراجات اٹھتے ہیں تو اس کا اجر و ثواب بھی دیکھئے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس آدمی نے حج کیا اور اس میں نہ تو کسی شہوانی اور فحش بات کا ارتکاب کیا اور نہ اللہ کی کوئی نافرمانی کی تو وہ گناہوں سے ایسا پاک وصاف ہو کر واپس ہوگا جیسا اُس دن تھا جس دن اس کی ماں نے اس کو جنا تھا۔'' (بخاری ومسلم)

تہوار منانا' خوشی کا اظہار کرنا' زیب وزینت اختیار کرنا بھی فطری تقاضا ہے۔ چنانچہ اسلام میں دو مقدس تہوار عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہیں۔ ایک تو رمضان المبارک کے روزوں کی تکمیل پر اظہارِ خوشی کا موقع ہے اور دوسرا جدّ الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس یادگار فعل کی یاد تازہ کرتا ہے جب انہوں نے اللہ کے حکم کی تعمیل میں اپنے پیارے بیٹے اسماعیل علیہ السلام کو قربانی کے لیے پیش کر دیا۔ اس دن مسلمان جانوروں کی قربانی پیش کرتے ہیں' اچھے سے اچھا کھانا کھاتے ہیں۔ گوشت وافر ہوتا ہے اس لیے اُس دن ہر غریب اور نادار کو بھی اچھا کھانا میسر آتا ہے۔ ان دونوں عیدوں کے موقع پر انفاق فی سبیل اللہ کی خصوصی ترغیب ہے۔ علاوہ ازیں ان دونوں ایام میں دو رکعت نماز عید بھی ادا کی جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ کی بے پایاں نعمتوں پر شکر کا اظہار ہوتا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ سنجیدگی اور وقار پسندیدہ عادات ہیں مگر انسان کی طبیعت خوش طبعی اور مزاح کا بھی تقاضا کرتی ہے۔ چنانچہ اسلام میں اس کی بھی گنجائش موجود ہے۔ خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں خوشگوار مزاح کی مثالیں ملتی ہیں۔ ایک بوڑھی عورت کے ساتھ گفتگو کے دوران آپؐ نے فرمایا کہ بوڑھی عورت تو کوئی بھی جنت میں نہ جائے گی۔ زبانِ وحی ترجمان سے یہ بات سن کر وہ عورت سخت پریشان ہوئی۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیوں پریشان ہوتی ہو؟ جنت میں بوڑھی عورتیں بھی جوان ہو کر جائیں گی۔ جب یہ انداز سنت سے ثابت ہوا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں بھی موجود تھا۔ ایک دفعہ چند صحابی اکٹھے کھجوریں کھا رہے تھے۔ ان کو سوجھا کہ جو بھی کھجور کھاتا گٹھلی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے آگے رکھ دیتا۔ اس طرح حضرت علیؓ کے سامنے گٹھلیوں کا ڈھیر لگ گیا۔ اس پر دوسروں نے کہا لگتا ہے علیؓ نے ہم سب سے زیادہ کھجوریں کھائی ہیں۔ یہ سن کر حضرت علیؓ کہنے لگے یہ بات نہیں' بلکہ لگتا ہے کہ تم گٹھلیوں سمیت کھجوریں کھاتے رہے ہو جبکہ میں نے گٹھلیاں

نکال کر کھائی ہیں۔ اس پر سب ہنس دیے۔

فطرتِ انسانی کو صفائی پسند ہے۔ چنانچہ اسلام صاف ستھرا رہنے کی تاکید کرتا ہے۔ صفائی کو ایمان کا ایک جز و قرار دیا گیا ہے۔ ہر نماز سے پہلے وضو لازمی شرط ہے جس میں ہاتھ، مُنہ، بازو اور پاؤں دھوئے جاتے ہیں، ناک میں پانی ڈالا جاتا ہے اور گلا بھی صاف کیا جاتا ہے۔ پھر مسواک کی فضیلت بیان کر کے ہر نماز کے وضو میں مسواک کر کے دانت صاف کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ آج ہر شخص جانتا ہے کہ بہت سی بیماریاں محض دانتوں کے صاف نہ کرنے سے پیدا ہوتی ہیں، کیونکہ دانتوں میں انکی ہوئی خوراک کے ذروں میں نقصان دہ جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں جو پیٹ میں پہنچ کر مختلف بیماریوں کا باعث بنتے ہیں۔ ہفتے میں ایک دن خصوصی اجتماعی نماز ہوتی ہے، یعنی نمازِ جمعہ۔ اس میں قرب و جوار کے سب لوگ شرکت کرتے ہیں۔ یوں تو مسجدوں میں بڑے بڑے اجتماع ہوتے ہیں، لیکن اس نماز کے لیے خصوصی حکم ہے کہ مسجد میں آنے سے پہلے غسل کیا جائے، مسواک کی جائے، اچھے صاف ستھرے کپڑے پہنے جائیں اور خوشبو بھی لگائی جائے۔ اس طرح اس بڑے اجتماع کو ہر قسم کی ناگوار مہک سے پاک اور خوشبو کے ذریعے خوشگوار بنایا جاتا ہے۔

اسلام کا ہر حکم افراط و تفریط سے پاک ہے۔ اللہ کا ذکر، تلاوتِ قرآن، نماز و روزہ انتہائی فضیلت کی حامل عبادات ہیں، مگر اِن میں بھی توازن و اعتدال کو پسندیدہ قرار دیا گیا ہے۔ ان پسندیدہ عبادات کو اس حد تک اختیار کرنے کی اجازت ہے کہ دوسرے ضروری اعمال و افعال متاثر نہ ہوں اور نہ ہی معاشرے کے دوسرے افراد خصوصاً اہل خانہ اور عزیز و اقرباء کے حقوق تلف ہوں۔ نفلی نماز اور تلاوتِ قرآن اُس وقت تک کریں جب تک اس میں دل لگے۔ اگر نیند آنے لگے تو طبیعت پر جبر کر کے تلاوت میں مصروف رہنے کی ممانعت ہے۔ اسی طرح پیشاب یا پاخانے کی حاجت ہو، یا بھوک لگ رہی ہو اور کھانا بھی تیار ہو، تو ایسی صورت میں پہلے پیشاب پاخانے سے فارغ ہونے اور بھوک کی صورت میں پہلے کھانا کھانے کا حکم ہے، بعد ازاں دِل جمعی کے ساتھ نماز ادا

کرنے کی ہدایت ہے۔

روزہ رکھنا پسندیدہ عبادت ہے' مگر نفل روزے اتنی تعداد میں ہی رکھنے کی اجازت ہے جس سے بیوی بچوں کے حقوق تلف نہ ہوں اور نہ ہی اپنی صحت متاثر ہو۔ بیوی کو نفل روزہ میں خاوند کی اجازت کا پابند بنانا بھی گہری حکیمانہ تعلیم ہے۔ دوسروں کے حقوق کے اتلاف کا اس قدر خیال رکھنے کا حکم ہے کہ اُس جگہ بلند آواز سے قرآن مجید کی تلاوت کی اجازت نہیں جہاں لوگوں کا تلاوت کے لیے ہمہ تن گوش ہونا ممکن نہ ہو۔

شادی بیاہ کے موقع پر اسلام سادگی کی تعلیم دیتا ہے۔ بہتر ہے کہ نکاح مسجد میں ہو اور پاکیزہ ماحول کے اندر دلہا' دلہن کی کامیاب ازدواجی زندگی کے لیے اجتماعی دعا کی جائے۔ شادی کے موقع پر دلہا کے ہاں تو اظہارِ خوشی کے لیے عزیز واقارب کی دعوت ہو گی' جسے ولیمہ کہتے ہیں' مگر دلہن کے ہاں کسی قسم کی تقریب منعقد نہیں ہونی چاہیے۔ نہ تو ان کے ہاں بارات آئے کہ اسے کھانا کھلانے کا اہتمام کیا جائے اور نہ ہی والدین پر یہ ذمہ داری ہے کہ وہ بیٹی کو جہیز دیں۔ یوں تو دلہن کے والدین کو بیٹی کو رخصت کرتے وقت جدائی کے غم کے ساتھ ساتھ فرض سے سبکدوش ہونے کا خوشگوار احساس بھی ہوتا ہے' مگر اس موقع پر ان پر کسی طرح کی دعوت وغیرہ کا کچھ بار نہیں ڈالا گیا۔ البتہ بیٹی والدین کی جائیداد سے وراثت کی حق دار ضرور ٹھہرائی گئی ہے۔ اگر وراثت تھوڑی ہے تو وہ تھوڑا حصہ پائے گی' زیادہ ہے تو زیادہ حصہ پائے گی۔ اس کا حصہ وراثت میں مقرر ہے۔

اسلام میں رات کو جاگ کر اللہ کی حمد وثنا' نماز اور ذکر اذکار کی بڑی فضیلت ہے' مگر یہاں بھی افراط وتفریط ہرگز پسندیدہ نہیں۔ رات آرام کے لیے ہے' لہٰذا پسندیدہ طرزِ عمل یہ ہے کہ رات کو اتنی دیر جاگ کر عبادت کی جائے جس سے صحت متاثر نہ ہو اور صبح اٹھ کر آدمی دن بھر کے کام کاج کرنے کے قابل رہے۔ ایسا نہ ہو کہ شب بیداری کے نتیجہ میں وہ سارا دن اونگھتا رہے اور روزمرہ کے فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کا مرتکب ہو جائے۔ شب بیداری کے سلسلہ میں جہاں اپنے جسمانی حقوق کا خیال رکھنا ضروری ہے وہاں بیوی بچوں کے حقوق خوش اسلوبی کے ساتھ ادا کرنے میں کوتاہی کی بھی ہرگز

اجازت نہیں۔

الغرض دین اسلام میں تمام احکام ایسے ہیں کہ ان میں افراط وتفریط کہیں نظر نہیں آتی۔ اس کی تعلیمات فطرتِ انسانی کے عین مطابق ہیں۔ انسانی طبیعت کی فطری کمزوریوں کو ہر وقت پیش نظر رکھا گیا ہے۔ کوئی حکم اور ضابطہ ایسا نہیں جس پر عمل کرنا ناممکن ہو یا وہ انسانی ہمت و صلاحیت سے ماوراء ہو۔ ایسا متوازن اور معتدل ضابطۂ حیات صرف دین اسلام ہی ہے' کیونکہ اسے بنانے والا خود وہ خالق ہے جس نے انسان کو پیدا کیا اور جو اس کی کمزوریوں اور صلاحیتوں سے پوری طرح باخبر ہے۔ اللہ تبارک و تعالیٰ انسانوں کے حق میں رحمٰن ورحیم ہے۔ چنانچہ اصولاً وہ لوگوں کے لیے آسانی چاہتا ہے تنگی نہیں چاہتا۔ سورۃ البقرۃ میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (آیت ۱۸۵)

''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے' وہ تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا۔''

اسی بنیادی تعلیم کے تحت ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ دوسروں کے لیے ہر ممکن حد تک آسانی پیدا کرے اور سختی سے باز رہے۔

اسلام ـــ ایک مکمل ضابطۂ حیات

اسلام بلا شبہ ایک مکمل ضابطۂ حیات ہے اور پیغمبر اسلام ﷺ کے دورِ نبوت اور خلفائے راشدین کے زمانہ میں مسلمانوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں پوری طرح جلوہ گر نظر آتا ہے۔ لیکن آج مسلمان اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات کے طور پر تسلیم تو کرتے ہیں لیکن خود اپنے عمل سے اس کی نفی کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو وہ اسلامی تعلیمات سے واقف نہیں اور جدید علوم حاصل کر کے ان کی چمک دمک سے مرعوب ہو گئے ہیں اور مختلف نظریۂ ہائے زندگی کی تعریف کرتے ہوئے نظر آتے ہیں' یا خود اسلام کے اصولوں کو قابلِ ترمیم سمجھتے ہوئے اپنی عقل اور سمجھ کے مطابق انہیں ڈھالنا چاہتے ہیں۔ شاید انہیں یہ بات بھول جاتی ہے کہ اسلام اللہ تعالیٰ (خالقِ کائنات) کا پسندیدہ طرزِ زندگی ہے۔ چونکہ اللہ ربّ العزت ہر عیب اور کمزوری سے پاک ہے اس لیے اس نے جو دین بنی نوع انسان کے لیے پسند کیا وہ بھی بے عیب ہوگا۔ نیز یہ کہ اسی اسلام کو بطور دین کے پیغمبر ﷺ نے خود بالفعل نافذ کر کے مسلمانوں کے حوالے کیا۔ اور آپؐ کے خلفائے راشدین نے بھی اُس کو اپنے اپنے دورِ خلافت میں جاری رکھا اور تاریخِ عالم نے دیکھا کہ امن وسکون' خوشحالی اور فارغ البالی میں وہ دور اپنی نظیر نہیں رکھتا۔

آج خود مسلمان اسلام سے مطمئن نہیں۔ لاتعداد فرقے پیدا ہو چکے ہیں جو اسلام کے چہرے پر بدنما داغ کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جب غیر مسلموں کو اسلام کی دعوت دی جائے تو وہ حیرت میں پڑ جاتے ہیں کہ اسلام کے کس فرقے میں شامل ہوں۔ یہ صورت حال اس لیے پیدا ہوئی کہ خود مسلمان مختلف اغراض ومقاصد کے حصول میں اس حد تک منہمک ہو گئے کہ اسلامی تعلیمات کے سرچشموں کو فراموش کر بیٹھے۔ اسلام میں ذاتی پسند کی چیزوں کو داخل کر دیا اور اس طرح مسخ شدہ اسلام کے حامل بن کر ہر قسم کی برکات

سے محروم ہو گئے۔

قرآن حکیم میں اسلامی تعلیمات کا اوّلین ماخذ ہے۔اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ''اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے تھام لو اور فرقہ بندی نہ کرو''۔مسلمانوں نے فرقہ بندی کر کے حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی۔چنانچہ نتیجہ ظاہر ہے کہ ہر مسلمان کسی نہ کسی فرقے سے متعلق ہے اور وہ اپنے مخصوص فرقے کو ہی اسلام سمجھتا ہے حالانکہ اُس کی غلطی واضح ہے۔صحابہ کرامؓ صرف مسلمان تھے۔ان کا کوئی فرقہ یا ٹولہ نہ تھا۔انہوں نے اللہ کی رسّی کو مضبوطی سے پکڑا ہوا تھا۔اُن کے سامنے رسول پاکؐ کا فرمان موجود تھا: ''میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑے جا رہا ہوں' جب تک تم اُن کو اختیار کیے رکھو گے گمراہ نہ ہو گے: ایک کتاب اللہ' دوسری میری سنت''۔صحابہ کرامؓ نے قرآن وسنت کے اتباع کی جو مثالیں قائم کی ہیں وہ اسلامی تاریخ کا درخشندہ باب ہے لیکن یہاں طوالت کی خاطر اس سے صرفِ نظر کیا جا رہا ہے۔

خلفائے راشدین کے بعد کے لوگوں کے لیے آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''تم پر لازم ہے کہ میرے طریقے پر چلو اور خلفائے راشدینؓ کی راہ اختیار کرو''۔اللہ تعالیٰ کروڑوں رحمتیں نازل فرمائے خلفائے راشدین پر کہ جنہوں نے پیغمبر اسلامؐ کے اعتماد کو ذرّہ برابر ٹھیس نہ پہنچائی اور اپنے زمانے میں سنّتِ نبویؐ پر سختی سے عمل پیرا رہے اور کسی ایسی چیز کو اسلام میں داخل نہ کیا جو آنحضرت ﷺ نے اسلام میں شامل نہ کی تھی۔اس طرح وہ دین اسلام کو خالص حالت میں چھوڑ کر رخصت ہوئے۔

اُصولی طور پر تو اسلام کی تکمیل بطور ضابطۂ حیات خود ربّ العزت نے فرما دی جب آنحضرت ﷺ کی زندگی کے آخری ایام میں یہ اعلان کیا گیا کہ ''آج میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور میں نے تم پر اپنی نعمت تمام کر دی اور میں نے تمہارے لیے اسلام کو بطور دین (ضابطۂ حیات) پسند کیا''۔یوں اللہ تعالیٰ نے ضابطۂ حیات مکمل اور تمام صورت میں مرحمت فرمایا اور پیغمبر اسلامؐ نے اُس کو نافذ کیا۔لیکن اُمت کی بدقسمتی کہ نظری طور پر تو دین کو مکمل ضابطۂ حیات تسلیم کیا مگر اُس کی سادگی' سہولت اور خلوص کو

قائم نہ رکھا۔ پیچیدہ رسمیں، مشکل ریاضتیں اور عجیب وغریب بدعات خود اپنی طرف سے گھڑ کر انہیں دین کا اہم جزو قرار دیا اور یوں بالفعل یہ ظاہر کیا کہ اسلام جو رسولؐ اور اُس کے اصحاب نے پیش کیا وہ مکمل دین نہ تھا بلکہ ابھی اُس میں بہت سی باتوں کا اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ بس مسلمانوں کی اجتماعیت کے لیے اصولوں سے انحراف زہر قاتل ثابت ہوا اور ہونا تھا، اس طرح مسلمان گروہ در گروہ ہو کر حق و باطل کی طرح ٹکرانے لگے۔

کاش کہ مسلمان قرآنی تعلیمات کو فراموش نہ کرتے اور اسلام کو اس کی خالص شکل میں رکھتے اور فرمانِ نبویؐ کو قولِ فیصل جانتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ بحوائے الفاظِ قرآنی: ''اگر کسی بات میں تمہارا جھگڑا ہو جائے پس اس کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف لوٹاؤ''۔ یعنی وہاں سے راہنمائی حاصل کرو۔

ہر مسلمان یہ جانتا ہے کہ تکمیل دین کی آیت کے نزول کے وقت اور خلفائے راشدین کے مبارک ادوار میں صحابہ کرامؓ کی قبریں کچی تھیں۔ نہ اُن کو غسل دیا جاتا تھا، نہ اُن پر غلاف چڑھائے جاتے تھے، نہ وہاں پیسے ڈالنے کے لیے صندوق ہوتے تھے، نہ وہاں روشنی کی جاتی تھی، نہ اُن پر گنبد بنائے جاتے تھے، نہ درگاہیں تعمیر ہوتی تھیں، نہ متولی بیٹھتے تھے، نہ عرس ہوتے تھے اور نہ میلے۔ البتہ قبروں پر جا کر اپنی موت کو یاد کرنا اور فوت شدگان کے حق میں دعائے مغفرت کرنا معمول تھا۔ خود آنحضرت ﷺ قبرستان میں تشریف لے جاتے اور اہل قبور کے حق میں دعائے مغفرت فرماتے، حضرت جابرؓ فرماتے ہیں کہ منع فرمایا ہے رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو پختہ کرنے سے، ان پر عمارت بنانے سے اور ان پر بیٹھنے سے۔ نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ کی لعنت ہے قبروں پر چراغ جلانے والوں پر''۔ آپؐ کے ان فرامین پر عہد نبویؐ میں عمل رہا اور خلافتِ راشدہ میں بھی قبروں پر گنبد تعمیر نہ کیے گئے۔ یہی چیز کتب تواریخ سے ثابت ہے۔ اب مسلمانوں کا عمل ملاحظہ ہو کہ آنحضرت ﷺ کے اُسوہ اور خلفائے راشدین کے طریقہ کے خلاف قبریں پختہ بن رہی ہیں ان پر گنبد بنائے جا رہے ہیں، درگاہیں تعمیر ہو رہی ہیں، متولی بیٹھے ہیں، عرس اور میلے ہو رہے ہیں، قبروں کو غسل دیا جا رہا ہے، غلاف چڑھائے جا رہے ہیں اور وہاں منتیں

مانی جارہی ہیں۔

یہ ایک مثال ہے۔علاوہ ازیں بدعات کا ایک وسیع سلسلہ ہے جو مسلمانوں کی زندگی کے ہر پہلو میں شامل ہے اور سنت رسولؐ کے متوازی ایک دوسرا سلسلہ قائم ہے۔ بچے کی پیدائش کی رسومات' وفات پر مختلف ناموں پر اجتماع' نکاح کے موقع پر فضول رسمیں اور اُسوہ حسنہ کی خلاف ورزی' شب برات' معراج شریف اور لیلۃ القدر کے خود ساختہ پروگرام' میلاد النبیؐ کے نام پر عید' الغرض اسلام کو مکمل ضابطۂ حیات قرار دینے والے خود نئی نئی چیزیں دین میں شامل کر رہے ہیں اور علمائے حق کا وہ گروہ جو اُن کی ان بدعات کے خلاف آواز بلند کرتا ہے اور دین کو اُسوۂ رسولؐ اور عملِ صحابہؓ کے مطابق دیکھنا چاہتا ہے' اُسے برا بھلا کہتے ہیں' حالانکہ خود آنحضرت ﷺ نے فرمایا ہے کہ: ''جس نے کوئی نئی بات گھڑی جو ہمارے دین میں نہیں تو وہ مردود ہے''۔ (مسند احمد) نیز آپ ﷺ نے فرمایا: ''یقیناً سب سے بہتر بات خدا کی کتاب ہے اور بہترین طریقہ محمد (ﷺ) کا طریقہ ہے' اور بدترین چیز وہ ہے جو دین میں نئی پیدا کی گئی ہو اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔ (صحیح مسلم) بدعت کو آپؐ نے اس لیے بدترین عمل قرار دیا کہ دین میں اضافہ جائز سمجھنے والا دراصل تکمیل دین کی نفی کر رہا ہے۔وہ اپنے ناقص ذہن کے ساتھ دین کو مکمل کرنے کی کوشش کر رہا ہے' حالانکہ ربّ العزت اُسے مکمل کر چکا ہے۔ بظاہر بدعات کو مزین کر کے پیش کیا جاتا ہے مگر یہ بات فراموش کر دی جاتی ہے کہ اس سے دین کی سادگی اور سہولت پر زد پڑتی ہے اور دین میں سادگی اور سہولت منشائے خداوندی ہے: ﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا ہے تمہارے لیے آسانی کا اور نہیں چاہتا تمہارے لیے تنگی''۔

دین میں بدعات کے وجود کو صحیح تسلیم کرنے والے کہتے ہیں کہ ان چیزوں سے ہمارا مقصود قربِ الٰہی کا حصول ہے' یعنی ہماری نیت نیک ہے۔لیکن وہ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ قربِ الٰہی کے حصول کے جو طریقے مناسب اور بھلے تھے وہ خود آنحضرت ﷺ نے سکھلا دیے ہیں اور کسی دوسرے کے لیے اس میں کوئی گنجائش

نہیں چھوڑی۔

قرآن پاک میں بدعت کی مذمت سورۃ الحدید میں مذکور ہے۔ رہبانیت اسلام میں نہیں ہے' لیکن نصاریٰ نے دنیا کی شہوات اور لذائذ سے کنارہ کشی کی اور حسنِ نیت کے تحت ترکِ دنیا اختیار کی۔ اس طرح وہ گناہ سے بچنے کا اہتمام کرنے لگے۔ گناہ سے بچنے کا یہ اہتمام چونکہ فطرت کے تقاضوں سے متصادم تھا لہٰذا وہ لوگ اس پر قائم نہ رہ سکے اور اپنی حسنِ نیت کے باوجود غضب الٰہی کے سزاوار ہوئے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَرَهْبَانِيَّةَنِ ابْتَدَعُوْهَا مَا كَتَبْنٰهَا عَلَيْهِمْ اِلَّا ابْتِغَآءَ رِضْوَانِ اللّٰهِ فَمَا رَعَوْهَا حَقَّ رِعَايَتِهَا﴾ (الحدید:۲۷)

''اور رہبانیت انہوں نے خود ایجاد کر لی' ہم نے ان پر فرض نہ کی تھی' مگر اللہ کی خوشنودی کی طلب میں انہوں نے آپ ہی یہ بدعت نکالی اور پھر اس کی پابندی کرنے کا جو حق تھا اسے ادا نہ کیا۔''

اگر رہبانیت بذاتہٖ اچھی چیز ہوتی تو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے اسلام میں داخل کر دی جاتی۔ معلوم ہوا کہ بدعت کا آغاز اللہ کی خوشنودی کی خاطر ہی ہوتا ہے مگر بدعت انسانی ذہن کی پیداوار ہونے کی وجہ سے ناقص ہوتی ہے اور ایجاد کرنے والے اُس میں پیدا ہونے والی قباحتوں کو روک نہیں سکتے۔ بدعت کا انجام کے اعتبار سے ناقص ہونا اسی بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسے علاّم الغیوب نے خود دین میں شامل نہیں کیا۔ ہر وہ عبادت بدعت کہلائے گی جس کی ادائیگی کی نظیر رسول اللہ ﷺ اور خلفائے راشدین کے دَور میں نہیں ملتی۔

کاش کہ مسلمان اُسوۂ رسولؐ اور خلفائے راشدین کے طریقے کو اپنائیں' آسان اور سہل دین پر عمل کریں اور اسلامی عبادات میں اضافے کر کے منصبِ رسالت میں مداخلت کی جسارت نہ کریں!

❁❁❁

اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيْمٌ

توحید باری تعالیٰ سب سے بڑی حقیقت اور سچائی ہے جبکہ شرک سے بڑا کوئی جھوٹ اور غلط بیانی نہیں۔ چونکہ اسلام دین فطرت ہے اور یوں وہ ہر سچائی اور اچھائی کو قبول کرتا ہے اور جھوٹ اور برائی کو مسترد کرتا ہے۔ سب سے بڑا سچ ہونے کی وجہ سے توحید باری تعالیٰ کو اسلامی تعلیمات میں بنیادی حیثیت حاصل ہے' بلکہ جب تک کوئی شخص توحید کا اقرار نہ کرے وہ اسلام میں داخل ہی نہیں ہو سکتا۔ دوسری طرف شرک کو سب سے بڑا دروغ ہونے کی وجہ سے انتہائی مذموم اور قبیح رویہ سمجھا جاتا ہے' یہاں تک کہ مشرکوں کو ناپاک قرار دیا گیا ہے۔ قرآن پاک میں ہے:

﴿اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ نَجَسٌ﴾ (التوبة:٢٨)

''مشرک تو ناپاک ہیں۔''

پھر شرک کو بہت بڑا جھوٹ بھی کہا گیا ہے۔ قرآن شریف میں ہے:

﴿وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدِ افْتَرٰٓى اِثْمًا عَظِيْمًا﴾ (النساء)

''اور اللہ کے ساتھ جس نے (کسی اور کو) شریک ٹھہرایا اس نے تو (بہت ہی بڑا جھوٹ تصنیف کیا اور) بڑے سخت گناہ کی بات کی۔''

برے کام کا نتیجہ بھی برا ہوتا ہے' چنانچہ ایک دوسرے مقام پر قرآن پاک میں بتایا گیا ہے کہ مشرک کو شرک کی وجہ سے ابدی اور حقیقی زندگی میں راحت اور آرام نہیں ملے گا بلکہ وہ اس جرم کے بدلے میں آگ میں پڑا رہے گا اور کسی طرف سے کوئی بھی اس کی مدد کو نہیں پہنچے گا:

﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ﴾ (المائدة)

''یقیناً جس نے اللہ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرایا اس پر اللہ نے جنت حرام

کر دی ہے اور اس کا ٹھکانہ جہنم ہے۔ اور ایسے ظالموں کا کوئی مدد گار نہیں۔''

اسلامی تعلیمات میں شرک کی مذمت کے کئی پہلو اختیار کیے گئے ہیں۔ سورۂ لقمان میں شرک کو ظلمِ عظیم کہا گیا ہے۔ یعنی یہ انتہائی بے انصافی کی بات ہے۔ تمام انبیاء ورُسل نے جہاں لوگوں کو توحید پر کار بند رہنے کی تعلیم دی وہاں شرک سے دور رہنے کی بھی تلقین کی۔ اگر کوئی شخص تھوڑی سی توجہ کے ساتھ قرآن پاک کا مطالعہ کرے تو اس پر یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ شرک ایسا گناہ ہے کہ قیامت کے دن جس کی بخشش کی کوئی گنجائش نہیں جبکہ دوسرے تمام گناہوں کی معافی کا امکان موجود ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۴۸ کا پہلا حصہ اس طرح ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ﴾

''اللہ بس شرک ہی کو معاف نہیں کرتا' اس کے سوا جس قدر گناہ ہیں وہ جس کے لیے چاہتا ہے معاف کر دیتا ہے۔''

پس بخشش کے اعتبار سے گناہ کی دو قسمیں ہیں' ایک قابل بخشش' دوسری نا قابلِ بخشش۔ اور نا قابل بخشش گناہ صرف شرک ہے۔ سورۃ النساء کی آیت ۱۱۶ ملاحظہ ہو:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًا بَعِيْدًا﴿۱۱۶﴾﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ اس چیز کو معاف نہیں کرتا کہ اس کے ساتھ شرک کیا جائے' البتہ دوسرے گناہ جس کے لیے چاہے گا معاف فرما دے گا۔ اور جس نے اللہ کے ساتھ (کسی کو) شریک ٹھہرایا وہ تو گمراہی میں بہت دور نکل گیا''۔

گویا جوں جوں انسان شرک کی آلائش میں لتھڑتا جاتا ہے توں توں وہ جادۂ حق سے دور ہوتا جاتا ہے اور بالآخر اس کا واپس پلٹنا مشکل سے مشکل تر ہو جاتا ہے۔

شرک کی سنگینی کے اظہار کے لیے سورۃ النساء کی محولہ بالا آیات بھی کافی تھیں' مگر شرک تو ایسا گناہ ہے کہ انسانوں کو حقیقی ناکامی سے دوچار کر کے ان کے لیے بخشش کے دروازوں کی مستقل بندش کا سبب بنتا ہے اور یوں ان کو ابدی زندگی کی راحتوں کے لیے نااہل اور نا ختم ہونے والی اذیتوں اور بے انتہا عذابوں کا مستحق ٹھہراتا ہے۔ اس لیے

قرآن پاک میں اس کی مذمت حد درجہ مؤثر انداز میں کرنے کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿وَلَقَدْ اُوْحِيَ اِلَيْكَ وَاِلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ لَئِنْ اَشْرَكْتَ لَيَحْبَطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُوْنَنَّ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿٦٥﴾ بَلِ اللّٰهَ فَاعْبُدْ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿٦٦﴾﴾ (الزُّمر)

''(اے نبیؐ) تمہاری طرف اور تم سے پہلے گزرے ہوئے لوگوں کی طرف یہ وحی بھیجی جا چکی ہے کہ اگر تم نے شرک کیا تو لازماً تمہارا عمل ضائع ہو جائے گا اور تم لازماً خسارہ پانے والوں میں ہو گے' لہٰذا (اے نبیؐ) تم بس اللہ ہی کی بندگی کرو اور شکرگزار بندوں میں سے ہو جاؤ۔''

آیت کی تفسیر میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''شرک کے ساتھ کسی عمل کو عمل صالح قرار نہیں دیا جائے گا اور جو شخص بھی مشرک رہتے ہوئے اپنے نزدیک بہت سے کاموں کو نیک سمجھتے ہوئے کرے گا ان پر وہ کسی اجر کا مستحق نہ ہو گا اور اس کی پوری زندگی سراسر زیاں کاری بن کر رہ جائے گی''۔ (تفہیم القرآن' ج ۴' ص ۳۸۲)

جس طرح ربّ العزت نے قرآن پاک میں توحید کی اہمیت اور شرک کی مذمت نہایت اہتمام سے بیان کر دی ہے اسی طرح رسول پاک ﷺ نے بھی اُمت کو توحید اختیار کرنے کی ترغیب کے ساتھ ساتھ شرک سے قطعاً دور رہنے کی تلقین کی ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((لَا تُشْرِكْ بِاللّٰهِ شَيْئًا وَّاِنْ قُتِلْتَ وَحُرِّقْتَ)) (مشکوٰۃ' باب الکبائر)

''کسی کو اللہ کا شریک نہ ٹھہرا' اگرچہ تو قتل کر دیا جائے یا جلا دیا جائے''۔

ایک حدیث قدسی ہے' رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

((يَا ابْنَ آدَمَ اِنَّكَ مَا دَعَوْتَنِيْ وَرَجَوْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ عَلٰى مَا كَانَ فِيْكَ وَلَا اُبَالِيْ' يَا ابْنَ آدَمَ لَوْ بَلَغَتْ ذُنُوْبُكَ عَنَانَ السَّمَاءِ ثُمَّ اسْتَغْفَرْتَنِيْ غَفَرْتُ لَكَ وَلَا اُبَالِيْ ' يَا ابْنَ آدَمَ اِنَّكَ لَوْ اَتَيْتَنِيْ بِقُرَابِ الْاَرْضِ خَطَايَا

ثُمَّ لَقِيتَنِيْ لَا تُشْرِكُ بِيْ شَيْئًا لَأَتَيْتُكَ بِقُرَابِهَا مَغْفِرَةً))

(رواہ الترمذی' احمد' الدارمی)

''حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ فرماتا ہے: اے آدم کے بیٹے! جب تک تو مجھ سے دعا کرتا رہے گا اور مجھ سے اُمید رکھے گا میں تجھے بخشوں گا خواہ تو نے کتنا ہی برا کام کیا ہو اور مجھ کو اس کی پرواہ نہیں ہے۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تیرے گناہ آسمان تک بھی پہنچ جائیں پھر تو مجھ سے معافی مانگے اور بخشش چاہے تو میں تجھ کو بخش دوں گا اور مجھ کو اس کی پرواہ نہ ہوگی۔ اے آدم کے بیٹے! اگر تو مجھ سے اس حال میں ملے کہ تیرے گناہوں سے زمین بھری ہو مگر تو میرے ساتھ کسی کو شریک نہ کرتا ہو تو میں تیرے پاس زمین بھر بخشش لے کر آؤں گا''۔

اسی طرح حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کی ہلاکت بیان کرتے ہوئے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ عَزَّوَجَلَّ لَيَغْفِرُ لِعَبْدِهٖ مَا لَمْ يَقَعِ الْحِجَابُ)) قَالُوْا يَارَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا وُقُوْعُ الْحِجَابِ؟ قَالَ: ((اَنْ تَمُوْتَ النَّفْسُ وَهِيَ مُشْرِكَةٌ))

(رواہ احمد)

''اللہ تعالیٰ بخشتا ہے اپنے بندے کے گناہوں کو جب تک بندہ کے اور رحمت حق کے درمیان پردہ حائل نہ ہو''۔ صحابہ نے پوچھا: یارسول اللہ! پردے کا حائل ہونا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: ''یہ کہ آدمی شرک کی حالت میں مرے''۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان نقل کرتے ہیں کہ آپ نے فرمایا:

''جو شخص خدا سے اس حال میں ملے کہ اس کے برابر کسی کو نہ مانتا ہو (یعنی شرک نہ کرتا ہو) تو وہ جنت میں داخل ہو جائے گا''۔ (رواہ البخاری و مسلم)

اس حدیث کو امام بیہقی نے ''کتاب البعث والنشور'' میں روایت کیا ہے۔ یہ چند احادیث اور اسی مضمون کی دیگر بہت سی احادیث میں بھی یہی بات بتائی گئی ہے جو قرآن پاک کی آیات بینات میں ہے کہ شرک کا گناہ ناقابل بخشش ہے جبکہ باقی تمام گناہوں

کے بخشے جانے کا امکان ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب ایک شخص کفر کو چھوڑ کر اسلام قبول کر لیتا ہے' خدا کی توحید کا اقرار اور شرک سے بیزاری کا اعلان کر دیتا ہے' ارکانِ اسلام کی پابندی کرنے لگتا ہے تو ایسے شخص کو مأمون و مصئون ہو جانا چاہیے۔ اسے شرک کی سنگینی سے خبردار کرنا چہ معنی دارد! تو آیئے اس بات کے جواب کے لیے بھی قرآن پاک کی طرف رجوع کرتے ہیں:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ﴾ (یوسف)

''ان میں سے اکثر اللہ کو نہیں مانتے مگر اس طرح کہ اس کے ساتھ دوسروں کو شریک ٹھہراتے ہیں۔''

اس آیت کی توضیح میں شاہ رفیع الدین محدثؒ دہلوی لکھتے ہیں:

''منہ سے سب کہتے ہیں کہ خالق مالک سب کا وہی ہے' پھر اوروں کو پکڑتے ہیں''۔

علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اپنی مقبولِ عام تفسیر میں اس آیت کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں:

''زبان سے سب کہتے ہیں کہ خالق و مالک اللہ تعالیٰ ہے مگر اس کے باوجود کوئی بتوں کو خدائی کا حصہ دار بنا رہا ہے' کوئی اس کے لیے بیٹیاں تجویز کرتا ہے' کوئی اسے روح و مادہ کا محتاج بناتا ہے۔ کسی نے احبار و رہبان کو خدائی کے اختیارات دے دیے ہیں۔ بہت سے تعزیہ پرستی' قبر پرستی' پیر پرستی کے خس و خاشاک سے توحید کے صاف چشمہ کو مکدر کر رہے ہیں۔ ریا اور ہوا پرستی سے تو کتنے موحدین ہیں جو پاک ہوں گے''۔

پس واضح ہوا کہ توحید کا اقرار کر کے دین اسلام میں داخل ہو جانے کے بعد شرک سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول پاک ﷺ اپنے صحابہ رضی اللہ عنہم کو شرک سے اجتناب کرنے کی تاکید کرتے تھے' ورنہ ان سے بڑھ کر توحید کا اقرار کرنے والا کون ہو گا! حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا:

يَا نَبِيَّ اللّٰهِ حَدِّثْنِيْ بِعَمَلٍ يُدْخِلُنِيَ الْجَنَّةَ ...... قَالَ نَبِيُّ اللّٰهِ ﷺ: ((بَخٍ بَخٍ ' لَقَدْ سَاَلْتَ بِعَظِيْمٍ ...... وَاِنَّهٗ لَيَسِيْرٌ عَلٰى مَنْ اَرَادَ اللّٰهُ بِهِ الْخَيْرَ ......

تُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَتُقِيْمُ الصَّلٰوةَ وَتَعْبُدُ اللّٰهَ وَحْدَهٗ لَا تُشْرِكُ بِهٖ شَيْئًا حَتّٰى تَمُوْتَ وَاَنْتَ عَلٰى ذٰلِكَ......)) (رواہ احمد والترمذی والنسائی)

''اے اللہ کے نبی ﷺ! مجھے کوئی ایسا کام بتا دیجیے جو مجھے جنت میں لے جائے ...... آپؐ نے فرمایا: ''بہت خوب' بہت خوب' تو نے بڑی بات پوچھی (تین بار فرمایا)۔ جس کے لیے خدا بھلائی کا ارادہ کرے اُس کے لیے کچھ اتنی دشوار بھی نہیں' ...... آپؐ نے فرمایا: ''اللہ اور آخرت کے دن پر یقین رکھو' نماز پڑھا کرو' اللہ کی عبادت کیا کرو' اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ یہاں تک کہ اسی حال پر تمہاری موت آ جائے ......''

اگر ایمان باللہ کے بعد کسی مسلمان کے لیے شرک کا امکان ختم ہو جاتا تو رسول اللہ ﷺ اس حدیث میں جلیل القدر صحابی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو دخولِ جنت اور بُعد عن النار کے لیے شرک سے اجتناب کرنے کو کیوں کہتے؟ معلوم ہوا کہ ایک مسلم اور مؤمن کے لیے اقرارِ توحید باری تعالیٰ کے بعد شرک سے علیحدگی ضروری ہے' ورنہ اس کے نیک اعمال بھی نتیجہ خیز نہ ہوں گے اور نہ ہی اسے جہنم سے بچا سکیں گے۔ قرآن پاک کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ شرک کی آمیزش والی توحید تو کفارِ مکہ کے پاس بھی تھی۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

﴿قُلْ لِّمَنِ الْاَرْضُ وَمَنْ فِيْهَآ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۸۴﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ﴿۸۵﴾ قُلْ مَنْ رَّبُّ السَّمٰوٰتِ السَّبْعِ وَرَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيْمِ﴿۸۶﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ اَفَلَا تَتَّقُوْنَ﴿۸۷﴾ قُلْ مَنْۢ بِيَدِهٖ مَلَكُوْتُ كُلِّ شَيْءٍ وَّهُوَ يُجِيْرُ وَلَا يُجَارُ عَلَيْهِ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ﴿۸۸﴾ سَيَقُوْلُوْنَ لِلّٰهِ ۭ قُلْ فَاَنّٰى تُسْحَرُوْنَ﴿۸۹﴾﴾ (المؤمنون)

''(اے نبیؐ) کہہ دیجیے کس کی ہے زمین اور جو کوئی اس میں ہے اگر تم جانتے ہو؟ اب کہیں گے اللہ کا ہے۔ تو کہیے پھر کیا تم سوچتے نہیں؟ پوچھیے (ان سے) کون ہے مالک ساتوں آسمانوں کا اور مالک اس بڑے تخت کا؟ اب بتائیں گے اللہ۔ تو کہیے پھر کیا تم ڈرتے نہیں؟ پوچھیے (ان سے) کس کے ہاتھ میں ہے حکومت ہر چیز کی اور وہ بچا لیتا ہے اور اس سے کوئی بچا نہیں سکتا' اگر تم جانتے ہو؟ اب

بتائیں گے اللہ! کہیے تو پھر کہاں سے تم پر جادو آ پڑا ہے؟''

مگر خدا تعالیٰ کی ان تمام صفاتِ توحید کو ماننے کے باوجود وہ کافر تھے جنہیں سرکارِ دو عالم ﷺ ایمان کی دعوت دے رہے تھے۔ آج بھی مسلمانوں کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ وہ توحید کی امانت سینوں میں لیے ہوئے شرک میں مبتلا ہیں اور بے خبر ہیں کہ کتنا بڑا جرم کر رہے ہیں۔

خدا تعالیٰ کی ذات وصفات اور صفات کے تقاضوں میں کسی دوسرے کو شریک سمجھنا شرک ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تمام صفات مطلق' بے پایاں اور ذاتی ہیں۔ جمادات' نباتات' حیوانات' انسان' جن' فرشتے سب اس کی مخلوق اور اس کے سامنے عاجز اور بے بس ہیں۔ وہ قادر مطلق ہے۔ مخلوق کا ہر ہر فرد پیدائش سے لے کر وفات تک اس کا محتاج ہے جب کہ وہ کسی کا محتاج نہیں۔ یعنی وہ بے نیاز ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان بے پایاں قدرتوں اور اختیار کو تسلیم کرنے کے بعد یہ کیسے ممکن ہے کہ مخلوق کے کسی فرد کو مشکل کشا اور حاجت روا سمجھا جائے' اس سے اولاد اور رزق کے لیے سوال کیا جائے' اسے داتا یا گنج بخش کہا جائے! شرک کی یہی بیماری کفار مکہ کو تھی۔ جب ان سے پوچھا جاتا کہ تم ان دوسروں کو معبود کیوں پکارتے ہو تو ان کا جواب قرآن پاک میں اس طرح نقل ہوا ہے:

﴿مَا نَعۡبُدُهُمۡ اِلَّا لِيُقَرِّبُوۡنَاۤ اِلَى اللّٰهِ زُلۡفٰى ؕ﴾ (الزُّمر:۳)

''ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قرب کے درجہ تک پہنچا دیں''۔

آج کے مسلمان بھی ﴿اِيَّاكَ نَعۡبُدُ وَاِيَّاكَ نَسۡتَعِيۡنُ﴾ نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے اور اقرار کرتے ہیں کہ ''ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد مانگتے ہیں'' مگر ساتھ ہی نماز کے باہر یا اللہ مدد کے نعرے کے ساتھ یا علی مدد اور یا رسول اللہ مدد بھی پکارتے ہیں۔ یہی خدا تعالیٰ کو معبودِ حقیقی ماننے والے عبد النبی' عبد الرسول اور عبد المصطفیٰ نام رکھ لیتے ہیں جبکہ رسول اللہ ﷺ نے عبد کی نسبت اللہ کی طرف کرتے ہوئے عبد اللہ اور عبد الرحمٰن نام پسند کیے ہیں' کیونکہ قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ﴾ (آل عمران:۷۹)

''کسی انسان کا کام نہیں ہے کہ اللہ اس کو کتاب' حکمت اور نبوت عطا کرے' پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم میرے بندے ہو جاؤ اللہ کو چھوڑ کر۔''

پھر رسول پاک ﷺ جن کی سیرت ہی سراپا قرآن ہے' وہ عبداللہ اور عبدالرحمٰن کی بجائے عبدالرسول اور عبدالنبی جیسے نام کیسے برداشت کر سکتے! چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ کسی صحابی نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ والہانہ محبت کے باوجود ایسے ناموں کو اختیار نہیں کیا۔

قرآن پاک میں ارشاد ہے کہ نبی ﷺ پر درود بھیجو' یعنی ان کے حق میں رحمت اور سلامتی کی دعا کرتے رہا کرو۔ نیز اپنے لیے اور اپنے فوت شدہ عزیزوں کے لیے استغفار کرتے رہا کرو' مگر یہاں زندہ اور اہل قبور دونوں سے استمداد کی جارہی ہے حالانکہ وہ استغفار کے مستحق ہیں' اور زندوں کا حق ہے کہ وہ فوت شدہ مسلمانوں کی بخشش کی دعا کرتے رہیں۔

پہلے بیان ہو چکا ہے کہ خدا تعالیٰ کی تمام صفات مطلق ہیں اور کوئی مطلق صفت اس کی مخلوق میں نہ ہے نہ تسلیم کی جائے گی' مگر اس کے باوجود مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد حاضر و ناظر' عالم ماکان و مایکون اور عالم الغیب کی صفات انبیاء کی طرف منسوب کرتی ہے' حالانکہ یہ صفات بلا استثناء صفاتِ باری تعالیٰ ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ انبیاء نے غیب کی خبریں دی ہیں' آخرت میں پیش آنے والی باتیں بتائی ہیں' مستقبل میں ہونے والے واقعات کی اطلاعات دی ہیں' مگر یہ ساری خبریں اس خبیر نے ان کو بتائیں جو عالم الغیب ہے۔ یہی وجہ ہے کہ زندگی بھر کسی پیغمبر نے عالم ماکان و مایکون اور حاضر و ناظر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ قرآن کریم میں آتا ہے:

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْۗءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ﴾ (الاعراف)

''(اے محمدؐ اُن سے) کہو: میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان کا اختیار نہیں رکھتا مگر اللہ ہی جو کچھ چاہتا ہے (وہ ہوتا ہے)۔اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے (اپنے لیے) حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو محض ایک خبر دار کرنے والا اور خوشخبری سنانے والا ہوں ان لوگوں کے لیے جو میری بات مانیں۔''

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرآن و حدیث کی ان ساری تصریحات کے باوجود مسلمان شرکیہ افعال کیوں اپناتے ہیں' جبکہ وہ توحید کی اہمیت اور شرک کی ہلاکت خیزی سے پوری طرح آگاہ ہیں؟ جواب یہ ہے کہ ایسے لوگ اپنے سب سے بڑے دشمن کے حملوں سے بے خبر ہیں اور وہ دشمن شیطان ہے' جس کا مشن اولادِ آدم کو جنت سے محروم کر کے دوزخ کا مستحق ٹھہرانا ہے۔ چونکہ شرک ناقابل بخشش گناہ ہے اس لیے اس کی ہمہ وقت یہ کوشش ہے کہ نیک عمل کرنے والے مسلمانوں کو شرک کا خوگر بنا دے۔ وہ بڑا دھوکے باز ہے۔ جیسا کہ قرآن کریم میں ہے:

﴿وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴿٣٣﴾﴾ (لقمٰن)

''اور نہ دھوکہ دے تم کو اللہ کے نام سے وہ بڑا دغاباز (یعنی ابلیس)۔''

وہ شرک کے نام سے شرک نہیں کرواتا' بلکہ وہ شرک کی تباہ کن گولی پر نصح و خیر خواہی کے دھوکے کا غلاف چڑھا کر پیش کرتا ہے۔ اور نادان انسان شرک میں ملوث ہو کر بھی اسی زعم میں رہتا ہے کہ وہ مؤمن اور مسلم ہے اور جنت اور بخشش کا مستحق ہے۔ حالانکہ اوپر دی گئی قرآنی تصریحات اور احادیثِ صحیحہ سے ثابت ہو رہا ہے کہ شرک ناقابل بخشش گناہ ہے۔ شیطان تو اولادِ آدم کا بدترین دشمن ہے' وہ تو مسلمانوں کو شرک کی تعلیم دے گا ہی' مگر مسلمان بھی تو سوچیں کہ جو کام آج وہ کر رہے ہیں کیا وہ کام قرونِ اولیٰ میں بھی ہوتے تھے؟ کیا ان کاموں میں شرک یا شرک کا شبہ تو نہیں ہے؟ پس شرک کے شبہ والے کام بھی چھوڑ دینے چاہئیں' مبادا شبہ صحیح ہو اور بات ارتکابِ شرک تک پہنچ جائے اور کامیابی اور فلاح خسرانِ ابدی میں بدل جائے۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ

۞۞۞

اسلام اور شخصیت پرستی

شخصیت پرستی انسانی کمزوریوں میں سے ایک کمزوری ہے۔ اسی کی انتہائی صورت بت پرستی ہے۔ شخصیت پرستی خود فریبی کے سوا کچھ نہیں۔ عجلت پسندی، سہل انگاری اور حصول مقصد کے لیے ہر حربہ اختیار کر لینا بھی انسانی کمزوریاں ہیں، جن کو توازن اور اعتدال پر رکھنا بڑے عزم کی بات ہے۔ اسلام ہمیں یہ سکھاتا ہے کہ دنیا میں مقصد براری کے لیے صرف وہی وسائل اختیار کیے جائیں جو جائز اور مستحسن ہوں۔ غلط وسائل اگرچہ حصولِ مقصد کے لیے کتنے ہی مناسب نظر آئیں اختیار نہ کیے جائیں۔ اصل میں اسی فرق و امتیاز کو پیش نظر رکھ کر عمل کرنا مطلوب ہے۔ قرآن کریم میں آتا ہے:

﴿خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ط﴾ (المُلك)

''اللہ نے پیدا کیا موت اور زندگی کو تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ کون تم میں سے اچھا عمل کرتا ہے۔''

اگرچہ ایمان بالآخرت بنیادی اسلامی عقائد میں سے ہے مگر دنیا کا عیش و آرام اور نقد سہولتیں اسے وقتی طور پر ذہن سے بھلا دیتی ہیں اور مسلمان ہونے کے باوجود انسان وہ کام کر گزرتا ہے جو آخرت کے اعتبار سے انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ پھر ابلیس تو ہر وقت برائی کو خوشنما بنا کر پیش کرتا ہے۔ شیطان کو قرآن کریم میں ''غَرور'' بھی کہا گیا ہے جس کا معنی ہے دھوکے باز۔ انسان بہت جلدی شیطان کے دھوکے میں آ کر غلط کام کر گزرتا ہے اور خدائی امتحان میں ناکام اور نامراد ہو جاتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں صلاحیتوں کے ساتھ پیدا نہیں کیا۔ بعض لوگ اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوتے ہیں، پھر وہ مزید محنت و ریاضت کے ساتھ معاشرے میں ایک امتیازی مقام بھی حاصل کر لیتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی صلاحیتوں کا اعتراف کرنا اور

دائرہ اعتدال میں رہتے ہوئے ان کی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھانا تو درست ہے مگر ایسے لوگوں کو دائرہ انسانیت سے ماوراء (superman) سمجھنا بہت بڑا دھوکہ ہے۔ اچھے ڈاکٹر' قابل انجینئر' لائق استاذ' عالم باعمل' ماہر کاریگر' کامیاب ہوا باز وغیرہ بلاشبہ قابل عزت وتکریم بھی ہیں اور ان کی صلاحیتوں سے بھرپور فائدہ بھی اٹھانا چاہیے۔ مگر ان کو انسانی کمزوریوں سے بالا سمجھ کر ان کے سامنے جھک جانا اور اپنی ذات کی تذلیل کرنا ہرگز روا نہیں۔ وہ تو خدائے واحد کی ایک اور صرف ایک ذات ہے جس کے سامنے خشوع وخضوع اور تذلل جائز ہے۔ بلاشبہ اللہ تعالیٰ کے بھیجے ہوئے انبیائے کرام انسانیت کی عظمت اور بلندی کے انتہائی مقام پر فائز ہوتے ہیں اور اخلاق وکردار کے اعتبار سے درجہ کمال تک پہنچے ہوئے ہوتے ہیں مگر اس کے باوجود اسلام میں اس بات کی ہرگز گنجائش موجود نہیں کہ انہیں پرستش کا حق دار سمجھا جائے۔ قرآن کریم میں اس حقیقت کو ان الفاظ میں بیان کیا گیا ہے:

﴿مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا رَبّٰنِيّٖنَ......﴾ (آل عمران:۷۹)

''کسی آدمی کا یہ حق نہیں کہ اللہ اسے کتاب' حکمت اور نبوت عطا فرمائے' پھر وہ لوگوں سے کہے کہ تم میرے بندے بن جاؤ اللہ کو چھوڑ کر' بلکہ (وہ تو یہی کہے گا کہ) تم اللہ والے ہو جاؤ''۔

پھر اسلام نے ہمیں صرف نظریاتی تعلیم ہی نہیں دی بلکہ رسول پاک ﷺ کو اس تعلیم پر عمل کا نمونہ بنا کر بھی پیش کیا۔ قرآن میں ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب:۲۱)

''بے شک اللہ کے رسول ﷺ (کی زندگی) میں تمہارے لیے بہترین نمونہ موجود ہے''۔

رسول اللہ ﷺ اپنے وقت کے سب سے زیادہ قدر ومنزلت کے حامل انسان تھے۔ آپؐ عظمت کے انتہائی مقام پر فائز تھے۔ آپؐ خدا کے محبوب اور انسانوں کے ہادی تھے۔ اس کے باوجود آپؐ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنے سامنے جھکنے یا بچھنے کی

اجازت نہیں دی۔ اس بات کو زیادہ واضح کرنے کے لیے حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے آپؐ سے عرض کیا کہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپؐ کو سجدہ کریں مگر آپؐ نے پوری شدت کے ساتھ وضاحت کر دی کہ ہرگز نہیں، سجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پرستش کی اجازت نہیں دی تو انسانوں میں آپؐ سے بڑا کون ہے جس کی پرستش کی جائے! پس پرستش کے لائق تو فقط وہی ایک ہے جو کائنات کا خالق و مالک ہے، حی و قیوم ہے، جس کو بقا ہے فنا نہیں، جو ہر طرح کی ادنیٰ سے ادنیٰ کمزوری (weakness) سے منزہ و مبرا ہے۔ بلکہ آپؐ نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ پرستش میں بھی صرف اسی خدائے واحد کی کرتا ہوں اور آپؐ بھی صرف اسی کی پرستش کریں۔ آپؐ کا اُسوۂ حسنہ اس ضمن میں روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ آپؐ اللہ کی عبادت میں دن رات لگے رہتے تھے، آپؐ کے دن کے عمل بھی عبادت تھے اور رات کا قیام و سجدہ بھی عبادت تھا۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے محبوب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو معراج سے نوازا اور قیامت کے روز مقامِ محمود پر فائز کرے گا مگر اس کے باوجود آپؐ نے اپنے کسی عقیدت مند یا رشتہ دار کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ عمل سے فارغ رہے اور رسول کی نری محبت یا رسول سے خونی رشتہ ہی کو اپنی نجات کے لیے کافی سمجھے۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے قریشیو! اپنی خبر لو۔ میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے عبدِ مناف! میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے صفیہ رسولِ خدا کی پھوپھی! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے محمد کی بیٹی فاطمہ! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا''۔ ایک بار حضرت فاطمہؓ کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا کہ تم کو برا نہ معلوم ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی بیٹی کے گلے میں آگ کا ہار ہے؟

یہاں قارئین کی توجہ مسئلہ شفاعت کی طرف مبذول ہوگی۔ تو سمجھ لینا چاہیے کہ بلاشبہ رسول پاکؐ کی شفاعت اُمت کے گناہگاروں کے بارے میں حق ہے مگر وہ ایک

اجازت نہیں دی۔ اس بات کو زیادہ واضح کرنے کے لیے حدیث میں آتا ہے کہ ایک دفعہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے آپؐ سے عرض کیا کہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ آپؐ کو سجدہ کریں مگر آپؐ نے پوری شدت کے ساتھ وضاحت کر دی کہ ہرگز نہیں، سجدہ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کو سزاوار ہے۔ جب رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پرستش کی اجازت نہیں دی تو انسانوں میں آپؐ سے بڑا کون ہے جس کی پرستش کی جائے! پس پرستش کے لائق تو فقط وہی ایک ہے جو کائنات کا خالق و مالک ہے، حی و قیوم ہے، جس کو بقا ہے فنا نہیں، جو ہر طرح کی ادنیٰ سے ادنیٰ کمزوری (weakness) سے منزہ و مبرا ہے۔ بلکہ آپؐ نے اپنے عمل سے بتا دیا کہ پرستش مَیں بھی صرف اسی خدائے واحد کی کرتا ہوں اور آپؐ بھی صرف اسی کی پرستش کریں۔ آپؐ کا اُسوۂ حسنہ اس ضمن میں روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ آپؐ اللہ کی عبادت میں دن رات لگے رہتے تھے، آپؐ کے دن کے عمل بھی عبادت تھے اور رات کا قیام و سجدہ بھی عبادت تھا۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے محبوب تھے۔ اللہ تعالیٰ نے آپؐ کو معراج سے نوازا اور قیامت کے روز مقامِ محمود پر فائز کرے گا مگر اس کے باوجود آپؐ نے اپنے کسی عقیدت مند یا رشتہ دار کو اس بات کی اجازت نہیں دی کہ وہ عمل سے فارغ رہے اور رسول کی نری محبت یا رسول سے خونی رشتہ ہی کو اپنی نجات کے لیے کافی سمجھے۔ ایک موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے قریشیو! اپنی خبر لو۔ میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے عبدِ مناف! میں تم کو خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے عباس بن عبدالمطلب! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے صفیہ رسولِ خدا کی پھوپھی! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا۔ اے محمد کی بیٹی فاطمہ! میں تم کو بھی خدا سے نہیں بچا سکتا''۔ ایک بار حضرت فاطمہؓ کے گلے میں سونے کا ہار دیکھا تو فرمایا کہ تم کو برا نہ معلوم ہوگا جب لوگ کہیں گے کہ پیغمبر کی بیٹی کے گلے میں آگ کا ہار ہے؟

یہاں قارئین کی توجہ مسئلہ شفاعت کی طرف مبذول ہو گی۔ تو سمجھ لینا چاہیے کہ بلاشبہ رسول پاکؐ کی شفاعت اُمت کے گناہگاروں کے بارے میں حق ہے مگر وہ ایک

اعزاز ہے جو رسول اکرم ﷺ کو دیا جائے گا اور آپؐ صرف ان لوگوں کے حق میں شفاعت کریں گے جن کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت دے گا اور جن کی بخشش کرنا چاہے گا۔ آج کسی فردِ بشر کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ معلوم کر سکے کہ اس کے بارے میں رسول پاکؐ کو شفاعت کا اِذن دیا جائے گا۔ شفاعت کے بارے میں یہی نقطۂ نظر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔ اسی لیے وہ لوگ ہمہ وقت نیک اعمال میں منہمک رہے اور نظریۂ شفاعت نے ان کے اندر کسی بھی درجے میں بے عملی اور کوتاہی پیدا نہیں کی' ورنہ رسول پاکؐ کے ہمہ وقت ساتھی ہونے کے ناطے وہ آپؐ کی شفاعت کے اوّلین امیدوار ہونے کی بجائے اُسوۂ حسنہ کی پیروی میں اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالتے اور مشقت اور تکلیف کے بجائے آرام و راحت کی زندگی بسر کرتے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبریں پختہ بنانے سے منع فرمایا۔ اس میں بھی اسی بات کی پیش بندی کی گئی ہے کہ نیک اور صالح لوگوں کی قبریں اگر باقی رہیں گی تو شخصیت پرستی کے جذبے کے تحت لوگ ان قبروں کے ساتھ وابستگی رکھیں گے اور طرح طرح کی خرافات میں لگ جائیں گے۔ اسی طرح کسی خاص قبر کی زیارت کے لیے سفر کرنا آپؐ کے اُسوۂ حسنہ میں نظر نہیں آتا۔ خود عرب کے اندر شہر جدہ میں اماں حوا کی قبر بتائی جاتی ہے مگر آپ کا جدہ کی طرف سفر بغرضِ زیارت ثابت نہیں ہے۔ آپ کی زندگی میں آپ کے بیٹے فوت ہوئے' بیٹیاں فوت ہوئیں' دیگر رشتہ دار اور دوست فوت ہوئے مگر آپؐ نے کسی کی قبر کو پختہ نہیں کیا اور نہ باقی رکھنے کی ہدایت کی۔ ہاں قبرستان میں جانا' اہل قبور کی مغفرت کے لیے دعا کرنا اور اپنی موت کو یاد کرنے کا عمل نہ صرف آپؐ سے ثابت ہے بلکہ اس کا آپؐ نے حکم دیا ہے۔

شخصیت پرستی انسان کو فریب نفس میں مبتلا کر کے شرک کی نجاست سے آلودہ کر دیتی ہے جبکہ شخصیت پرستی سے کامل اجتناب نہ صرف توحید پر پختہ یقین اور اُسوۂ حسنہ کی پیروی میں مستعدی پیدا کرتا ہے' بلکہ اُمت کے اندر افتراق و انتشار اور فرقہ پرستی کو ختم کرنے کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ فرقوں کی بنیاد عموماً مختلف نامور اشخاص کے ساتھ حد

درجہ وابستگی پر قائم ہوگئی ہے۔ جب اُمت کے تمام افرادِ اُمت کے نیک اور صالح افراد کے ساتھ یکساں وابستگی رکھیں' ان کی تحقیقات اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں' مگر رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی کو مطاع نہ سمجھیں' یعنی واجب الاطاعت ہستی بلا اختلاف رسول اللہ ﷺ کی ہی تسلیم کریں تو جھگڑے ختم اور فرقے بھی ختم۔ اور یہی حکم اللہ تعالیٰ کا ہے:

﴿فَإِنْ تَنَازَعْتُمْ فِيْ شَيْءٍ فَرُدُّوْهُ إِلَى اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ (النساء:٥٩)

''پس اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان جھگڑا پیدا ہو جائے تو اس کو اللہ اور (اس کے) رسول کی طرف لوٹا دو''۔

یعنی قرآن حکیم اور اُسوۂ حسنہ سے اس کا حل تلاش کرو۔ پس یہی دو چیزیں اتحاد و اتفاقِ اُمت کی بنیاد ہیں۔ قولِ رسولؐ اور آیت قرآن کے مقابلے میں کسی دوسرے شخص کی تحقیق کو اہم سمجھنا نہ صرف نادانی' جہالت اور گمراہی ہے بلکہ اُمت کے اندر انتشار و افتراق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مشہور قول ہے کہ رسول پاکؐ کے فرمان کے مقابلے میں میری بات کو ترک کر دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود امام صاحب تلقین کر رہے ہیں کہ میری تحقیقات سے فائدہ تو اٹھاؤ مگر آنکھیں بند کر کے نہیں' کیونکہ قولِ فیصل میری بات نہیں بلکہ فرمانِ رسول ﷺ ہے۔ قریب قریب یہی بات اُمت کے صلحاء نے بھی کہی ہے۔ کسی نے اپنی بات کو اس انداز میں پیش نہیں کیا کہ اسے حرفِ آخر سمجھ کر قبول کیا جائے۔

اگر آج ہم صلحائے اُمت میں سے کسی ایک دو کا انتخاب نہ کریں بلکہ سب لوگوں کی تحقیق سے فائدہ اٹھائیں' جس بزرگ کے ساتھ کسی شخص کو زیادہ نسبت ہو جائے وہ دوسرے لوگوں کو اس بزرگ کے ساتھ ویسی ہی نسبت رکھنے پر مجبور نہ کرے بلکہ ان کی دوسرے بزرگوں کے ساتھ عقیدت اور محبت کو برداشت کرے تو مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی طرف مثبت پیش رفت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بزرگوں کی قبروں کے ساتھ اگر وہی معاملہ کیا جائے جو سنت مطہرہ سے ثابت ہے تو قبر پرستی کی جڑ کٹ جاتی

ہے اور یہی ہمارے لیے راہِ صواب ہے۔آپؐ نے اپنی آخری بیماری کے دوران فرمایا کہ ''(لوگو! تم میری قبر کو صنم نہ بنانا) یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا تھا''۔ (رواہ البخاری)

پس آج مسلمانوں کو چاہیے کہ شخصیت پرستی اور قبر پرستی کو چھوڑ کر اُسوۂ حسنہ کو دل و جان سے فیصلہ کن تسلیم کریں اور اس کے بدلے میں اتفاق و اتحاد کی نعمت سے بھی حظ اٹھائیں اور اپنی عاقبت بھی سنوار لیں۔

مسئلہ شفاعت

مسئلہ شفاعت اُن مسائل میں سے ہے جن کی وضاحت اگرچہ قرآن پاک میں موجود ہے لیکن عام طور پر اُن کی توجیہہ غیر معقول انداز میں کی جاتی ہے۔ درحقیقت یہاں ٹھوکر صرف اُن افراد نے کھائی ہے جنہوں نے شفاعت کو عام مشاہدے میں آنے والی دُنیوی سفارش ہی کی طرح سمجھ لیا ہے جس میں ایک مقتدر آدمی کسی مجرم کی سفارش کرتا ہے اور اسے سزا سے بچا لیتا ہے اور اس طرح بااثر اور مقتدر لوگوں کے ساتھ تعلقات رکھنے والے لوگ قانون کی گرفت سے بے خوف ہو کر جرائم کرتے ہیں۔ اسی قسم کی غلط فہمی یہود کے ایک گروہ کو ہوئی تھی جو ﴿نَحْنُ اَبْنَآءُ اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ (المائدۃ:١٨) کا دعویٰ کرتے تھے اور اسی دعویٰ کو اپنی نجات کے لیے کافی سمجھتے تھے۔ اس مغضوب طبقے کے افراد کی طرح کچھ مسلمانوں نے بھی بس کلمۂ طیبہ کے اقرار باللسان کو نجات کے لیے کافی خیال کر کے فرار کی راہ اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ قرآن پاک کلمہ گو مسلمانوں سے اسلامی احکام پورے کے پورے عملاً اختیار کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ كَآفَّةً﴾ (البقرۃ:٢٠٨)

''اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔''

اس طرح قرآن پاک میں ایمان لانے والوں کو بھی ایمان لانے کو کہا گیا ہے' جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ زبان سے توحید و رسالت کا اقرار کرنے والو! قلب کی گہرائیوں میں کلمۂ طیبہ پر یقین پختہ کرو جس کے نتیجہ میں تمہارے اعمال تقویٰ کی غربال سے چھن کر نکلیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ کلمۂ طیبہ پڑھنے والوں کو طرح طرح کی آزمائشوں سے گزارے بغیر نہیں چھوڑا جائے گا' یعنی کلمہ پڑھ کر جس عقیدۂ توحید و رسالت کا انہوں نے اقرار کیا ہے' اس کی پختگی کا اندازہ مختلف امتحانات کے ذریعے کیا جائے گا۔ گویا کلمہ

طیبہ کا زبانی اقرار انسان کو قانونی طور پر مسلمان تو بنا دیتا ہے مگر اعمالِ صالحہ سے فارغ نہیں کرتا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ۝﴾ (العنکبوت)

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم اُن سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ پس اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور ضرور معلوم کرنا ہے کہ جھوٹے کون ہیں۔''

اسی مضمون کو قرآن پاک میں کئی جگہ مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے جس سے بات پوری طرح واضح ہوگئی ہے۔ مثلاً:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ۝﴾ (آل عمران)

''کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے جہاد میں جان لڑانے والے اور ثابت قدم رہنے والے کون ہیں۔''

معلوم ہوا کہ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کی آزمائش کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ سنت اللہ تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ اب اس دور میں ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو آزمائش میں ڈال کر ان کے دعویٰ کی عملی صداقت کیوں نہ دیکھی جائے گی اور اُن کے زبانی اقرار کو سنت اللہ کے خلاف کیسے قبول کر لیا جائے گا؟ جبکہ تکالیف و مصائب کی بھٹیوں سے خود رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کو بھی گزارے بغیر نہ چھوڑا گیا۔ حکیم الاُمت علامہ اقبال نے آزمائش کے خوف کا اظہار اس طرح کیا ہے:

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

اب وہ حدیث ملاحظہ ہو جس میں کلمہ گو کو جنت کی بشارت ہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں:

((مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا دَخَلَ الْجَنَّةَ)) قِيْلَ وَمَا اِخْلَاصُهَا؟ قَالَ:

((اَنْ تَحْجِزَهٗ عَنْ مَحَارِمِ اللّٰهِ)) (طبرانی فی الاوسط الکبیر)

''جو شخص اخلاص کے ساتھ لا الہ الا اللہ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا''۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ کلمے کا اخلاص کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ کہ وہ اسے حرام کاموں سے روک دے''۔

اس حدیث سے یہ سمجھنا کہ کلمۂ طیبہ زبان سے پڑھ لینا حصولِ جنت کے لیے کافی ہے' پرلے درجے کی نافہمی ہے۔ قولِ رسولؐ تو سورۃ العنکبوت کی محولہ بالا آیت کی سرتاسر تائید کررہا ہے کہ نافع کلمہ صرف وہی ہے جو قائل کی زندگی میں انقلاب پیدا کر کے اسے متقی (پرہیزگار) بنادے' یعنی وہ حرام کاموں سے پرہیز کرنے لگے۔

شفاعت کا مسئلہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ یوں سمجھئے کہ کچھ اعمال ایسے ہیں جو کسی مسلمان کی شفاعت کا تقاضا کریں گے اور اس طرح اس کی شفاعت کی جائے گی۔ مگر اس بات کو تو اللہ ہی جانتا ہے کہ شفاعت کا اعزاز کس کو ملے گا اور شفاعت کن کے حق میں نافع ہوگی۔ اگر ہر مدعیٔ اسلام کے حق میں شفاعت کو نافع سمجھ لیا جائے تو:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (الانعام:۱۶۴)

''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا''۔

اور:

﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿۳۸﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿۳۹﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿۴۰﴾ ثُمَّ يُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴿۴۱﴾﴾ (النجم)

''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا' اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی۔ اور یہ کہ اس کی سعی و کوشش عنقریب دیکھی جائے گی (یا اس کو دکھادی جائے گی)' پھر بدلہ دیا جائے گا اس کو پورا بدلہ''۔

اور:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ (البقرۃ:۲۸۶)

''ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اُس کا پھل اُس کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے
اُس کا وبال اسی پر ہے۔''

کے قبیل کی آیات کی نہ صرف تکذیب ہوتی ہے بلکہ اس بات سے عدلِ خداوندی پر بھی حرف آتا ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ کو خود وحیٔ الٰہی کے ذریعے حکم ملا کہ:

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ (الشُّعراء)

''اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ۔''

اس پر جناب رسول کریم ﷺ نے اپنے دادا کی اولاد کو جمع کیا اور مخاطب کر کے فرمایا:

''اے بنی عبدالمطلب! اے عباس' اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی' اے فاطمہ محمد کی بیٹی! تم لوگ آگ سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کر لو۔ میں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا' البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو۔'' (صحیحین)

قرآن پاک کی رو سے کفار کو تو کسی قسم کی شفاعت بھی نفع نہ دے گی۔ جب کفار دوزخ میں جھونک دیے جائیں گے تو وہ کہیں گے:

﴿وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ﴿٩٩﴾ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ﴿١٠٠﴾ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ﴿١٠١﴾﴾ (الشُّعراء)

''اور وہ مجرم لوگ ہی تھے جنہوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا۔ اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست۔''

اسی طرح سورۃ المدثر میں ذکر ہے کہ کافر کو کسی کی شفاعت نفع نہ دے گی:

﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ﴿٤٨﴾﴾

''پس سفارش کرنے والوں کی سفارش اُن کو فائدہ نہ دے گی۔''

رہے ایمان دار لوگ تو اُن کے حق میں سفارش قبول کی جائے گی' لیکن وہ سفارش دنیا کی سفارش پر قیاس نہیں کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور جس کا جی چاہے اور جس کے حق میں جی چاہے سفارش کر دے۔ ایسی بے سروپا سفارش احکم الحاکمین کے حضور تو گمان بھی نہیں کی جا سکتی۔ قرآن شاہد ہے کہ:

﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً

سَیِّئَةً یَّکُنْ لَّهٗ کِفْلٌ مِّنْهَا﴾ (النساء:۸۵)

''جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا''۔

اب ایسا کون ہے جو خدا کی گرفت سے بے نیاز ہو کر مغضوب لوگوں کی سفارش کر کے اپنے آپ کو خدا کے غضب کا نشانہ بنا لے؟ اسی لیے قرآن حکیم کی تعلیم اس ضمن میں یہ ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کر سکے گا' بلکہ سفارش کرنے والے کو بھی بارگاہِ خداوندی سے جس کے حق میں سفارش کی اجازت دی جائے گی وہ صرف اسی کے حق میں سفارش کر سکے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سفارش کا مطلق حق صرف ربّ العالمین ہی کو ہے۔ سورۃ الزمر میں اسی حقیقت کا بیان ہے:

﴿قُلْ لِّلّٰهِ الشَّفَاعَةُ جَمِیْعًا﴾ (آیت ۴۴)

''کہہ دیجیے سفارش تو پوری کی پوری اللہ کے اختیار میں ہے۔''

قرآن کی رو سے شفاعت تو ایک قسم کا اعزاز ہے جسے ربّ العالمین اپنے بعض بندوں کو عنایت فرمائے گا' لیکن یہ اعزاز اُسی صورت میں ہے جبکہ شافع کی شفاعت کو شرفِ قبولیت بخشا جائے' مگر خدا کے بندوں میں سے کوئی عالم الغیب تو ہے نہیں جو کسی انسان کی زندگی کے تمام ظاہری و باطنی احوال و اعمال سے واقف ہو' اور اس واقفیت کی بنا پر جان لے کہ فلاں کے حق میں وہ سفارش کرے تو وہ یقیناً قبول ہو گی۔ لٰہذا عالم الغیب ہی اس بات کو جانتا ہے کہ کون شخص شفاعت کے لائق ہے' چنانچہ اُسی کے حق میں اللہ تعالیٰ اپنے اس معزز بندے کو شفاعت کا حق دے گا اور پھر اُس کی شفاعت کو شرفِ قبولیت بخش کر بھرے اجلاس میں اس عبدِ شافع کے حق میں اپنی شانِ شکوری کا اظہار فرما کر اسے سرفراز فرمائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں شفاعت کا اثبات کیا گیا ہے وہاں عموماً عالم الغیب کا اِذن ضروری قرار دیا گیا۔ سورۃ البقرۃ میں ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ﴾ (آیت ۲۵۵)

''کون ہے جو اُس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔''

پھر سورۂ طٰہٰ میں فرمایا:

﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴿١١٠﴾﴾

''اس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی اِلاّ یہ کہ کسی کو رحمٰن اس کی اجازت دے اور اس کی بات سننا پسند کرے۔ وہ لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے اور دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں''۔

پس شفاعت کو مشروط باذن اللہ کرنا دراصل شافعین کو اہانت سے محفوظ رکھنے اور اُن کی تکریم کو حتمی بنانے کے لیے ہے۔ کیونکہ جس طرح یہ بات شافع کے لیے حد درجہ اکرام کا باعث ہے کہ اُسے بارگاہِ خداوندی سے شفاعت کی اجازت ملے اور پھر اس کی شفاعت شرفِ قبولیت پائے' اسی طرح اگر کسی کی شفاعت میدانِ حشر میں ردّ کر دی جائے تو یہ اس کے لیے رسوائی کا باعث ہوگی۔ اس لیے شفاعت کو باذن اللہ مشروط کر کے ربّ شکور نے اپنے برگزیدہ اور نیک بندوں کے لیے میدانِ حشر میں رسوائی کے امکان ہی کو ختم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں جہاں بھی شفاعت کا ذکر ہے وہاں باذن اللہ کی شرط بھی لگائی گئی ہے۔ سورۃ البقرۃ اور سورۂ طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیات کے علاوہ سورۃ الانبیاء کی آیت ملاحظہ ہو:

﴿وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ﴿٢٨﴾﴾

''اور وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اُس شخص کے جس کے حق میں سفارش سننے پر رحمٰن راضی ہو اور وہ اس کے خوف سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں''۔

اس کے علاوہ سورۃ النبا میں روزِ محشر کا نقشہ اور شفاعت کا ذکر اس طرح ہے:

﴿يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿٣٨﴾﴾

''وہ دن جبکہ روح اور ملائکہ سب صف بستہ کھڑے ہوں گے' ذرا بات نہ کریں گے' صرف وہی بول سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے اور جو ٹھیک ٹھیک بات کہے۔''

فرشتے بھی بارگاہِ خداوندی میں بایں ہمہ تقرب بدون اجازت لب کشائی نہ کر سکیں گے:

﴿وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْئًا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى﴾ (النجم)

''اور کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی بجز اس کے کہ اللہ سے اجازت ملنے کے بعد کی جائے اور ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لیے وہ سفارش سننا چاہے اور پسند کرے۔''

نتیجہ اس ساری گفتگو کا یہ نکلا کہ اُصولی طور پر قیامت کا دن دوستیاں نبھانے یا سفارشیں کرنے کا نہیں ہے۔ جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے: ﴿وَلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ﴾ (البقرۃ:۲۵۴) بلکہ عدل وانصاف کا دن ہے۔ اُسی عدل کا تقاضا ہے کہ احکم الحاکمین کی بارگاہ میں غیر معمولی فرماں بردار اور برگزیدہ بندوں کو خصوصی اکرام و اعزاز سے نوازا جائے۔ چنانچہ انبیاء و رُسل اور نیک لوگوں کو بعض دوسرے افراد کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی اور اسے شرفِ قبولیت بخشا جائے گا۔ کیونکہ عالم الغیب اور شفاعت کا مطلق مختار اللہ تعالیٰ ہے اس لیے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس کے حق میں سفارش کرنے کی کسی نبی یا ولی کو اجازت ملے گی۔ لہٰذا شفاعت پر بھروسہ کر کے نیک اعمال اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی قرآن کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آیاتِ شفاعت پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کو زندگی میں خدا اور رسول کے احکامات کی ہر قدم پر پابندی کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ربّ العزت کے ہاں سے رسول اللہ ﷺ کو اس کی شفاعت کا اذن مل جائے اور اس طرح اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر ستار العیوب پردہ ڈال دے۔ گویا مسئلہ شفاعت ان قرآنی تعلیمات کا اہم جزو ہے جن میں جدوجہد اور پرہیزگاری پر زور دیا گیا ہے۔ مکافاتِ اعمال سے غفلت کا جواز کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ ۔

مَا سَلَكَكُمْ فِیْ سَقَرَ

سورۃ المدثر میں مذکور ہے کہ حساب کتاب کے بعد جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں بھیج دیے جائیں گے تو جنتی دوزخ میں پڑے لوگوں سے پوچھیں گے کہ تمہیں کون سی چیز دوزخ میں لے گئی؟ تو وہ جواب میں چار چیزوں کا ذکر کریں گے اور کہیں گے کہ اوّل ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔ دوم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ سوم فضول قسم کی محفلوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ چہارم فیصلے کے دن کا انکار کرتے تھے۔ اسی حال میں ہماری مہلتِ عمر ختم ہوگئی یعنی موت آ گئی۔ گویا وہ لوگ اپنی آپ بیتی سناتے ہوئے اقرار کررہے ہیں کہ دیگر جرائم وآثام کی نسبت یہ چاروں کام دوزخ کا مستحق بنانے کی خصوصی تاثیر رکھتے ہیں۔ اب قرآن تو آیات پر غور وفکر اور تذکر وتدبر کی دعوت دیتا ہے۔ جب کوئی قاری ان آیات پر غور کرے گا تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ دوزخیوں اور جنتیوں کے مابین یہ گفتگو اُمت مسلمہ کے افراد کو دوٹوک انداز میں اسبابِ دخولِ جہنم کی نشاندہی کرتی ہے تاکہ قرآن پڑھنے والے دخولِ جہنم کے اسباب کو اچھی طرح جان لیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں' ورنہ پیمانہ لبریز ہوجانے کے بعد خدا کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار واعتراف کچھ فائدہ نہ دے گا۔

ترکِ صلوٰۃ

جہنم میں لے جانے والی ان چار باتوں میں پہلی بات ترکِ صلوٰۃ ہے۔ نماز ارکان اسلام میں سے ایک رکن' حقوق اللہ میں سے ایک حق اور لا الٰہ الاّ اللہ کے اقرار کی مظہر ہے۔ فرمان نبویؐ کے مطابق جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والا گویا کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔ یعنی نماز مؤمن اور کافر کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ نماز مسلمان کی شناخت ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہوجاؤ۔ آنحضرت ﷺ

نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے۔ نماز قائم کرنے کا حکمِ خداوندی قرآن کریم میں متعدد مرتبہ آیا ہے جس سے اس کی اہمیت واضح ہے۔ پھر خود رسول پاکؐ کا طرزِ عمل ملاحظہ ہو کہ آپؐ نے پوری زندگی آخری سانس تک نماز پنجگانہ کی پابندی کی ہے بلکہ آپؐ کو نماز کے ساتھ اس قدر الفت تھی کہ راتوں کو نفل نمازوں میں اس قدر لمبا قیام کرتے کہ پاؤں مبارک پر ورم آ جاتا۔ نماز عبد اور معبود کے تعلق کو نمایاں کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ حالتِ سجدہ میں انسان اللہ تعالیٰ کے قریب ترین ہوتا ہے۔ غور کیجیے تارکِ صلوٰۃ معرفتِ حق تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ وہ رسول پاک ﷺ کی محبوب عبادت کو چھوڑ کر خدا کا پیارا کیسے بن سکتا ہے؟ خالی زبانی دعوؤں اور خوشامدی جملوں سے نہ خدا کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے نبی ﷺ کو۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان وہی ہے جس کی پسند و ناپسند اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پسند و ناپسند کے تابع ہو گی۔

آج دیکھئے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نماز کی اہمیت سے غافل ہے۔ اپنی اپنی مصروفیتوں میں نماز کو بھولے بیٹھے ہیں اور کچھ فرقہ پرست مولویوں کے طرزِ عمل کو آڑ بنا کر نماز اور مسجد سے بے تعلقی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ مولویوں کو دین کا نمائندہ سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ یہ دھوکہ ہے۔ ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ خود رسول پاک ﷺ ہیں ' ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنا ہے اور بس! ایسے لوگ داڑھی رکھنے ' نماز پڑھنے اور شلوار کو ٹخنوں سے اونچا رکھنے کو محض قدامت پسندی اور جنونیت سمجھتے ہوئے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ غفلت بڑی خطرناک ہے۔ سورۃ المدثر کی زیر بحث آیات پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوزخی اہل ایمان میں سے ہوں گے ' کیونکہ اگر کافر ہوتے تو مطلق کفر ہی کو دخولِ جہنم کا سبب بتاتے۔ مولانا مودودیؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

''......اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نماز کوئی شخص اس وقت تک پڑھ ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ ایمان نہ لایا ہو ' اس لیے نمازیوں میں سے ہونا آپ سے آپ ایمان لانے والوں میں سے ہونے کو مستلزم ہے ' لیکن نمازیوں میں نہ ہونے کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دے کر یہ بات واضح کر

دی گئی کہ ایمان لا کر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا اگر وہ تارکِ نماز ہو''۔
(تفہیم القرآن' جلد ششم' ص ۱۵۴)

پس مسلمان کا کسی بھی عذر سے تارکِ صلوٰۃ ہونا انتہائی خود فریبی ہے۔ ترکِ نماز تو دور کی بات ہے' نماز کو پورے اہتمام اور تکلف سے پڑھنے کی تلقین ہے۔ غفلت اور سستی کے ساتھ ادا کردہ نماز پر بھی بڑے عذاب کی تنبیہہ کی گئی ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ خود بھی نماز پڑھیں اور اپنے گھر والوں کو بھی نماز پڑھنے کی تاکید کریں۔ دیکھئے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ (طٰہٰ:۱۳۲)

''اور (اے نبیؐ!) اپنے اہل خانہ کو نماز کا حکم دیجیے اور خود بھی اس پر جمے رہیے۔''

نماز کی اس قدر اہمیت اور تاکید کے باوجود اگر کوئی مسلمان تارکِ صلوٰۃ ہو تو یہ بات اسی طرح ناقابلِ فہم ہے جس طرح کسی مسلمان کا جہنم میں پھینکا جانا سمجھ میں نہیں آتا۔

مسکین کو کھانا نہ کھلانا

اہل دوزخ اپنا دوسرا بڑا جرم مسکین کو کھانا نہ کھلانا بتاتے ہیں۔ نماز کی طرح قرآن کریم میں مسکین کو کھانا کھلانے کی تاکید بھی کئی مرتبہ بیان ہوئی ہے۔ صاحبِ حیثیت لوگوں کا فرض ہے کہ وہ مفلس اور نادار لوگوں کا خیال رکھیں' ان کی ضروریات پوری کریں' ان کی تنگدستی دور کرنے کی کوشش کریں' بھوکوں کو کھانا کھلائیں۔ رزق کی کثرت و قلت اللہ کے اختیار میں ہے' وہ کچھ لوگوں کو کشادہ روزی دیتا ہے جبکہ کچھ دوسروں کا رزق تنگ ہوتا ہے۔ پس کشادہ روزی والے نعمتوں اور آسائشوں کی فراوانی پا کر احساسِ برتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور غریبوں اور مسکینوں کو قابل نفرت اور حقیر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی تعلیم کے مطابق امیر لوگوں کی روزی میں ناداروں کا حصہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اسی لیے امیروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مفلسوں اور غریبوں کو اُن کا حق ادا کریں۔ اور اگر وہ یہ حق نہیں ادا کرتے تو گویا وہ حق تلفی کے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ سورۃ الذّٰریٰت میں ہے:

﴿وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾

''اور اُن کے مالوں میں سوالی اور نادار کا حق ہے''۔

اسی طرح سورۃ المعارج میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ فِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾

''اور وہ لوگ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا مقرر حق ہے۔''

یوں دولت مندوں پر واضح کر دیا کہ ان کے مالوں میں ضرورت مندوں کا حق شامل ہے جو انہیں ضرور ادا کرنا ہے۔ پھر سورۃ الماعون میں یومُ الدِّین کو جھٹلانے والے شخص کی نشانیاں بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ گویا دولت مندوں کو اس بات کی تلقین کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے کشادہ رزق میں سے لازمی طور پر ناداروں کا حصہ ادا کریں۔ یہاں قابل غور بات یہ بھی ہے کہ سورۃ الماعون میں ''اطعام المسکین'' کی بجائے ''طعام المسکین'' یعنی ''مسکین کا کھانا'' مرکب اضافی کی صورت میں آیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دولت مند مسکینوں کو ان کا کھانا لوٹائیں جو اُن کے پاس بطور امانت رکھا گیا ہے۔

اگر ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اَسلاف میں نہ صرف ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کا جذبہ تھا بلکہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے تھے۔ سورۃ الحشر میں انصارِ مدینہ کے ایثار کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر:۹)

''اور وہ دوسرے ضرورت مندوں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں اور اگرچہ وہ خود بھوکے ہوتے ہیں۔''

یعنی رسول پاک ﷺ کے تربیت یافتہ افراد کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ خود بھوکے رہ کر دوسروں کی بھوک مٹاتے تھے چہ جائیکہ اپنی ضروریات اور سہولتوں کی فراہمی میں اپنے اردگرد کے نادار اور غریب لوگوں کو نظر انداز کیا جائے۔

یہ گھاٹی عبور کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ نفس کا لالچ تو ہر انسان کو خود غرض بناتا ہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ﴾ (یوسف:۵۳)

''بے شک نفس تو پوری قوت کے ساتھ برائی پر آمادہ کرتا ہی ہے سوائے اس شخص کے جس پر میرے ربّ نے رحم کیا۔''

جب بھی انسان فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا ارادہ کرے شیطان اسے مال کے کم ہونے کے خدشے میں مبتلا کر کے اس کا ہاتھ روکتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ﴾ (البقرۃ:۲۶۸)

''شیطان تمہیں افلاس سے ڈراتا ہے۔''

ایسے موقع پر اہل اللہ ہی نفس کو کچلنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اور جو اس میں کامیاب رہے بس وہی حقیقت میں کامیاب ہیں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ﴾ (الحشر)

''اور جو نفس کے لالچ سے بچالیا گیا پس ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

ورنہ نفس کا حملہ تو آخری وقت تک جاری رہتا ہے۔ اگر انسان ضرورت مندوں پر مال خرچ کرنے کا ارادہ کر ہی لے تو نفس نمود و نمائش کی ترغیب دیتا ہے تاکہ یہ انفاق اکارت چلا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ﴾

(البقرۃ:۲۶۴)

''مانند اس شخص کے جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کے دکھلاوے کے لیے اور وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ یومِ آخر پر۔''

یا پھر بچا کھچا اور ناقص مال خرچ کرتا ہے جو قبول نہیں ہوتا:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ﴾ (آل عمران:۹۲)

''تم ہرگز نیکی کو نہیں پاسکتے یہاں تک کہ اس شے میں سے خرچ کرو جسے تم پسند کرتے ہو۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا جو خود تو پیٹ بھر کر سو جائے اور اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا ہو اور اسے علم بھی ہو''۔ (معارف الحدیث' جلد ششم)

معلوم ہوا کہ بھوکے کو کھانا کھلانا انتہائی ضروری ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ ثروت مند لوگ غریبوں اور مسکینوں کی تضحیک وتحقیر کی بجائے ان کے ساتھ ہمدردی اور اعانت کا رویہ اپنائیں تاکہ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر معاشرے کا عضوِ معطل نہ بنیں' بلکہ برابری کے احساس کے ساتھ اپنی صلاحیتیں بروئے کار لا کر ملک وملت کے لیے مفید ثابت ہو سکیں۔

فضول بحث ومشاغل میں اُلجھنا

لایعنی باتوں کے پیچھے پڑنا اور فضول مشاغل میں وقت صرف کرنا بھی دخولِ جہنم کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اگر ہم سیرتِ نبویؐ کا مطالعہ کریں تو ہمیں اُسوۂ حسنہ میں ایک بھرپور عملی زندگی نظر آتی ہے جو سراسر جدوجہد اور سعی وجہاد سے پُر ہے۔ حیاتِ طیبہ کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جسے بامقصد نہ گزارا گیا ہو۔ یہی اُسوۂ حسنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنایا اور یہی صلحائے اُمت کا شعار تھا۔ اسلام میں تضییع اوقات کا کوئی تصور نہیں۔ کسی مسلمان کے پاس فالتو وقت نہیں ہوتا جس میں وہ کسی عبث کام میں الجھے۔ اہل دوزخ کہہ رہے ہیں: ﴿وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَآئِضِينَ ۝﴾ (المدثر) ''اور ہم مشغول رہتے تھے مشغول رہنے والوں کے ساتھ''۔ اور ''خوض'' وہ مشغلہ ہے جو نتیجہ خیز نہ ہو۔ گویا جس قسم کی بھی محفل دیکھی اسی میں شامل ہو گئے' یہ نہ سوچا کہ اس مشغولیت میں کوئی دینی یا دنیاوی منفعت بھی متوقع ہے یا نہیں۔

یہ مشغولیت اگرچہ معصیت کے تحت تو نہیں آتی' لیکن مسلمان کی زندگی کے لمحات بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طالب علم امتحان گاہ میں بیٹھا ہے۔ اسے محدود وقت دیا گیا ہے۔ اگر وہ طالب علم اپنے وقت سے بھرپور انداز میں استفادہ کرتا ہے اور پرچہ میں دیے گئے سوالوں کے جوابات میں پوری طرح منہمک

رہتا ہےتو اس کا نتیجہ اچھا رہے گا۔ اس کے برعکس اگر طالب علم کمرۂ امتحان میں بیٹھ کر نہ تو دھیان سے پرچۂ امتحان ہی پڑھے اور نہ ہی سنجیدگی کے ساتھ سوالات کے جوابات لکھے' بلکہ اپنی جوابی کاپی پر الٹی سیدھی لکیریں لگانے میں وقت ختم کر دے' تو ایسے طالب علم نے کارِعبث کیا اور نتیجہ کے وقت اسے حسرت اور مایوسی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ حدیث نبویؐ کے مطابق دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۔ جو کسان بوائی کے موسم میں بیج کاشت کرنے کی بجائے اِدھر اُدھر کے کاموں میں مشغول رہا وہ کٹائی کے موسم میں لازماً محروم رہے گا۔

مسلمان کوتو زندگی گزارنے کا مکمل پروگرام دیا گیا ہے' جو الفاظ کی صورت میں قرآن پاک ہے اور عمل کی صورت میں رسولِ خدا کی زندگی ہے جو سراسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے تعبیر ہے۔ حقوق اللہ میں تمام عبادات اور حقوق العباد میں تمام معاشرتی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ کون شخص ایسا ہوگا جو عبادت کا حق بھی ادا کر چکا اور معاشرتی ذمہ داریاں بھی پوری کر چکا اور اب لغویات کے لیے بھی اس کے پاس وقت بچ گیا ہے؟ ع ''ایں خیال است ومحال است وجنوں''۔

کھیل تماشے' ناچ گانے اور اسی طرح کی دوسری لغویات نفس کے لیے تو پرکشش ہیں' مگر کارِعبث ہونے کی وجہ سے اسلام میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمان کی زندگی میں وقت کاٹنے کا کوئی تصور نہیں' کیونکہ اس کی زندگی میں کرنے کے بہت اہم کام موجود ہیں جن سے مطلق خیر برآمد ہوتی ہے۔ وہ اللہ کے ذکر میں اور قرآن سیکھنے سکھانے میں مصروف رہے گا۔ پھر روزی کمانے اور اہل خانہ کی تربیت اور نگہداشت کا فریضہ ادا کرے گا۔ ملک وقوم کی بہتری اور فلاح و بہبود کے کاموں میں شرکت کرے گا۔ اس کے پاس تاش کھیلنے اور لہوولعب کے لیے وقت ہی کہاں ہوگا!

جہالت اسلام کی ضد ہے' اس لیے کوئی مسلمان جاہل نہیں ہوسکتا۔ اسلام میں صحت کی بحالی کی خاطر سیر وتفریح اور ورزش کا تو جواز ہے' کیونکہ صحت خود بہت بڑی نعمت ہے۔ صحت ہوگی تو فرائض کی ادائیگی ہو سکے گی۔ اگر مسلمان کو سفر درپیش ہو تو وہ

﴿سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ کے حکم کے موافق چشمِ عبرت وا رکھے گا تاکہ قدرت کی نشانیاں دیکھے اور ایمان و یقین کو مزید پختہ کرے۔ اگر وہ روزی کمانے کے لیے محنت کرتا ہے تو اس لیے کہ وہ دوسروں کے لیے مفید ثابت ہو سکے' نہ صرف اپنا اور اہل و عیال کا بوجھ اٹھائے بلکہ مستحقین کی خبر گیری بھی کر سکے۔ یہ ساری مصروفیات بامقصد ہیں۔ پھر لایعنی مشاغل کے لیے اس کے پاس وقت کہاں سے آئے گا! اگر وہ فضول کاموں میں وقت لگائے گا تو اہم اور ضروری فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا اور یہی چیز اسے برے نتیجے تک پہنچائے گی۔ قرآن شریف میں مسلمان کا طرزِ عمل یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کسی وقت اسے فضولیات کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو وہ بڑے وقار کے ساتھ گزر جاتا ہے چہ جائیکہ خود ان لغویات اور لہو و لعب کا حصہ بن جائے۔ سورۃ الفرقان میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ لَا يَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا﴾ (الفرقان)

''اور جو لوگ شامل نہیں ہوتے جھوٹے کام میں اور جب گزرتے ہیں کھیل کی باتوں پر تو نکل جائیں بزرگانہ۔'' (ترجمہ شیخ الہند)

یعنی وہ لایعنی مجالس attend نہیں کرتے۔

علامہ قرطبی نے حضرت عکرمہؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ لعب کو جاہلیت میں ''زور'' کہتے تھے۔ مشہور مفسر مولانا عبدالماجد دریابادی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس کے تحت زمانے کے میلے ٹھیلے' مختلف بازیوں کے جمگھٹے' ناچ رنگ کی محفلیں' تھیٹر' سینما وغیرہ داخل ہیں۔''

کیونکہ یہ تمام امور خیر سے خالی اور رغبت الی المعصیہ کا باعث بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت مسلمہ کے اکابرین' مشاہیر' ائمہ' محدثین اور صالحین کی زندگیاں اپنے اپنے دور میں رائج الوقت ہر قسم کے لہو و لعب سے یکسر پاک تھیں۔ سینما اور تھیٹر تو سلف صالحین کے وقت موجود نہ تھے مگر میلے ٹھیلے اور ناچ گانے کی محفلیں تو دورِ نبویؐ اور عہدِ صحابہ میں بھی موجود تھیں' لیکن نہ کبھی رسول اللہ ﷺ نے ان میں حصہ لیا اور نہ ہی صحابہ کرامؓ نے ان

میں شمولیت کی۔ مگر آج کے مسلمان لہو ولعب کے ان کاموں میں بڑے انہماک کے ساتھ مشغول ہیں۔ نہ صرف اس میدان میں اپنی توانائیاں پیسہ اور وقت صرف کر رہے ہیں بلکہ دوسروں کی ترغیب کا ذریعہ بھی بن رہے ہیں۔ کاش وہ قرآن پاک سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں اور سورۃ المدثر کی تلاوت کے دوران دوزخیوں کی آواز ان کے کانوں تک پہنچ کر دل میں اتر جائے کہ وہ کہہ رہے ہیں:

﴿كُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَآئِضِينَ﴾ (المدثر)

''مشغلہ میں رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغلہ میں پڑے رہتے تھے۔''

(ترجمہ عبدالماجد دریابادی)

ٹیلی ویژن نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہے کہ ناچ گانے کی محفلیں ہر گھر میں پہنچ گئی ہیں۔ متقی اور صالح گھرانے بھی دانستہ یا نادانستہ ان محافل کے ''شاہد'' ہو رہے ہیں۔ چونکہ باطل امور نفس کو بہت مرغوب ہوتے ہیں اس لیے بہت جلد انسان ان کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اسی انسانی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دورِ نبویؐ میں نضر بن الحارث مختلف ملکوں سے لٹریچر کی کتب لاتا' وہاں کے بہادروں کے افسانے اور قصے سناتا اور لوگوں کو کہتا کہ ان کو سنو اور ان میں جی لگاؤ' قرآن کے وعظ میں کیا رکھا ہے؟ اور ساتھ ہی ایک حسین وجمیل ناچنے والی لڑکی رکھتا۔ اس طرح وہ لوگوں کو اسلام اور قرآن سے دور رہنے کی ترغیب دیتا۔ اب بھی جو لوگ مسلمان ہونے کے باوجود فحاشی اور لہو ولعب کی نشر واشاعت اور تشہیر میں لگے ہوئے ہیں وہ دشمنِ خدا ورسول نضر بن الحارث ملعون کے طریقے پر چل کر فسق وفجور پھیلا رہے ہیں' اگرچہ وہ اپنے تئیں بہت عقل مند سمجھ رہے ہوں' کیونکہ وہ اس راہ سے بین الاقوامی شہرت اور ڈھیروں دولت کما رہے ہیں۔ مگر سچ پوچھیے تو یہی لوگ انتہا درجہ کے احمق اور بے وقوف ہیں جو چند روزہ حیاتِ مستعار کی تزئین کی خاطر ابدالآباد کی حیاتِ اُخروی کے لیے عذاب در عذاب جمع کر رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِى الْاَبْصَارِ﴾ (الحشر:۲)

''عبرت پکڑو اے دیکھنے والو!''

فیصلے کے دن کا انکار

اہل جنت کے پوچھنے پر اہل دوزخ جو چوتھی بات بتائیں گے وہ یہ ہے کہ:

﴿وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (المدثر)

''اور ہم فیصلے کے دن کا انکار کرتے تھے۔''

یوم آخرت پر ایمان اسلام کے بنیادی اور اہم ترین عقائد میں سے ہے جس کی بنا پر ہر مسلمان کا یقین ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ملے گی۔ قیامت کے روز سب لوگوں کا حساب کتاب ہوگا' دنیا میں کیے گئے اعمال کی پڑتال ہوگی اور نتیجہ کے طور پر نیکوکاروں کو جنت میں جگہ ملے گی' جہاں ہر طرح کا آرام' چین اور سکھ ہوگا' جبکہ بداعمال لوگوں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا جہاں دہکتی ہوئی آگ کا عذاب ہوگا۔

عقیدۂ آخرت کا استحضار انسان کو گناہوں سے دور رکھتا ہے جبکہ آخرت کی طرف سے عدم توجہی آدمی کو شتر بے مہار بنا دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تقویٰ کی زندگی پسند ہے اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان دنیا میں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھے اور محتاط زندگی گزارے اور احتسابِ آخرت کو کبھی ذہن سے محو نہ ہونے دے' تاکہ اگلی زندگی میں اس کے لیے ابدی راحت و آرام ہو اور وہ عذابِ الٰہی سے بھی بچ جائے۔ قرآن کریم میں بتایا گیا ہے:

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ (الحُجرات:۱۳)

''بے شک تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے۔''

پس خدا کا محبوب بننے کے لیے تقویٰ کی زندگی بہت ضروری ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ ہے۔ آپؐ نے پوری زندگی رضائے الٰہی کے مطابق گزاری اور کبھی ذاتی خواہش کو اہمیت نہ دی۔ آپؐ کے طریقہ پر چل کر صلحائے اُمت کا بھی یہی معمول رہا۔ انہوں نے اپنی زندگیاں رضائے الٰہی کے تابع رکھیں اور یہ صرف ایمان بالآخرت سے ہی ممکن ہوا۔ جوں جوں ایمان بالآخرت میں ضعف پیدا ہوتا جائے گا توں توں اعمال میں بے احتیاطی راہ پاتی جائے گی۔ اگر عمل

کرتے وقت اس کے نتیجے کا احساس بیدار ہو تو آدمی گناہ سے بچ جاتا ہے اور نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے' کیونکہ اسے معلوم ہے کہ فرمان رسول ﷺ کے مطابق دنیا آخرت کی کھیتی ہے' جو یہاں آج بویا جائے گا وہی وہاں کل کاٹنا ہوگا۔

سورۃ الحدید میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ یومِ آخرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے' جب ایمان والے مردوں اور عورتوں کا نور اُن کے سامنے اور دائیں روشن ہوگا اور وہ اطمینان کے ساتھ اس روشنی میں چل کر جنت کی طرف رواں دواں ہوں گے۔ ان کے پیچھے منافق مرد اور عورتیں ہوں گی جو اُن کو آواز دے کر کہیں گے کہ ذرا رک جاؤ تا کہ ہم بھی تمہاری روشنی سے کچھ استفادہ کرلیں۔ اس پر اُن کو جواب ملے گا کہ ''واپس جاؤ اور روشنی لے کر آؤ''۔ اُس وقت دنیا میں واپسی تو ممکن نہ ہوگی لہٰذا ان کو یاس وحسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا اور بالآخر وہ جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی فکر آخرت کے بغیر گزاری' من مانی کی' خواہشِ نفس کے غلام بنے رہے' ''بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' پر عمل پیرا رہے' دنیا کمانے اور سجانے کی دوڑ میں اپنا سارا وقت اور توانائی خرچ کرڈالی اور کبھی نہ سوچا کہ فیصلے کے دن ہمیں روشنی کی ضرورت پڑے گی۔ یہی لوگ ہیں جو عملی طور پر یومِ آخرت کے انکاری رہے۔

سورۃ المنافقون کے اخیر میں بتایا گیا ہے کہ غیر محتاط زندگی گزارنے والوں کو جب اپنا انجام معلوم ہو جائے گا تو وہ خواہش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ انہیں تھوڑی مدت کے لیے دوبارہ واپس دنیا میں بھیج دے تو وہ بہت خیرات کریں گے اور نیکوکار بن جائیں گے۔ مگر افسوس کہ اللہ تعالیٰ ان کو موقع نہ دے گا' کیونکہ ان کی موت کے ساتھ مہلتِ عمر بیت چکی۔ اور اسی حسرت و یاس کی حالت میں ان کو آگ کے عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔

ہر طرزِ عمل کا انجام قرآن کریم میں کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے' مگر فکرِ آخرت کو نظرانداز کرنے سے انسان کی آنکھوں کے سامنے پردہ آ جاتا ہے جس سے وہ بدعملی کا واضح انجام نہیں دیکھ سکتا اور برائیوں میں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ آج جو ہر طرف برائیوں

کا دور دورہ ہے اس کی بڑی وجہ یہی عقیدۂ آخرت کی کمزوری ہے۔ بلاشبہ ہر مسلمان آخرت پر یقین رکھتا ہے مگر یہ یقین نظریے کی حد تک رہ گیا ہے' عملی طور پر وہ دنیا کی چمک دمک پر فریفتہ ہو کر عقیدۂ آخرت کا انکاری ہو چکا ہے۔ ورنہ مسلمان اور یہ بدعملی؟ کون سا جرم اور گناہ ہے جو اِس وقت نہیں ہو رہا؟ قاتل کی سزا جہنم ہے مگر بے گناہوں کے گلے کون کاٹ رہا ہے؟

یومِ آخرت کا ذکر قرآن پاک میں جابجا موجود ہے' مگر خود قرآن پاک کی تلاوت کرنے والوں میں کتنے ہیں جن کو فکرِ آخرت دامن گیر ہے؟ قرآن کی ایک یاددہانی ملاحظہ ہو:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝۱۸ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝۱۹ لَا يَسْتَوِيْۤ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ؕ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ۝۲۰﴾ (الحشر)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' اور چاہیے کہ ہر شخص دیکھ لے کہ کل کے لیے کیا آگے بھیجتا ہے' اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور تم ان لوگوں کی مانند نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا' پھر اللہ نے ان کو خود ان کے جی بھلا دیے' وہی لوگ فاسق ہیں۔ نہیں برابر آگ والے اور جنت والے' رہے جنت والے تو وہی ہیں مراد پانے والے۔''

ہوش مندی کا تقاضا ہے کہ آخرت پر ایمان لانے والے انجام کار کی پشیمانی' پچھتاوے' حسرت اور عذابِ جہنم سے بچنے کے لیے قرآن پاک کی آفاقی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے رسالت مآب ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو ہر وقت پیش نظر رکھیں۔ دوسری شخصیات کے کردار کی جانچ کے لیے بھی اُسوۂ حسنہ ہی کو معیارِ حق سمجھیں' ورنہ رسول پاک ﷺ کے آستانہ کو چھوڑ کر دوسری ''بڑی'' شخصیات کو محبوب بنانے کا نتیجہ تو بس محرومی اور ناکامی ہی نکلے گا۔ قرآن پاک ایسے لوگوں کی حالت زار اس طرح بیان کرتا ہے:

﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِىْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۝ لَقَدْ اَضَلَّنِىْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِىْ ۭ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ۝ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝﴾ (الفرقان)

''اُس دن ستم گر شخص اپنے ہاتھوں کو چبا چبا کر کہے گا: ہائے کاش کہ میں نے رسولؐ کی راہ لی ہوتی! ہائے افسوس' کاش کہ میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوا ہوتا! اس نے تو مجھے الذکر (یعنی قرآن) سے گمراہ کر دیا اس کے بعد کہ وہ میرے پاس آ پہنچا تھا۔ اور شیطان انسان کو وقت پر دغا دینے والا ہے۔ اور رسولؐ کہے گا: اے میرے پروردگار! بے شک میری اُمت نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔''

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ

ذکر کا مطلب ہے اللہ کی یاد۔ اللہ تعالیٰ جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے اس قابل ہے کہ اسے ہمہ وقت یاد کیا جائے اور یاد رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر زبان سے بھی ہے اور عمل سے بھی۔ اس دور کے بعض مادہ پرست ذہن جنہیں روحانی بالیدگی میسر نہیں ہے' کہہ اٹھتے ہیں کہ زبان سے اللہ کا ذکر چہ معنی دارد؟ مگر یہ ان کی غلط فہمی ہے' کیونکہ صرف زبان سے اللہ کا ذکر بھی اعلیٰ درجہ کی تاثیر کا حامل ہے۔ اگر اسے مادی مثال سے ہی سمجھنا ہو تو ایک سنگلاخ چٹان پر پانی کا قطرہ قطرہ گرتے دیکھئے۔ یہ قطرہ بظاہر نہایت کمزور' حقیر اور ملائم سی چیز ہے' مگر جب یہ لگاتار ایک مدت تک ایک ہی جگہ گرتا رہے تو سنگلاخ چٹان میں سوراخ کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بعض اوقات بظاہر چھوٹا سا عمل پیہم مشق سے حیرت انگیز نتائج پیدا کرتا ہے اور پھر ذکر اللہ تو چھوٹا عمل بھی نہیں۔ خالق کائنات نے قرآن پاک میں اللہ کے ذکر کو سب چیزوں سے بڑا قرار دیا ہے' ملاحظہ ہو سورۃ العنکبوت ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ط﴾ (آیت ۴۵) ''اور اللہ کا ذکر تو سب سے بڑی چیز ہے''۔

کہتے ہیں کہ قیامت کے دن جنتیوں کے لیے سب سے بڑی نعمت دیدارِ الٰہی ہوگا۔ اس میں ایسی لذت ہوگی کہ ناظرین رؤیت باری تعالیٰ سے نظر اِدھر اُدھر کرنا گوارا نہ کریں گے۔ بھلا اس ہستی کا ذکر بے اثر ہو سکتا ہے؟

دنیا میں ہمیں کسی شخص سے اس کے باکمال ہونے یا باکردار ہونے کی وجہ سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مشاہدہ ہے کہ جب کسی محفل میں ہماری اس پسندیدہ شخصیت کا ذکر ہو گا تو ہماری دلچسپی اس میں بڑھتی جائے گی۔ نیز ہم کسی محفل میں بیٹھے ہوں تو ہمارا دل چاہے گا کہ کسی نہ کسی طور اپنی محبوب شخصیت کا تذکرہ شروع کریں' یعنی اس کا ذکر اپنے

احباب کے سامنے کریں۔ یہی تو ذکر ہے۔ بلکہ ایک شخص کو ایک خاص فن محبوب ہے، وہ اس فن کا شیدائی ہے، تو اپنے محبوب فن کا ذکر اور تذکرہ اس کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اب سمجھئے کہ انسان کو اشرف المخلوقات بنانے والا کون ہے؟ اسے موزوں قد و قامت، حسین شکل وصورت، ذہنی اور دماغی صلاحیتیں جن سے وہ کائنات کو مسخر کرنے کے قابل ہوا، کس نے دیں؟ اللہ نے۔ تو بس جو شخص کائنات کی اس اشرف صنف یعنی بشریت سے تعلق رکھتا ہے اس کا سب سے بڑا محسن اللہ تبارک وتعالیٰ ہے اور محسن کے سامنے اظہارِ نیازمندی اخلاق کی ایک معروف خوبی ہے۔ محسن کے ساتھ محبت اور لگاؤ فطرتِ سلیمہ کا مسلمہ تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص انسانیت سے عاری نہ ہو تو اللہ کے ساتھ اس کی انتہائی محبت عالمگیر سچائی کا درجہ رکھے گی۔ اسی حقیقت کو قرآن شریف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان والے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت اللہ کے ساتھ ہے۔ دیکھئے سورۃ البقرۃ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ
وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۶۵)

''اور بعض لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اَوروں کو۔ ان سے محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی، اور ایمان والوں کو اس سے کہیں زیادہ ہے محبت اللہ سے''۔

ظاہر ہے کہ خدا کی محبت اسی کو ہوگی جو حق شناس اور حقیقت آشنا ہوگا۔ پھر انبیائے کرام ﷺ فہم وبصیرت، عقل وسمجھ، حق شناسی اور حقیقت آشنائی کی معراج پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی محبت کا مرکز ومحور ذاتِ الٰہی اور دن رات کا وظیفہ ذکرِ الٰہی ہوتا تھا۔ چونکہ انبیاء ورُسل مقصدِ حیات سے آگاہ تھے اسی لیے انہوں نے نہ صرف خود اللہ کے ذکر کو ہمہ وقت کا معمول بنایا بلکہ نصح و خیرخواہی کے جذبے کے تحت تمام انسانوں کو بھی ذکرِ الٰہی کی طرف دعوت دی۔ ایک شخص کو جس چیز کی معرفت ہوگی وہی اس کی قدر کر سکے گا ع قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری!

ایک ہی چیز کی مختلف اشخاص کے ذہنوں میں قدر و قیمت مختلف ہو گی' یعنی افراد کو اس شے کی معرفت کے تناسب سے ہی قدر ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت سب سے زیادہ انبیاء و رُسل کو ہوتی ہے' چنانچہ وہی اس عظیم الشان ہستی کے صحیح قدر دان ہوتے ہیں اور ہمیشہ ذکر الٰہی میں مشغول نظر آتے ہیں۔

چونکہ انسان کا محسنِ اعظم اللہ تبارک و تعالیٰ ہے لہٰذا شدید ترین محبت اسی کا حق ہے۔ اگر کوئی شخص محسنِ حقیقی کو چھوڑ کر شدید ترین محبت کا حق کسی دوسرے کے لیے تسلیم کرتا ہے تو یہ سب سے بڑی حماقت ہے اور اسی کو شرک کہتے ہیں اور یہ بدترین گناہ ہے جو اللہ کے غضب کو بھڑکاتا ہے۔ دنیا میں ہم صاحبِ کمال لوگوں سے ان کی صلاحیتوں کے مظاہرے پر متأثر ہوتے ہیں اور ان کی محبت اور کشش کا پیدا ہو جانا بھی فطری امر ہے' مگر یہ حقیقت کبھی نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ ان صاحب کمال لوگوں کی یہ صلاحتیں اسی خدائے واحد کی عطا کردہ ہیں جس کے قبضہ میں عزت دینا اور ذلت دینا ہے۔ یہ صلاحیتیں کسی کی ذاتی نہیں ہیں' بلکہ خدا کی عطا کردہ ہیں۔ وہ کسی کو صلاحیت دے بھی سکتا ہے اور چھین بھی سکتا ہے۔ اگر یہ حقیقت انسان کو مستحضر رہے تو اس کے جادۂ حق سے بھٹکنے کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔

اللہ کا ذکر روح کی غذا اور قلب کی تسکین ہے۔ اس کی لذت سے وہی شخص آشنا ہے جسے اس کا تجربہ ہے۔ ذکر اللہ کا سب سے بڑا مظہر خود قرآن پاک یعنی کلامِ الٰہی ہے' اسے ''الذکر'' کہا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۃ الحجر:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ﴾

''بے شک ہم نے ہی اس ذکر (یعنی قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

گویا قرآن پاک سراسر ذکر ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان قرآن کی عظمت کے کما حقہ قائل تھے۔ ان کے ہاں بہترین مشغولیت قرآن کا سیکھنا اور سکھانا تھا۔ بخاری شریف میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهُ))

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن کا علم حاصل کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے''۔

یہی قرآن سینوں کی بیماریوں یعنی اخلاقی کمزوریوں کا علاج ہے۔ دیکھئے سورۂ یونس:

﴿يَاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾

''اے لوگو تمہارے پاس نصیحت آئی ہے تمہارے ربّ کی طرف سے اور یہ شفا ہے اس کے لیے جو سینوں میں ہے اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے''۔

نیز دیکھئے سورۂ بنی اسرائیل:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (آیت ۸۲)

''اور ہم نے اتارا قرآن جو شفا اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔''

اللہ کے ذکر سے طمانیتِ قلبی نصیب ہوتی ہے۔ دیکھئے سورۃ الرعد:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں ان کے دل اللہ کی یاد سے۔ سنتا ہے! اللہ کی یاد سے ہی چین پاتے ہیں دل۔''

علاوہ ازیں سنن بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بنی آدم کے قلوب پر اسی طرح زنگ چڑھ جاتا ہے جس طرح پانی لگ جانے سے لوہے پر زنگ آ جاتا ہے''۔ عرض کیا گیا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم! دلوں کے اس زنگ کے دور کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''موت کو زیادہ یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت!''

بات ہو رہی ہے اللہ کے ذکر کی۔ تو قرآن میں نماز کو بھی اللہ کا ذکر کہا گیا ہے۔ دیکھئے سورۂ طٰہٰ:

﴿اِنَّنِيْ اَنَا اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنَا فَاعْبُدْنِيْ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ﴾

''بیشک میں اللہ ہوں' کوئی معبود نہیں سوائے میرے' پس میری عبادت کرو اور قائم کرو نماز میرے ذکر کے لیے۔''

قرآن پاک میں ہے کہ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہو۔ دیکھئے سورۃ النساء:

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ﴾ (آیت ۱۰۳)

''اللہ کا ذکر کرو کھڑے' بیٹھے اور اپنے پہلوؤں کے بل لیٹے۔''

ترمذی شریف کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے ذکر اللہ کو ''افضل الاعمال'' فرمایا ہے:

''حضرت عبداللہ بن بسرؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا: یارسول اللہ! آدمیوں میں کون بہتر ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''جن کی عمر زیادہ ہو اور عمل اچھے ہوں''۔ پھر اس نے پوچھا: اعمال میں کون سا عمل بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ کہ تم دنیا سے رخصت ہو اور اس وقت تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو''۔

ظاہر ہے کہ یہاں زبان کے ذکر ہی کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔

اللہ کے ذکر یعنی اس کی حمد وثنا کے لیے موزوں ترین کلمات کون سے ہیں؟ اوّل تو قرآنی آیات ہیں جو ذکر کا اوّلین مصداق ہیں' کیونکہ قرآن تو ہے ہی الذکر' دوسرے وہ جملے جو حدیث کی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے تعلیم کردہ ہیں' اصلاً وہ بھی آیاتِ قرآنی سے ماخوذ ہیں' مثلاً تسبیح' تحمید' تمجید' تکبیر' تہلیل' استغفار وغیرہ۔

جہاں تک اوقاتِ ذکر کا تعلق ہے تو ذکر الٰہی کے لیے ہر وقت موزوں ہے' البتہ خصوصی طور پر صبح وشام کے اوقات اور فراغت کا کوئی بھی وقت مناسب ہے۔ جس طرح ہر کام کے لیے کچھ پیشگی شرائط ہوتی ہیں جو اس کام کے مثبت نتائج کے لیے لوازم کا درجہ رکھتی ہیں اسی طرح ذکر اللہ کے لیے بھی کچھ لوازمات ہیں۔ اوّل زندگی کے معمولات معصیت سے پاک ہوں' یعنی خشیت الٰہی کا عنصر اقوال وافعال میں نمایاں ہو۔ دوم رزق حلال کا اہتمام اور آخری بات یہ کہ ذکر اللہ میں خلوص ہو اور یہ معمولی سی ریاکاری اور ادنیٰ سی نمائش سے بھی پاک ہو اور اس کا مقصد صرف حصولِ رضائے الٰہی ہو اور بس!

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ

بدعت کا لفظی معنی نئی چیز' ایجاد اور انوکھے کے ہیں' لیکن اسلامی اصطلاح میں یہ لفظ ایسے امور پر بولا جاتا ہے جو دین میں نئے نکالے گئے ہوں۔ اُمور دین میں ہر قسم کے اضافے کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی دُنیوی زندگی کے آخری ایام میں تکمیل و اتمامِ دین کی خوشخبری سنا کر یہ بات بالکل واضح کر دی گئی کہ اُمور دین میں اب کسی قسم کی کوئی خامی باقی نہیں رہی' بلکہ دین تکمیل اور اتمام کے درجے کو پہنچ چکا ہے۔ مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ درجۂ کمال صرف ایک ہی ہوتا ہے جو کمی بیشی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح کمی درجۂ کمال میں نقص پیدا کرتی ہے اسی طرح اضافہ بھی قصور پیدا کرتا ہے' کیونکہ جس شے میں اضافے کو قبول کرنے کی گنجائش موجود ہو وہ کامل نہیں ہو سکتی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

> ''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے پس وہ مردود ہے''۔ (رواہ بخاری و مسلم)

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ پیش بندی نہ کی جاتی تو دین مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا اور اس میں تکمیلی شان بھی باقی نہ رہتی' جو چاہتا حسن و خوبی کے نام پر اس میں اضافہ کرتا اور یہ اضافے اصل دین کا اسی طرح حلیہ بگاڑ دیتے جس طرح یہود و نصاریٰ نے تورات و انجیل کی تعلیمات کا ستیاناس کیا۔

دین کا پورا نظام عہد رسالت کے آخری ایام میں جاری و ساری ہو گیا اور پھر خلافت راشدہ کے دور میں بھی رائج رہا۔ اگر دورِ صحابہؓ میں چند چیزیں دین میں اضافہ معلوم ہوتی ہیں تو ان کی حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے باہمی مشورے سے کسی کام کو منشأ رسالت سمجھا اور یہ بھی جانا کہ عہد رسالت میں اس کی ترویج میں کیا چیز حائل تھی؛

چنانچہ اس کو رائج کیا۔ ایسے امور کو اوّل تو ہم اس لیے بدعت نہیں کہتے کہ صحابہ کرامؓ مزاج شناسِ رسول تھے۔ یہ بات محال ہے کہ وہ کسی بدعت پر اجماع کرتے۔ دوم اس لیے کہ خود رسول پاک ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریق کار کو اپنی سنت اور اُمت کے لیے قابلِ تقلید قرار دیا ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو اختیار کرنا لازم ہے۔ مثال کے طور پر تراویح کا نظام نہ عہد رسالت میں رائج تھا اور نہ ہی عہد صدیقی میں۔ مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں نماز تراویح کا نظام قائم کر دیا جس پر تمام صحابہ کا اجماع ہوا اور کسی نے مخالفت نہ کی اور اُمت نے اس کو سنت کے طور پر اپنایا۔ نظامِ تراویح کی ترویج کے ضمن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے یہ بات بالکل واضح تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رمضان شریف کی راتوں میں عبادت نہایت پسندیدہ ہے' نیز یہ کہ نظامِ تراویح کے قیام سے آنحضرت ﷺ کو اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہ عبادت اپنی عظمت کی وجہ سے فرضیت کے درجے میں آ جائے گی اور یہ بات اُمت کے عام افراد پر بھاری ہوگی۔ دورِ رسالت کے اختتام پر سلسلۂ وحی بند ہو جانے کے باعث رمضان کی راتوں کے قیام کا فرض ہونا ممکن نہ رہا تو امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جملہ صحابہ کرامؓ کے مشورے سے رسول پاک ؐ کی پسندیدگی کے باعث اور حصولِ رضائے خداوندی کے لیے نظامِ تراویح کو رائج کر دیا۔ وگرنہ عہد صحابہ میں بدعت کی روک تھام کا پورا انتظام کیا گیا اور کسی ایسی بات کو دین میں داخل نہ ہونے دیا گیا جس کی نظیر عہد رسالت میں نہ ملتی ہو۔ کیونکہ اس ضمن میں جب لوگوں نے بیعت رضوان والے ببول کے درخت کا احترام کرنا اور زیارت کے لیے جانا شروع کر دیا تو حضرت عمر فاروق ؓ نے اس درخت کو جڑوں سمیت اُکھاڑ پھینکا کہ مبادا اس طرح کوئی بدعت رواج پا جائے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''سب سے بہتر بات خدا کی کتاب اور بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے' اور بدترین کام وہ ہیں جن کو دین میں نیا نکالا گیا ہو' اور ہر بدعت (یعنی دین میں نئی

نکالی ہوئی چیز) گمراہی ہے''۔ (رواہ مسلم)

جولوگ بدعت کی برائی میں لچک پیدا کرتے ہیں اور حسنِ ظن اور حسنِ نیت کی دلیل پیش کرتے ہیں ان کا خیال صحیح نہیں' کیونکہ بدعت تو کہتے ہی اس کام کو ہیں جو دین کا کام سمجھ کر اور حصولِ رضائے الٰہی کے لیے اختیار کیا جائے' لیکن اس کی مثال سنت میں نہ ملتی ہو۔ کیونکہ دین میں نئی چیز کا اطلاق اس چیز پر تو ہو نہیں سکتا جس میں فی نفسہٖ برائی موجود ہو۔ بلکہ برائی کی تو دین میں سرے سے گنجائش ہی نہیں رکھی گئی۔ البتہ بزعمِ فکر انسانی دین میں اچھائی کے اضافے کا امکان موجود تھا جسے آنحضرت ﷺ نے پوری صراحت کے ساتھ ختم کر دیا' تا کہ دین اپنی اصلی صورت میں اور تکمیلی شان کے ساتھ قائم رہے۔

اسلامی ممالک میں عام طور پر اور برصغیر میں خاص طور پر جن بدعات کو اختیار کیا گیا ہے' ان کے پیچھے بھی حبِ رسولؐ اور حصولِ رضائے الٰہی کے جذبے کا دعویٰ کیا جاتا ہے' لیکن اس بات کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ حبِ رسول اور رضائے الٰہی کی بہترین صورت تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار کر رکھی تھی۔ اگر حبِ رسولؐ اور حصولِ رضائے الٰہی کے کچھ تقاضے ان بدعات کو اپنا کر پورے کیے جا رہے ہیں جو صحابہ کے دور میں رائج نہ تھیں تو اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسلام میں نعوذ باللہ خامی لازم آتی ہے جو محال ہے' کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے طرزِ عمل کو نبی پاک ﷺ نے قابلِ اعتماد جانا ہے اور خدائے بزرگ و برتر نے اس طائفہ کی تعریف کی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حبِ رسولؐ اور دینی استقامت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے چھوٹی سے چھوٹی سنت کو مضبوطی سے پکڑا اور عملاً اختیار کیا۔ انہوں نے پوری زندگی قرآن وسنت کے مطابق بسر کی' البتہ حبِ رسول اور دینی استقامت کی نمائش کے لیے جلوس اور میلاد کی محافل منعقد نہ کیں۔ ذکرِ نبیؐ تو خود خدا نے بلند کر دیا جو عہدِ رسالت' عہدِ صحابہ اور موجودہ دور میں بھی بلند ہی ہے اور بلند رہے گا' لیکن اگر بلند بانگ نعروں' بے ہنگم اجتماعات' پر از تعصب مجالس اور نمائشی جلسوں سے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کا تقاضا پورا ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تقاضا نہ عہدِ رسالت میں پورا ہوا نہ عہدِ صحابہ میں۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ استقامت فی الدین کے

تقاضے جس طرح جماعت صحابہؓ نے پورے کیے وہی جامع اور مکمل ہیں۔ آج بھی اگر حبِ رسولؐ اور رضائے الٰہی کے جذبہ کے تحت بدعات کو رواج دینے والے لوگ اپنے دیگر امور میں تابع سنت نظر آئیں تو ان کے جذبے کو حسنِ ظن کے تحت لانے کا جواز پیش کیا جا سکتا ہے' لیکن جب ان نمائشی محافل میں اکثریت بے عمل بلکہ بدعمل لوگوں کی ہوتی ہے جو نماز کی پابندی' وعدے کی پاسداری' اخلاق کی بلندی' کسب رزقِ حلال کی اہمیت سے بھی بے خبر ہوتے ہیں تو ایسے لوگوں کو کسی نمائشی جلوس میں نعرے لگاتے دیکھ کر اللہ کا نبیؐ اور خود خدائے علیم وخبیر تو دھوکہ نہیں کھا سکتے' البتہ بے شعور لوگوں میں وہ اپنے عاشقِ رسول ہونے کا رعب جما سکتے ہیں۔

اصل بات تو یہ ہے کہ دین میں شامل تمام امور کے تقاضے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بطریق احسن پورے کر دیے اور اُمت کی راہنمائی کر دی۔ اب دین میں کسی امر کا اضافہ خواہ وہ کتنی ہی حسن نیت اور حصولِ رضائے الٰہی کے لیے ہو' قابل قبول نہیں۔ قرآن پاک کی سورۃ الحدید کے آخری رکوع میں مذکور ہے کہ نصاریٰ نے گناہوں سے بچنے اور حصولِ رضائے الٰہی کی خاطر ترکِ دنیا کی بدعت اختیار کی جو اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم نہ کی تھی' چنانچہ وہ اس کو نباہ نہ سکے۔ معلوم ہوا کہ گناہوں سے بچنے اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے وہ کوشش اور طرزِ عمل بھی بدعت ہے جو شارع نے دین میں شامل نہ کیا ہو۔ اگرچہ گناہوں سے بچنا اور حصولِ رضائے الٰہی امر محمود ہے' مگر کوئی بات بھی محمود نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا طریقہ تعلیماتِ نبویؐ کے مطابق نہ ہو۔ تین دن کے بھوکے کو روزے کا ثواب نہ ملے گا مگر سنت نبویؐ کے مطابق چند گھنٹے کا روزہ مقبول ومبرور اور کارِ ثواب ہوگا۔

حدیث پاک میں بار بار کتاب وسنت پر انحصار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''پس تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ اختلافِ کثیر دیکھے گا۔ ایسی حالت میں تم پر لازم ہے میرے اور میرے خلفائے راشدین المہدیین کا

طریقہ۔تم اس کے ساتھ چمٹ جاؤ اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑے رہو۔ اور تم دین میں نئی باتیں پیدا کرنے سے بچو اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔ (رواہ ابوداؤد و ترمذی)

حبِ رسول اور حصولِ رضائے الٰہی کا مسنون طریقہ تو یہ ہے کہ اُسوۂ حسنہ کو اپنایا جائے۔ اظہارِ دین کے پیغمبرانہ مشن کو پورا کرنے میں کوشش کی جائے۔ مسلمانوں میں اتفاق و اتحاد پیدا کر کے ناقابلِ شکست قوت بنا دیا جائے۔ اگر یہ بات نہیں ہے تو تمام نمائشی اور اضافی امور بے معنی اور فریبِ محض ہیں کیونکہ اگر ہم حبِ رسول اور استقامت چاہتے ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل سے اچھی مثال کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔

دین اسلام خالق کائنات کا مرتب کردہ دین ہے اور انسانوں کے لیے ہے جنہیں خود اس علیم و خبیر نے بنایا ہے لہٰذا اس دین کا کامل ہونا واضح ہے اگر غور کیا جائے تو اس کی ہر بات میں تکمیلی شان نظر آتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے دوسرے ادیان باطلہ کی کسی چیز کو اخذ نہیں کیا بلکہ دوسرے ادیان اور نظاموں نے دین اسلام سے بہت سی باتیں اخذ کیں لیکن یہ دین اسلام کے پیروکاروں کا زوال اور دین کی تکمیلی شان سے بے خبری ہے کہ ان کو دوسرے نظاموں میں حسن اور کشش نظر آنے لگی۔ برصغیر میں ہندو اور مسلمان سینکڑوں سال ساتھ ساتھ رہے۔ ہندو اپنے ایک تہوار پر اپنی عمارات پر روشنی کرتے تھے مسلمانوں نے بھی ایک تہوار ایجاد کر لیا اور اپنی عمارتوں پر چراغاں کے علاوہ آتش بازی کا مظاہرہ بھی کرنا شروع کیا وہ یہ بات بھول گئے کہ دین اسلام تو فضول خرچی اور ریاکاری (نمود و نمائش) سے روکتا ہے۔ عیسائیوں نے یومِ ولادتِ مسیحؑ پر جشن کا اہتمام کیا مسلمانوں نے ان کی نقالی کی اور لغویات میں نصاریٰ کو پیچھے چھوڑ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح عیسائیوں نے جذبہ فراریت کے تحت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات کو چھوڑ کر نمائش محبت رسول پر اکتفا کیا' اسی طرح مسلمان بھی کتاب و سنت کے احکام کی پیروی چھوڑ کر ناقص مسلمان ہو گئے تو اس نقص کو چھپانے کے لیے وہ بھی نمائشی اظہارِ محبت کے ذریعے بدعملی کے باوجود بزعمِ خویش اتقیاء و اصفیاء بن رہے ہیں۔

دین اسلام کی تعلیم تو یہ تھی کہ رسول پاکؐ کے طریقوں کو اپنایا جائے اور آپؐ کے اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی زندگیوں کے مطابق طرزِ عمل اختیار کر کے صحت مند اسلامی معاشرہ استوار کیا جائے لیکن سہل انگاری، غفلت، سستی، کم ہمتی اور ضعف ایمان نے اصل سے توجہ ہٹا کر خود ساختہ رسوم کی پیروی پر آمادہ کر دیا۔ اور چند نمائشی طریقوں سے حصول مقصد کی موہوم اُمید پیدا کر دی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے جسے حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

''جس شخص نے میری اُمت کے بگڑنے کے وقت میری سنت کو اپنا راہنما بنایا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا''۔ (مشکوٰۃ)

بدعات کے خوگر لوگوں پر جب بدعات کی مذمت واضح کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں اگر نئی چیزیں مثلاً عینک، لاؤڈ سپیکر، ہوائی جہاز، جدید طرزِ تعمیر کو اختیار کرنا جائز ہے تو گیارہویں شریف، عرس اور تعزیے، محافل میلاد کیوں ناجائز ہوئیں جبکہ ان میں انفاق فی سبیل اللہ اور درود و سلام بھی ہوتا ہے لیکن یہ بات کہتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ دین میں نئی چیز بدعت ہوتی ہے مگر دنیا کی نئی چیزیں ایجادات کہلاتی ہیں جن سے فائدہ اٹھانا جائز ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ جب معروف سیاسی، سماجی، مذہبی اور قومی راہنماؤں کی سالگرہ منائی جا سکتی ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد منانے میں کیا حرج ہے تو یہاں بھی غلط فہمی واضح ہے کہ سیاسی اور قومی اہمیت کی شخصیات کے نام اور کارناموں کو زندہ رکھنے کے لیے ہم ان کی یاد میں ایام مناتے ہیں اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو ان نامور ہستیوں کے معدوم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ان لوگوں سے مختلف ہے کیونکہ آپؐ کے ذکر کی بلندی اور دوام کا خودکار نظام خالق کائنات نے دنیا میں جاری فرما دیا ہے لہٰذا اس بات کی حاجت ہی نہیں رہی کہ مصنوعی طریقوں سے آپؐ کے ذکر کو بلند کیا جائے بلکہ ایسا کرنے سے حسن نیت کے باوجود منفی نتائج برآمد ہونا لازمی ہیں کیونکہ دیگر شخصیات کے ساتھ ہمارا جو تعلق ہے وہ محض دنیاوی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو تعلق ہے وہ سراسر دینی ہے اور دینی تعلق کے تقاضے دنیاوی تقاضوں سے

مختلف ہیں۔ اس فرق کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ کمالِ محبت کے باوجود خلافت راشدہ میں کبھی ربیع الاول کے مہینے میں ذکر رسول کی خاطر اجتماعی محافل میلاد کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

بعض لوگ نفلی نوعیت کی عبادات کو مستقلاً اختیار کر لیتے ہیں' اس حد تک تو یہ بات مستحسن ہے' لیکن جب اپنے نفلی معمولات کو پوری اُمت پر لازم قرار دینے کی کوشش کی جائے اور اختیار نہ کرنے والوں کو مطعون کیا جائے تو یہ امر بدعت کہلاتا ہے' کیونکہ یہ دین میں نئی بات ہے۔ پوری اُمت کے لیے عبادات اور وظائف کو لازم قرار دینا صرف پیغمبر خدا کا منصب ہے۔ مذکورہ عمل اختیار کرنے والے یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے اختیار سے تجاوز کر کے پیغمبر کی حیثیت اپنا رہے ہیں جو شرک فی الرسالت کا ارتکاب ہے۔

خود رحمۃٌ للعالمینؐ کا اُسوہ یہ ہے کہ آپؐ نے اپنے نفلی معمولات اُمت پر واضح تو فرما دیے لیکن لازم نہ کیے' بلکہ اختیاری رکھے' تاکہ اُمت پر بوجھ نہ ہو۔ تو آج کون شخص پوری اُمت کے لیے کوئی نیا عمل تجویز کر کے رائج کر سکتا ہے؟

آج کے دور میں بدعات کو ختم کر کے صحیح اسلامی طرزِ زندگی اپنانے کی ضرورت ہے۔ پس سنت کے احیاء میں جس قدر محنت ہو سکے' کرنی چاہیے۔ یہی طریقہ حصولِ حبِ رسولؐ کے لیے مستند اور مجرب ہے۔

❁ ❁ ❁

مقامِ رسالت اور اس کے تقاضے

محاورہ ہے کہ ''گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی'' اگر تجھے لوگوں کے مقام و مرتبے میں فرق نہیں تو تُو حق شناس نہیں ہے۔ یعنی لوگوں کے منصب اور حیثیت سے واقف ہونا ضروری ہے تاکہ حقوق کی ادائیگی بطریق احسن ہو سکے۔ والدین کے حقوق وہی شخص پورے طور پر ادا کر سکے گا جو والدین کی عظمت سے آگاہ ہوگا۔ اسی اصول کی وضاحت ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ ''قدرِ زر زرگر بداند قدرِ جوہر جوہری''۔ یعنی سونے کی قدر اسی کو ہوگی جو سونے کی شناخت رکھتا ہو' اسی طرح جواہرات کی قیمت تو جواہر شناس ہی لگا سکتا ہے۔ ہم اپنے استاد کو راہ چلتا دیکھتے ہیں تو ادب کے ساتھ اس کے سامنے جھک جاتے ہیں' مگر اسی اُستاد کے پاس سے سینکڑوں دوسرے لوگ بغیر ادب آداب کے گزر جائیں گے' کیونکہ وہ اس کو پہچانتے نہیں۔ پس بادنیٰ تأمل یہ بات سمجھ میں آجاتی ہے کہ جب ہم کسی شخص کے مقام و مرتبہ سے واقف نہ ہوں گے تو اس شخص کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت ہم کیسے متعین (determine) کریں گے؟ چنانچہ مقامِ رسالت سے آگاہی ہر مسلمان پر لازم ہے تاکہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنا تعلق صحیح بنیادوں پر استوار کر سکے۔

سادہ انداز میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص کلمہ طیبہ پڑھ لیتا ہے اس پر مقامِ رسالت تو واضح ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ بات کچھ تشریح طلب ہے' کیونکہ مسلمانوں میں بہت سوں کو رسول اللہ ﷺ کی شرعی حیثیت اور مقام و مرتبہ کے متعلق کئی طرح کی غلط فہمیاں ہیں۔ جب تک وہ غلط فہمیاں دور نہ ہوں اور مقامِ رسالت سے آگہی نہ ہو حقوق کی ادائیگی کماحقہٗ کیسے ہو سکتی ہے!

اطاعت

حضرت محمد ﷺ کی ممتاز ترین حیثیت اللہ کے رسول کی ہے۔ اللہ نے آپ کو برگزیدہ کیا' وحی کے ساتھ سرفراز کیا' منصبِ رسالت پر مأمور کیا اور لوگوں پر آپؐ کی اطاعت لازمی قرار دی' بلکہ رسول کی اطاعت کو خود اللہ کی اطاعت قرار دیا:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء: ۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔''

رسول ﷺ کے علاوہ یہ کسی کا منصب نہیں۔ ماں باپ کا بہت بڑا درجہ ہے لیکن وہ بھی رسولؐ کے حکم کے تابع ہے۔ اگر وہ بھی کوئی ایسا حکم دیں جس کی رسول اجازت نہ دیتا ہو تو ان کا حکم بھی نہیں مانا جائے گا۔ اس کی وجہ بھی قرآن پاک میں بتا دی گئی کہ:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم)

''پیغمبر اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ صرف وہی کہتا ہے جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔''

جب رسول اللہ ﷺ کی زبان پر سراسر حق جاری ہے تو اُن کی اطاعت ربّ ہی کی اطاعت ہوئی۔ اسی لیے قرآن پاک میں اس مضمون کی بے شمار آیات موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ۝﴾ (محمد)

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور (بصورتِ دیگر) اپنے اعمال ضائع نہ کر دو''۔

سورۃ الشعراء میں متعدد رسولوں کا اپنی قوم سے یہ خطاب نقل ہوا:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝﴾

''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔

﴿وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ؕ﴾ (النور: ۵۴)

''اور اگر تم اس کی پیروی کرو گے تو ہدایت پالو گے''۔

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾

(النساء:۱۳)

''اور جس نے اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کی اللہ اسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے منہ موڑنے کے بھیانک نتائج سے بھی قرآن پاک میں جابجا خبردار کیا گیا ہے۔ دیکھئے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا ﴾ (النساء)

''اور جو کوئی خلاف کرے رسول کے بعد اس کے کہ اس پر ہدایت واضح ہو گئی اور پیروی کرے مسلمانوں کی راہ کے علاوہ کسی دوسری راہ کی تو ہم پھیر دیں گے اس کو جدھر کو وہ پھرا اور ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے' اور وہ بری جگہ ہے پھر جانے کی''۔

سورۂ محمد میں پیغمبر کی مخالفت کا انجام حبطِ اعمال بتایا گیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَاۗقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـــًٔا ۭ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴾

''بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور اللہ کی راہ سے روکتے رہے اور انہوں نے رسول کی مخالفت کی بعد اس کے کہ ان پر ہدایت واضح ہو چکی تھی وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے' البتہ وہ عنقریب ان کے اعمال ضائع کر دے گا''۔

جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے غافل رہے اور اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے روزِ محشر ان کی رسوائی دیدنی ہو گی' مگر اُس وقت ان کی آہ و زاری' اعترافِ گناہ' پشیمانی اور پچھتاوا کسی کام نہ آئیں گے۔ بالفاظِ قرآنی:

﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴾ (الاحزاب)

''جس دن پھیرے جائیں گے مُنہ اُن کے آگ کے اندر' کہیں گے اے کاش ہم نے فرماں برداری کی ہوتی اللہ کی اور اطاعت کی ہوتی رسول کی!''

پھر رسول اللہ ﷺ کا نافرمان روزِ قیامت اپنے ہاتھ کاٹے گا' افسوس کرے گا' مگر بے فائدہ۔ دیکھئے سورۃ الفرقان:

﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴾

''اور جس دن ظالم اپنے ہاتھ کاٹے گا' کہے گا اے کاش میں رسول کی ہمراہی اختیار کرتا''۔

ادب واحترام

جس ہستی کو اللہ کا فرستادہ' حق کا ترجمان اور واجب الاطاعت تسلیم کرلیا جائے تو اس کا ادب واحترام کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اگرچہ یہ بات ظاہر وباہر ہے تاہم خود ربّ کائنات نے اس کی اہمیت اجاگر کردی ہے' تاکہ لوگ اس ضمن میں کسی بے احتیاطی کا ارتکاب نہ کربیٹھیں۔ اگرچہ یہ مضمون قرآن پاک میں کئی جگہ آیا ہے لیکن سورۃ الحجرات میں اس سلسلہ کی راہنمائی واضح ترین صورت میں آئی ہے جہاں رسول اللہ ﷺ کے ہاں آنے والوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپؐ کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوکر آپؐ کو آواز نہ دیں' بلکہ کھڑے کھڑے انتظار کریں' اگر آپؐ خود تشریف لے آئیں تو مدعا بیان کرلیں' ورنہ واپس چلے جائیں۔ سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ۝ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ۝﴾

''یقیناً وہ لوگ جو حجروں کے باہر سے آپ کو آوازیں دیتے ہیں' ان میں بہت سے عقل سے عاری ہیں۔ اور اگر وہ رک جاتے یہاں تک کہ آپ خود نکل کر اُن کے پاس آجاتے تو یہ اُن کے لیے بہتر ہوتا' اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے''۔

پھر اسی سورۃ الحجرات میں رسول اللہ ﷺ کی محفل میں بیٹھنے والوں کو اس بات کا

پابند کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ان کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کریں اور جیسے وہ بلند آواز میں ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اس طرح چلا چلا کر آپؐ کو ہرگز نہ پکاریں۔ ورنہ اتنی سی بات سے ہی ان کے تمام اعمال اکارت چلے جائیں گے جبکہ وہ اس فعل کو معمولی سمجھ رہے ہوں گے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ﴾

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند مت کرو اور اُن سے اونچی آواز میں بات نہ کرو' جیسا کہ اونچی آواز میں تم ایک دوسرے سے بات کر لیتے ہو' بصورتِ دیگر تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تم کو خبر بھی نہ ہوگی''۔

یوں ایک مسلمان آپؐ کے ادب واحترام میں کوتاہی کا سوچ بھی نہیں سکتا اور نہ ہی آپؐ کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کر سکتا ہے جن سے ذرّہ برابر بھی ادب کے تقاضے میں فرق آتا ہو۔

محبت

رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر انسان کا محسن کون ہو سکتا ہے جن کے ذریعے سے دولت ایمان نصیب ہوئی جو بخشش کا وسیلہ بن جائے گی! پھر انہوں نے انسانوں کے سروں سے وہ بوجھ اتار کر انہیں ہلکا پھلکا کر دیا جو خود انہوں نے اپنے اوپر ڈال رکھے تھے۔ اس طرح انسانوں کو وہ دین یعنی طریق حیات نصیب ہوا جو فطرت کے انتہائی قریب اور انسانی نفسیات کو ملحوظ رکھے ہوئے ہے۔ اس میں آسانیاں ہیں' مشکلات نہیں:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرة:١٨٥)

''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لیے تنگی پسند نہیں کرتا''۔

یہ رسول اللہ ﷺ کا بہت بڑا احسان ہے۔ اس دین کی سادہ اور عام فہم تعلیمات پر عمل کرنا سہل بھی ہے اور مفید بھی۔ چنانچہ اس احسان کا تقاضا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ

انتہائی محبت کا تعلق رکھا جائے۔اگر چہ یہ بات بھی منطقی اور عام فہم ہے تاہم اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اس کی بھی وضاحت کر دی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حق لوگوں پر خود اُن کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ ہے:

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (الاحزاب:٦)

''بلاشبہ نبی (کا حق) تو ایمان والوں کے لیے ان کی اپنی جانوں پر بھی مقدم ہے''۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذات کو ہر مؤمن خود اپنے جسم و جان پر ترجیح دے گا اور مخلوق کے ہر فردِ بشر سے زیادہ محبت رسول اللہ ﷺ سے رکھے گا۔حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ)) (صحیح البخاری و صحیح مسلم)

''تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان والا نہیں ہو سکتا جب تک میں اسے اس کے بیٹے' باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب اور پیارا نہ ہو جاؤں''۔

ایک دفعہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ یقیناً مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں سوائے میری اپنی جان کے۔تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''نہیں' اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہاں تک کہ میں تمہیں تمہاری اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہو جاؤں (تب بات بنے گی)'' تو حضرت عمرؓ نے اپنا مزید جائزہ لینے کے بعد عرض کیا: ''یقیناً اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔تو آپؐ نے فرمایا: ((اَلْآنَ یَا عُمَرُ!)) یعنی اے عمر! اب تم مؤمن کامل بنے ہو! (صحیح البخاری و مسلم) چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے مقام و مرتبہ سے آگاہی کا تقاضا ہے کہ مسلمان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی محبت مخلوق کی ہر شے بلکہ خود اپنی ذات سے بھی زیادہ ہو۔یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے آپؐ کے اشارے پر اپنا جان و مال اور اولاد کو قربان کر دیا۔آج بھی مسلمانوں میں یہ جذبہ موجود ہے اور وقت آنے پر ہر مسلمان اپنی جان آپ ﷺ پر فدا کرنے کو سعادت سمجھتا ہے۔

اسلامی تاریخ اس قسم کے فدایانہ کارناموں سے بھرپور ہے۔

ختم نبوت

اللہ تعالیٰ جو اپنے بندوں پر مہربان ہے' انسانوں کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً پیغمبر بھیجتا رہا ہے۔ ہر پیغمبر کسی مخصوص خطے یا قوم کی طرف بھیجا جاتا۔ ایک وقت میں ایک سے زیادہ پیغمبر بھی زمین پر موجود رہے' مگر حضرت محمد ﷺ کو قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا:۲۸)

''اور ہم نے آپؐ کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

آپ ﷺ پر دین اسلام کی تکمیل کر دی گئی۔ اب اس ضابطۂ حیات میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اس دین میں کمی کرنا مذموم ہے اسی طرح اس میں ادنیٰ سا اضافہ بھی اس کی تکمیلی شان کو عیب دار ٹھہراتا ہے۔ اب کوئی دوسرا نبی بھی نہیں آئے گا اور نہ ہی وحی نازل ہوگی۔ آپؐ کی نبوت اب قیامت تک کے لیے ہے۔ اس حقیقت کو بھی قرآن میں واضح کر دیا گیا:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ ؕ﴾ (الاحزاب:۴۰)

''محمد (ﷺ) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں' لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں پر مہر''۔

اپنی زندگی میں رسول اللہ ﷺ نے کئی مرتبہ اس بات کو کھول کر بیان کیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس عنوان کی احادیث تفہیم القرآن' جلد چہارم' ص۱۴۰ تا ۱۴۴ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ میرے لیے تم ایسے ہو جیسے موسیٰ کے لیے ہارون تھے' لیکن (فرق یہ ہے کہ) میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا''۔

پس آج اگر کوئی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ کذاب ہے۔ جیسا کہ آپؐ نے اپنے بعد بہت سے نبوت کے جھوٹے دعوے داروں کی پیشین گوئی کی تھی۔ چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ آپؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے سارے کے سارے کذاب تھے اور اُن کے کردار و عمل میں پیغمبرانہ عصمت و عظمت کا کوئی نشان نہیں ملتا تھا' بلکہ قدم قدم پر اُن کا جھوٹ اور دروغ گوئی ظاہر تھی۔ ان میں سے اکثر نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو بھی تسلیم کیا مگر خود پر وحی آنے کے دعوے دار بھی ہوئے' لیکن کسی ایک کو بھی عالمِ اسلام میں پذیرائی نہ ملی' بلکہ ذلیل و خوار ہو کر مرے۔ اب قیامت تک کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الاّ اللہ محمدٌ رسول اللہ'' ہی رہے گا اور اسی کلمے کا اقرار کرنے والے اور دل سے یقین اور اعضاء و جوارح سے اس پر عمل کرنے والے ہی بالآخر فلاح سے ہم کنار ہوں گے۔ اس وحیٔ الٰہی کا اعلان رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرما دیا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا﴾ (المائدۃ:٣)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا''۔

پس مقامِ رسالت سے آگاہی کا تقاضا ہے کہ آپؐ کی رسالت کو اختتامی اور تکمیلی شان کے ساتھ مانا جائے اور آپؐ کے بعد کسی بھی قسم کی نبوت یا رسالت کو پوری قوت کے ساتھ مسترد کر دیا جائے۔ کیونکہ جب آخری زمانے میں عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے تو وہ نبی کی حیثیت سے نہیں آئیں گے' بلکہ رسول اللہ ﷺ کے اُمتی ہوں گے اور آپؐ ہی کا کلمہ پڑھیں گے۔

اُسوۂ حسنہ

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو تمام انسانوں کے لیے مثالی قرار دیا گیا ہے۔ جب ہم سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ طیبہ میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جسے ذرا سا بھی غیر معیاری قرار دیا جا سکے۔ کوئی ایسی اخلاقی خوبی نہیں ہے جو آپؐ کے کردار

میں نہ پائی جاتی ہو اور کوئی ناپسندیدہ بات ایسی نہیں ہے جس کا صدور کبھی آپؐ کی ذات سے ہوا ہو۔ زندگی میں پیش آنے والے تمام نشیب و فراز سے آپؐ گزرے ہیں مگر ہر قسم کے حالات میں آپؐ کا طرزِ عمل مثالی رہا۔ انتہائی خوشی کے لمحات میں بھی رسول اللہ ﷺ کبھی معیار سے فروتر نہیں ہوئے اور اسی طرح کبھی غصے کی حالت میں بھی آپؐ سے غیر معیاری انداز نہیں دیکھا گیا۔ آپؐ نے غریبوں کے لیے نمونہ چھوڑا کہ نادار اور مفلس لوگ بھی پریشان ہو کر ناشکری کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں۔ کئی کئی دن آپؐ کے ہاں چولہا نہ جلتا تھا۔ امیروں اور دولت مندوں کے لیے آپؐ کی زندگی مشعلِ راہ ہے کہ ایک وقت وہ بھی آیا کہ عرب کی دولت آپؐ کے قدموں میں آپڑی اور آپؐ مدینہ کی ریاست کے سربراہ ہو گئے' مگر اس حال میں بھی آپؐ نے عیش و عشرت کا انداز نہیں اپنایا بلکہ انتہائی سادہ زندگی اختیار کی اور دولت کو اپنی ذات پر خرچ کرنے کی بجائے ضرورت مندوں میں تقسیم کیا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ آپؐ کی پیاری بیٹی فاطمہؓ نے آپؐ سے ایک خادم کا مطالبہ کیا تو آپؐ نے انہیں خادم تو نہیں دیا البتہ تسبیحاتِ فاطمہ کے الفاظ سکھا دیے کہ یہ غلام و کنیز سے بہتر ہیں۔ آپ ﷺ نے مظلومیت کے دن بھی گزارے جن میں ہر دَور کے مظلومین کے لیے حوصلہ مندی اور ثابت قدمی کی تعلیم ہے' کیونکہ آپؐ نے اور آپؐ کے باصفا ساتھیوں نے نہایت صبر و ثبات کے ساتھ مکی زندگی میں ہونے والے مظالم کو برداشت کیا۔

پھر ایک وقت آیا کہ رسول اللہ ﷺ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے جہاں سے آپؐ کو نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا' مگر اب بھی آپؐ جذبۂ شکر و امتنان کے ساتھ اپنے ربّ کے حضور سجدہ ریز تھے۔ آپؐ کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے جنہوں نے آپؐ کے ساتھ بدسلوکی کی انتہا کر دی تھی' آپؐ کے سامنے دست بستہ کھڑے تھے۔ آپؐ جس طرح چاہتے ان سے انتقام لے سکتے تھے مگر آپؐ نے فرمایا: ''جاؤ تمہیں معاف کیا' آج تم سے کوئی بدلہ نہیں لیا جائے گا''۔ بطورِ سپہ سالار آپؐ نے کئی عسکری مہمیں اختیار کیں مگر تاریخ گواہ ہے کہ کسی لڑائی کے موقع پر آپؐ نے نہ تو کسی بوڑھے'

بچے اورعورت پر ہاتھ اٹھانے دیا اور نہ ہی پرامن دشمن کونشانہ بنایا' بلکہ مقابلہ پرآنے والے جنگجوؤں کے ساتھ ہی لڑائی کی اور فتح حاصل ہونے پرقیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وہ مثالیں قائم کیں کہ قیدیوں نے اس قیدکوآزادی پرترجیح دی۔

رسول اللہ ﷺ کرسیٔ عدالت پر بیٹھنے والوں کے لیے بھی مثالی شخصیت تھے۔آپؐ نے عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرتے وقت اپنے پرائے' دوست دشمن' امیرغریب کی تفریق ختم کردی۔حسب ونسب اور جاہ ومنصب کا بھی کوئی خیال نہ رکھا' بلکہ بےبس اور کمزورکواس کاحق دلایا۔صاحب جاہ ومنصب کودوسروں پرزیادتی سے روک دیا۔ جب بنی مخزوم قبیلے کی ایک عورت پرچوری ثابت ہوئی اوراس کوسزا سنائی گئی تولوگوں نے آپؐ کے چہیتے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کوآپؐ کے پاس سفارش کے لیے آمادہ کر لیا۔جب انہوں نے آپؐ کے سامنے مخزومی عورت کی سزامعاف کرنے کوکہاتوآپؐ نے فرمایا:''اگرمیری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا''۔(رواہ البخاری ومسلم)

عبادت گزاروں کے لیے بھی آپؐ کےنقوش قدم راہنما تھے۔آپؐ نے ہرجگہ عمل میں اعتدال کواختیار کیااوراُمت کے لیے پسندکیا۔جن لوگوں نے ارادہ کیا کہ وہ گناہوں سے بچنے کی خاطر بیوی بچوں کے چکر میں پڑنے کی بجائے تجرد کی زندگی اختیارکریں گے'اسی طرح ساری ساری رات نمازیں پڑھیں گےاور ہمیشہ روزہ رکھیں گےتو آپؐ نے ان کواس طرزِعمل سے یہ کہہ کرروک دیا کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے: نکاح میری سنت ہے' میں رات کوعبادت کے لیے جاگتا بھی ہوں' آرام بھی کرتا ہوں' نفل روزے رکھتا بھی ہوں اورچھوڑتا بھی ہوں۔ ہرشخص پراُس کے اپنے نفس کا بھی حق ہے' اسے بیوی بچوں کے حقوق اداکرنے بھی ضروری ہیں اورمعاشرے کے دوسرےافراد کاخیال بھی رکھنا ہے۔گویاآپؐ نے زندگی بھرپورانداز میں بسرکرنے کا نمونہ چھوڑا ہے۔

سربراہِ خانہ کی حیثیت سے بھی آنحضور ﷺ کی زندگی مثالی ہے۔آپؐ کی ازواجِ

مطہرات انتہائی عسرت کی زندگی میں بھی آپؐ سے خوش تھیں۔ آپؐ اپنی ازواجِ مطہرات' اولاد اور خادموں کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ ڈانٹنا ڈپٹنا آپؐ کے مزاج میں نہ تھا' بلکہ ہر فرد آپؐ کے حسنِ سلوک سے متاثر تھا۔

الغرض ہر شخص کے لیے آپ ﷺ کی زندگی مشعلِ راہ ہے۔اسی لیے خالق کائنات نے ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (بے شک رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے) فرما کر تمام انسانوں کو آپؐ کی پیروی کی ہدایت کی۔

بشریت

رسول اللہ ﷺ اولادِ آدم میں سے ایک فرد تھے۔ آپؐ مخلوقِ خدا میں سب سے اونچے مقام پر فائز تھے۔ آپؐ امام الانبیاء ہیں۔تمام نبی انسان تھے اور انسان اشرف المخلوقات ہے۔پس جو ہستی پوری کائنات میں اعلیٰ مقام پر ہوگی وہ بھی انسان ہی ہوگی۔ دوسرے انبیاء کی طرح انسانی کمزوریاں آپؐ کے ساتھ بھی تھیں۔ آپؐ خوشی کے موقع پر خوش ہوتے تھے' ناخوشگوار صورت حال میں ناراض ہوتے تھے۔کبھی کبھی آپؐ بیمار بھی ہوئے ہیں۔آپؐ کو زخم آئے اور آپؐ نے درد کی اذیت محسوس کی۔بھوک اور پیاس کی تکلیف بھی آپؐ محسوس کرتے تھے۔ دشمنوں کے مظالم' چیرہ دستیاں' طعن و تشنیع اور الزام تراشی آپؐ کے دل کو آزردہ کرتی تھی۔اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی پیدائش پر آپؐ نے خوشی کا اظہار کیا اور اُن کی وفات پر آپؐ سخت غمگین ہوئے ہیں۔

ان ساری کیفیات اور داعیات کے باوجود رسول اللہ ﷺ ہمیشہ مالک کی رضا پر راضی رہے۔حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں کبھی کمی نہ کی۔ آپؐ کی اسی صفت کی وجہ سے آپؐ کی زندگی کو انسانوں کے لیے نمونہ اور قابل تقلید قرار دیا گیا' کیونکہ انسان کے علاوہ مخلوق کی کوئی دیگر نوع انسان کے لیے مثال نہیں بن سکتی۔ اگر کسی فرشتے کی زندگی کو انسانوں کے لیے نمونہ بنایا جاتا تو وہ اس کی پیروی کیسے کرتے؟ فرشتے کو نہ بیوی بچوں کی ضرورت' نہ کھانے پینے کی فکر۔انسانوں کے لیے تو انسان ہی اُسوہ حسنہ ہوسکتا

ہے جس میں تمام انسانی کمزوریاں موجود ہوں مگر وہ ان کمزوریوں کو اپنے کردار و عمل پر منفی طور پر اثر انداز نہ ہونے دے' بلکہ اپنی زندگی کو ہمیشہ معیاری رکھے' تاکہ دوسرے لوگوں کو حوصلہ ملے اور وہ بھی اچھا اور پسندیدہ رویہ اختیار کرنے کی کوشش کریں۔ قرآن کریم میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ تمام انبیاء انسان ہی تھے اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی انسان ہی تھے۔ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو آسمان سے کسی فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿۹۴﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿۹۵﴾﴾ (بنی اسراءیل)

''جب لوگوں کے پاس ہدایت پہنچ گئی تو انہیں ایمان لانے سے یہ بات مانع ہوئی کہ وہ کہنے لگے کہ کیا آدمی کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دیجیے: اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور آباد ہوتے تو ہم اُن پر لازماً آسمان سے کسی فرشتے کو ہی رسول بنا کر بھیجتے''۔

پھر سورۃ الکہف میں فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾

(الکہف: ۱۱۰)

''(اے پیغمبر!) کہہ دیجیے میں تو ایک انسان ہوں تمہاری طرح' البتہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے''۔

سورۃ الکہف کے یہ الفاظ بعینہٖ سورۃ حم السجدۃ کی چھٹی آیت میں بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی اور آیات میں بھی آپ کی بشریت کا واضح ذکر موجود ہے۔

اَخلاقِ نبویؐ

اسلامی تعلیمات میں اَخلاقیات کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اسلام بنی آدم کو صحیح معنوں میں انسان بنانا چاہتا ہے' تا کہ معاشرہ اچھے افراد سے بھر جائے' اَخلاقی خوبیاں عام ہوں اور معاشرہ امن وسلامتی کی تصویر بن جائے۔ مکارمِ اَخلاق سیرت وکردار کی بلندی کے مظہر ہوتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ اُن سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ رسول پاکﷺ سرتاپا اَخلاقی خوبیوں سے متصف تھے۔ یہ آپؐ کے سیرت وکردار کی بلندی ہی تھی جس نے اوّلین اہل مکہ کو متأثر کیا اور وہ آپ کو صادق اور امین کے لقب سے پکارنے لگے۔ جب آپؐ نے نبوت کا اعلان کیا تو وہی لوگ آپؐ کے شدید ترین مخالف ہو گئے۔ یہ مخالفت صرف آپؐ کے پیش کردہ نظام کی تھی جس میں بڑے چھوٹے کی تمیز ختم ہو رہی تھی۔ ورنہ نبی اکرمﷺ کے سابقہ کردار پر کوئی کٹر سے کٹر مخالف بھی کبھی انگلی نہ اٹھا سکا۔

چالیس سال کی عمر میں رسول اکرمﷺ پر نزولِ وحی کا آغاز ہوا تو آپؐ پیغامِ رسالت لوگوں تک پہنچانے لگے۔ اب آپؐ کی ہر بات خدا کی تعلیم کردہ تھی' جو کہ انتہائی صاف ستھری' مبنی بر انصاف اور معاشرے سے گندگی اور غلاظت کو ختم کرنے والی اور امن وسکون فراہم کرنے والی تھی۔ مگر آپؐ تو قبل از اعلانِ نبوت کی زندگی میں بھی اَخلاق وکردار کی انتہائی بلندیوں پر تھے۔ ایک شخص نے آپؐ کے ساتھ کوئی لین دین کا معاملہ کیا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ یہاں ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں۔ آپؐ اس کے انتظار میں وہاں کھڑے ہو گئے۔ شاید وہ شخص جا کر بھول گیا اور واپس نہ آیا۔ تین دن کے بعد اتفاق سے اِدھر سے گزرا تو دیکھا آپؐ اسی جگہ کھڑے ہیں۔ وہ شخص شرمندہ ہوا' مگر آپؐ نے

صرف اتنا کہا کہ تمہاری وجہ سے مجھے بہت تکلیف اٹھانی پڑی ہے۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب آپؐ پر ابھی نزولِ وحی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے چالیس سال انتہائی سادگی کے ساتھ مکہ کے جاہلی معاشرے میں گزارے۔ وہاں ہر طرف اَخلاق باختہ عادات و اطوار کا ماحول تھا، مگر آپؐ نے اپنے دامن کو کسی ادنیٰ سی برائی سے بھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ یہاں جس قدر بھی تعجب کیا جائے کم ہے کہ اہل مکہ آپؐ سے معجزہ کا مطالبہ کرتے رہے۔ کیا انہیں نظر نہیں آ رہا تھا کہ آپؐ جیسا اَخلاق و کردار پورے ماحول میں کسی کا نہ تھا۔ کیا یہ معجزہ نہ تھا! اگر دینِ آبائی کی زنجیریں اور اپنے مفادات کے طوق اُن کے لیے رکاوٹ نہ بنتے تو مکہ کا ہر شخص آپؐ کے اخلاق و کردار کی عظمت سے متأثر ہو کر اسلام قبول کر لیتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃٌ للعالمین تھے۔ آپؐ نے بے کسوں کی دست گیری، بیواؤں کی خبر گیری اور یتیموں پر شفقت کرنے کا حکم دیا۔ آپؐ ضعیفوں اور کمزوروں کے کام آئے۔ معذوروں اور محتاجوں کی ضروریات کا خیال رکھا۔ عدل و انصاف کے معاملے میں اپنے پرائے کا فرق ختم کر دیا۔ عورت کی عزت و وقار کو بلند کیا۔ مَردوں کو اس بات کی تلقین کی کہ وہ عورتوں کے حقوق کا خیال رکھیں۔ بچوں کے ساتھ محبت و پیار اور بڑوں کے لیے احترام کے جذبات رکھنے کی تعلیم دی۔ ہمسایوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے، بلکہ اُن کی خبر گیری کو ضروری ٹھہرایا اور فرمایا کہ جس شخص نے خود سیر ہو کر کھایا اور اُس کا ہمسایہ بھوکا سویا تو وہ ہم میں سے نہیں۔ ہمسائے کے حقوق پر اس قدر زور دیا کہ بقول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسا معلوم ہونے لگا کہ شاید ہمسائے کو وراثت میں حصہ دار ٹھہرا دیا جائے گا۔ معاشرے میں امن و سکون کی بحالی کے لیے فرمایا کہ مؤمن تو حقیقت میں وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ یعنی نہ تو مسلمان کے ہاتھ کسی پر زیادتی کے لیے اٹھیں اور نہ ہی وہ زبان سے کسی کو ستائے۔ کسی دوسرے کی چیز پر غاصبانہ قبضہ تو بہت دور کی بات ہے، بغیر اجازت کسی کی کوئی چیز استعمال کرنے سے بھی منع فرمایا۔ آپؐ نے تعلیم دی کہ اپنا کام خود کیا جائے اور حتی الوسع کسی دوسرے پر اپنے کام کا بوجھ نہ

ڈالا جائے۔ آپؐ نے تو جانوروں سے کام لینے کے بھی ضابطے بتادیے تاکہ اُن پر بھی کسی طرح کا ظلم نہ ہونے پائے۔ آپؐ نے تعلیم دی کہ اپنے جانوروں کو خوراک اُن کی ضرورت کے مطابق دو اور ان سے کام ان کی استطاعت کے مطابق لو۔ حلال جانور کا گوشت کھانا جائز ہے مگر جانور کے ذبح کرنے میں بھی آپؐ کی تعلیمات رأفت ورحمت کا مظہر ہیں۔ جانور کو بھوکا پیاسا رکھ کر ذبح نہ کیا جائے۔ ذبح میں استعمال ہونے والی چھری کو پہلے سے تیز کر کے رکھا جائے تاکہ جانور کو کم سے کم تکلیف ہو۔ مذبوحہ کا جسم بے حرکت ہو جائے تو پھر اُس کی کھال کھینچی جائے' جبکہ اس معاشرے میں یہ رواج بھی تھا کہ زندہ جانور کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ لیتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ازدواجی زندگی کو تجرد کی زندگی پر ترجیح دی' بلکہ تجرد کی زندگی کو ناپسند فرمایا' کیونکہ یہ فطری تقاضوں کو فنا کرنے کے مترادف ہے۔ آپؐ نے بھرپور اور مصروف زندگی کو پسند کیا جس میں اللہ کے حقوق کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق کی بھی پوری پوری پاسداری کی جائے۔ والدین پر لازم کیا کہ وہ اولاد کے حقوق کا خیال رکھیں اور اولاد کو والدین کے آرام اور سکھ کا خیال رکھنے کی تلقین کی۔ اس طرح آپؐ نے معاشرے کے کسی فرد کو بھی بے یارومددگار اور unattended نہیں چھوڑا۔

رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپؐ کی صحبت میں بیٹھنے والے تھے۔ انہوں نے آپؐ کے اخلاق کو خود آنکھوں سے دیکھ کر بیان کیا ہے۔ حضرت زید رضی اللہ عنہ آپؐ کے غلام تھے۔ اُن کے والد اور کچھ رشتہ دار آپؐ کے پاس آئے اور زید کو آزاد کرنے کی اپیل کی۔ آپؐ نے فرمایا زید کو لے جاؤ۔ وہ زید کی طرف متوجہ ہوئے تو زید نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں رہنے کو آزادی پر ترجیح دی۔ یہ آپؐ کے حسنِ اخلاق ہی کا نتیجہ تھا۔

محمدؐ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی
خدا کے دامن توحید میں آباد ہونے کی

رسول اللہ ﷺ نے غلاموں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی تعلیم دی۔ فرمایا جو خود کھاؤ وہ انہیں

کھلاؤ' جوخود پہنووانہیں بھی پہناؤ۔ یہ کیسی غلامی ہے! اس پر تو واقعی آزادی قربان کی جا سکتی ہے۔ آپؐ نے ہر شخص کو ذمہ دار ٹھہرایا اور اسے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اور عفو کا معاملہ کرنے کی تلقین کی۔ کسی حکمران اور مقتدر کو اپنے زیردستوں پر زیادتی کی اجازت نہ دی' بلکہ انہیں احساس دلایا کہ ہر وقت یاد رکھو کہ جس نے آج تمہیں اقتدار اور حکومت دی ہے وہ کل تم سے تمہارے اختیارات کے بارے میں ضرور پوچھے گا' لہٰذا ماتحتوں کے بارے میں آخرت کی جواب دہی کے لیے ہر وقت تیار رہو۔

الغرض زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں آپؐ نے تعلیم نہ دی ہو یا عملی نمونہ پیش نہ کیا ہو۔ آپؐ کے اخلاقِ حسنہ پر کئی کتابیں بھی لکھی جائیں تو موضوع کا حق ادا نہ ہوگا' مگر نصیحت حاصل کرنے کے لیے اشارات ہی کافی ہوتے ہیں۔ اخلاق کی یہ خوبیاں آپؐ کی شخصیت کا جزو لاینفک تھیں' کیونکہ قرآن کی ساری الہامی تعلیمات پر آپؐ نے عمل کر کے دکھا دیا۔ بقول اُمّ المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپؐ چلتا پھرتا قرآن تھے اور ایسا کیوں نہ ہو' آپؐ نے خود فرمایا ہے کہ مجھے اخلاقی خوبیوں کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔

ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اُسوۂ حسنہ سے سبق سیکھے اور مسنون اخلاقی خوبیوں کو اپنانے کی طرف سنجیدگی سے دھیان دے۔

۞۞۞

مساواتِ مَرد وزَن

مرد اور عورت اولادِ آدم کی دو اصناف ہیں۔ ہر صنف کی اپنی اہمیت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ تاہم شکل وشباہت' حقوق وفرائض اور دائرہ عمل میں دونوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ عورت کو حسن ظاہری میں مرد سے زیادہ حصہ ملا ہے' نیز اس کی صوتی آہنگ میں نرمی اور ملائمت عیاں ہے' جبکہ مرد کو نسبتاً توانا' جفاکش اور متحمل بنایا گیا ہے۔ الغرض عورت کی چال ڈھال' گفتگو اور اندازِ نشست و برخاست سے نسوانیت ٹپکتی ہے جبکہ مرد کی حرکات وسکنات اور کیفیات سے رجولیت مترشح ہوتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی انفرادی خصوصیات ان کے اپنے اپنے دائرہ کار کے لیے انتہائی مفید اور ضروری ہیں۔

جس طرح کوئی سی بھی دو چیزوں میں مساوات کا حکم لگانا آسان کام نہیں اسی طرح مرد وزن کے درمیان محض مساوات کا لفظ لگا دینا کافی نہیں' بلکہ دونوں کے حقوق وفرائض اور دائرۂ کار کا تعین بھی ضروری ہے جس میں مساوات کا پہلو بھی سامنے آ جائے گا۔ مرد و عورت انسان ہونے اور مخصوص حقوق رکھنے کے ناطے تو بہرحال مساوی ہیں' مگر یہ مساوات تو اپنی نوعیت میں اس قدر سادہ ہے کہ بہت سی مختلف چیزوں میں موجود ہے۔ مثلاً چرندے' پرندے اور درندے بھی ربّ کی مخلوق اور جاندار ہونے میں انسان کے مساوی ہیں۔ اگرچہ دائرۂ کار ہر کسی کا الگ الگ ہے اور جب دائرۂ کار کو زیر بحث لایا جائے گا تو مجموعی اعتبار سے انسان کی دوسرے جانداروں پر فضیلت سامنے آئے گی۔ لیکن ایک صنف کی دوسری اصناف پر فضیلت دوسری اصناف کی مخصوص اہمیت کو چنداں متاثر نہیں کرتی۔ اسی طرح جب مرد وعورت کے دائرۂ کار' عملی زندگی میں حقوق وفرائض اور وظیفہ ہائے زندگی کو زیر بحث لایا جائے گا تو مجموعی طور پر مرد کی عورت پر فضیلت ثابت

ہوگی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوگا کہ صنف نازک کو غیر اہم قرار دے دیا جائے۔

ماحول پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں پولیس کے اہلکار' فوجی جوان' کالج کے اساتذہ' انتظامیہ کے افسران' محکمہ ڈاک اور ٹیلی فون کے ملازمین نظر آئیں گے۔ ان میں اس اعتبار سے تو مساوات ہے کہ یہ سب حکومت کے کارندے ہیں مگر فرائض کی نوعیت اور اختیارات کی کمی بیشی ان کے درمیان مساوات کا حکم لگانے میں سراسر مانع ہے' اگرچہ ہر گروہ کی اہمیت مسلمہ ہے۔

مرد کی اپنی اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے چند مخصوص فرائض کی انجام دہی کے لیے بنایا ہے اور اس کی تخلیق میں طاقت اور شجاعت جیسی صلاحیتیں رکھی ہیں۔ تاریخ گواہ ہے کہ دفاعِ وطن یا عزت و ناموس کی حفاظت کی خاطر ہمیشہ مردوں نے ہی اپنی جان جوکھوں میں ڈالی اور میدانِ کارزار میں متصادم ہوئے۔ اسی طرح جسمانی مشقت کے کام ہمیشہ سے مرد ہی کرتے چلے آئے ہیں' مگر عورت کی اپنی اہمیت ہے کہ امورِ خانہ داری میں حسن ترتیب اور سلیقے کے ساتھ نہ صرف وہ مرد کو عظیم الشان کاموں کے لیے تیار کرتی ہے بلکہ نئی نسل کے ذکور و اناث کی صلاحیتیں اسی کی گود میں نشوونما پاتی ہیں۔

اسلام منظم اجتماعی زندگی پر یقین رکھتا ہے۔ اسلامی تعلیمات کے مطابق چند افراد مل کر سفر کریں تو انہیں اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کر لینا چاہیے۔ پس خاندان کے نظام کو منظم رکھنے کے لیے صاحبِ خانہ مرد کو سربراہی سونپی گئی ہے(۱) اور مرد و زن دونوں کو یہ فیصلہ خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے کہ یہ ربّ العالمین کی مشیت ہے۔ ہم یہاں قرآن و حدیث کی روشنی میں مرد و زن کی امتیازی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ مَرد و زَن میں مساوات کس درجہ کی ہے۔

۱) قرآن پاک میں اوامر و نواہی کے مخاطب عام طور پر مرد ہی ہیں جبکہ تبعاً وہی احکام عورتوں کے لیے بھی ہیں۔ ایسا نہیں ہوا کہ مخاطب عورتیں ہوں اور تبعاً مرد بھی ان میں شامل ہوں۔(۲)

۲) قرآن پاک میں واضح طور پر مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت دی گئی ہے۔

سورۃ البقرہ' آیت ۲۲۸ میں ہے: ''عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسی اُن پر ذمہ داریاں ہیں' البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ (فضیلت) حاصل ہے''۔

۳) نکاح مرد و عورت کے درمیان ایک معاہدہ ہے جس میں بااختیار فریق مرد کو بنایا گیا ہے۔ نکاح کی ڈور بلا استثناء (exclusively) مرد کے ہاتھ میں ہے' یعنی مرد کو یہ قانونی اختیار ہے کہ وہ جس وقت چاہے عورت کو طلاق دے کر الگ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر عورت اپنے خاوند سے علیحدگی چاہے تو اس کو عدالت میں اپنی مظلومیت ثابت کرنا ہوگی۔(۳)

۴) اسلامی قانونِ شہادت میں بعض معاملات میں دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر سمجھا گیا ہے۔(۴)

۵) اسلامی قانونِ وراثت میں لڑکے کو لڑکی سے دوگنا حصہ ملتا ہے۔(۵)

۶) عورتوں کا گھروں میں بیٹھنا اور چار دیواری کے اندر کے امور انجام دینا پسندیدہ ہے جبکہ مرد کو روزی کی تلاش میں بیرونِ خانہ کی سرگرمیوں کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے۔(۶)

۷) عورت کی نماز مسجد کی نسبت گھر میں پڑھنا پسندیدہ اور افضل ہے اور برآمدے کی نسبت کمرے کے اندر پڑھنا بہتر ہے جبکہ مرد کے لیے لازم ہے کہ وہ مسجد میں جا کر پنج گانہ نماز ادا کرے۔(۷)

۸) مرد کو منتظم خانہ ہونے کے ناطے اپنی عورت کو تادیبی سزا دینے کی اجازت ہے جبکہ عورت اپنے مرد کی اصلاح کے لیے اسے جسمانی سزا نہیں دے سکتی۔ قرآن کریم میں ہے: ''اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ' خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو''۔ (النساء:۳۴)

۹) عورت کا نان و نفقہ اور رہائش کی سہولت مرد کی ذمہ داری ہے۔ عورت پر یہ

ذمہ داری نہیں کہ وہ افرادِ خانہ کے قیام وطعام کا بندوبست کرے۔(النساء:۳۴)

۱۰) میدانِ جنگ میں جہاد و قتال مردوں کی ذمہ داری ہے اور عورتیں اس سے کلیتاً مستثنیٰ ہیں۔ اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ عورتیں جسمانی کمزوری کے سبب جنگ و جدال، نیزہ اور تیر و تفنگ اٹھانے کے قابل نہیں۔

۱۱) نبوت اور رسالت اللہ تعالیٰ نے صرف مردوں میں رکھی ہے، کسی عورت کو یہ منصب نہیں عطا ہوا۔ اس حقیقت پر تاریخِ انسانیت شاہد ہے۔ البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے کہ انبیاء و رُسل نے عورتوں کے ہاں ہی جنم لیا۔

۱۲) نماز باجماعت میں امامت صرف مرد ہی کی ذمہ داری ہے۔ عورت نماز باجماعت میں آگے کھڑی ہو کر امامت نہیں کر سکتی۔ البتہ اگر عورتیں ہی مل کر نماز پڑھ رہی ہوں تو اگلی صف کے درمیان کھڑی عورت ان کی امامت کر سکتی ہے، مگر وہ بھی صف سے آگے نکل کر اکیلی کھڑی نہیں ہوگی۔[۸]

۱۳) نماز جمعہ اور عیدین چونکہ گھر سے باہر نکل کر ادا کرنا ہوتی ہیں اس لیے عورتوں پر فرض نہیں، صرف مردوں پر فرض ہیں۔[۹]

۱۴) مردوں کے لیے صرف ستر کے احکام ہیں جبکہ عورتوں کے لیے ستر کے علاوہ حجاب (پردہ) کے احکام بھی ہیں۔ وہ مردوں کی طرح بلا تکلف گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں۔[۱۰]

۱۵) شادی شدہ عورت کو قرآن میں محصنہ کہا گیا ہے، یعنی جو کسی مرد کے زیرِ حفاظت آ چکی ہو۔ گویا مرد عورت کو حفاظت (Protection) فراہم کرنے والا ہے۔[۱۱]

۱۶) ایک مرد ایک ہی وقت میں چار عورتوں کو نکاح میں رکھ سکتا ہے جبکہ ایک عورت کو اجازت نہیں کہ وہ بیک وقت کئی مردوں سے نکاح کر سکے۔[۱۲]

۱۷) حج ارکانِ اسلام میں سے ہے۔ مرد کو استطاعت ہو تو جب چاہے سفرِ حج اختیار کر سکتا ہے۔ مگر عورت استطاعت کے باوجود حج کا سفر اختیار نہیں کر سکتی جب تک

کوئی محرم مرد اس کے ساتھ جانے والا نہ ہو۔(۱۳)

۱۸) مرد جب چاہے نفلی روزہ رکھ لے۔مگر شادی شدہ عورت اپنے موجود شوہر کی اجازت سے ہی نفلی روزہ رکھ سکتی ہے۔(۱۴)

۱۹) رسول پاک ﷺ کا فرمان ہے: ''اللہ کے سوا کسی کو سجدہ روا نہیں۔اگر خدا کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورتوں کو کہتا کہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں''۔(۱۵)

۲۰) جس عورت کو طلاق ہو جائے یا اس کا شوہر فوت ہو جائے تو وہ عدت کی مدت گزار کر ہی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے' مگر کسی مرد کی بیوی فوت ہو جائے یا وہ اسے طلاق دے دے تو وہ بلا انتظار کسی دوسری عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔(۱۶)

۲۱) نماز جنازہ صرف مردوں پر فرض ہے' عورتوں پر نہیں۔یہ بھی اس لیے کہ عورتوں کا گھروں سے باہر نکلنا پسندیدہ نہیں۔(۱۷)

مذکورہ بالا شواہد سے مرد اور عورت کے دائرہ ہائے کار اور حقوق و فرائض کا تعین چنداں مشکل نہیں رہا۔رہا یہ سوال کہ جدید دور ہے اور اس کے جدید تقاضے ہیں' اس میں آبادی کے نصف حصے کو گھر کی چار دیواری میں پابند رکھنا مناسب نہیں جبکہ عورت نے وہ تمام کام کر دکھائے ہیں جو مرد کرتا ہے۔تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مندرجہ بالا شواہد اسلامی تعلیمات پر مبنی ہیں جن کے اصول خود خالقِ کائنات نے وضع کیے ہیں' وہ ہر دور کے تقاضے جانتا ہے' اس لیے یہ اعتراض سرے سے غلط ہے کہ اسلامی تعلیمات جدید تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔البتہ یہ ممکن ہے کہ انسانی ذہن خالقِ فطرت کے وضع کردہ قوانین کو ازخود غلط سمجھ بیٹھے' مگر ایسا انسان بھی راہِ گم گشتہ کی کیفیت سے نکل کر اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ خالقِ کائنات کے دیے ہوئے قوانین ہی بہترین ہیں۔عورت کے حقوق و فرائض کے تعین میں افراط و تفریط کا یہ نیا تجربہ نہیں بلکہ اس سے قبل یہ کئی مرتبہ آزمایا گیا ہے' مگر ہر دفعہ نتائج بد سے بدتر نکلے۔آج بھی مغرب میں مخلوط معاشرے کا رواج اور عورت پر بیرونِ خانہ کی ذمہ داریاں ڈال کر خاندانی زندگی کو تہہ و

بالا کر دیا گیا ہے اور نتیجتاً یہ یورپی دانشور اپنی غلطی تسلیم کر رہے ہیں اور زبانِ حال سے پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مرد و عورت کے وہی حقوق و فرائض جو اسلام نے پیش کیے ہیں متوازن' معتدل اور اقرب الی الفطرت ہیں۔ مشہور فرانسیسی دانشور روسو نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب ''عمرانی معاہدہ'' (Social Contract) میں لکھا ہے:

''یہ عورت کے رول میں ہے کہ وہ گھر میں رہے' گھر کو درست رکھے' بچوں کی نگہداشت کرے' گھر کے مردوں کو اس قسم کی تعلیم دے کہ وہ اچھے شہری بن سکیں' مگر عورت کو اس میدان میں خود کبھی دخل نہیں دینا چاہیے''۔

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر ایلیکس کیرل نے اپنی مشہور کتاب ''انسان نادریافت'' میں لکھا ہے:

''عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو خود اپنی فطرت کے مطابق ترقی دیں اور مردوں کی نقل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ تہذیب کی ترقی میں ان کا حصہ اس سے زیادہ ہے جتنا مردوں کا ہے۔ ان کو اپنے مخصوص عمل کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

زمانہ قدیم سے عورت کی حیثیت' مقام اور حقوق و فرائض کے تعین میں افراط و تفریط رہی۔ ہر دفعہ نتیجہ یہی نکلا کہ عورت کی سرگرمیاں گھریلو نوعیت کی ہیں' اسے مردوں کے شانہ بشانہ بیرونِ خانہ کے پرمشقت کاموں میں الجھانا ہمیشہ انتشار و فساد کا باعث ہوا۔ مشہور یونانی فلسفی ارسطو (جس کی وفات ۳۲۲ قبل مسیح میں ہوئی) نے اپنی کتاب ''سیاسیات'' میں لکھا ہے:

''سیاست میں عورت کا کوئی رول نہیں ہے۔ اس کا ان فیصلوں میں کوئی ہاتھ نہیں ہونا چاہیے جو خاندان سے باہر خلقِ خدا کی بہتری کے لیے کیے جاتے ہیں''۔

آج اگر چند عورتوں نے بیرونِ خانہ کے وہ کام جو مردوں کے شایانِ شان ہیں' کر دکھائے ہیں تو اس میں چنداں تعجب کی بات نہیں۔ عورتوں کی ایک قلیل تعداد میں غیر معمولی صلاحیتوں کا پایا جانا مستثنیات میں شمار ہوتا ہے اور مستثنیات کو عموم کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے برعکس عورتوں کی اس کارکردگی نے جو منفی اثرات پیدا کیے ہیں وہ کہیں زیادہ ہیں۔ مغربی معاشرے میں جہاں عورتوں کو کھلے بندوں مردوں کے ساتھ مسابقت

(compete) کرنے کے مواقع ہیں وہاں بھی جن عورتوں کی کارکردگی عمدہ قرار دی جاسکتی ہے ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ سائنس کا نوبل پرائز پانے والے ۲۷۸ افراد میں سے صرف چھ عورتیں ہیں۔ امریکہ میں سب سے بڑے سائنسی ادارے نیشنل اکیڈمی آف سائنس کے منتخب ممبران میں عورتوں کی تعداد ڈیڑھ فیصد سے زیادہ نہیں۔ اور تو اور کسی ترقی یافتہ ملک میں بھی زچگی کی ماہرین ڈاکٹر خواتین کی تعداد بھی اس ملک کی ضرورت کے مطابق نہیں بلکہ مرد ماہر ڈاکٹروں کو یہ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

اگر ان تمام تصریحات کے باوجود کوئی شخص اس بات پر مصر ہو کہ مرد اور عورت میں کامل مساوات اور برابر کی صلاحیتیں ہیں اور عورتوں کو بیرونِ خانہ کے پر مشقت کاموں میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے تو یہ اس کی خود فریبی ہے یا پھر اسے ذہنی اور فکری انتشار کا عارضہ لاحق ہے۔

حواشی

(۱) ''مرد عورتوں پر قوام (حکمران ونگران) ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں''۔ (النساء: ۳۴)

(۲) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کیے گئے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تاکہ تم پرہیزگار بنو'' (البقرۃ: ۱۸۳) اور اس طرح کی بے شمار آیات۔

(۳) البقرۃ: ۱۴۶،۱۴۴۔

(٤) ''......اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرالو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے''۔ (البقرۃ: ۲۸۲)

(٥) ''تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے''۔ (النساء)

(٦) ''اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دور جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو''۔ (الاحزاب: ۳۳)

(۷) ''عورت کا اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھے اور اس کا اپنے اندرونی کمرے میں نماز پڑھنا بیرونی کمرہ میں پڑھنے سے بہتر ہے''۔ (ابو داؤد عن ابن مسعودؓ)

(۸) سنن ابی داؤد۔ دارقطنی۔ بیہقی۔

(۹) سنن ابی داؤد، عن طارق بن شہاب۔

(۱۰) الاحزاب:۵۹۔

(۱۱) النساء:۲۴۔

(۱۲) النساء:۳۔

(۱۳) ترمذی۔ سنن ابی داؤد، عن ابی ہریرہؓ۔

(۱۴) احسن الفتاویٰ از مفتی رشید احمد، جلد چہارم، ص ۵۲۲۔

(۱۵) معارف الحدیث، ج۴، ص ۲۹۴۔

(۱۶) البقرۃ:۲۲۸،۲۳۴۔

(۱۷) بخاری عن اُم عطیہ۔

عورت کا دائرۂ کار

عورت عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے پردہ میں رہنے کی چیز۔یعنی وہ شے جو چھپانے کے قابل ہو اور اس کا نظروں کے سامنے آنا طبعاً ناپسندیدہ اور ناگوار ہو۔اسی لیے یہ لفظ انسان کے ان اعضاء کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو ہمیشہ چھپائے جاتے ہیں۔عربی زبان میں لفظ عورت مرد (رَجُل) کی مؤنث کے لیے نہیں بولا جاتا۔البتہ اردو زبان میں یہ لفظ زَن (woman) کے معنوں میں مستعمل ہے اور یہ لفظ حوا کی بیٹی کے لیے اسی لیے اختیار کیا گیا ہے کہ وہ ہمہ تن چھپانے کی چیز ہے۔زن کے لیے فارسی میں لفظ مستور استعمال کیا جاتا ہے جس کی جمع مستورات ہے جو اردو میں عام مستعمل ہے۔مستور کا معنی بھی بالکل وہی ہے جو عورت کا معنی عربی زبان میں اوپر مذکور ہوا' یعنی چھپی ہوئی چیز۔

جس شخص نے اسلامی لٹریچر کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ کیا ہوگا اس پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ عورتوں کا اصل مقام ان کا گھر ہے جہاں ان پر غیر محرم افراد کی نظر نہیں پڑ سکتی۔حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((اَلْمَرْأَۃُ عَوْرَۃٌ)) (سنن الترمذی) یعنی عورت چھپائے جانے کے لائق ہے۔نیز دوپٹہ کے لیے قرآن شریف میں لفظ ''خمار'' استعمال ہوا ہے جس کا لفظی معنی ہے چھپا دینے والی چیز۔عورت گھر سے باہر نکلے تو پردے کے لیے جلباب اوڑھ کر نکلے۔لفظ جلباب قرآن شریف میں مذکور ہے اور اس کا معنی ہے وہ بڑی چادر جو اصل لباس کو بھی ڈھانپ لے' تو گویا قرآن وحدیث کی ان تصریحات کے مطابق عورت لاریب وہ ہے جو پردہ نشین اور ستر وحجاب کی پابندی کرنے والی ہے۔

مسلمانوں کی زندگی میں مخلوط معاشرے کا کوئی تصور نہیں۔یہاں مرد روزی کمانے کے لیے گھر سے باہر بھاری اور پر مشقت کام کرتا ہے جبکہ عورت گھر کے اندر ہلکے پھلکے

کام کرنے کی ذمہ دار ہے۔عورتوں کے فرائض منصبی گھر کی چار دیواری کے اندر تک محدود ہیں۔ان کا کام مردوں کے لیے گھر کے اندر پرسکون ماحول کی فراہمی اور اولاد کی صحیح خطوط پر تربیت کرنا ہے۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو خطاب فرماتا ہے:

﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾ (الاحزاب:۳۳)

''اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو''۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ترمذی شریف میں اس طرح نقل ہوا ہے:

''عورت مستور رہنے کے قابل شے ہے' جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے''۔

چنانچہ عورتوں کو ان کاموں کا مکلف ہی نہیں ٹھہرایا گیا جن کا تعلق گھر سے باہر کی دوڑ دھوپ سے ہو۔ یہاں تک کہ عورتوں کو جہاد پر جانے سے روک دیا گیا ہے۔حافظ ابوبکر بزار حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ عورتوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ساری فضیلتیں تو مرد لوٹ کر لے گئے۔وہ جہاد کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کرتے ہیں' ہم کیا عمل کریں کہ ہمیں بھی مجاہدین کے برابر اجر مل سکے۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا:''جو تم میں سے گھر بیٹھے گی وہ مجاہدین کے عمل کو پالے گی''۔مطلب یہ ہے کہ خاتون خانہ اپنے مرد کو اطمینان کے ساتھ جہاد پر جانے کا موقع دے گی اور اسے اپنے گھر کی طرف سے پورا اطمینان ہوگا کہ اس کی بیوی اس کے گھر اور بچوں کو سنبھالے بیٹھی رہے گی اور اس کی عدم موجودگی میں اپنی عفت و عصمت کی بھی حفاظت کرے گی تو اس کا یہ عمل جہاد ہی سمجھا جائے گا۔

جہاد تو بڑی دُور کی بات ہے' مسلمان عورتوں کو تو جمعہ کی نماز سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے' کیونکہ یہ نماز گھر سے نکل کر صرف مسجد ہی میں ادا ہوسکتی ہے۔حالانکہ

نمازِ جمعہ وہ نماز ہے جس کے ادا کرنے کی مردوں کو سخت تاکید کی گئی ہے۔ ایک موقع پر رسول پاک ﷺ نے فرمایا: ''میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو بلاعذر جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں نہیں آتے''۔ مردوں کے لیے روزانہ کی نماز پنج گانہ بھی محلے کی مسجد میں پابندیٔ وقت کے ساتھ جماعت کی صورت میں ادا کرنا فرض قرار دیا گیا ہے جبکہ عورت کو پانچوں نمازیں گھر پر ادا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مسند احمد اور طبرانی میں مذکور ہے کہ اُم حمید ساعدیہؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ مجھے آپؐ کے پیچھے نماز پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''تمہارا اپنے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں پڑھنے سے بہتر ہے اور تمہارا اپنے گھر میں نماز پڑھنا اپنے محلے کی مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے اور تمہارا اپنے محلے کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھنا جامع مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے''۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں جو احمد اور طبرانی میں ہے' آنحضور ﷺ کے الفاظ یہ ہیں:

((خَيْرُ مَسَاجِدِ النِّسَاءِ قَعْرُ بُيُوْتِهِنَّ))

''عورتوں کے لیے بہترین مسجدیں ان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں''۔

چونکہ عورت کا دائرۂ کار اور اس کی سرگرمیاں گھر کی چار دیواری کے اندر تک محدود ہیں اس لیے بیرون خانہ کے کاموں کی ذمہ داری اس پر ڈالی ہی نہیں گئی۔ اس کے جملہ اخراجات اور ضروریات کی کفالت مرد کے ذمہ ہے۔ قرآن پاک میں جہاں مردوں کی عورتوں پر ایک گونہ فضیلت کا ذکر ہے وہاں اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ (مرد) ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں' یعنی ان کی کفالت کے ذمہ دار ہیں۔ گویا عورت کو معاشی ذمہ داریوں سے آزاد رکھا گیا ہے۔

عورت سرتاپا چھپانے کی چیز ہے' یہاں تک کہ اس کی آواز بھی غیر محرم مردوں کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیے۔ اور اگر کبھی ایسا ضروری ہو جائے تو قرآن پاک میں تعلیم (بحوالہ آیت ۳۲' سورۃ الاحزاب) یہ ہے کہ ایسے موقع پر عورت کا لہجہ اور اندازِ گفتگو غیر ملائم اور بھاری سا ہونا چاہیے تاکہ مخاطب کو نہ تو آواز میں دلکشی اور نسوانیت محسوس ہو اور

نہ اسے کسی طرح کے لالچ کی راہ نظر آئے۔ اسی بنا پر عورت کے لیے اذان دینا ممنوع ہے۔ بلکہ اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ نماز باجماعت میں پیچھے کوئی عورت بھی موجود ہو اور امام غلطی کرے تو مرد کی طرح اسے ''سبحان اللہ'' کہنے کی اجازت نہیں بلکہ اسے ہاتھ پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کرنی چاہیے تاکہ امام متنبہ ہو جائے۔

سورۃ النور کی آیت ۳۱ میں مسلمان عورتوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ مزید یہ کہ اگر اشد ضرورت کے تحت عورت کو گھر سے باہر نکلنا ہو تو زیورات کی جھنکار کے اظہار کی بھی اسے ممانعت ہے اور خوشبو لگانے سے بھی روکا گیا ہے۔

سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۹ کی تفسیر میں امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمان عورتوں کو حکم دیتا ہے کہ جب وہ اپنے کسی کام کے لیے گھر سے باہر نکلیں تو جلباب اوڑھ کر اپنا چہرہ ڈھانپ لیں۔ اور جلباب کا معنی اوپر مذکور ہوا' یعنی وہ چادر جو جسم پر اس طرح لپیٹ لی جاتی ہے کہ اس سے لباس بھی چھپ جاتا ہے۔

مذکورہ بالا توضیحات سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق عورت کا دائرہ کار گھر کے اندر تک محدود ہے اور اگر اسے ناگزیر حالات میں گھر سے باہر جانا پڑے تو اسے ایک بڑی چادر سے اپنے جسم بلکہ کپڑوں تک کو ڈھانپ کر نکلنا چاہیے۔ تاریخِ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں پر یہ چیز مخفی نہیں کہ عہدِ رسالت مآب ؐ اور دورِ خلافت راشدہ میں مسلمان عورتیں منشائے اسلام کے مطابق پردے کی سخت پابندی کرتی تھیں۔ البتہ چند واقعات ایسے بھی ملتے ہیں جن سے اگرچہ کسی طرح کی غلط فہمی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تاہم کج رو اور زیغ پسند طبائع ان سے فائدہ اٹھانے کی ناکام کوشش کر سکتے ہیں' چنانچہ یہاں ان کا تذکرہ کر دینا بھی بات کو مزید واضح کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں معاشی جدوجہد کی مثال ملتی ہے' مگر

اوّل تو یہ ان کے رسول پاک ﷺ کی زوجیت میں آنے اور قبولِ اسلام سے پہلے کی بات ہے لہٰذا یہ حجت نہیں' دوم یہ کہ وہ معاشی جدوجہد گھر کے اندر بیٹھ کر کرتی تھیں اور خود باہر نہیں گھومتی تھیں۔ سوم یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب ان کے شوہر فوت ہو چکے تھے اور اُن کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں تھا مگر جب وہ آنحضرت ﷺ کی زوجیت میں آئیں تو اب کفالت کی ذمہ داری آپؐ نے لے لی اور اُم المؤمنینؓ نے معاشی جدوجہد ترک کر دی۔ اسی طرح ازواجِ مطہرات اور صحابیات رضی اللہ عنہن میں شاید ہی کوئی عورت ہو جو معاشی جدوجہد میں مصروف نظر آتی ہو۔

(۲) جنگ بدر میں چند صحابیاتؓ نے میدانِ جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کی تو سمجھ لینا چاہیے کہ اوّل تو جنگ بدر کا یہ واقعہ سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب (جن میں پردے کے احکام نازل ہوئے) کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہے لہٰذا حجت نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ صورت بھی اضطراری تھی' کیونکہ یہ کفر و اسلام کے درمیان پہلی جنگ تھی اور مسلمانوں کے لیے تخت یا تختہ والا معاملہ تھا۔ تیسرے یہ کہ بعد کے کسی غزوے میں عورتوں کا اس طرح میدانِ جنگ میں کام کرنا ثابت نہیں بلکہ بعد کی ایک جنگ کے موقع پر کچھ عورتیں اس مقصد کے لیے گھروں سے نکلیں' آنحضور ﷺ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے ناگواری کا اظہار کیا اور انہیں واپس گھروں کو بھیج دیا اور پھر کبھی مسلمان عورتوں کو میدانِ جنگ میں نہ جانے دیا۔

(۳) جنگ جمل میں حضرت عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا نے بذاتِ خود حصہ لیا مگر معلوم ہونا چاہیے کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال اس بارے میں کیا تھا۔ عبداللہ بن احمد بن حنبلؒ نے زوائد الزھد میں اور ابن المنذر' ابن ابی شیبہ اور ابن سعد نے اپنی کتابوں میں مسروق رحمۃ اللہ علیہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ ...... الخ پر پہنچتی تھیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں یہاں تک کہ ان کا دوپٹہ بھیگ جاتا تھا' کیونکہ انہیں اس پر وہ غلطی یاد آ جایا کرتی تھی جو اُن سے جنگ جمل میں ہوئی تھیں۔

(۴) عورت کے لیے ستر وحجاب کی یہ پابندی فحاشی اور زنا کاری کی روک تھام کے لیے تھی مگر اس کے باوجود عہدِ رسالت مآبؐ میں زنا کے اِکا دُکا واقعات پیش آئے اور مجرموں کو سزا بھی دی گئی۔ تو اس میں تو کوئی شک نہیں کہ رسالت مآبؐ کے پاکیزہ عہد میں ستر وحجاب کی پابندی کے نتیجہ میں نہایت مطہر معاشرہ قائم ہو چکا تھا مگر جاننا چاہیے کہ وہ لوگ بھی آخر انسان ہی تھے اور انسانوں کا معاشرہ جرائم سے قطعی پاک نہیں ہو سکتا۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ واقعات پیش نہ آتے تو آنحضرت ﷺ مجرموں پر حد جاری نہ کرتے اور بعد میں اعتراض ہو سکتا تھا کہ قذف و زنا کی اتنی سخت سزا نظری طور پر تو درست ہو سکتی ہے مگر اس پر عمل درآمد ممکن نہیں اور ناممکن کا حکم حکمت کے خلاف ہے۔ چنانچہ عہدِ رسالت میں قذف و زنا کے مجرموں کو سزا دے کر حدود پر عمل درآمد کی مثال قائم کر دی گئی۔ آج تو معاشرہ اتنا صاف ستھرا نہیں تو ایسے میں تو ستر وحجاب کی پابندی اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ گھر عورت کے لیے قید خانہ نہیں بنایا گیا' بلکہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' ضرورت کے تحت وہ بڑی چادر اوڑھ کر باہر نکل سکتی ہے' لہٰذا گھر کے باہر کی تمام ناگزیر سرگرمیوں میں وہ حصہ لے سکتی ہے۔ بچیاں سکول جائیں' خواتین انہیں پڑھانے کے لیے تعلیمی اداروں کی طرف چل کر جائیں۔ طالبات طب کی تعلیم حاصل کر کے زنانہ ہسپتالوں میں ملازمت اختیار کریں یا اپنے کلینک کھول لیں وغیرہ۔ مگر ان ناگزیر صورتوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے نوجوان لڑکیوں کو بینک' ڈاک خانے اور دوسرے دفاتر میں حسن و زیبائش کی نمائش کرتے ہوئے مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کی اجازت دینا ہرگز ہرگز قرین انصاف نہیں۔ پھر ہمارے ہاں تو مرد جو بنیادی طور پر کفیلِ خانہ ہیں' ہر قسم کی صلاحیت اور تعلیم کے باوجود تلاشِ روزگار میں پریشان اور سرگرداں ہیں اور اس صورتِ حال نے تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور یہ ہونہار نوجوان جرائم کا راستہ اختیار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پا رہے ہیں۔ ایسے میں اگر مردوں کو نظر انداز کر کے عورتوں کو ملازمتیں دی جائیں تو اس

سے اچھے نتائج کی توقع قطعاً کارِ عبث ہے۔

خلاقِ کون و مکاں نے حسن و جمال میں عورت کو وافر حصہ عطا کیا ہے اور وہ فطرتاً خوبصورت نظر آنا چاہتی ہے۔ قدرت نے جس حکمت کے تحت عورت میں یہ دلکشی رکھی ہے وہ کسی صاحبِ بصیرت سے مخفی نہیں۔ چنانچہ اس جذبے کی تسکین کے لیے اسلام میں عورت کو زیورات پہننے' سجاوٹ کرنے اور جسمانی زینت و آرائش اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے مگر اس زیب و زینت کا اظہار گھر کی چار دیواری کے اندر صرف شوہر کے سامنے جائز ہے اور ان افرادِ خانہ کے سامنے جو اس کے محرم ہیں' یعنی جن کے ساتھ اس کا نکاح کسی حال میں نہیں ہو سکتا' مثلاً باپ' بھائی' بیٹا' چچا وغیرہ۔ اس طرح عورت کے فطری جذبہ کی تسکین بھی ہو جاتی ہے اور کسی فتنے کا بھی کوئی امکان نہیں رہتا۔ مگر عورت کا پوری دلکشی اور رعنائی کے ساتھ نیم عریاں لباس' ننگے سر' سراپا نمائش گھر سے نکلنا اسلامی معاشرے میں کسی طرح فٹ نہیں بیٹھتا۔ اسلام تو اس انداز کو جاہلیت کی سج دھج قرار دیتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۲ کے تحت دورِ جدید کے مفسر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''......اب یہ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ جو دین عورت کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی لوچدار اندازِ گفتگو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے مردوں کے سامنے بلاضرورت آواز نکالنے سے بھی روکتا ہے' کیا وہ کبھی اس کو پسند کر سکتا ہے کہ عورت سٹیج پر آ کر گائے' ناچے' تھرکے' بھاؤ بتائے اور ناز و نخرے دکھائے؟ کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ ریڈیو پر عورت عاشقانہ گیت گائے اور سریلے نغموں کے ساتھ فحش مضامین سنا سنا کر لوگوں کے جذبات میں آگ لگائے؟ کیا وہ اسے جائز رکھ سکتا ہے کہ عورتیں ڈراموں میں کبھی کسی کی بیوی اور کبھی کسی کی معشوقہ کا پارٹ ادا کریں؟ یا ہوائی میزبان (Air Hostess) بنائی جائیں اور انہیں خاص طور پر مسافروں کا دل لبھانے کی تربیت دی جائے؟ یا کلبوں اور اجتماعی تقریبات اور مخلوط مجالس میں بن ٹھن کر آئیں اور مردوں سے خوب گھل مل کر بات چیت اور ہنسی مذاق کریں؟ یہ کلچر آخر کس قرآن سے برآمد

کی گئی ہے؟ خدا کا نازل کردہ قرآن تو سب کے سامنے ہے'اس میں کہیں اس کلچر کی گنجائش نظر آتی ہو تو اس مقام کی نشاندہی کر دی جائے ......اللہ تعالیٰ جس طرزِ عمل سے عورتوں کو روکنا چاہتا ہے وہ ان کا اپنے حسن کی نمائش کرتے ہوئے گھروں سے باہر نکلنا ہے۔ وہ ان کو ہدایت فرماتا ہے کہ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو' کیونکہ تمہارا اصل کام گھر میں ہے نہ کہ اس کے باہر۔ لیکن اگر باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو اس شان کے ساتھ نہ نکلو جس کے ساتھ سابق دورِ جاہلیت میں عورتیں نکلا کرتی تھیں۔ بن ٹھن کر نکلنا' چہرے اور جسم کے حسن کو زیب و زینت اور چست لباسوں یا عریاں لباسوں سے نمایاں کرنا اور ناز و انداز سے چلنا ایک مسلم معاشرے کی عورتوں کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کے طور طریقے ہیں جو اسلام میں نہیں چل سکتے۔ اب یہ بات ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو ثقافت ہمارے ہاں رائج کی جا رہی ہے وہ قرآن کی رو سے اسلام کی ثقافت ہے یا جاہلیت کی ثقافت۔ البتہ اگر کوئی اور قرآن ہمارے کارفرماؤں کے پاس آ گیا ہے جس سے اسلام کی یہ روح نکال کر مسلمانوں میں پھیلائی جا رہی ہے تو دوسری بات ہے''۔ (تفہیم القرآن' جلد چہارم' ص۸۹ تا ۹۲)

فاعتبروا یا اولی الابصار

بدعات کیوں قابل مذمت ہیں؟

اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ یہی اُس نے انسانوں کے لیے منتخب کیا ہے۔ جو کوئی بھی اسلام کے علاوہ کوئی اور طریقۂ زندگی اختیار کرے گا تو وہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (آل عمران:۸۵)

''اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ اُس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

وجہ اس کی یہ ہے کہ دین اسلام کے قواعد وضوابط اور اوامر ونواہی خود انسان کے خالق نے بنائے ہیں اور خالق اپنے علم' قدرت' اختیار اور حکمت میں بے مثل و بے مثال ہے۔ اس کی تخلیق میں کسی طرح کا عیب یا نقص نہیں ہوسکتا' کیونکہ وہ خود ہر کمزوری اور عیب سے پاک ہے۔ اس نے جو ضابطۂ حیات انسان کے لیے پسند کیا ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس بات کا اعلان خود اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے آخری ایام میں ان الفاظ کے ساتھ کر دیا تھا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِيْنًا ؕ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارا دین (ضابطۂ حیات) مکمل کر دیا' اور تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطورِ دین پسند کرلیا''۔

یوں اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی تکمیل رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کر دی۔ اب قرآن اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اُس کا عملی نمونہ۔ چنانچہ قرآن پاک میں جگہ جگہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور

آپؐ کی زندگی کو بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ......﴾ (الاحزاب:٢١)

''بے شک تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے''۔

پھر فرمایا:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ﴿۳۳﴾﴾ (محمد)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو اور (اس کے خلاف کر کے) اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔''

اب مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے شب و روز کے مشاغل میں سیرتِ طیبہ سے راہنمائی حاصل کرے' کیونکہ سیرتِ طیبہ ہی وہ طرزِ زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپؐ کے طرزِ عمل کے خلاف کام کرنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۚ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا﴿۱۱۵﴾﴾ (النساء)

''اور جو کوئی خلاف کرے رسول کے' بعد اس کے کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی' اور پیروی کرے مسلمانوں کی راہ کے علاوہ کسی دوسری راہ کی تو ہم پھیر دیں گے اس کو جدھر کو وہ پھرا اور ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے' اور وہ بری جگہ ہے پھر جانے کی''۔

اسی پر بس نہیں بلکہ اللہ اور رسول کی خلاف ورزی پر قیامت کے دن کی رسوائی اور ندامت کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے کر دیا کہ اُس وقت اپنے خلافِ سنت عمل پر پچھتاوا کسی کام نہ آئے گا۔ آج موقع ہے کہ وہی کام کیے جائیں جو رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر کیے اور جن کے کرنے کا حکم دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَاۤ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا﴿۶۶﴾﴾ (الاحزاب)

''جس دن پھیرے جائیں گے اُن کے چہرے آگ کے اندر' کہیں گے اے
کاش! ہم نے فرمانبرداری کی ہوتی اللہ کی اور اطاعت کی ہوتی رسول کی''

پس دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہر مسلمان رسول اللہ ﷺ کی سادہ اور صاف زندگی کو نمونہ بناتے ہوئے وہی کام کرے جو آپؐ نے کیے ہیں یا اُن کا حکم دیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آپؐ نے خلفائے راشدین کے عمل کو بھی سند کا درجہ دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر کوئی چیز کتاب و سنت میں واضح نہ ہو تو صحابہ کرامؓ کے مجمع علیہ عمل کی پیروی کرو۔ آپؐ نے فرمایا:

((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) (ابوداوٗد' ترمذی)

''پس تمہارے اوپر لازم ہے کہ میرا طریقہ اختیار کرو اور میرے ہدایت یافتہ اور
راست رو خلفاء کا طریقہ اختیار کرو''۔

یوں آپؐ نے اُمت کے لیے مزید آسانی پیدا کر دی کہ اگر کسی معاملے میں سنت سے راہنمائی نہ مل رہی ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل دیکھ لیا جائے' کیونکہ صحابہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خود رسول اللہ ﷺ سے دین سیکھا۔ وہ قرآن کو خوب سمجھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ ان کے سامنے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی ہمہ وقت صحبت نے انہیں مزاجِ رسول کا شناسا بنا دیا تھا' لہٰذا ان کا طریقہ بھی سنت کی طرح مستند اور محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ آپؐ نے کسی کے عمل کو سند کا درجہ عطا نہیں کیا۔ تو اب ضروری ہوا کہ کتاب و سنت اور تعاملِ صحابہ تک محدود رہا جائے' کیونکہ اس کے علاوہ کسی عمل کو سند حاصل نہیں ہے کہ اسے اختیار کیا جائے۔

بدعت اُس کام کو کہتے ہیں جو بظاہر اچھا اور خوشنما ہو مگر نہ تو قرآن و سنت میں موجود ہو اور نہ ہی صحابہ کرامؓ کے عمل و کردار کا حصہ رہا ہو۔ ایسا کام خوشنما نظر آنے کے باوجود شریعت اسلامیہ میں ناپسندیدہ بلکہ گمراہی ہے۔ ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((...... مَنْ يَعِشْ مِنْكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ' فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِيْ وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّيْنَ الرَّاشِدِيْنَ' تَمَسَّكُوْا بِهَا وَ عَضُّوْا عَلَيْهَا

بِالنَّوَاجِذِ ' وَإِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْأُمُوْرِ ' فَإِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) (ابو داوٗد' ترمذی)

''جو کوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ پس تم پر میرے اور میرے ہدایت یافتہ اور راست رو خلفاء کے طریقے کی پیروی لازم ہے' اس کے ساتھ چمٹ جاؤ اور اسے اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑے رہنا' اور نئے نئے کاموں سے بچتے رہنا' کیونکہ ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔

بدعت اس لیے مردود و مسترد ہے کہ یہ دین میں مداخلت ہے۔ دین تو مکمل ہو چکا' زندگی کے شب و روز گزارنے کا مستند اور محفوظ طریقہ ہمارے پاس موجود ہے' اب اس میں کسی طرح کے اضافے کی گنجائش نہیں۔ جس طرح دین میں کسی طرح کی کمی کرنا جائز نہیں اسی طرح اضافہ بھی جائز نہیں' کیونکہ متناسب اور مکمل چیز وہی ہوتی ہے جس میں کمی بھی اُس کے کمال میں نقص پیدا کر دے اور اضافہ بھی بگاڑ پیدا کرے۔ عام طور پر کمی کا نقص پیدا کرنا تو سمجھ میں آ جاتا ہے مگر اضافہ ناگوار معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہم انسان کی بنائی ہوئی کسی بھی مکمل اور خوبصورت چیز میں اضافے کی گنجائش موجود پاتے ہیں' اسی طرح دین کو بھی مزید مزین کرنے کی کوشش کو ناپسندیدہ نہیں سمجھتے' حالانکہ ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دین تو اللہ کا بنایا ہوا اور مکمل کیا ہوا ہے' اس میں اب ذرّہ برابر اضافہ بھی اُسی طرح اس کے حسن کو متاثر کرے گا جس طرح اس میں سے کسی شے کو کم کر دینا۔ دین اسلام کی تکمیل کو انسان کی مکمل کردہ شے کی طرح سمجھنا سخت نادانی ہے۔ ایک شخص اپنا مکان تعمیر کرتا ہے' اس پر کثیر رقم خرچ کر کے ضرورت کی ہر شے مہیا کرتا ہے' عمارت کے ظاہری حسن کو قیمتی پتھروں اور رنگ برنگے شیشوں کے ساتھ مزین کرتا ہے' بجلی کے قمقموں کے ساتھ روشنی کا وافر بندوبست کرتا ہے' گویا اس کو ہر لحاظ سے مکمل کر لیتا ہے۔ یہ کام ایک انسان نے انتہائی جدوجہد کر کے اور ضروری وسائل استعمال کر کے مکمل کیا ہے' مگر عین ممکن ہے کہ اس کا کوئی دوست اس کے ہاں آئے اور صاحب خانہ کو کوئی خامی بتائے اور مزید بہتر کرنے کی تجویز دے جسے صاحب خانہ بھی

تسلیم کر لے۔ مگر دین میں جو خدا کا بنایا ہوا ہے اور مکمل کیا ہوا ہے اس میں اس طرح کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ کوئی شخص اس میں اضافہ تجویز کرے اور وہ قبول بھی کر لیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم بنایا۔ خوبصورت شکل وصورت اور متناسب اعضاء وجوارح عطا کیے۔ اگر اس کے کسی عضو میں خامی واقع ہو جائے تو اس کے جسم میں نقص پیدا ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر انسان کے چہرے پر دو آنکھیں سجائی گئی ہیں' اگر خدانخواستہ ایک آنکھ ضائع ہو جائے یا بالکل بند ہو جائے تو انسان کا وہی خوبصورت چہرہ بھیانک صورت اختیار کر لے گا۔ اسی طرح انسان کی متناسب اور موزوں ترکیب میں اضافہ بھی نقص اور برائی پیدا کر دے گا۔ غور کیجیے اگر کسی آدمی کے چہرے پر دو کی بجائے تین آنکھیں ہوں تو کیا اس ایک آنکھ کا اضافہ اس کو حسین تر کر دے گا؟ ہرگز نہیں' بلکہ وہ تو اسے بدصورت بنا دے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو چیز کمال کی انتہا پر ہو اُس میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ صاف ظاہر ہے کہ جس چیز میں ابھی مزید بہتری کی گنجائش ہو اسے اکمل اور مکمل تو نہیں کہا جا سکتا۔ پہلے ذکر ہو چکا کہ انسان کی بنائی ہوئی کوئی شے اکمل اور مکمل ایک حد تک تو ہو سکتی ہے' مگر ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس میں مزید خوبی پیدا کرنے کی گنجائش نہ ہو' کیونکہ انسان بہرحال انتہا درجے کی ذہانت اور صلاحیت کے باوجود کمزوریاں رکھتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ نہیں' وہ ہر طرح کے عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔ اس لیے اس کا ہر کام کمالِ حکمت کا مظہر ہے۔ اس نے جس چیز کو تکمیل کے آخری مرحلے پر پہنچا دیا اب اس میں کمی کرنا اور زیادتی کرنا دونوں ایک جیسے جرم ہیں۔

دین اسلام کو اللہ تعالیٰ نے مکمل کر دیا۔ اب جو چیزیں اس میں داخل کر دی گئی ہیں بس وہی اس کے اجزاء ہیں۔ اگر اس کے اجزاء میں اضافہ کیا جائے گا تو وہ دین کے چہرے کو مزید خوشنما نہیں بنائے گا بلکہ بدنما کر دے گا۔ اسی لیے جو شخص رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو انسانیت کے لیے اُسوۂ حسنہ سمجھتا ہے اس کے دل میں تو کبھی یہ خیال نہیں گزر سکتا کہ رسول اللہ ﷺ کی مسنون چیزوں کے علاوہ بھی کوئی چیز دین کا جزو بن کر محل ثواب ہو سکتی ہے۔ آپؐ کی زندگی میں بچوں کی پیدائش اور خوشی کے دیگر مواقع بھی آئے'

چھوٹوں اور بڑوں کی وفات کا غم بھی آپ ؐ کو پیش آیا۔ ایسے مواقع پر رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل ہی پسندیدہ' جامع اور مکمل ہے'اس پر کسی طرح کا اضافہ نہ صرف یہ کہ قابل تحسین نہیں بلکہ مذمت کے لائق ہے۔

دین مکمل ہو چکا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ اس کے اوامر پر عمل کریں اور نواہی سے رکیں' اپنی طرف سے دین کے کسی کام میں ہرگز نہ کوئی کمی کریں اور نہ اضافہ' یہ دونوں ہی مذموم ہیں۔ کمی کا برا ہونا تو ظاہر ہے مگر زیادتی بھی اتنی ہی بری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اَحْدَثَ فِیْ اَمْرِنَا ھٰذَا مَا لَیْسَ مِنْہُ فَھُوَ رَدٌّ)) (متفق علیہ)

''جس شخص نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات پیدا کی جو دین میں نہیں تو وہ نامقبول ہے''۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بدعت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب وسنت اور قرونِ مشھود لہا بالخیر میں نہ ہو اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کر کیا جائے۔''

پس دین کے اندر کچھ تہواروں اور رسوم کا اپنی طرف سے اضافہ بدعت ہی ہے۔ اس کی ایک واضح پہچان یہ ہے کہ ان تہواروں کے منانے یا رسوم کی ادائیگی کا پروگرام شریعت سے نہیں ملے گا' بلکہ خود انسانوں کو اپنی خواہش کے مطابق ترتیب دینا ہوگا۔ غور کیجیے عید الفطر اور عید الاضحیٰ اسلامی تہوار ہیں۔ ان تہواروں کو منانے کا طریقہ اور پروگرام آپ کو قرآن وسنت اور عمل صحابہ ؓ سے مل جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر کسی دن کو عید کا نام دیا جائے تو اس دن کا پروگرام کہاں سے لیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ انسان اپنی پسند کے مطابق وہ پروگرام وضع کرے گا۔ تو کسی انسان کا وضع کردہ پروگرام دین کا حصہ کیسے بن سکتا ہے! پھر اسلام کی تعلیمات میں اور بہت کچھ ڈالا جا سکتا تھا' مگر دانستہ طور پر خالق نے اوامر کو مختصر اور سادہ رکھا تاکہ اس پر عمل کرنا عوام الناس کے لیے آسان ہو۔ یہ تو بنی اسرائیل کا طریقہ تھا کہ انہوں نے بہت سے رسوم ورواج دین کے نام پر شروع کر دیے

تھے اور اس طرح دین کو مشکل بنا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو بھیج کر اُن اِصر واَغلال (دیکھئے الاعراف: ۱۵۷) کے بوجھ سے انسان کو آزاد کیا اور دین میں آسانی پیدا کی اور یہی اللہ کی مرضی بھی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا''۔

پس دین کے اندر اضافے کر کے دین کی سادگی کو قائم نہ رہنے دینا اور مشکلات پیدا کرنا ہرگز محمود عمل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو قرآن کے الفاظ میں حکم دیتا ہے یا رسول اللہ ﷺ کی زبان سے احکام صادر فرماتا ہے۔ ایسے احکام کی تعمیل لوگوں پر لازم ہوتی ہے۔ یا پھر صحابہ کا عمل لوگوں کے لیے اختیار کرنا جائز ہے۔ اس کے علاوہ آج کون ہے جو اپنی طرف سے اُمت محمدؐ کو کسی کام کے بجا لانے کا حکم خود اپنی خواہش کے مطابق دے سکے اور اُمت اُس کے اختیار کرنے کی بھی اسی طرح پابند ہو جیسے کتاب وسنت کے احکام کی؟ یہ طرزِ عمل تو خود کو رسولؐ کے مقام پر لا کھڑا کرنے کے مترادف ہے جو نری ہلاکت ہے۔ پس بدعات سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ ہمارے لیے وہی اعمال بہت کافی ہیں جو شریعت میں ہمارے لیے مقرر کر دیے گئے ہیں۔ اگر ہم ان کو صحیح انداز میں اپنا سکیں تو فھو المطلوب۔

بدعت انتہائی نامعقول عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ)) (سنن النسائی)

''ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ڈالے جانے کے لائق ہے''۔

یہی تو انسان کا امتحان ہے کہ وہ اپنی پسند و ناپسند کو احکامِ شریعت کے تابع رکھے۔ شریعت کی روشنی کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے مطابق جو بھی عمل کیا جائے خواہ وہ کتنا ہی بھلا معلوم ہو اور نیت کتنی ہی اچھی ہو' نفسانی خواہش کی پیروی کی وجہ سے مردود و مسترد ہے۔ یہاں اس سوال میں کوئی معقولیت نہیں کہ ریل اور ہوائی جہاز پر سواری کیوں کی جاتی ہے جبکہ ان پر سواری نہ تو رسول اللہ ﷺ نے کی نہ صحابہ کرامؓ نے' اس کا جواب یہ ہے کہ ریل اور

ہوائی جہاز دنیاوی چیزیں ہیں دین نہیں۔ مادی ایجادات سے شریعت کے اصولوں کے مطابق فقہاء کرام کی راہنمائی میں استفادہ کرنا بالکل جائز ہے' مگر بزعم خویش اچھی سے اچھی رسم ایجاد کرنا اور دوسروں کو اس عمل کی تلقین کرنا اور اس عمل کو کارِ ثواب سمجھنا بدعت ہے۔آج مسلمان مساجد میں نئی نئی رسموں کی ادائیگی کے لیے مجالس منعقد کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ان میں شامل ہو کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔ ایسی خود ساختہ مجالس کا انعقاد ہی جائز نہیں تو ان پر ثواب کیسا؟ مگر ع دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے! انسان کو فریب نفس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے' ورنہ شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ سبز باغ دکھا کر انسان کو غلط کام پر آمادہ کر لیتا ہے۔ جب آدمی فی سبیل اللہ خرچ کرنے لگتا ہے جو سراسر فائدے کی بات ہے تو شیطان نمود و نمائش پر اکساتا ہے تاکہ یہ عمل اکارت چلا جائے' یا پھر سرے سے خرچ کرنے ہی سے یہ کہہ کر روک دیتا ہے کہ خرچ کرو گے تو مفلس ہو جاؤ گے' یا پھر ایسی جگہ خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے جہاں خرچ مشروع نہ ہو۔ چنانچہ صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اُس کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے لیے قرآن و سنت اور عمل صحابہؓ کی طرف رجوع کیا جائے' تاکہ فریب نفس اور اغوائے شیطان سے محفوظ رہا جا سکے۔

قرض کالین دین اور اسلامی تعلیمات

قرض لینا اچھی بات نہیں' مگر دنیا میں رہتے ہوئے ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ قرض لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں اس ناگزیر ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے قرض کے لین دین کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں دوسرے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ وہاں قرض کے معاملات کے سلسلہ میں آداب وہدایات سورۃ البقرۃ میں بتائے گئے ہیں۔ یہاں قرض کے معاملات کو گواہوں کی موجودگی میں لکھ لینے کی تاکید کی گئی ہے' تاکہ رقم کی مقدار اور ادائیگی کے طریق کار میں بھول چوک کا امکان نہ رہے۔ پھر قرض کے لین دین میں مدت کا تعین بھی کئی الجھنوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسی طرح قرض کے معاملے میں کوئی چیز رہن رکھنے کی بھی اجازت ہے' البتہ احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شے مرہونہ سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

قرض لینا بھاری ذمہ داری ہے۔ قرض دار کو قرضہ کی رقم واپس کرنا ہوتی ہے۔ جب تک وہ قرض کی رقم واپس نہیں کرتا وہ زیر بار رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ قرض کی رقم ہو تو اُس وقت تک وہ سبکدوش نہیں ہوتا جب تک اس کے وارث وہ رقم ادا نہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ جب کوئی جنازہ آتا تو پوچھ لیتے کہ اس کے ذمہ کوئی قرض تو نہیں ہے! اگر قرض ہوتا تو اس کا جنازہ پڑھنے سے گریز کرتے۔ ایک دفعہ ایک جنازہ آیا' آپ ﷺ نے پوچھا: ''اس کے ذمہ قرض ہے؟'' بتایا گیا نہیں۔ تو آپؐ نے اس کا جنازہ پڑھا دیا۔ پھر ایک اور جنازہ لایا گیا۔ آپؐ نے پوچھا: ''اس کے ذمہ قرض ہے؟'' بتایا گیا ہاں۔ پوچھا: ''یہ کچھ چھوڑ کر مرا ہے؟'' بتایا گیا کہ ہاں تین دینار۔ پس آپؐ نے اس کا جنازہ پڑھا دیا۔ پھر تیسرا جنازہ لایا گیا۔ آپؐ نے پوچھا: ''اس کے ذمہ قرض ہے؟'' بتایا گیا ہاں تین دینار۔ آپؐ نے

پوچھا: ''کیا اس نے کوئی ترکہ چھوڑا؟'' لوگوں نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم خود ہی اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھ لو''۔ یہ سن کر ابو قتادہؓ نے عرض کی: یا رسول اللہ ﷺ! اس کا جنازہ پڑھا دیجیے! اس کے قرض کا ذمہ میں لیتا ہوں۔ چنانچہ آپؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھا دی۔(۱)

ابتدا میں تو یہ صورت حال رہی، مگر بعد ازاں جب افلاس و ناداری کا دور ختم ہو گیا تو آپؐ نے اعلان فرما دیا کہ جو شخص اس حال میں مر جائے کہ اس کے ذمہ قرض ہو تو اس کے قرضے کی ادائیگی میں کر دیا کروں گا۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ مرنے والا اپنے سر پر قرضہ لے کر مرے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف تو خوشحال لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ضرورت مند بھائیوں کو قرض دیں اور اس کی وصولی میں سختی نہ کریں، بلکہ سہولت کا رویہ اپنائیں، دوسری طرف قرض لینے والوں کو ہدایت کی کہ وہ جلد از جلد قرضے کی ادائیگی کی کوشش کریں۔ اگر خدانخواستہ وہ قرض ادا کیے بغیر اس دنیا سے چلے گئے تو آخرت میں یہ معاملہ ان کے لیے سنگین نوعیت کا ہوگا اور اس کی معافی بھی نہ ہو سکے گی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَعْظَمَ الذُّنُوْبِ عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ يَّلْقَاهُ بِهَا عَبْدٌ بَعْدَ الْكَبَائِرِ الَّتِيْ نَهَى اللّٰهُ عَنْهَا اَنْ يَمُوْتَ رَجُلٌ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ لَا يَدَعُ لَهٗ قَضَاءً))(۲)

''ان کبیرہ گناہوں کے بعد جن سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع فرمایا ہے، سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اس حال میں مرے کہ اس پر قرض ہو اور اس کی ادائیگی کا سامان نہ چھوڑ گیا ہو۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

۱) صحیح البخاری، کتاب الحوالات، باب ان احال دین المیت علی رجل جاز۔

۲) سنن ابی داوٗد، کتاب البیوع، باب فی التشدید فی الدّین۔

((نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهٖ حَتّٰی یُقْضٰی عَنْهُ))[٣]

''مؤمن بندے کی روح اس کے قرضہ کی وجہ سے بیچ میں معلق رہتی ہے جب تک وہ قرض ادا نہ کر دیا جائے جو اُس پر ہے۔''

اس لیے ایسے شخص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے وارث جلدی سے جلدی اس کا قرض ادا کر دیں تاکہ مرنے والا راحت اور رحمت کے اس مقام پر پہنچ سکے جو مؤمنین صالحین کے لیے موعود ہے۔

قرض کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ شہید ہونے والے مردِ مؤمن کے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں سوائے قرض کے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((یُغْفَرُ لِلشَّهِیْدِ کُلُّ ذَنْبٍ اِلَّا الدَّیْنَ))[٤]

''شہید ہونے والے مردِ مؤمن کے سارے گناہ (راہِ خدا میں جان کی قربانی دینے کی وجہ سے) بخش دیے جاتے ہیں بجز قرض کے۔''

یہ اس لیے کہ حقوق العباد کا معاملہ بڑا سخت ہے۔ جس کے حقوق تلف کیے گئے ہوں وہ خود ہی بخشے گا تو بخشے جائیں گے۔ اسی طرح یا تو قرضہ ادا کیا جائے یا پھر دائن قرضے کی رقم معاف کر دے' ورنہ وہ قرضہ مؤمن کے لیے انتہائی مصیبت کا باعث بنے گا۔

حضرت ابوقتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یارسول اللہ ﷺ! مجھے بتلایئے کہ میں اللہ کے راستے میں صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ اور اللہ کی رضا اور ثوابِ آخرت کی خاطر جہاد کروں اور مجھے اس حالت میں شہید کر دیا جائے کہ میں پیچھے نہ ہٹ رہا ہوں (بلکہ پیش قدمی کر رہا ہوں)' تو کیا (اس شہادت اور قربانی کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے گا؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا: ''ہاں''۔ پھر جب وہ آدمی لوٹنے لگا تو آپؐ نے اس کو پھر پکارا

---

٣) سنن الترمذی' کتاب الجنائز عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء عن النبی ﷺ انه قال: ((نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَیْنِهٖ))

٤) صحیح مسلم' کتاب الامارة' باب من قتل فی سبیل اللہ کفرت خطایاہ الا الدَّین۔

اور فرمایا:

((نَعَمْ وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ اِلَّا الدَّيْنَ ' فَاِنَّ جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ لِيْ))(٥)

''ہاں' بشرطیکہ تم ثابت قدم ہو' اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید رکھو' میدانِ جنگ میں آگے بڑھنے والے بنو نہ کہ پیچھے ہٹنے والے' سوائے قرض کے' یہ بات مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے کہی ہے''۔

جب قرض کا معاملہ اتنا سنگین ہے تو انتہائی مجبوری کے سوا قرض ہرگز نہیں لینا چاہیے۔ مکان کی تعمیر یا کاروبار کرنے کے لیے کچھ قرض لینا پڑے تو مناسب حد تک قرض لیا جا سکتا ہے اور وہ بھی اتنی مقدار میں جسے واپس کرنا ممکن نظر آ رہا ہو۔ مگر شادی بیاہ اور مرگ کی فضول رسموں کی ادائیگی اور بدعات کے لیے رقم قرض لینا ہرگز عقل مندی نہیں۔ ایک تو فضول رسمیں بذاتِ خود گناہ کا کام ہیں اور پھر اس گناہ کے کام پر ادھار کی رقم خرچ کرنا تو انتہائی حماقت ہے۔ یہ تو دنیا کی خاطر عاقبت برباد کرنے کے مترادف ہے۔

اوپر ذکر ہوا کہ انتہائی ناگزیر صورت میں قرض لینے کی اجازت ہے۔ یہ قرض اتنی مقدار میں ہو کہ لینے والے کے لیے مستقبل میں اس کا ادا کرنا ممکن ہو اور اُس کی نیت بھی ادا کرنے کی ہو۔ ان حالات میں اور اس نیت کے ساتھ قرضہ لیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی واپسی کے لیے سازگار حالات پیدا فرما دیتا ہے۔ جو شخص اس نیت سے قرضہ لیتا ہے کہ اس کا ارادہ واپس کرنے کا نہیں ہوتا تو اسے نہ تو واپسی کی توفیق ہوتی ہے اور نہ ہی وہ قرضے سے فارغ ہوتا ہے' بلکہ وہ قرضہ دنیا میں بھی اس کے لیے وبال بن جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيْدُ أَدَاءَ هَا اَدَّى اللّٰهُ عَنْهُ وَمَنْ أَخَذَ يُرِيْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللّٰهُ))(٦)

---

٥) صحیح مسلم' کتاب الامارة' باب من قتل فی سبیل اللہ کفرت خطایاہ الا الدَّین۔

٦) صحیح البخاری' کتاب فی الاستقراض واداء الدیون والحجر والتفلیس' باب من اخذ اموال الناس یرید اداء ھا او اتلافھا۔

''جو شخص لوگوں سے ادھار مال لے اور اس کی نیت اور ارادہ ادا کرنے کا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی توفیق سے اس سے ادا کرا دے گا' اور جو کوئی کسی سے ادھار لے اور اس کا ارادہ ہی ہڑپ کر لینے کا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو تلف اور تباہ کر دے گا۔''

مقروض کو چاہیے کہ وہ قرض دینے والے کا شکر گزار ہو اور اس کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرے۔ نہ صرف ادائیگی خوش اسلوبی سے کرے بلکہ کچھ زائد رقم بھی دے دے تو یہ مستحسن ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہی طرزِ عمل تھا۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ:

كَانَ لِيْ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ دَيْنٌ فَقَضَانِيْ وَزَادَنِيْ (۷)

''میرا رسول اللہ ﷺ پر کچھ قرض تھا تو آپؐ نے جب وہ ادا فرمایا تو کچھ رقم زیادہ واپس کی۔''

اس طرح کی زائد رقم پر ربا کا اطلاق نہیں ہوتا' کیونکہ یہ رقم نہ تو کسی شرط کے تحت طے شدہ ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا مطالبہ کیا جاتا ہے' بلکہ یہ تو محض حسن سلوک کے طور پر رضاکارانہ ہوتی ہے۔ اس لیے یہ سود نہیں بلکہ تبرع اور احسان ہے۔ اس طرح کی سنتوں کو رواج دینا آج کی ضرورت ہے۔

ایک ضرورت مند شخص ادھار مانگتا ہے۔ ایسے شخص کی مدد کرنا اور اسے قرض کی رقم فراہم کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ مقروض کو ایسے شخص کے احسان کو یاد رکھنا چاہیے اور رقم کی جلد از جلد واپسی کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر مقروض وقت پر رقم ادا نہ کر سکے اور اس کی بدحالی اور مجبوری کے پیش نظر قرض کا تقاضا کرنے والا اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے اسے مہلت دیتا ہے اور نرمی اختیار کرتا ہے تو بہت بڑا ثواب حاصل کرتا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا اِذَا بَاعَ وَاِذَا اشْتَرٰى وَاِذَا اقْتَضٰى))(۸)

---

۷) سنن ابی داوٗد' کتاب البیوع' باب فی حسن القضاء۔

۸) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب السھولۃ والسماحۃ فی الشراء والبیوع ومن طلب حقا۔

''اللہ کی رحمت ہو اُس بندے پر جو بیچنے میں' خریدنے میں اور اپنے حق کا تقاضا کرنے اور وصول کرنے میں نرم اور فراخ دل ہو''۔

بخاری اور مسلم میں ایک حدیث ہے کہ ایک شخص سے اُس کی موت کے بعد پوچھا جائے گا کہ اپنی دُنیوی زندگی پر نظر ڈال اور بتا کہ تیرا کوئی نیک عمل ہے جو تیرے لیے وسیلۂ نجات بن سکے؟ وہ عرض کرے گا کہ میرے علم میں میرا کوئی ایسا عمل نہیں' سوائے اس کے کہ میں لوگوں کے ساتھ کاروبار اور خرید و فروخت کا معاملہ کیا کرتا تھا تو میرا رویہ ان کے ساتھ درگزر اور احسان کا ہوتا تھا۔ میں مال دار کو بھی مہلت دیتا تھا اور غریبوں اور مفلسوں کو معاف بھی کر دیتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ اس شخص کے لیے جنت میں داخلہ کا حکم فرما دے گا۔(۹)

ضرورت مند کو قرض دے کر تقاضا کرنے میں نرمی اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا ہی محبوب اور مقبول عمل ہے۔ حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' آپؐ ارشاد فرماتے تھے:

((مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَظَلَّهُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهِ))(۱۰)

''جو بندہ کسی غریب تنگدست کو مہلت دے یا معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سایۂ رحمت میں لے لے گا''۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ لَهٗ عَلٰى رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ اَخَّرَهٗ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ))(۱۱)

''جس آدمی کا کسی دوسرے بھائی پر کوئی حق (قرضہ وغیرہ) واجب الادا ہو اور وہ اس مقروض کو ادا کرنے کے لیے دیر تک مہلت دے دے تو اُس کو ہر دن کے عوض صدقہ کا ثواب ملے گا''۔

اسی طرح قرض دے کر کسی ضرورت مند کی مدد کرنا بہت بڑا کارِ ثواب اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول عمل ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

۹) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

۱۰) صحیح مسلم' کتاب الزھد والرقائق' باب حدیث جابر الطویل وقصة ابی الیسر۔

۱۱) مسند احمد' کتاب اوّل مسند البصریین' باب حدیث عمران بن حصین۔

((دَخَلَ رَجُلٌ الْجَنَّةَ فَرَاٰی عَلٰی بَابِهَا مَكْتُوبًا : اَلصَّدَقَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا وَالْقَرْضُ بِثَمَانِيَةَ عَشَرَ))(۱۲)

''ایک آدمی جنت میں داخل ہوا تو اس نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا کہ صدقہ کا اجر و ثواب دس گنا ہے اور قرض دینے کا اٹھارہ گنا۔''

یہ کسی مردِ صالح کا خواب ہو سکتا ہے یا پھر خود آپ ﷺ کا مشاہدہ۔ اس دوسرے احتمال کی تائید ابن ماجہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے جبریل سے پوچھا قرض میں کیا خاص بات ہے کہ وہ صدقہ سے افضل ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ سائل اس حالت میں بھی سوال کرتا اور صدقہ لے لیتا ہے جبکہ اس کے پاس کچھ ہوتا ہے اور قرض مانگنے والا قرض جب ہی مانگتا ہے جب وہ محتاج اور ضرورت مند ہوتا ہے''۔(۱۳)

بعض اوقات آدمی مفلسی کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے' مگر اس کی عزتِ نفس یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ کسی سے صدقہ وخیرات یا زکوۃ لے کر اپنی اور بچوں کی ضرورت پوری کرلے' بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی صاحب خیر سے رقم بطورِ قرض مل جائے۔ تو ایسے محتاج کو قرض دینا یقیناً صدقہ اور خیرات سے بھی افضل ہے۔

حاصل کلام یہ کہ عام حالات میں قرض لینے سے ضرور بچنا چاہیے' کیونکہ قرض بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ اگر اس کو واپس نہ کیا جائے تو اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ خود صاحب مال معاف کر دے' مگر قیامت میں کون معاف کرے گا جب کہ نفسا نفسی کا عالم ہو گا؟ خاص طور پر شادی بیاہ اور مرگ کی فضول رسومات کو قرض لے کر پورا کرنا دُنیوی اور اُخروی دونوں اعتبارات سے خسارے کا موجب ہے۔ پھر خود ساختہ بدعات کے لیے قرض لے کر خرچ کرنا تو اور بھی برا ہے۔ قرض انتہائی مجبوری میں لینا چاہیے اور واپس کرنے کی نیت سے لینا

---

۱۲) رواہ الطبرانی فی الکبیر۔

۱۳) سنن ابن ماجہ' کتاب الاحکام' باب القرض۔

چاہیے۔ایسے قرضے کی واپسی کے لیے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد شامل حال ہو جاتی ہے۔ حقیقی ضرورت مند کو قرض دینا بہت بڑی نیکی ہے' بلکہ جیسا کہ اوپر گزرا' ایسا قرض صدقے سے بھی افضل ہے۔

قرض کے لین دین کی دستاویز تیار کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر اس حکم کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور مروّت کے پیش نظر قرض کی رقم اور شرائط ادائیگی پر مشتمل تحریر کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔مگر بعدازاں جب جھگڑے اٹھتے ہیں تو اس حکم کی اہمیت اور اسے نظرانداز کرنے کے نقصانات سامنے آتے ہیں۔ اس لیے قرض کا معاملہ چاہے اپنوں کے ساتھ ہو یا غیروں کے ساتھ' اسے گواہوں کی موجودگی میں تحریر کر لینا ضروری ہے۔بعض اوقات مقروض بروقت قرض ادا نہیں کر سکتا اور مزید مہلت کا خواستگار ہوتا ہے۔ایسی صورت میں اسے مہلت دینا بہت بڑی نیکی ہے' کیونکہ ایسا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جو مال و دولت اس کے پاس ہے اصل میں وہ اللہ ہی کا مال ہے اور اس مال و دولت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا یہ اچھا طریقہ ہے کہ ضرورت مند اور محتاج بندوں کو مال ادھار دیا جائے اور انہیں واپس ادائیگی میں سہولت دی جائے۔

مَتَاعُ الْغُرُوْرِ

متاعُ الغُرور کا معنی ہے دھوکے کا سامان۔ قرآن حکیم میں دنیا کی زندگی کو متاعُ الغُرور کہا گیا ہے۔ غَرَّ یَغُرُّ دھوکہ دینے کے معنوں میں آتا ہے۔ سورۃ الانفال میں ہے: ﴿غَرَّ هٰۤؤُلَآءِ دِیْنُهُمْ ؕ﴾ (آیت ۴۹) "دھوکہ دیا اُن کو اُن کے دین نے"۔ سورۃ الانعام میں فرمایا: ﴿وَغَرَّتْهُمُ الْحَیٰوةُ الدُّنْیَا﴾ (آیت: ۱۳۰) "اور دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکہ دیا"۔ اسی طرح ان معنوں میں یہ لفظ قرآن حکیم میں کئی جگہ آیا ہے۔ اسی سے غرور اور مغرور کے الفاظ بنے ہیں جن کا معنی بالترتیب "دھوکہ" اور "دھوکہ کھایا ہوا" ہیں۔ یہ دونوں لفظ اردو میں بھی مستعمل ہیں مگر اردو میں غرور تکبر کے معنوں میں اور مغرور متکبر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ تکبر اصل میں دھوکہ ہی ہے' کیونکہ جو تکبر کرتا ہے اُسے اپنی بڑائی کا زعم ہو رہا ہوتا ہے' حقیقت میں وہ بڑا نہیں ہوتا۔ اُس کی بڑائی عارضی اور ناپائیدار ہے' وہ آناً فاناً اپنی بڑائی سے محروم ہو سکتا ہے۔ پس مغرور اصل میں وہی شخص ہے جسے اپنی کسی صلاحیت یا فضیلت پر دھوکہ ہو رہا ہو۔

دنیا کی زندگی بہت بڑی حقیقت ہے جسے قرآن میں متاعُ الغُرور (دھوکے کا سامان) کہا گیا ہے۔ انسان دنیا میں امتحان کی غرض سے بھیجا گیا ہے۔ اسے متنبہ کر دیا گیا ہے کہ اس کی دُنیوی زندگی کا خاتمہ موت کے ساتھ ہو جائے گا اور حتمی' یقینی اور نہ ختم ہونے والی زندگی کا آغاز ہو جائے گا۔ پھر یا تو ابدی آرام و راحت ہو گا یا دردناک عذاب۔ دنیا کی زندگی دھوکہ ان معنوں میں ہے کہ انسان یہاں کی رونق' دلکشی اور لہو و لعب کو حقیقت سمجھ کر اُن پر ریجھ جاتا ہے۔ اُس کی ساری تگ و دو کا محور پیسہ اکٹھا کر کے اچھی رہائش' اچھی سواری' اچھا لباس اور اچھی بود و باش فراہم کرنا ہوتا ہے اور اس

مشغولیت میں وہ اس قدر الجھ جاتا ہے کہ آنے والی حقیقی زندگی کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا انسان کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ سورۃ آل عمران (آیت ۱۸۵) اور پھر سورۃ الحدید (آیت ۲۰) میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ''اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سامان ہے''۔ یعنی یہاں کی چمک دمک نرا دھوکہ ہے' اس سے بچ کر رہیے!

انسان کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے شیطان بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ اسی لیے اُسے قرآن مجید میں ''اَلْغَرُوْرُ'' (غ پر زبر کے ساتھ) ''بہت بڑا دھوکے باز'' کہا گیا ہے اور اُس کے دھوکے میں نہ آنے کی تلقین کی گئی ہے۔ سورۃ الحدید میں ارشاد ہوا: ﴿وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾ ''اور اُس بڑے دھوکے باز (شیطان) نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکے میں مبتلا کیے رکھا''۔ وہ اتنا زبردست دھوکے باز ہے کہ وہ انسانِ اوّل علیہ السلام کو سبز باغ دکھانے میں کامیاب ہو گیا۔ انسان جو بداعمالیاں کرتا ہے شیطان اُسے مطمئن کرتا ہے کہ یہ گناہ کے کام نہیں' بلکہ اچھے کام ہیں۔ اُن برے کاموں کے جواز میں وہ طرح طرح کے عذر سکھاتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الانعام) ''اور شیطان نے انہیں اُن کاموں کو جو انہوں نے کیے ہیں' مزین کر کے دکھایا''۔ اسی طرح متعدد جگہ پر فرمایا گیا ہے: ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ ''اور مزین کر کے دکھائے شیطان نے ان لوگوں کو اُن کے اعمال''۔ یہ الفاظ قرآن مجید کی چار سورتوں الانفال' النحل' النمل اور العنکبوت میں آئے ہیں۔

دنیاوی زندگی میں حسن و جمال' رعنائی' خوش نمائی اور دلکشی پیدا کی گئی ہے۔ یہ بھی اسی لیے کہ انسان کا امتحان ہو جائے۔ گویا ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کے وہ یہ کہتے ہیں
اِدھر آتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ جاتا ہے!

اسی حقیقت کو قرآن مجید میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ

الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ (آل عمران)

''مزین کر دی گئی لوگوں کے لیے مرغوب چیزوں کی محبت' جیسے عورتیں' بیٹے سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان زدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیتی۔ یہ سامان ہے دنیا کی زندگی کا' اور اللہ ہی کے پاس ہے اچھا ٹھکانہ''۔

پس دنیا کی زندگی میں حد درجہ کشش اور محبت رکھی گئی ہے۔ تاہم دنیا کی حقیقت بھی اُسی زور کے ساتھ واضح کر دی گئی ہے کہ ساز و سامانِ دنیا کی کشش میں کھو جانا نری ناکامی ہے۔ جسے اس امتحان میں ناکامی منظور ہو وہ دنیا کی زینت میں بے شک کھب جائے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا:

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

مگر حقیقت شناس لوگ ہمیشہ vigilant رہیں گے کہ نقد راحت و آرام کی تلاش میں سرگرداں ہونے کے بجائے یہاں حقیقی اور جاوداں زندگی کے حصول کے لیے کوشش کی جائے۔ البتہ آزاد منش' غیر سنجیدہ اور نادان لوگ جن کے سامنے حیاتِ دُنیوی کا مقصد واضح نہیں' یا جانتے بوجھتے انہوں نے اُسے بھلا دیا ہے' وہ اس زندگی کو ہی سب کچھ سمجھے بیٹھے ہیں' ایسے ہی لوگ خسارے میں ہیں۔ کافروں کا یہی حال ہے اور کافرانہ اندازِ زندگی بھی اسی طرح ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ (البقرۃ:۲۱۲) ''مزین کر دی گئی ہے کافروں کے لیے دنیا کی زندگی''۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انجام سے غافل گمراہی میں پڑ کر صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے ہیں اور دنیاوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ اُن کا ایمان آخرت پر اوّل تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ اس قدر کمزور ہے کہ وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتا۔

دنیا کی زندگی کی حقیقت کو جاننا بہت ضروری ہے۔ قرآن اسے دھوکے کا سامان کہتا ہے۔ یہاں بدکردار لوگ دندناتے پھرتے ہیں' ظالموں نے ظلم و ستم کا بازار گرم کر

رکھا ہے' مالدار غریبوں کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں' سرمایہ دار' جاگیردار اور صنعت کار مزدوروں کا خون نچوڑ رہے ہیں' طاقت وروں نے کمزوروں کو غلام بنا رکھا ہے' حاکموں نے محکوموں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اس طرح بڑے لوگوں نے عیش وعشرت میں پڑ کر خود کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے کہ ع بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست! یعنی بابر عیش کر لو' دنیا میں بار بار نہیں آنا! دنیا کے ساز و سامان سے بھرپور فائدہ اٹھا لو' آخرت کی فکر کو ذہن پر سوار کر کے زندگی میں تلخی' مشقت اور تکدر کیوں پیدا کیا جائے!

دھوکہ کسے کہتے ہیں؟ یہی نا کہ کسی چیز کی حقیقت کو چھپا لینا! ظاہر کچھ اور ہو اور اندر کچھ اور۔ کامیابی دکھائی دے مگر اصل میں ناکامی ہو' مفید نظر آئے مگر ہو مضر۔ اب دیکھئے دنیا کی زندگی کس طرح دھوکے کا سامان ہے۔ سادہ سی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

ایک دولت مند ہے' اُس نے جائز یا ناجائز طریقے سے دولت اکٹھی کی ہے۔ گلی' محلے کے لوگ اُس سے مرعوب ہیں' اُسے جھک کر سلام کرتے ہیں اور جی حضور کہتے ہیں۔ اُس کے ہاں شادی کی تقریب ہے۔ وہ پانی کی طرح دولت بہاتا ہے۔ رقص وسرود کی محفل جماتا ہے' گھر کو رنگا رنگ روشنیوں کے ساتھ بقعۂ نور بنا دیتا ہے' آتش بازی کا مظاہرہ کرتا ہے' بلند آواز میں گانے بجا کر دُور دُور تک لوگوں کی نیندیں حرام کر دیتا ہے' تقریب ختم ہوئی' لوگوں کے دلوں میں اُس کا رعب اور زیادہ ہو گیا۔ دولت کی نمائش سے اُسے باوقار' خوشحال اور معزز لوگوں کی فہرست میں نمایاں مقام مل گیا۔ اب وہ پھولا نہیں سما رہا۔ غرور سے اس کی گردن تن گئی ہے۔ موت تو آئے گی' پھر ربّ کے حضور حاضر ہونا ہوگا۔ اس سے پوچھا جائے گا دولت کو کہاں استعمال کیا؟ فضول خرچی کی؟ فضول خرچ تو شیطان کے بھائی ہوتے ہیں! تم نے قرآن میں نہیں پڑھا تھا کہ ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِيْنَ كَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّيٰطِيْنِ﴾ (بنی اسرائیل:۲۷) تمہاری دولت میں مسکینوں' غریبوں کا حق تھا' وہ ادا نہیں کیا۔ انجامِ کار اس غفلت کی سزا بھگتنی پڑے گی اور اس اکڑی ہوئی گردن والے طرے باز کو گھسیٹ کر ذلت کے عذاب سے دوچار کر دیا جائے

گا۔ دیکھا دنیا کی شان وشوکت حقیقت کے اعتبار سے ذلت نکلی!

اسی طرح ایک آدمی کی چوری ہو جاتی ہے۔ بڑی تفتیش ہوئی مگر چوروں کا سراغ نہ ملا۔ جس کی چوری ہوئی اُس کا نقصان ہوا' گلی محلے کے لوگ' دوست احباب اُس کے پاس اظہارِ ہمدردی کے لیے آ رہے ہیں اور وہ اپنے نقصان پر افسردہ اور غمگین ہے۔ چوروں کا حال یہ ہے کہ جی میں پھولے نہیں سماتے' لوٹی ہوئی دولت سے عیش کر رہے ہیں' خوش ہو رہے ہیں' اتنی کامیاب چوری پر اپنے آپ کو شاباش دے رہے ہیں۔ موت آ گئی' مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے سامنے پیش ہوئے۔ اللہ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے۔ چوروں کو حکم دے گا کہ چوری کا مال اس کے مالک کو واپس کرو۔ وہ کہاں سے واپس کریں گے؟ اچھا اگر کوئی نیکیاں ہیں تو مال کے بدلے وہ مال کے مالک کو دے دو۔ اگر نیکیاں نہیں' یا ختم ہو گئی ہیں تو مال کے مالک کے گناہ اپنے سر لو۔ جب مال کے مالک کے گناہ چوروں کے کھاتے میں ڈالے جائیں گے تو چور حسرت و یاس کے ساتھ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے اور ذلت کے عذاب میں پڑیں گے' جبکہ جس کی چوری ہوئی تھی اور مال لٹ گیا تھا بدلے میں اُس کو نیکیاں ملیں اور گناہ دور ہوئے۔ یہ لوٹا ہوا مال اُس کے لیے نجات کا باعث بن گیا۔ ہو سکتا ہے وہ اپنے اعمال کے بل بوتے پر جنت میں نہ جا سکتا' مگر لوٹے ہوئے مال کے بدلے جو کچھ اسے ملا وہ اُسے جنت میں لے گیا۔ یہ شخص جو دنیا میں مال لٹ جانے پر افسردہ اور غمگین تھا' اب خوش ہو گیا۔ اب اُس نے جانا کہ دنیا کا غم اصل غم نہ تھا بلکہ غم کے بھیس میں حقیقی نجات کا سامان تھا۔

اس کے برعکس ایک ایسا مسکین اور نادار ہے جس پر فکرِ آخرت کا غلبہ ہے۔ وہ تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہے۔ وہ اپنی مشکلات پر قابو پانے کے لیے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہیں کرتا' زندگی حلال و حرام کی مکمل پابندی کے ساتھ گزار رہا ہے' تو اس شخص کا اگرچہ دنیاوی اعتبار سے کوئی مقام نہیں' لوگوں کے دل میں اُس کی کوئی عزت اور حیثیت نہیں' مگر یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا کی زندگی کو واقعی مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (دھوکے کا سامان) سمجھا ہے' دنیا کی چمک دمک اس کو غلط روی کی طرف لے جانے میں ناکام رہی ہے۔ یہ شخص

اپنی پوری بے بضاعتی کے باوجود فیصلے کے دن عزت کے مقام پر کھڑا ہوگا جبکہ بڑے بڑے منصب داراور دولت مند ذلت اور رسوائی سے دوچار ہوں گے۔

اسی طرح ایک دولت مند آدمی ہے۔ اپنی دولت کو اللہ کا عطیہ جانتا ہے۔ اپنی دولت کو خدا کی رضا والے کاموں میں خرچ کرتا ہے۔ فضول خرچی کے قریب نہیں جاتا۔ اچھا کھاتا ہے' اچھا پیتا ہے' مگر بے محل خرچ نہیں کرتا۔ رشتہ داروں اور نادار لوگوں کی خوب مدد کرتا ہے۔ تقویٰ شعار' عبادت گزار اور خواہشاتِ نفس پر مکمل کنٹرول رکھنے والا ہے۔ یہ صاحب ثروت آدمی وہ ہے جس نے دنیا کی زندگی کو دھوکے کا سامان سمجھا' خبردار رہا اور اس دھوکے سے بچا رہا۔ یہ بھی فیصلے کے دن عز و شرف کے مقام پر ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی دنیا کی زندگی کی حقیقت پورے طور پر واضح کردی تاکہ افرادِ اُمت خبردار رہیں اور اُن کے پاؤں پھسلنے نہ پائیں۔ آپ ﷺ کا اپنا طرزِ عمل دوسروں کے لیے ہمت افزا ہے۔ ایک دفعہ آپؐ چٹائی پر سوکر اٹھے تو بدن پر چٹائی کے نشان تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پاس تھے' دیکھ کر عرض کیا کہ ہم آپؐ کے لیے کیوں نہ ایک بچھونا بنا دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس دنیا سے کیا سروکار! میری مثال اس دنیا میں اُس سوار کی سی ہے جو دن کے وقت کسی درخت کے سایہ میں کچھ دیر بیٹھا اور پھر اسے چھوڑ کر چل دیا''۔ (مسند احمد)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا مؤمن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے''۔ (مسلم) یعنی مؤمن کو تو شرعی پابندیوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے' مگر کافر کو اگلی زندگی کی کوئی فکر نہیں' وہ یہاں عیش و عشرت کے مزے لوٹتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی تو آپ ﷺ کے ترکہ میں نہ درہم و دینار تھے نہ لونڈی غلام' صرف سواری کا ایک سفید خچر اور اسلحہ تھا اور زمین تھی جو مسافروں کے لیے صدقہ کردی تھی۔ (بخاری)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کافر کو ایک گھونٹ پانی تک نہ دیتا''۔ (ترمذی)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں''۔ یعنی اس دنیا کی رونق، چہل پہل اور کشش محض فریبِ نظر ہے۔ حقیقت میں یہ بالکل گھٹیا سی شے ہے۔ اس کے مقابلے میں آخرت اصل اہمیت کی چیز ہے۔ آخرت کی فکر سے آزاد ہو کر خواہشاتِ نفس کی پیروی میں زندگی گزارنے والا حیوان ہی تو ہے! قرآن مجید میں دنیا کی زندگی کو لہو ولعب کہا گیا ہے۔ لہو ولعب کا مطلب ہے کھیل تماشا۔ کھیل تماشا بچوں اور نادانوں کی وقتی سی مصروفیت ہوتی ہے، اس سے کسی طرح کی پائیدار منفعت حاصل نہیں ہوتی۔ بچے کھلونوں سے کھیلتے ہیں، پھر جی بھر جاتا ہے تو انہیں پھینک دیتے ہیں۔ لہو ولعب میں کوئی ذی شعور جی نہیں لگاتا۔ کرنے کے کام تو وہ ہیں جو فلاح اور کامیابی پر منتج ہوں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَآ اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ۭ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِىَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (العنکبوت)

''اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف بہلاوا اور کھیل ہے، اصل زندگی تو عالمِ آخرت کی ہے، کاش وہ لوگ جانیں!''

انسان کی حیثیت ایک مسافر کی ہے۔ مسافر راستے میں ٹھنڈی چھاؤں پاتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے سائے میں لیٹ جاتا ہے اور پھر اٹھ کر منزل کی طرف چل دیتا ہے۔ وہ مسافر نادان ہے جو اُسی سائے کو منزل سمجھ بیٹھے اور اصل منزل کو بھول جائے۔ دنیا کی زندگی ایک وقفہ ہے۔ ؏ ''یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر''۔ انسان کو جہاں جانا ہے اور جہاں جا کر ہمیشہ کے لیے رہنا ہے اُس زندگی کی فکر کرنا چاہیے۔ حیاتِ مستعار کے وقفے کو سب کچھ سمجھ لینا انتہائی نادانی اور حماقت ہے۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ بتایا گیا ہے کہ انسان کے لیے دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں امتحان کی تیاری کرنا ہے، مگر یہاں مرغوب چیزوں کی کشش اس راہ میں رکاوٹ ہے۔ عقل مند انسان وہ ہے جو یہاں کی پُرکشش چیزوں یعنی عورتوں، بچوں اور دولت وغیرہ کے ساتھ واجبی سی محبت رکھے، ان کی محبت میں اس قدر نہ کھو جائے کہ عاقبت کی فکر

ذہن سے محو ہو جائے اور انہی چیزوں پر فریفتہ قبر میں چلا جائے جہاں نہ بیوی بچے کام آئیں گے نہ مال و دولت۔ ایسا انسان اپنی بے عقلی پر حسرت ویاس کے آنسو بہائے گا مگر لاحاصل۔ کسی نے سچ کہا ہے: ؎

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے' تماشا نہیں ہے!

چونکہ دولت ہی انسان کو آزاد خیال اور خواہشات کا غلام بناتی ہے لٰہذا جو شخص حصولِ دولت اور صرفِ دولت میں راہِ راست پر رہا بس وہی کامیاب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''اللہ کی قسم! مجھے اس بات کا خوف نہیں کہ تم فقر میں گرفتار ہو گے' بلکہ خوف اس بات کا ہے کہ دولت تم پر ایسے نہ چھا جائے جیسے تم سے پہلی اقوام پر چھا گئی اور تم اُن کی طرح اسے ایک دوسرے سے بڑھ کر چاہنے لگو اور یہ تمہیں بھی اسی طرح ہلاک کر دے جیسے سابقہ اقوام کو کیا تھا''۔ (بخاری ومسلم)

حاصل کلام یہ ہے کہ کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ شریعت کی پابندیوں کو نظر انداز کر کے خواہشات کی پیروی میں لگ جائے۔ ایسا کرنے سے وہ ابدی خسارے کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ جب وہ یومِ حساب اپنی بداعمالیوں کے سبب بُرے انجام سے دوچار ہوگا تو اُس کے بیوی بچے اور اعزہ واحباب اس کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے۔ اس کے برعکس سچا مؤمن وہ ہے جو احکامِ شریعت پر چلنے کی سعی کرتا رہے' فرائض سے غفلت اختیار نہ کرے' حلال وحرام کی پابندیاں قبول کرے' دولت کا صحیح استعمال کرے اور کبھی بھی موت اور آخرت کو فراموش نہ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی کوتاہیوں پر استغفار کرتا رہے۔ ایسا انسان خواہ دنیا میں کیسی ہی پُر مشقت زندگی گزارے' وہ دائمی آرام و آسائش کی زندگی سے ہمکنار ہوگا' جہاں تمام نعمتیں میسر ہوں گی' کوئی نعمت کسی بھی وقت چھینی نہ جائے گی۔

۞۞۞

غُرورُالغَرور

(بڑے دھوکے باز کا دھوکہ)

ابلیس جب اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے بارگاہِ خداوندی سے رجیم (مردود) ٹھہرا تو اُس نے مہلت مانگی تاکہ اولادِ آدم کو قیامت تک گمراہ کرتا رہے۔ چنانچہ اسے یوم القیامۃ تک مہلت دے دی گئی' لیکن خدائے رحمٰن ورحیم نے اپنے بندوں کو بھی آگاہ کر دیا کہ شیطان ہر وقت اُن کو گمراہ کرنے کی تاک میں لگا رہے گا اور جونہی وہ موقع پائے گا انہیں گمراہ کر کے خدا کے حضور ذلیل وخوار کر دے گا۔ بالفاظِ قرآنی:

﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِىْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿۱۶﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ط وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿۱۷﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ط لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۸﴾﴾ (الاعراف)

''بولا (شیطان) چونکہ آپ نے مجھے گمراہ کر دیا ہے تو میں بھی لوگوں کے لیے آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھ کر رہوں گا' پھران کو اُن کے سامنے سے بھی آلوں گا اور اُن کے پیچھے سے بھی اوران کے داہنے سے بھی اور اُن کے بائیں سے بھی' اور آپ اُن میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہاں سے تو نکل ذلیل وخوار ہوکر۔ ان میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا سو میں تم سب سے جہنم کو بھر کر رہوں گا۔''

اس یاددہانی کی خاطر ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو نبی اور رسول بنا کر بھیجتا رہا جو انسانوں کو شیطان کے دھوکے سے بچنے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کی از حد تلقین کرتے رہے۔ انسان فطری طور پر عجلت پسند اور جلد باز واقع ہوا

ہے۔ جہاں اس کو نقد مفاد نظر آتا ہے اُس کی طبیعت ادھر لپکتی ہے' لیکن خدا کے نیک بندے ہر وقت خدا کی رضا اور خوشنودی کی طرف نظر رکھتے ہیں۔ وہ ظاہری اور وقتی مفادات کے پیچھے نہیں پڑتے مگر ایسے لوگ ہمیشہ قلیل تعداد میں رہے ہیں۔ قَلِيْلٌ مِنْ عِبَادِیَ الشَّكُوْرُ۔

شیطان گمراہی کے شعبے کا سربراہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے کام میں حد درجہ ماہر ہے۔ وہ ہر وقت اپنے نامسعود مشن میں مشنری سپرٹ کے ساتھ مصروف ہے۔ اُس کا طریق واردات دھوکہ دے کر انسان کو برائی پر ورغلانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ برائی کو برائی کی صورت میں پیش کیا جائے تو اُس کے قبول میں پس و پیش ہوگا' اس لیے وہ ہر برائی کو اچھائی کے روپ میں پیش کرتا ہے اور نقصان دہ کام کو مفید دکھلاتا ہے۔ برے اعمال کو دلکش اور مزین کر کے پیش کرتا ہے۔

شیطان نے پہلا حملہ سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام پر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت کے مخصوص درخت کا پھل کھانے سے روک دیا۔ لیکن شیطان نے آدمؑ کو یہ کہہ کر اُس درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کر لیا کہ اُس کا پھل کھا کر وہ ہمیش ہمیش کے لیے جنت میں رہ جائیں گے۔ جنت میں قیام کے خوشنما تصور کو پیش کر کے شیطان آدمؑ کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر شیطان آدم علیہ السلام پر کامیاب حملہ کر سکتا ہے تو عام انسان کی کیا حیثیت ہے؟ لیکن جس طرح ہر دور میں خدائے رحمٰن و رحیم نے شیطان کے حملوں سے بچ نکلنے کی تلقین کی ہے اُسی طرح قرآن پاک میں بھی تفصیل کے ساتھ شیطانی وساوس سے بچنے اور عمدہ کردار اور اخلاق اپنا کر اُسوۂ حسنہ کے مطابق عمل کرنے کی نصیحت کی گئی ہے' نیز شیطان کے پیروکاروں کو ابدی عذاب اور پیغمبروں کے فرماں برداروں کو ابدی راحت کی خوشخبری دی گئی ہے۔

قرآن پاک میں شیطانی حملے اور دھوکہ دہی کے طریق کار کی بھی وضاحت کی گئی ہے' حتیٰ کہ شیطان کو الغَرور یعنی بڑا دھوکے باز کہا گیا ہے۔ وہ بڑے سے بڑے آدمی کو

دھوکہ دینے سے نہیں چوکتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں انسان کو شیطان کے شر سے رحمان کی پناہ میں آنے کی دعا سکھائی ہے۔ شیطان انسان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے' لیکن دھوکہ دینے کی غرض سے کہتا ہے کہ اس طرح مال کم ہو جائے گا۔ لالچ میں آ کر انسان انفاق فی سبیل اللہ سے باز رہتا ہے اور اپنی دولت کے انبار اور بینک کی پاس بک دیکھ کر پھولا نہیں سماتا۔ اس طرح اُس کی نظر سے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنا اوجھل ہو جاتا ہے۔ شیطان کسی کو جھوٹ بولنے' شراب پینے' رشوت کھانے اور جوا کھیلنے کی براہِ راست ترغیب نہیں دیتا' بلکہ ان اعمال میں سے ہر عمل کی ایسی توجیہہ پیش کرتا ہے کہ انسان اس عملِ بد کو کرنے پر بآسانی آمادہ ہو جاتا ہے۔ شیطان کا یہ طریق کار بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کے واقعہ سے اچھی طرح واضح ہے جب وہ ہفتہ کے دن شکار کرنے سے اپنے خیال میں تو باز ہی رہے لیکن جو حیلہ سازی شیطان کی پیروی میں انہوں نے اختیار کی وہ اُن پر عذابِ عظیم کا باعث بنی۔

قرآن پاک کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بخشش کے لحاظ سے گناہوں کی دو قسمیں ہیں' ایک قابلِ بخشش دوسری ناقابلِ بخشش۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شرک ناقابلِ بخشش اور باقی سب گناہ قابلِ بخشش ہیں۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۭ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ﴾ (النساء)

''بے شک اللہ معاف نہیں کرتا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے' اور اس کے دوسرے گناہ جس قدر ہوں معاف کر دیتا ہے جس کے لیے چاہے' اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''

چونکہ شیطان انسان کا بدترین دشمن ہے اس لیے اس کا پورا زور لوگوں میں شرک پھیلانے پر رہا ہے تاکہ لوگ حتمی طور پر مغفرتِ خداوندی کے اہل نہ رہیں۔

دنیا میں مسلمانوں کے علاوہ کچھ لوگ لامذہب' کافر' بت پرست یا اہلِ کتاب یہود ونصاریٰ ہیں جن میں یہود ونصاریٰ اگرچہ توحید کی تعلیم کے علمبردار تھے مگر شیطان اُن

کے عقائد میں شرک کو داخل کر کے انہیں مشرکین کے زمرے میں شامل کر چکا ہے۔صرف مسلمان اب توحید کامل کے حامل ہیں جن کے سامنے قرآن پاک کی صورت میں خالق کائنات کی بھیجی ہوئی صحیح تعلیمات غیر متبدل موجود ہیں۔ مگر شیطان کو یہ کیونکر گوارا ہوسکتا ہے کہ دنیا میں توحید خالص کی ترویج ہو؟ چنانچہ اُس نے مسلمانوں میں بھی اس ناقابلِ بخشش گناہ کو مزین صورت میں پیش کیا۔ آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے کلمہ گو مسلمان بدترین شرک میں ملوث ہیں۔

جو مسلمان نمازوں میں ﴿اِیَّاكَ نَعْبُدُ وَاِیَّاكَ نَسْتَعِیْنُ﴾ بار بار پڑھتے ہیں وہ نبیوں اور ولیوں کی روحوں سے بھی استعانت کرتے ہیں اور پھر گرتے گرتے یہاں تک گر جاتے ہیں کہ گھوڑوں اور گائیوں سے استعانت سے بھی نہیں شرماتے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہے: ﴿لَیْسَ كَمِثْلِهٖ شَیْءٌ﴾ لیکن آج مسلمان مخلوق میں خالق کی صفات بلاتامل تسلیم کرتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو آسمان اور زمین کی باریک سے باریک چیز کی حقیقت اور وجود کو جاننے والا ہے۔ ہر شخص کو جس قدر چاہے علم عطا کرتا ہے۔ ہر فرد کا علم اُس کے علم کے سامنے ہیچ ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ لَّا یَعْلَمُ مَنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَیْبَ اِلَّا اللّٰهُ ؕ وَمَا یَشْعُرُوْنَ اَیَّانَ یُبْعَثُوْنَ ﴿۶۵﴾﴾ (النمل)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا، اور وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

﴿وَیَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَیْهِ اٰیَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَیْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۲۰﴾﴾ (یونس)

''اور وہ کہتے ہیں کیوں نہ اتاری گئی اس پر کوئی نشانی اُس کے پروردگار کی طرف سے؟ پس کہہ دیجیے علم غیب تو سراسر خدا کے پاس ہے بس تم انتظار کرو، میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔''

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَیَّ ۭ﴾ (الانعام: ۵۰)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں' میں تو صرف اُسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔''

﴿ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾﴾ (الاعراف)

''کہہ دیجیے میں مالک نہیں ہوں اپنے واسطے برے کا اور بھلے کا مگر جو چاہے اللہ۔ اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں اپنے لیے بہت سے فائدے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو ایمان لانے والوں کے لیے تنبیہ کرنے اور خوشخبری دینے والا ہوں۔''

قرآن پاک کی ان تصریحات کے باوجود کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے اور اس کے رسول ﷺ عالم الغیب نہیں ہیں' آج مسلمان بڑے واضح الفاظ میں آنحضرت ﷺ کو عالم الغیب اور ماکان وما یکون کا علم رکھنے والا مانتے ہیں۔ کچھ دوسرے مسلمان صلحائے اُمت اور شہداء کو عالم الغیب سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن کی مندرجہ بالا تصریحات کے علاوہ قرآن میں انبیاء اور نیک لوگوں کے واقعات بھی موجود ہیں جن سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا عالم الغیب نہیں ہے۔

قرآن پاک کی رو سے تمام اختیارات کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ہر قسم کے نفع اور نقصان کا مالک ہے' حفاظت کرنے والا' زندگی اور موت پر اختیار رکھنے والا ہے' دعائیں سننا' نگہبانی کرنا' قسمت کا بنانا' بگاڑنا اُس کے ہاتھ میں ہے۔ حرام وحلال' جائز وناجائز کی حدود متعین کرنا اور انسانی زندگی کے لیے شریعت تجویز کرنا اسی کے اختیار میں ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:

﴿يَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۵۴)

''وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے۔ کہہ دیجیے اختیارات تو سارے کے سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔''

کیا پیغمبر یعنی خدا کے پیارے اور برگزیدہ بندے دوسروں کے نفع نقصان کے مختار ہیں یا وہ اپنے نفع نقصان کے مالک ہوتے ہیں؟ فیصلہ کلام الٰہی سے سنیے:

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ﴾ (یونس:٤٩)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے میرے اختیار میں تو اپنا نفع اور ضرر بھی نہیں' مگر جو اللہ چاہے۔ (سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے)۔''

﴿قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ڏ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝﴾ (الجن)

''کہہ دیجیے میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا۔ کہہ دیجیے مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔''

﴿وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَاۗدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (یونس)

''اور اگر اللہ تجھے کوئی نقصان دے تو اُس کو سوائے اس کے کوئی دور کرنے والا نہیں' اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو اُس کے فضل کو کوئی پھیرنے والا نہیں۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنا فضل پہنچاتا ہے۔ اور وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔''

ان قرآنی تصریحات کے مطابق اللہ تعالیٰ ہی جملہ اختیارات کا مالک ہے۔ وہی مخلوقات کے نفع اور نقصان پر قادر ہے۔ اگر وہ کسی کو نفع پہنچانا چاہے تو کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ اور اگر وہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی دوسرا اسے نفع نہیں دے سکتا۔ لیکن آج مسلمان ہر کس و ناکس کو مشکل کشا' حاجت روا اور داتا کے نام دیتے اور اللہ کی کتاب کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں اور بڑے دھوکہ باز سے دھوکا کھا رہے ہیں۔ اس ضمن میں مزید سنیے:

﴿۔۔۔ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ؕ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ﴾ (فاطر:۱۳'۱۴)

''۔۔۔۔ یہی ہے اللہ پروردگار تمہارا' اُسی کے واسطے ہے بادشاہی۔ اور اُس (اللہ) کو چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے مالک بھی نہیں ہیں۔ اگر تم انہیں پکارو تو تمہاری دعائیں سن نہیں سکتے' اور اگر سن لیں تو اُن کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کریں گے۔''

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۞ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۞﴾ (بنی اسرائیل)

''ان سے کہیے پکار دیکھو اُن معبودوں کو جن کو تم خدا کے سوا اپنا کارساز سمجھتے ہو' وہ کسی تکلیف کو تم سے ہٹا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے ربّ کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون اس سے قریب تر ہو جائے' اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔ بے شک تیرے پروردگار کا عذاب ایسا ہی ہے کہ اُس سے خوف کھایا جائے۔''

صاف ظاہر ہے کہ یہ آیات بتوں کے متعلق نہیں ہیں' بلکہ صلحائے اُمت اور بزرگانِ دین کے متعلق ہیں۔ ہمیشہ سے شیطان کا یہ طریق کار رہا ہے کہ وہ عوام کو انبیاء اور صلحاء کی قبروں کی طرف متوجہ کرتا ہے' کیونکہ لوگ بزرگوں پر اعتقاد اور حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر وہ لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے کہ یہ قبروں کے اندر بھی تمہاری ہر طرح کی بات سنتے ہیں اور مدد کو پہنچتے ہیں' وہ خدا رسیدہ ہیں اس لیے تمہاری مشکلات خدا تعالیٰ سے سفارش کر کے حل کرا دیں گے۔ چنانچہ لوگوں نے بزرگوں کی قبروں کو بچا کر

رکھنے کے لیے پختہ' مضبوط اور خوبصورت بنایا اور ان پر عمارتیں کھڑی کیں۔ اُن کے مزار مرجع خلائق بن گئے۔ اُمت مرحومہ پر بھی شیطانی دھوکہ اثر انداز ہوا اور وہ یہود و نصاریٰ کی طرح قبروں کا طواف کرنے' وہاں دعائیں مانگنے اور حاجات طلب کرنے میں مشغول ہو گئے اور شرک کا ارتکاب کر کے ابلیس کے مشن کی تکمیل کا باعث ہوئے۔ حالانکہ نبی آخرالزمان صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے ظہور کے اس قدیم ترین راستے کو یہ کہہ کر قطعی مسدود کر دیا تھا کہ میں تمہیں قبروں کو پختہ کرنے اور اُن پر عمارت بنانے سے منع کرتا ہوں۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ:

نَهٰی رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ یُجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ یُّقْعَدَ عَلَیْهِ وَاَنْ یُبْنٰی عَلَیْهِ

(رواہ مسلم)

''رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے کہ قبر کو پختہ کیا جائے' اُس پر بیٹھا جائے اور اُس پر عمارت بنائی جائے''۔

اور فرمایا:

نَهَی النَّبِیُّ ﷺ اَنْ تُجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ یُّکْتَبَ عَلَیْهَا وَاَنْ تُوْطَاَ

(رواہ الترمذی)

''منع فرمایا ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے قبروں کو پختہ کرنے سے اور قبروں پر لکھنے سے اور قبروں کو روندنے سے۔''

چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خود زندگی بھر نہ کسی کی قبر پختہ کی نہ اس پر عمارت بنوائی اور کوئی تحریر لکھوائی۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی اسی سنت پر عمل رہا۔ خود عم رسولؐ حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ ۳ھ میں میدانِ اُحد میں شہید ہوئے۔ آپؐ نے انہیں سید الشہداء کہا' خود ہی ان کی تجہیز و تکفین کی۔ اُن کی قبر عہد رسالت میں اسی طرح خاک کی بنی ہوئی رہی' عہد صحابہ میں بھی بحالہ قائم رہی اور آج تک میدانِ اُحد میں بغیر عمارت اور قبے کے موجود ہے۔ رسول پاکؐ کے واضح ارشادات' آپؐ کے اُسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طریقے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آج مسلمان اپنے بزرگوں کی قبریں پختہ بنا رہے ہیں' ان پر عمارتیں اور قبے تعمیر کر رہے ہیں' ان کے اوپر تحریریں لکھ رہے ہیں۔ یہ

کیوں ہو رہا ہے؟ یہ سب کچھ شیطانی دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ شیطان اچھے روپ میں برے کام پیش کرتا ہے۔ حالانکہ بزرگوں کے احترام کا طریقہ خود شریعت اسلامیہ، صحابہ کرامؓ اور تابعین کے عمل سے واضح ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو بزرگوں کے گستاخ سمجھنا خود پرلے درجے کی حماقت ہے۔ جس طریق سے وہ اپنے بزرگوں کا احترام کرتے تھے وہی صحیح طریقہ تھا۔ قبر پرستی کا اُس دور میں نشان تک نہیں ملتا۔

مختصر یہ کہ جس طرح شیطان کی ہمیشہ سے یہ سرتوڑ کوشش ہے کہ لوگوں کو نا قابل معافی گناہ (شرک) میں مبتلا کر کے اُن پر جنت کا دروازہ بند کرا دے اسی شدت کے ساتھ ہمیں اس بات کا احساس ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیے کہ شرک ہم سے ہرگز سرزد نہ ہو۔ ہم بار بار قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں اور اطمینان کر لیں کہ ہم کسی شیطانی دھوکے میں آ کر وہ کام تو نہیں کر رہے جن سے ہادیٔ اعظم ﷺ نے ہمیں منع کیا ہے۔ کیونکہ یہ شیطانی دھوکہ انجامِ کار ابدی زندگی کی تباہی کا موجب بنے گا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ ؕ﴾

(المائدۃ:۷۲)

''جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا پس اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اُس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔''

❀ ❀ ❀

وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا

اسلامی تعلیمات میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی خصوصی تاکید ملتی ہے۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حق یعنی توحید کے متصلاً بعد والدین کے حقوق بیان کیے ہیں اور ان کے ساتھ اچھے سلوک کی تلقین کی ہے۔ والدین کا ادب واحترام' ان کے ساتھ حسن وخوبی کا برتاؤ اخلاقیات کا اہم تقاضا ہے۔چونکہ اسلام میں اخلاقیات کی اہمیت ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے اس لیے اولاد کے لیے اپنے والدین کی خدمت' فرماں برداری اور نیک سلوک کو اسلامی اخلاق میں اہم ضابطے کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔

دین اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں فطری تقاضوں کی تسکین کے لیے احسن طرزِ عمل اور عمدہ طریقِ کار اختیار کیا گیا ہے۔ والدین کے دل میں اولاد کی محبت کا جذبہ فطری طور پر نہایت شدت کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اس جذبے کا کرشمہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کے آرام و آسائش کا خیال رکھتے اور ان کی تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر انتظام کرتے اور ان کی تکالیف رفع کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ اگر اولاد کو مصیبت میں دیکھیں تو اس قدر بے تاب ہو جاتے ہیں کہ خود اپنی تکلیف بھی بھول جاتے ہیں۔سردیوں کے موسم میں ماں کے پہلو میں لیٹا ہوا بچہ رات کو بستر پر پیشاب کر کے بچھونے کو گیلا کر دے تو ماں کے لیے یہ نا قابل برداشت ہوتا ہے کہ وہ خود تو خشک بچھونے پر سوئے اور اس کا بچہ گیلے حصے پر پڑا رہے۔ چنانچہ وہ خود گیلے حصے پر ہو جاتی ہے اور بچے کو خشک بچھونے پر لٹا دیتی ہے۔اسی طرح والد اپنے خون پسینے کی کمائی اولاد پر خرچ کرتا ہے۔بعض اوقات خود تکلیف اٹھا کر اولاد کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ والدین اولاد کی کوتاہیوں کو برداشت کرتے اور کمالِ فراخ دلی سے انہیں معاف

کر دیتے ہیں۔

مروّت کا تقاضا ہے کہ محسن کو یاد رکھا جائے۔ اس کے حسن سلوک اور مصیبت میں کام آنے کو فراموش نہ کیا جائے۔ حدیث میں آتا ہے کہ جس نے لوگوں کا شکر ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا۔ اولاد کے لیے والدین سے بڑھ کر کون محسن ہو سکتا ہے! چنانچہ اولاد پر یہ فرض خود بخود عائد ہو جاتا ہے کہ وہ بڑی ہو کر والدین کی خدمت اور اطاعت کرے اور اس بات کو کبھی فراموش نہ کرے کہ انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھا کر دکھ سہہ کر اور مال خرچ کر کے ان کی پرورش کی ہے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ارشادِ باری ہے:

﴿...... وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ؕ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ﴿۲۳﴾ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ﴿۲۴﴾﴾

''......اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اگر اُن میں سے ایک یا وہ دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا' بلکہ ان کے ساتھ بات کرنا احترام کے ساتھ۔ اور ان کے لیے عاجزی کا بازو جھکا دو مہربانی کے ساتھ۔ اور (خدا سے التجا کرتے ہوئے) کہو اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحم کر جیسا انہوں نے مجھے چھوٹے سے کو پالا''۔

والدین کے اپنی اولاد پر اس قدر احسان ہوتے ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ عام ضابطۂ اخلاق کے تحت اولاد کے لیے لازم ہے کہ وہ ہوش مندی کی عمر کو پہنچ کر اپنے والدین کے احسانات کا بدلہ چکائے' خصوصاً جبکہ والدین بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر جسمانی کمزوری کی وجہ سے اولاد کی خدمت کی حاجت بھی رکھتے ہوں۔ چونکہ والدین نے اولاد کی پرورش کے دوران دکھ اور تکلیف برداشت کیے ہوتے ہیں اس لیے فطرتاً وہ اُمید رکھتے ہیں کہ جن کے لیے انہوں نے دکھ اور تکلیفیں اٹھائیں بلکہ جان تک نچھاور کرتے رہے اب احتیاج کے وقت وہ ان کی نگہداشت کریں اور سہولت پہنچانے کی کوشش کریں۔ لیکن جب ناخلف اولاد جوان ہو کر اپنے من پسند مشاغل میں منہمک ہو جائے اور بوڑھے والدین کو بے سہارا چھوڑ دے تو ماں باپ کا ان پر ناراض ہونا فطری امر

ہے۔ چونکہ والدین کی ناراضی بجا ہوتی ہے اس لیے ان کی ناراضی خدا کی ناراضی کا موجب بنتی ہے۔ اسی طرح جب سعادت منداولاد جوان ہوکر اپنے ضعیف والدین کی خدمت کرتی ہے اور ان کے آرام وآسائش کا خیال رکھتی ہے تو والدین کا دل خوش ہوتا ہے اور ان کی یہ خوش دلی اللہ تعالیٰ کو بھی پسند آتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ اللہ کی رضا والدین کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضی والدین کی ناراضی میں ہے۔ ایک اور حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں کہ جب کوئی اپنے ماں باپ کے لیے دعا کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں تنگی کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ والدین کے حق میں دعا مانگنا بھی ادائے حقوق کے لیے لازم ہے۔ نیز والدین کے حق میں دعا کے الفاظ بھی خود قرآن پاک میں بتائے گئے ہیں' یعنی: ﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ ''اے میرے پروردگار! ان دونوں (میرے ماں باپ) پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا''۔ گویا دعا مانگنے والا ''كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا'' کہہ کر خدا تعالیٰ سے اپنے والدین کے لیے غیر مشروط اور مطلق مہربانی کی تمنا کر رہا ہے' کیونکہ انہوں نے مطلق مہربانی کے جذبے کے تحت ہی اپنی اولاد کی تربیت کی ہے۔ اولاد سے ناپختگی کی عمر میں اکثر اوقات نامناسب رویے کا ظہور بھی ہو جاتا ہے لیکن والدین اپنے تیور نہیں بدلتے' بلکہ معاف کیے دیتے ہیں اور درگزر سے کام لیتے ہیں۔ تو اب جوان صاحبزادے کی اللہ کے حضور دعا کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح میرے والدین نے میری لغزشوں' کوتاہیوں' غلطیوں اور نالائقیوں کے باوجود مطلق مہربانی کے جذبے سے میری پرورش کی اسی طرح تو بھی ان کی خطاؤں اور گناہوں کو نظر انداز کر کے اُن پر مطلق مہربانی فرما۔ کتنی معنی خیز دعا ہے جو ہمیں ہمارے خالق نے اپنے والدین کے حق میں مانگنے کے لیے سکھائی ہے۔

بعض اوقات والدین خود اخلاقی یا عملی اعتبار سے قصوروار ہوتے ہیں' تو سوال پیدا ہوگا کہ والدین کے حق میں دعا مانگنا اس وقت کیسا رہے گا؟ تو اس صورتِ حال کے لیے قرآن پاک میں کوئی استثناء مذکور نہیں ہے' بلکہ اولاد کو والدین کے حق میں غفور اور رحیم

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بچے کے سر پر خون نہیں بلکہ اس کی جگہ خلوق (زرد رنگ کی خوشبو) لگایا کرو''۔

خلوق ایک خوشبو کا نام ہے جو زعفران وغیرہ سے تیار کی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ عقیقہ کا رواج جاہلیت میں بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی اصلاح کر دی۔ لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرے کی قربانی کرنے کو کہا۔ اگر وسعت نہ ہو تو لڑکے کی طرف سے بھی ایک ہی قربانی کافی ہے۔ اس گوشت کے ساتھ عزیز و اقارب کی دعوت کی جائے اور کچھ گوشت مساکین و فقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔ عقیقہ ملت ابراہیمی کے شعائر میں سے ہے۔ سنن الترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روایت ہے کہ:

عَقَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْحَسَنِ بِشَاةٍ وَقَالَ :((يَا فَاطِمَةُ احْلِقِيْ رَاْسَهٗ وَتَصَدَّقِيْ بِزِنَةِ شَعْرِهٖ فِضَّةً)) قَالَ :فَوَزَنْتُهٗ فَكَانَ وَزْنُهٗ دِرْهَمًا اَوْ بَعْضَ دِرْهَمٍ)) (رواہ الترمذی)

''رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کے عقیقہ میں ایک بکری کی قربانی کی اور آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے فرمایا: ''اس کا سر صاف کر دو اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کر دو''۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ نے ان کا وزن کیا تو وہ ایک درہم کے برابر یا اس سے بھی کچھ کم تھے''۔

بچے کا نام رکھنا بھی ایک حق ہے' ایسا نام جو کسی اچھی شخصیت کے نام پر ہو یا اچھے معنی رکھتا ہو۔ نام بے تکا اور بے معنی نہ ہو کہ بڑا ہو کر بچہ اپنے نام کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرے۔ مثلاً محمد بوٹا' پیراں دتہ' اروڑہ' گھسیٹا' علی بخش' عباد علی' شقنود وغیرہم۔ رسول اللہ ﷺ کے پسندیدہ نام عبدالرحمٰن اور عبداللہ ہیں' یعنی وہ نام جس میں اللہ کا بندہ ہونے کا مفہوم نکلتا ہو۔ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناموں پر نام رکھنا بھی پسندیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَوَّلُ مَا يَنْحَلُ الرَّجُلُ وَلَدَهٗ اسْمُهٗ فَلْيُحْسِنِ اسْمَهٗ))

(رواہ ابوالشیخ' بحوالہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)

''آدمی اپنے بچے کو سب سے پہلا تحفہ نام کا دیتا ہے' اس لیے چاہیے کہ اس کا اچھا

حقوقِ اولاد

عام طور پر حقوقِ والدین پر بڑا زور دیا جاتا ہے اور بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ اپنے والدین کے فرماں بردار رہیں اور ہر وقت ان کا ادب واحترام ملحوظ رکھیں، کبھی گستاخی کا کلمہ ان کی زبان سے نہ نکلنے پائے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بچوں کو سکھانے اور تعلیم دینے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ ناسمجھی میں ان سے خلافِ ادب حرکات سرزد ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں' لیکن اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ پند ونصائح کرنے والے لوگ بڑی عمر کے ہوتے ہیں۔ اکثر صاحبِ اولاد بھی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کو فرماں بردار دیکھنا چاہتے ہیں۔ وعظ و نصیحت کے ان کلمات میں ان کی اپنی غرض بھی شامل ہوتی ہے۔ جب وہ چھوٹوں کو نصیحت کر رہے ہوتے ہیں تو ان کی انا کو تسکین ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو پارسا سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

تھوڑا سا غور کریں تو انسان آسانی سے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ بچوں کو ان کے فرائض یاد دلانے واقعتاً بہت ضروری ہیں' مگر اس سے بھی اہم تر یہ ہے کہ بڑے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کما حقہٗ دلچسپی لیں اور بچوں کی تربیت اس نہج پر کریں کہ عمر کے ساتھ ساتھ بچے خود بخود اپنے فرائض سے آگاہ ہوتے جائیں اور اپنے والدین کی مثال سامنے رکھتے ہوئے فرائض کی ادائیگی میں چستی اور مستعدی کا مظاہرہ کریں۔ ویسے بھی حقوق وفرائض کا عمل دوطرفہ ہے۔ ایک فریق کا رویہ دوسرے فریق کو متاثر کرتا ہے۔ اگر والدین اپنے فرائض کی ادائیگی میں چوکس (vigilant) ہوں تو بڑی حد تک ان کی اولاد فرض شناس اور ذمہ دار ہوگی۔ اگر ایک باپ گھر میں سگریٹ نوشی کرتا ہے تو یہ بُری عادت ہے اور صحت کے لیے بھی نقصان دہ ہے' لیکن اس کا بھیانک پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت میں بھی کوتاہی کا ارتکاب کر رہا ہے' کیونکہ خود تمباکو نوشی کرنے والا اپنے

بیٹے کو اس سے باز رہنے کی نصیحت کیسے کر سکتا ہے؟ اور اگر کرے بھی تو اُس کا اثر کیا ہوگا؟ اب اگر بچہ بڑا ہو کر سگریٹ نوشی کا عادی ہو جائے تو اس کا باپ بیٹے کی تربیت میں خامی سے کیسے بری الذمہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہی حال بے نماز' رشوت خور' جھوٹ بولنے والے' وعدہ خلافی کرنے والے' گالی گلوچ اور بدزبانی کرنے والے' روزے نہ رکھنے والے اور زکوٰۃ نہ دینے والے والدین کا ہے۔ اگرچہ یہ گناہ ذاتی نوعیت کے ہیں لیکن اولاد کے معاملے میں ان کی تاثیر متعدی ہو جاتی ہے۔

بچے اپنے والدین کو جس رویے اور جن مشاغل میں دیکھیں گے وہ ان سے کیسے متاثر نہ ہوں گے! لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ والدین بچوں کو زبانی وعظ و نصیحت بھی کریں مگر اہم تر بات یہ ہے کہ وہ انہیں اپنی شخصیت کا نمونہ پیش کر کے ان پر واضح کریں کہ کیا چیز پسندیدہ ہے اور کیا چیز ناپسندیدہ' کون سے کام کرنے کے ہیں اور کون سے اجتناب کرنے کے قابل ہیں۔ اس طرح بڑی حد تک توقع کی جا سکتی ہے کہ بچے ہمہ گیر تربیت پائیں اور اچھے شہری اور اچھے مسلمان ثابت ہوں۔ چنانچہ اس تحریر کا مدعا یہ ہے کہ والدین اپنے فرائض سے واقف ہوں اور ان کی ادائیگی کے سلسلے میں چوکس ہوں۔ جبکہ اولاد کو فرائض کی ادائیگی کا احساس دلانا بھی ضروری ہے' مگر وہ اس کے بعد کی بات ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' والدین کو حسنِ عمل اور حسنِ اخلاق کی عملی مثال پیش کرنا سب سے ضروری ہے۔ اس کے لیے اپنے فرائض کو ہر وقت ذہن میں مستحضر کرنا لازم ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اولاد کی تربیت بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کیونکہ اچھی' صالح اور نیک اولاد صدقہ جاریہ کے درجے میں آتی ہے اور اُس کے نیک اعمال کا ثواب والدین کو بھی ملتا رہتا ہے چاہے وہ وفات بھی پا جائیں۔ اسی طرح اگر ماں باپ نے اپنی اولاد کی تربیت میں کوتاہی کی ہوگی تو اولاد کی برائیوں کا گناہ بھی والدین کو لگاتار ملتا رہے گا' اگرچہ وہ فوت بھی ہو جائیں۔ پس مسئلے کی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے آیئے حقوقِ اولاد یعنی والدین کے فرائض کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

میاں بیوی اللہ تعالیٰ سے نیک اور سعادت مند اولاد مانگیں۔ جیسا کہ حضرت زکریا علیہ السلام کی دعا قرآن مجید میں منقول ہے:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً ۚ﴾ (آل عمران:۳۸)

''اے میرے پروردگار! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما۔''

پھر جب اللہ تعالیٰ اولاد مرحمت فرمائے تو اُس کی پیدائش پر اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے۔ اس عمل کی برکت اور تاثیر سے بچہ اُم الصبیان کے ضرر سے محفوظ رہے گا۔ نیز اللہ کی توحید اور رسول اللہ ﷺ کی رسالت کی پاکیزہ آواز اُس کے کانوں کے ذریعہ دل و دماغ تک پہنچ کر ضرور اپنا اثر دکھائے گی۔ بہتر ہے کہ پیدائش کے بعد بچے کو اللہ کے کسی مقبول اور صالح بندے کے پاس لے جائیں جو اُس کے لیے خیر و برکت کی دعا کرے۔ جب حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو قبا کے مقام پر اُن کے ہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی ولادت ہوئی۔ وہ بچے کو لے کر رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بچے کو آپ ؐ کی گود میں ڈال دیا۔ آپ ؐ نے چھوہارہ منگوایا' اس کو چبایا' پھر اپنا لعابِ دہن اس کے مُنہ میں ڈالا اور تالو پر ملا' اس کے بعد اس کے لیے خیر و برکت کی دعا کی۔

بچے کی پیدائش اہل خاندان کے لیے خوشی اور مسرت کا موقع ہوتا ہے۔ ایامِ جاہلیت میں اس موقعے پر خوشی کے اظہار کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔ اسلام نے اس فطری خوشی کے اظہار کو برقرار رکھتے ہوئے جاہلیت کے انداز ختم کر دیے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

كَانُوْا فِي الْجَاهِلِيَّةِ اِذَا عَقُّوْا عَنِ الصَّبِيِّ خَضَّبُوْا قُطْنَةً بِدَمِ الْعَقِيْقَةِ' فَاِذَا حَلَقُوْا رَاْسَ الصَّبِيِّ وَضَعُوْهَا عَلٰى رَاْسِهٖ ' فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ :((اجْعَلُوْا مَكَانَ الدَّمِ خَلُوْقًا)) (رواہ ابن حبان فی صحیحہ)

''زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ بچے کا عقیقہ کرتے تو روئی کے ایک پھوئے میں عقیقہ کے جانور کا خون بھر لیتے' پھر جب بچے کا سر منڈوا دیتے تو وہ خون بھرا ہوا پھویا اس کے سر پر رکھ دیتے۔ (یہ جاہلانہ رسم تھی) رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بچے کے سر پر خون نہیں بلکہ اس کی جگہ خلوق (زرد رنگ کی خوشبو) لگایا کرو''۔

خلوق ایک خوشبو کا نام ہے جو زعفران وغیرہ سے تیار کی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ عقیقہ کا رواج جاہلیت میں بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی اصلاح کر دی۔ لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرے کی قربانی کرنے کو کہا۔ اگر وسعت نہ ہو تو لڑکے کی طرف سے بھی ایک ہی قربانی کافی ہے۔ اس گوشت کے ساتھ عزیز واقارب کی دعوت کی جائے اور کچھ گوشت مساکین وفقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔ عقیقہ ملت ابراہیمی کے شعائر میں سے ہے۔ سنن الترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روایت ہے کہ:

عَقَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْحَسَنِ بِشَاةٍ وَقَالَ :((يَا فَاطِمَةُ احْلِقِىْ رَاْسَهٗ وَتَصَدَّقِىْ بِزِنَةِ شَعْرِهٖ فِضَّةً)) قَالَ :فَوَزَنْتُهٗ فَكَانَ وَزْنُهٗ دِرْهَمًا اَوْ بَعْضَ دِرْهَمٍ)) (رواہ الترمذی)

''رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کے عقیقہ میں ایک بکری کی قربانی کی اور آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے فرمایا: ''اس کا سر صاف کر دو اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کر دو''۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ سے ان کا وزن کیا تو وہ ایک درہم کے برابر یا اس سے بھی کچھ کم تھے''۔

بچے کا نام رکھنا بھی ایک حق ہے' ایسا نام جو کسی اچھی شخصیت کے نام پر ہو یا اچھے معنی رکھتا ہو۔ نام بے تکا اور بے معنی نہ ہو کہ بڑا ہو کر بچہ اپنے نام کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرے۔ مثلاً محمد بوٹا' پیراں دتہ' اروڑہ' گھسیٹا' علی بخش' عباد علی' شقنو وغیرہم۔ رسول اللہ ﷺ کے پسندیدہ نام عبدالرحمٰن اور عبداللہ ہیں' یعنی وہ نام جس میں اللہ کا بندہ ہونے کا مفہوم نکلتا ہو۔ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناموں پر نام رکھنا بھی پسندیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَوَّلُ مَا يَنْحَلُ الرَّجُلُ وَلَدَهٗ اسْمُهٗ فَلْيُحْسِنِ اسْمَهٗ))

(رواہ ابوالشیخ' بحوالہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)

''آدمی اپنے بچے کو سب سے پہلا تحفہ نام کا دیتا ہے' اس لیے چاہیے کہ اس کا اچھا

نام رکھے۔"

اب بچے کی تربیت کا آغاز ہوتا ہے۔ جسمانی نشو ونما کے لیے بچے کو اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے اچھی غذا اور خوراک جو حلال اور جائز طریقے سے کمائی گئی ہو' مہیا کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ بچہ تو معصوم ہے' اس کو تو جو ملے گا کھا لے گا' مگر والدین خصوصاً والد کا یہ بڑا اہم فرض ہے کہ وہ روزی کمانے کے جائز ذرائع اختیار کرے۔ یہ تربیت اولاد کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ رزقِ حلال پر پرورش پانے والے بچے عموماً صاف ستھرے اخلاق و کردار کے مالک' والدین کے فرماں بردار' بزرگوں کا احترام کرنے والے اور راست رو ہوتے ہیں۔

جب بچہ بولنے کا آغاز کرے تو سب سے پہلے اسے کلمہ طیبہ سکھایا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِفْتَحُوْا عَلٰی صِبْیَانِکُمْ اَوَّلَ کَلِمَةٍ بِلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَقِّنُوْهُمْ عِنْدَ الْمَوْتِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)) (شعب الایمان)

"اپنے بچوں کی زبان سے سب سے پہلے لا الٰہ الا اللہ کہلواؤ اور موت کے وقت ان کو اسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرو۔"

جس طرح پیدائش کے بعد پہلی آواز بچے کے کان میں جو ڈالی جاتی ہے وہ اذان کے الفاظ ہیں' اسی طرح جب اس کی گفتگو کا آغاز بھی کلمۂ توحید سے ہوگا تو اس کا اس کے قلب و ذہن پر اثر ضرور ہوگا۔ آج کے مغرب زدہ دور میں مسلمان بچوں کو زیادہ سے زیادہ انگریزی الفاظ سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے بچے کے ذہن پر اس زبان کی برتری غالب ہو کر اسے مغربی اقدار سے قریب اور اسلامی اقدار سے دور کرنے لگتی ہے۔

بچے کا سب سے پہلا مدرسہ اس کی ماں کی گود ہوتی ہے۔ اگر ماں پاکیزہ اخلاق و کردار کی مالک' سادگی پسند' مشرقی اقدار و روایات کی شائق اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والی ہوگی تو بچہ یہی باتیں خود بخود سیکھ جائے گا۔ اس کے برخلاف اگر ماں فیشن کی دلدادہ' موسیقی کی شوقین' بے پردگی کی عادی اور اسلامی روایات سے نفور ہوگی تو بچہ بھی

انہی اقدار کو پسند کرے گا اور اپنائے گا۔لہٰذا بچے کی تربیت میں ماں کا کردار باپ سے بھی زیادہ تاثیر رکھتا ہے۔علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے :

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

''اے مسلمان عورت! تو بتول (حضرت فاطمہؓ) کا کردار اپنا کر زمانے کی آنکھوں سے مستور زندگی گزار (یعنی باپردہ رہ)۔پھر دیکھ تیری گود میں بھی حسینؓ پرورش پائے گا''۔

جو عورت حیا باختہ اور برے کردار وعمل کی مالک ہو اور ستر وحجاب کی پابندیوں کا مذاق اڑاتی ہوئی سر کے بال کھولے کلبوں' پارکوں' گلیوں اور بازاروں میں گھومے اس کی گود میں اسلامی اقدار سے محبت رکھنے والی اولاد کیسے پل سکتی ہے؟ آج ہم اس بات کی خواہش تو ضرور کرتے ہیں کہ ہمارے بچے سعادت منداور باکردار ہوں مگر اس سلسلہ میں عائد فرائض کی ادائیگی سے اعراض کرتے ہیں۔اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔یہ تو وہی بات ہے کہ نیم کا پودا لگا کر کوئی شخص آم کھانے کی تمنا کرے۔

رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق مسلمان اور کافر کے درمیان نماز کا فرق ہے۔لہٰذا نماز کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بچوں کو نماز کا عادی بنانا بھی والدین کا فرض ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مُرُوْا اَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ اَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ)) (سنن ابی داوٗد)

''تمہارے بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز کی تاکید کرو اور جب دس سال کے ہو جائیں تو نماز میں کوتاہی کرنے پر ان کو سزا دو اور ان کے بستر بھی الگ کر دو''۔

یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ اگر ماں باپ دونوں نماز کے پابند ہوں تو بچے خود ہی ان کو دیکھ کر نماز پڑھنے لگیں گے اور مار پیٹ کی نوبت نہیں آئے گی۔اس کے برعکس اگر خود ماں باپ نماز کی اہمیت سے غافل ہوں تو وہ اولاد کو نماز کی ترغیب کیسے دیں گے!

اور بالفرض ایسے والدین اولاد کو نماز کی تاکید کریں تو اس کا اثر اولاد پر کیسے ہو سکتا ہے! اس لیے یہ ضروری ہے کہ والدین اچھی باتوں میں خود اپنا عملی نمونہ پیش کریں۔

والدین کے فرائض میں ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ مساوی سلوک کریں۔ بیٹے کے ساتھ برتری کا سلوک اور بیٹی کو گھٹیا سمجھنا مناسب نہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں لڑکی کی پیدائش پر غمی اور افسردگی کا اظہار کیا جاتا ہے اور لڑکے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں غیر اسلامی اور غلط رسومات کے طومار کی وجہ سے لڑکی کی شادی کرنا بہت ہی مشکل بنا دیا گیا ہے۔ لمبے چوڑے جہیز کا انتظام لڑکی کے والدین کو کرنا ہوتا ہے' جبکہ لڑکے والوں کی طرف سے آنے والی بارات کے افراد کی خاطر تواضع بھی انہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ لہٰذا جو شخص یہ اخراجات برداشت نہیں کر سکتا اسے بیٹی کی پیدائش پر یہ فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ اس کی رخصتی کیسے ممکن ہو سکے گی۔ مگر یہ طوق و اغلال خود ساختہ بوجھ ہیں جو ہم لوگوں نے ہندو معاشرے سے اخذ کر رکھے ہیں۔ اگر آج ہم نکاح کا اسلامی طریق کار اپنا لیں' یعنی جہیز اور بارات کو ختم کر دیں تو بیٹی کی پیدائش پر رنجیدہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہ ہو۔ ہمیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ بیٹی کی پیدائش پر غم اور ناراضی کا اظہار تو کفار کا طریقہ ہے' جو بعض اوقات تو بیٹی کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تھے۔ بالفاظِ قرآنی:

﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰى ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿۵۸﴾ يَتَوَارٰى مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰى هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِى التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿۵۹﴾﴾

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کے پیدا ہونے کی خبر سنائی جاتی ہے تو وہ سیاہ رو ہو جاتا ہے اور جی میں گھٹتا رہتا ہے' لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس بری خبر کی وجہ سے جو اسے ملی۔ سوچتا ہے کیا اس نومولود بچی کو ذلت کے ساتھ باقی رکھے یا اس کو کہیں لے جا کر مٹی میں دبا دے۔ سن رکھو! بہت برا ہے یہ فیصلہ جو یہ کرتے ہیں۔''

کفارِ مکہ کے اس ظالمانہ انداز کے برعکس اسلام میں بیٹی کی پیدائش کو مبارک سمجھا

جاتا ہے اور بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک اور اُن کے حقوق کی ادائیگی پر جنت کی خوشخبری دی گئی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنِ ابْتُلِيَ مِنَ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ فَأَحْسَنَ إِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ))

(رواه البخاری و مسلم)

''جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیٹیوں کی ذمہ داری ڈالی گئی اور اُس نے اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو یہ بیٹیاں اس کے لیے دوزخ سے بچاؤ کا سامان بن جائیں گی۔''

اسی طرح مسلم شریف میں حضرت انسؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ أَنَا وَهُوَ)) وَضَمَّ أَصَابِعَهٗ))

''جو شخص دو لڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں تو وہ شخص اور میں قیامت کے دن اس طرح ہوں گے۔ (یہ کہتے ہوئے) آپؐ نے ہاتھ کی انگلیوں کو ملا کر دکھایا''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرمودات سے معلوم ہوا کہ بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی پرورش اور پھر نکاح والدین کی بخشش کا باعث بن جائیں گے۔ اس طرح بیٹی قابل نفرت اور حقیر نہیں بلکہ باعث برکت و رحمت اور اللہ کی نعمت ہے۔ اسلامی معاشرے میں تو اس عورت کو مبارک سمجھا جاتا ہے جس کے ہاں پہلی پیدائش بیٹی کی ہو۔

موجودہ دور میں ایک برائی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ والدین زیادہ اولاد سے گھبراتے ہیں۔ اگر اس گھبراہٹ کا سبب یہ ہے کہ اولاد کا معاشی بوجھ کیسے برداشت ہوگا' تو یہ ذہنیت سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے' کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا﴾ (بنی اسراءیل)

''اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم اُن کو رزق دیں گے اور تم کو بھی دے رہے ہیں۔ بے شک ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے۔''

پس افلاس و ناداری کے باعث کثرتِ اولاد سے نفرت تو کسی صورت جائز نہیں' کیونکہ یہ

تو اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر عدم اعتماد ہے' البتہ کوئی اور وجہ مثلاً عورت کی کمزور صحت یا موت کا خطرہ ہو تو اور بات ہے۔

والدین پر ایک ذمہ داری یہ بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے ساتھ برابری کا سلوک کریں۔ نہ بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دیں اور نہ ہی کسی ایک بیٹے کو یا بیٹی کو دوسری اولاد سے برتر جانیں۔ اسی طرح داد و دہش میں بھی سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جب کوئی ایسا واقعہ پیش آیا کہ کسی ماں نے یا باپ نے اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو کچھ ہبہ کرنا چاہا تو آپؐ نے اس کی اجازت نہیں دی اور فرمایا:

((اِعْدِلُوْا بَیْنَ اَوْلَادِکُمْ)) (رواہ البخاری)

''اپنی اولاد کے مابین مساوات اور برابری کو ملحوظ رکھو''۔

اس طرح کا سلوک ظلم و جور سمجھا گیا ہے۔ البتہ اولاد میں سے اگر کوئی بیٹا یا بیٹی کسی واقعی عذر کی بنا پر ترجیحی سلوک کے مستحق ہوں تو اُن کے ساتھ خصوصی معاملہ فقہائے کرام کے نزدیک جائز ہے۔ مثلاً ایک بیٹا جسمانی معذوری یا کسی اور وجہ سے روزی کے معاملے میں خود کفیل نہیں ہے تو اگر والدین اُس کی مالی امداد کرتے ہیں تو نہ یہ عدل و انصاف کے خلاف ہے نہ ہی ناجائز و مکروہ ہے' بلکہ یہ تو حسن سلوک کے درجہ میں اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی خاص وجہ کی بنیاد پر دوسرے بھائی بہن کسی ایک بہن یا بھائی کے ساتھ خصوصی سلوک پر رضامند ہوں تو بھی والدین کے لیے یہ جائز ہے اور گناہ کی بات نہیں۔

والدین کی ایک یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اولاد میں سے کسی کو جائیداد سے محروم نہ کریں۔ یہ فطری بات ہے کہ ساری اولاد ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کچھ کے معاملہ میں اُن کی فرمانبرداری' خدمت اور خوش اطواری کے سبب والدین کا جھکاؤ زیادہ ہوتا ہے' جبکہ کچھ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت برتتے ہوں' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بداطوار اور بدعمل بھی ہوں۔ ظاہر ہے ایسی اولاد سے والدین ناخوش ہوں گے اور اس ناراضی کے سبب اُن کا دل چاہے گا کہ انہیں کسی طرح کا فائدہ نہ پہنچایا

جائے۔ مگر اسلامی تعلیمات کی رو سے کوئی باپ یا ماں اپنے بیٹے یا بیٹی کو بداطواری اور بدکرداری کی بنا پر جائیداد سے محروم نہیں کر سکتے۔ آئے دن اخبارات میں مسلمان ماں باپ کی طرف سے اپنی مسلمان اولاد کو وراثت سے محرومی کے اعلان یعنی عاق نامے شائع ہوتے رہتے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں' بلکہ اولاد میں سے اچھے برے سب ہی افراد اپنے ماں باپ کی وراثت سے حصہ پائیں گے۔ کسی ماں یا باپ کو اپنی اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کا حق نہیں۔ البتہ اگر کوئی نانہجار بیٹا یا بیٹی اپنے ماں یا باپ کو قتل کر دے تو وہ خود بخود اُن کی وراثت سے محروم ہو جائے گا۔

والدین کا فرض ہے کہ جب بیٹا یا بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ جائیں تو اُن کے نکاح کا انتظام کریں۔ کیونکہ یہ انسان کی فطری ضرورت ہے اور فطری ضروریات کو پورا کرنے سے نہ اسلام روکتا ہے اور نہ بے جا پابندی لگاتا ہے۔ لہٰذا پسندیدہ یہ ہے کہ بالغ ہونے کے فوراً بعد شادی کر دی جائے۔ اس سلسلہ میں اگر والدین کی غفلت کے سبب اولاد غلط راستے پر چل نکلے تو ذمہ داری والدین پر عائد ہوگی اور وہ مجرم ٹھہریں گے۔ شعب الایمان میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ فَلْيُحْسِنِ اسْمَهُ وَاَدَّبَهُ فَاِذَا بَلَغَ فَلْيُزَوِّجْهُ فَاِنْ بَلَغَ وَلَمْ يُزَوِّجْهُ فَاَصَابَ اِثْمًا فَاِنَّمَا اِثْمُهُ عَلٰى اَبِيْهِ))

''جس کے ہاں اولاد ہو تو اسے چاہیے کہ اس کا اچھا نام رکھے' اور اُسے اچھی تربیت دے۔ پس جب وہ بالغ ہو جائے تو اُس کی شادی کرے' اگر شادی کی عمر کے پہنچ جانے کے باوجود اس کی شادی نہ کی گئی اور وہ گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اُس کے گناہ کی ذمہ داری اس کے باپ پر ہو گی''۔

موجودہ دور میں دیر سے شادی کرنے کا رواج ہو گیا ہے اور یہ اس قدر معروف ہو گیا ہے کہ اگر کوئی باپ اپنے بیٹے یا بیٹی کا نکاح سولہ سترہ سال کی عمر میں کر دے تو اُس پر سخت نکتہ چینی کی جاتی ہے اور تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ بات ہماری اسلامی اقدار سے عدم واقفیت اور لاعلمی کو ظاہر کرتی ہے۔ یا یہ کہ ہم خود اپنی اقدار کی بجائے دوسری اقوام کی

اُن روایات کے شیدائی ہوتے جارہے ہیں جو گھناؤنے جرائم کا باعث بن کر گندگی پھیلا رہی ہیں۔ ابن ماجہ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا:

((اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ وَاَحْسِنُوْا اَدَابَھُمْ))

''اپنی اولاد کا اکرام کرو اور ان کو حسن آداب سے آراستہ کرو''۔

یعنی اولاد کو عطیہ خداوندی اور انمول نعمت جان کر ان کی قدر کرنی چاہیے۔ اولاد کی تربیت کو اہم ذمہ داری سمجھ کر اس کی طرف بھرپور توجہ دینی چاہیے۔ دنیاوی مصروفیتوں' فضول مشغلوں اور معاشی دوڑ دھوپ میں گم ہو کر تربیت اولاد کے سلسلہ میں غفلت انتہائی غیر ذمہ داری ہے۔ اس حدیث میں اسی بات کو مثبت انداز میں بیان فرما کر اس کی اہمیت کو اجاگر کیا گیا ہے۔

پس اگر والدین اپنے فرائض کی ادائیگی بطریق احسن کریں تو بڑی حد تک توقع کی جاسکتی ہے کہ اُن کی اولاد بھی ان کے حقوق پورے کرے گی اور خاندانی نظام میں بہتری پیدا ہوگی جس کے نتیجہ میں صحت مند مسلم معاشرہ قائم ہو کر خیر و برکت کا باعث ہوگا۔ اور اگر والدین اولاد کے حقوق پورے نہیں کرتے تو وہ کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ ان کی اولاد جوان ہو کر ان کی خدمت کرے اور حقوق ادا کرے۔

❁ ❁ ❁

نئ نسل کی بے راہ روی کا ذمہ دار کون؟

قائداعظم محمد علی جناح نے بجا طور پر نئ نسل کو معاشرے کے اہم ترین افراد گردانا ہے۔ نئ نسل ہی قومی اور ملی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے والی ہے۔ اگر نوجوانوں کی تربیت صحیح نہج پر ہو تو قوم کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر نوجوانوں کی اکثریت لہو ولعب میں محو اور لوٹ کھسوٹ میں مشغول ہو تو ظاہر ہے کہ قوم کی کشتی بس ڈوبنے ہی والی ہے۔ قوم کے باشعور اور ذمہ دار لوگوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نوجوانوں کی تربیت پر نظرِ عقاب رکھیں اور انہیں صحیح اقدار اور اچھے اخلاق کی تعلیم سے آراستہ کریں۔ اس ذمہ داری کو وہ یہاں تک محسوس کریں کہ اپنے تجربات کی روشنی میں ان کوتاہیوں کی بھی پیش بندی کریں جنہیں وہ نوجوانی میں اختیار کر کے ان کے نتائج بد سے نہیں بچ سکے۔

آج جب ہم اپنے معاشرے کی نئ نسل کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو ہم اسے تباہی کی طرف رواں دواں دیکھتے ہیں۔ ان حالات میں معاشرے کا ہر باشعور فرد یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر نئ نسل کی بربادی کا ذمہ دار کون ہے؟ جب ہم اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ معاشرے کا کوئی ایک طبقہ یا گروہ ہی خاص طور سے نئ نسل کی تباہی کا ذمہ دار نہیں ہے' بلکہ بہت سے عوامل ہیں جو انحطاط کے اس عمل میں کل پرزوں کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ بعض افراد تو شعوری طور پر اس عمل میں حصہ لے رہے ہیں جبکہ کچھ بے شعوری اور لاشعوری طور پر مصروفِ عمل ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ بلاشبہ والدین سے بڑھ کر اپنی اولاد کا کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا' والدین اپنی اولاد پر جان چھڑکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُن کے فرزندار جمند معزز اور معاشرے کے ذی وقار افراد ہوں' لیکن مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ والدین اپنی عدم توجہی' معاشی مصروفیت یا

غفلت کی وجہ سے اپنی اولاد کی تربیت خود اپنی خواہش کے مطابق نہیں کر پاتے۔ چونکہ والدین اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے اوّلین ذمہ دار ہوتے ہیں اس لیے نئی نسل کی بربادی کے ذمہ داروں میں سب سے پہلے والدین کا ذکر ہی مناسب ہے' اگرچہ بعد کے دلائل اس بات کی وضاحت کر دیں گے کہ والدین نئی نسل کی بربادی کے صرف جزوی ذمہ دار ہیں اور اس ضمن میں مؤثر ترین کردار چند دوسرے عوامل کا ہے۔

والدین پر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کا بوجھ قدرتی طور پر ڈالا گیا ہے۔ والدین کو اس ذمہ داری کا احساس بھی ہے' لیکن اکثر والدین معاشرے میں اپنی قابلِ ذکر حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے روزی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور اولاد کی تربیت کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔ وہ اولاد کی تربیت اور تعلیم کی ذمہ داری سکول کے اساتذہ پر ڈال دینا چاہتے ہیں اور ان حالات میں وہ اپنے طور پر مطمئن بھی ہو جاتے ہیں کہ ہم اپنی اولاد کی تربیت پر پیسے خرچ کر رہے ہیں۔ اگر انہیں کوئی اچھا استاد بطور ٹیوٹر مل جائے تو وہ اپنی ذمہ داری اُس پر ڈال کر خود کو بالکل فارغ البال محسوس کرتے ہیں' حالانکہ اپنی ذمہ داری کا بوجھ کسی غیر ذمہ دار کے کندھوں پر ڈالنا بالعموم اچھی اور نتیجہ خیز بات نہیں ہوتی۔ والدین کی یہ غفلت اُس وقت سب سے زیادہ شدید اور غالباً ناقابل تلافی ہو جاتی ہے جب والد کے ساتھ بچوں کی والدہ بھی معاشی حالت کی بہتری کے لیے کہیں ملازمت کر رہی ہو۔ اس طرح اگرچہ گھر کی معاشی حالت تو ضرور بہتر ہو جاتی ہے لیکن بچوں کی تربیت اکثر عجیب رنگ لاتی ہے۔ والدہ اور والد جب صبح سویرے اپنے اپنے کام پر نکل جاتے ہیں تو گھر میں نوکرانی بچوں کی نگرانی پر مامور ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نوکرانی بچوں کی نگران تو ضرور ہوگی لیکن وہ فطری طور پر والدہ کی طرح شفیق اور مشفق ثابت نہیں ہوسکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے اس ماحول میں پرورش پاتے ہیں جو سراسر شفقت سے محرومی کا مظہر ہوتا ہے۔ جس بچے نے شفقت سے محرومی میں پرورش پائی ہو وہ بڑا ہو کر شفیق اور رحم دل کیونکر ہوسکتا ہے! ایسے نوجوان لاشعوری طور پر معاشرے سے انتقام لینے کے لیے چل پڑتے ہیں۔ موجودہ دَور میں کھاتے پیتے خوشحال خاندانوں کے

نوجوانوں کا ڈاکہ زنی اختیار کرنا اسی قسم کی تربیت کا نتیجہ ہے' اگرچہ دوسرے عوامل نے بھی انہیں متاثر کیا ہے۔

انگریز نے سینکڑوں سال برعظیم پاک وہند پر حکمرانی کی اور یہاں کے باشندوں کے قلوب واذہان کو متاثر کیا۔ ہم انگریز کی جسمانی غلامی سے تو آزاد ہو گئے لیکن ذہنی غلامی کا اثر ہنوز تروتازہ ہے۔ یہاں انگریز کی برتری کے احساس کا یہ حال ہے کہ جو لوگ شلوار قمیص پہننے کے عادی ہیں انہیں جب بھی دانشوروں کے کسی اجلاس میں جانا ہوتا ہے تو وہ کوٹ پتلون زیبِ تن کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انہوں نے انگریزی لباس تیار رکھا ہوتا ہے۔ آپ نے کسی انگریز کو بمشکل ہی غیر انگریزی لباس میں دیکھا ہوگا۔ شلوار قمیص میں کیا قباحت ہے؟ انسان اس میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے اور بدن بھی غیر ضروری طور پر کسا ہوا نہیں ہوتا۔ پھر ہمارا دین ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہننے کی ترغیب دیتا ہے۔ اگرچہ ہمارے نوجوانوں نے انگریزی دَور کے ماہ وسال نہیں دیکھے لیکن جب وہ معاشرے میں ان دونوں لباسوں کو زیرِ استعمال دیکھتے ہیں تو اپنے طور پر انگریزی لباس کو بہتر سمجھ لیتے ہیں۔ نوجوانوں کے اس فیصلے کو ہم کسی حد تک حق بجانب کہہ سکتے ہیں' کیونکہ انگریزوں کے چلے جانے کے ۶۰ سال بعد بھی ہماری عدالتوں میں انگریزی قانون چل رہا ہے' انگریزی زبان کا تسلط ہے اور انگریزی سکولوں کی بالادستی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کے ذمہ دار افراد اپنی نوجوان نسل کو عملاً انگریزوں کی برتری کا سبق دے رہے ہیں۔ افسوس کہ اسلامی ملک میں جہاں مسلمان مدعی' مسلمان مدعیٰ علیہ اور مسلمان ہی جج ہیں' فیصلہ انگریز کے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ کیا مسلمانوں کا اپنا کوئی قانون نہیں؟ کیا نئی نسل کو تباہی کے راستے پر ڈالنے والوں میں ہم قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک کے تمام برسرِ اقتدار لوگوں کے نام نہیں لے سکتے؟ یہ ذمہ داری قوم کے بڑوں پر ہے کہ وہ اپنے تہذیبی ورثے کی قدر کریں اور نوجوان ان سے سیکھ کر اپنی روایات کو قابلِ افتخار سمجھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل کو گمراہ رکھنے میں اُن تمام افراد کا حصہ ہے جو فکراً یا عملاً ابھی تک انگریز کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں شلوار

قمیص کوترک ہی کرنا ہےتو عربی لباس ہمارے لیے پسندیدہ ہونا چاہیے' کیونکہ یہ ہمارے اسلاف کالباس رہاہےاورموجود ہے۔

نئ نسل کی تباہی میں ہماری اخباری صحافت نے بھی نمایاں کرداراداکیا ہے۔گندی' مضراورمخربِ اخلاق چیزوں کی تشہیر پر کالم کے کالم لکھے جاتے ہیں لیکن اسلامی تعلیمات کا ذکرمحض تبرک کے لیے کیا جاتا ہے۔ جرائم کی خبریں جلی سرخیوں میں شائع کی جاتی ہیں جنہیں چھوٹے بڑے سب لوگ پڑھتے ہیں۔چونکہ ملکی قوانین اورانتظامیہ کا طریق کار کچھ اس قسم کا ہے کہ بینک لوٹنے والوں' ڈاکہ ڈالنے والوں' قاتلوں اور بدمعاشوں کو شاذ ہی سزا ملتی ہے اس لیے نوجوان ذہن جس میں ذرا سی جرأت ہو' وہ ان برے طریقوں کو اپنانے میں ایک قسم کی ترغیب پاتا ہےاوراسے اظہارِ جرأت' مہم جوئی اور بہادری کا کارنامہ سمجھ کر کرنے کاارادہ کرلیتا ہےاوراس طرح دولت مند بننے کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہوتا دیکھتا ہے۔اگرملکی قوانین اسلامی ہوں اوراسلامی ضابطۂ اخلاق کے ماتحت فساد مچانے والوں کو سرعام پھانسی' کوڑوں اور قید کی عبرت ناک سزائیں ملیں تو آئندہ کسی نوجوان کو جرائم پر دلیری کرنے کا حوصلہ نہ رہے۔اخبارات میں اخلاقی جرائم کی خبریں نمایاں کر کے شائع کی جاتی ہیں جو اخلاقی اقدار کی پامالی کی حوصلہ افزائی کا اشتہار ہوتی ہیں۔بعض رسالے ایسے شائع ہوتے ہیں جو محض بداخلاقی' گناہ کی زندگی اور جرائم کی ترغیب کی تشہیر کرتے ہیں۔ان میں قزاقوں' ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کی حقیقی اور فرضی کہانیاں نہایت دلکش پیرائے اور مؤثر انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔گویا قومی تعمیر میں ان کا منفی کردار روزِ روشن کی طرح عیاں ہے' لیکن اس کے باوجوداُن کی اشاعت پرکوئی پابندی نہیں ہے۔

ابلاغِ عامہ کے دوادارے ریڈیواورٹیلیویژن بھی منفی کرداراداکرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھارہے ہیں۔محتاط اندازے کے مطابق ریڈیو کے پچاس فیصد پروگرام اور ٹیلی ویژن کا نوے فیصد وقت اس نسل کوتباہی کی راہ پرڈالنے کے لیے بڑی کامیابی کے ساتھ صرف ہورہا ہے۔انگریزی اورانڈین فلمیں' کارٹون اور بے ہودہ ڈرامے وغیرہ مغرب

اورعشاء کے درمیان دکھائے جاتے ہیں' مگر اسلامی تعلیمات کے چند پروگرام جومحض تبرکاً پیش کیے جاتے ہیں' اُن کا وقت رات ساڑھے دس یا اُس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ امسال حج کا براہِ راست منظر تو دن کو دوپہر کے وقت دکھایا گیا لیکن رات کو اُس پروگرام کا وقت گیارہ بجے تھا۔ رمضان شریف میں ٹی وی پر ہر روز ایک پارے میں بیان شدہ تعلیمات کا خلاصہ پیش کرنے کا اہتمام کیا گیا لیکن مقرر کو اس کے لیے صرف پندرہ منٹ دیے جاتے۔ مقرر کی انتہائی کوشش کے باوجود پورے پارے کا خلاصہ ہمیشہ تشنہ رہتا۔

ٹیلی ویژن پر چونکہ متحرک تصاویر نظر آتی ہیں اس لیے نوجوان نسل کے لیے اُن کے اندر ایک کشش پائی جاتی ہے۔ اگر ٹیلیویژن پروگرام اسلامی تعلیمات اور اخلاقی اقدار کی اشاعت پر مشتمل ہوں تو اس پُر کشش ذریعے سے نئی نسل ضرور متاثر ہو اور اُن کے قلوب اور اذہان اسلامی رنگ میں رنگے جائیں۔ مگر صورتِ حال نہ صرف افسوس ناک بلکہ خطرناک حد تک بگڑی ہوئی ہے۔ جو ڈرامے دکھائے جاتے ہیں اُن میں بیشتر ایسے ہوتے ہیں جن میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو چوری چھپے ملاقاتیں کرتے اور پیار ومحبت کے نغمے الاپتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ کیا مسلمانوں کے ضابطۂ اخلاق میں اس چیز کی اجازت ہے؟ قرآن وسنت کی تعلیمات کی رو سے بالغ عورتوں کے لیے پردہ کرنا فرض ہے۔ حیا عورت اور مرد کی زینت ہے۔ مرد اور عورت کا اختلاط فساد کا موجب ہے۔ جس نبیٔ محترم ﷺ نے اُمہات المؤمنین کو نابینا سے بھی پردہ کرنے کا حکم دیا اُس کا کلمہ پڑھنے والے نوجوان لڑکے لڑکیاں انتہائی بے باکی سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اُن کی اس طرح کی عشقیہ ملاقاتیں ٹیلیویژن کے ذریعے ملک کے دُور دراز گوشوں میں بیٹھے ہوئے معصوم بچوں تک بھی پہنچائی جاتی ہیں۔ مختلف کاروباری اشتہار ٹیلیویژن پر دکھائے جاتے ہیں جہاں عورت کے حسن وجمال کی نمائش ہی اشتہار کی روحِ رواں ہوتی' ہے۔ عورتیں ہی اناؤنسر ہیں اور عورتیں ہی خبریں سناتی ہیں۔ یوں معاشرے میں معصیت کی نشر واشاعت کے اس ادارے کی موجودگی میں

نوجوان نسل سے شرم وحیا اور اسلامی اقدار سے محبت کی توقع محض ایک دھوکا اور فریب ہے۔ بقول شاعر:

درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردہٗ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش!

پاکستان ٹیلیویژن کے ارباب بست وکشاد نئی نسل کو تباہی کے راستے پر گامزن کرنے کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں' ابلاغ عامہ کے اس ذریعے سے نئی نسل کے اندر اخلاق کی عظمت' دین کی محبت اور بزرگانِ دین کے عظیم کارناموں کی اشاعت کی جاسکتی ہے' مگر اس کے منفی استعمال سے یہ تفریح جرائم کی ترغیب اور گناہ کا محرک بن کر رہ گئی ہے۔

سینما ایک مقبولِ عام تفریح ہے۔ کہنے کو تو یہ تفریح ہے لیکن اسے مخرب اخلاق ادارہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ فلمیں اس قدر گھٹیا معیار کی دکھائی جاتی ہیں جن میں نصیحت کا پہلو تو برائے نام ہوتا ہے لیکن عشق کی داستان اور شہوانی جذبات کا اظہار نمایاں ہوتا ہے۔ جب نوجوان ایسی فلمیں دیکھتے ہیں تو سکولوں اور کالجوں کی خشک اور پیشہ ورانہ تعلیم میں انہیں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی' بلکہ اُن کی دل پسند شخصیتیں فلمی اداکار اور اداکارائیں بن جاتے ہیں اور وہ سڑکوں پر گھومتے پھرتے مختلف موسیقاروں کے گانے گنگناتے نظر آتے ہیں۔ بزرگوں کا مقولہ ہے کہ بچے کی مثال گیلی مٹی کے برتن کی ہے کہ اُسے آپ خواہش کے مطابق شکل دے سکتے ہیں' لیکن جب اُس کچے برتن کو آگ میں پختہ کرلیا جائے تو اُس کی کجی دور کرنا ممکن نہیں رہتا۔ جب ہمارے بچے چڑھتی جوانی میں عشق کے رسیا ہو گئے اور اپنے جنسی جذبات پر قابو نہ رکھ سکے تو نتیجہ بے راہ روی کے سوا اور کیا ہوگا؟ آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں اغوا اور زنا کے واقعات کی کس قدر کثرت ہے۔ آئے دن گھر سے بھاگے ہوئے بچے جب پکڑے جاتے ہیں تو تفتیش کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فلمی اداکار بننے کے شوق میں گھر کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ کیا یہ ہماری فلموں کا اثر نہیں ہے؟

سینمانوجوانوں کی کردار سازی میں قابل ذکر کردار ادا کرسکتا ہے۔ بزرگوں کے کارنامے اور بہادری کے واقعات پر مشتمل فلمیں بنائی جائیں تو یہ نوجوانوں کی صحیح سمت کی طرف راہ نمائی کرسکتی ہیں۔لیکن صورت حال بالکل برعکس ہے۔ہماری کون سی فلم ایسی ہے کہ جس میں گناہ کی دعوت دینے والا نسوانی کردار نہ ہو!اسی پر بس نہیں بلکہ یہاں تو فحاشی اور عریانی کے مناظر کی کثرت ہی کسی فلم کے معیاری ہونے کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

علم روشنی ہے اور جہالت تاریکی۔علم انبیاء کی وراثت ہے۔علم کے بغیر انسان خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔اہل علم معاشرے کے روحِ رواں ہوتے ہیں۔صاحب علم لوگ باشعور اور باخبر ہوتے ہیں۔مگر آج کے ماحول میں علم کی کوئی قدر نہیں رہی۔تعلیم محض ملازمت حاصل کرنے اور معاشی مسائل کے حل کے لیے حاصل کی جاتی ہے۔اس لیے جب نوجوان نسل دیکھتی ہے کہ گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ حضرات معمولی تنخواہ کی نوکریاں کر رہے ہیں' مگر اَن پڑھ لوگ جنھوں نے ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کرنے کا مشغلہ اختیار کر رکھا ہے' دنیا کی نظروں میں معزز ہیں تو اُن کے لیے تعلیم حاصل کرنے میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔وہ بچے جو ذوق وشوق سے تعلیم حاصل کرتے ہیں' جب اُن کے انٹرویوز اخبارات میں چھپتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈاکٹر' انجینئر بن کر قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اُن کا مدعا بھی بظاہر تو قوم کی خدمت ہوتا ہے لیکن اصل میں وہ دولت پیدا کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔یہی وجہ ہے کہ جب کوئی واقعی ڈاکٹر بن جاتا ہے تو وہ ہر شخص سے' بلاامتیاز مفلس وتونگر' اپنی بھاری معائنہ فیس وصول کرتا ہے۔ جو شخص ڈاکٹر بن کر ہزاروں روپے یومیہ کماتا ہے اگر وہ بزعم خود قوم کی خدمت کا جذبہ ظاہر کرے تو کون اس کو باور کرے گا!

دولت دنیا میں عزت وسرفرازی کا باعث ہے۔دولت کے ساتھ عیش وعشرت کی زندگی گزاری جاتی ہے۔ دولت سے ناجائز کام کروائے جاسکتے ہیں' اس لیے کہ ہمارا

معاشرہ اس کا رسیا ہو چکا ہے۔ آج یہ الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں کہ پیسہ ہو تو کون سا کام نہیں ہو سکتا؟ ہماری نوجوان نسل یہ مشاہدہ کرتی ہے کہ تعلیم یافتہ شریف آدمی کی معاشرے میں کوئی قدر نہیں ہے' وہ کسی مقامی مسئلے میں بطور مشیر نہیں بلایا جاتا' مگر علاقے کے دولت مند اور با اثر لوگ ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ مقامی مسائل کے حل کے وقت وہ مشیر خاص ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ پولیس کی خاطر تواضع کر سکتے ہیں لہٰذا تھانے میں بھی اُنہیں کرسی پیش کی جاتی ہے۔ پولیس کسی کو ملزم کی حیثیت سے پکڑ لے تو یہ دولت مند افراد اسے تھانے سے چھڑا کر لے آتے ہیں۔ معاشرے کے کمزور' غریب اور شریف لوگ ناخواندہ اور جاہل مگر دولت مند لوگوں سے خائف رہتے ہیں۔ یہ منظر ہماری نوجوان نسل کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم حاصل کر کے پروفیسر یا ٹیچر یا خطیب بن گئے تو معاشرہ اُن کی کیا قدر کرے گا؟ لیکن اگر انہوں نے بے علم رہ کر ناجائز دولت کمانے کا دھندا اختیار کر لیا تو انہیں معاشرے میں برتری حاصل ہوگی' لہٰذا وہ برتری کے حصول کا یہی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ملازمین میں بھی دو طبقے ہو جاتے ہیں۔ جو جائز ذرائع سے کماتے ہیں وہ بمشکل گزارہ کرتے ہیں' لیکن جو ناجائز کماتے ہیں انہیں بہت ہوشیار اور زیرک سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح معاشرے میں منفی اقدار کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اور شرافت اور تعلیم کو چنداں اہمیت نہیں دی جا رہی۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ملک میں انتخابات ہوئے۔ سرکاری ملازمین یعنی تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت کو مختلف پولنگ اسٹیشنوں پر متعین کر دیا گیا۔ گھروں سے باہر ہونے کی وجہ سے یہ لوگ خود ووٹ نہ ڈال سکے۔ اس طرح ہزارہا تعلیم یافتہ افراد کو حق رائے دہی سے محروم کر دیا گیا' جبکہ عوامی نمائندے چننے میں اکثریت غیر تعلیم یافتہ لوگوں ہی کی تھی۔ معلوم ہوا کہ پوری قومی مشینری میں تعلیم کی اہمیت کو سراسر ختم کیا جا رہا ہے۔ جب تعلیم اور تعلیم یافتہ افراد معاشرے میں اس درجے بے وقار ہیں تو نئی نسل تعلیم کے حصول میں اپنی توانائیاں کیوں ضائع کرے گی!

ضرورت اس بات کی تھی کہ صحیح اسلامی اقدار کی تشہیر و اشاعت کی جاتی اور اس

طرح نوجوان نسل اپنے دین کی طرف سے عائد کردہ فرائض سے روشناس ہونے کے علاوہ انسانیت کے تقاضوں سے بھی آگاہ ہوتی' کیونکہ اسلام دین فطرت ہے' کوئی اسلامی تقاضا ایسا نہیں ہے جو قوانینِ فطرت سے ٹکراتا ہو۔ لیکن ہوا یہ کہ جدید تہذیب نے جس قدر برائیاں چمکا دمکا کر پیش کیں اخلاقی قدروں کی اشاعت اُس سے کم تر رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان نسل ظاہری چمک دمک میں پڑ گئی اور آخرت کو فراموش کر بیٹھی۔ اس وقت پورا معاشرہ دولت کمانے کے چکر میں پڑ گیا ہے اور ہر شخص زیادہ سے زیادہ دنیاوی راحت کا سامان اکٹھا کرنے میں لگ گیا ہے۔ شادی بیاہ اور دوسری سماجی تقریبات پر بھاری اخراجات کے ساتھ نمود و نمائش کے لیے چمک دمک کا منظر پیش کیا جانے لگا ہے۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ہر شخص دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں ہے۔ قرآن کا حکم تو یہ ہے: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ ''نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو'' لیکن افسوس کہ یہاں نمود و نمائش' تصنع اور فضول خرچی کے کاموں میں سبقت لے جانے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ معاشرہ جب مجموعی طور پر چمک دمک پر فدا نظر آ رہا ہے تو نوجوان نسل تو پہلے ہی ناپختہ ذہن رکھتی ہے' لہٰذا اُن کا سحر زدہ ہونا یقینی ہے۔

یہاں علماء کی ذمہ داری تھی کہ وہ صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قناعت کا درس دیتے اور خود اپنی زندگیوں سے قناعت پسندی کا ثبوت دیتے' مگر علماء اس کام میں ناکام رہے' الا ماشاءَ اللہ۔ واعظین' مبلغین اور خطباء خود آسائش پسند ہو گئے۔ زبان سے قناعت پسندی کی تعلیم دینے والے بھی قناعت سے کوسوں دور چلے گئے۔ سچ پوچھیے تو علماء کا کام تھا دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' مگر خود علماء فرقہ بندی کے چکر میں پڑ گئے اور سادہ لوح عوام کو ایک دوسرے سے متنفر کرنے کا فریضہ سنبھال لیا۔ جب نئی نسل نے واعظین اور علماء کو آپس میں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتے سنا تو اس کے ذہن میں تحقیق و جستجو کی بجائے خود اسلام ہی سے نفرت پیدا ہو گئی۔ حالانکہ علماءِ دین کو اسلام کی کسوٹی سمجھنا بذاتِ خود غلطی ہے۔ ہاں علماء کی وہ جماعت ہمیشہ سے قابل قدر رہی ہے اور

اب بھی قابل قدر ہے جو ہر قسم کے حالات میں قرآن وسنت کی تعلیمات کی اشاعت وتبلیغ کے لیے کمر بستہ رہی اور نبی اکرم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پر عمل پیرا رہی۔ اب اگر کہیں اسلامی اقدار کی تھوڑی بہت ترویج نظر آتی ہے تو وہ انہی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ بہر حال نام نہاد علماء کے ناپسندیدہ طرزِ عمل نے بھی نئی نسل کو متاثر کیا اور یوں نئی نسل راہِ راست سے منحرف ہوئی۔

اگر علماء مسلک کے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرتے' جیسا کہ خود جلیل القدر ائمہ وفقہاء آپس میں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے' تو نفرت کے پیدا ہونے کا امکان نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر علماء دیانت داری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو اپنے لیے اسوۂ حسنہ سمجھ کر اپناتے اور اسے دوسروں کے سامنے پیش کرتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ لہٰذا نئی نسل کی تباہی کی بہت بڑی ذمہ داری اُن علمائے کرام پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے اسلام کے عالم گیر اور سادہ طرزِ زندگی کی اشاعت کو چھوڑ کر اور فقہی اختلاف کو ہوا دے کر مسلمان کو مسلمان سے نفرت دلانے بلکہ نوجوانوں کو اسلام سے متنفر کرنے کا گھناؤنا کام اختیار کر رکھا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے کے تمام افرادِ قوم وملت کی خیر خواہی کے ساتھ اپنا محاسبہ کریں' طرزِ عمل بدلیں اور وہی کام کریں جو اسلامی اور اخلاقی تقاضوں کے مطابق ہوں' نیز نوجوانوں کے لیے مثبت کردار کا نمونہ بنیں۔ OO

کیا چھوٹے گناہ معمولی ہوتے ہیں؟

بعض اوقات ایک چھوٹی سی غلطی بڑی خوفناک ثابت ہوتی ہے۔ معمولی سی بے احتیاطی کا نتیجہ بڑی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ دو آدمیوں میں تلخ کلامی ہو جاتی ہے' دیکھتے ہی دیکھتے وہ تلخ کلامی مسلح لڑائی میں تبدیل ہو کر نوبت قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے۔ کسی شخص نے سگریٹ کا سلگتا ہوا ٹکڑا بے احتیاطی سے پھینک دیا' قریب کا غذیا خشک پتے تھے' آگ بھڑک اٹھی اور آناً فاناً قابو سے باہر ہو گئی اور لاکھوں کا نقصان ہو گیا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ استری گرم تھی' بجلی چلی گئی' استری کا سوئچ آف کرنا یاد نہ رہا' رات گئے بجلی آ گئی' استری تیز گرم ہوئی' پاس پڑے ہوئے کپڑوں کو آگ لگ گئی اور جب تک اہل خانہ کو خبر ہوئی مکان کا ایک حصہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ کسی نے گاڑی غلط جگہ پر پارک کر دی' ٹریفک کا مسئلہ پیدا ہو گیا' کئی لوگ بروقت اپنے اپنے کام پر نہ پہنچ سکے۔ اس طرح کئی قسم کا نقصان ہو گیا۔ ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی معمولی بات ہے' مگر بعض اوقات اس کا نتیجہ اس قدر ہولناک ہوتا ہے کہ قیمتی جانیں چلی جاتی ہیں۔ کیلا کھاتے کھاتے اُس کا چھلکا بے احتیاطی سے راستے میں پھینک دیا' ایک آدمی کا پاؤں اُس پر پڑا' وہ بیچارہ پھسلا اور زندگی بھر کے لیے معذور ہو گیا۔

آپ نے دیکھا معمولی سی غلطی انجام کے اعتبار سے کس قدر بھیانک ثابت ہوئی۔ یہی حال گناہ کا ہے۔ ایسا گناہ جو بظاہر معمولی نظر آتا ہے' اکثر اوقات ہلاکت آفریں اور بڑی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ اگر ہم دورِ جاہلیت کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی کئی سال جاری رہنے والی لڑائیوں کی ابتدا بالکل معمولی معمولی باتوں سے ہوئی۔ اُس دور کی مشہور لڑائی جنگ بسوس قبیلہ شیبان اور قبیلہ تغلب کے درمیان شروع ہو کر چالیس سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہی۔ اس میں فریقین کے

سینکڑوں آدمی قتل ہو گئے۔ یہ لڑائی اس طرح شروع ہوئی کہ ایک قبیلے کی اونٹنی نے دوسرے قبیلے کے باغ میں واقع ایک پرندے کا گھونسلہ خراب کر دیا تھا اور انڈے توڑ دیے تھے۔ اس پر باغ کے مالک نے اونٹنی کو مار ڈالا تھا۔ بس اسی سے ایک دوسرے پر حملے شروع ہو گئے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ پس کسی گناہ کو چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کر کے فرمایا:

((يَا عَائِشَةُ اِيَّاكِ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ ، فَاِنَّ لَهَا مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ طَالِبًا)) (مسند احمد)

''اے عائشہ! چھوٹے گناہوں سے بھی بچا کرو' کیونکہ اللہ عزوجل کی طرف سے اِن کی بھی باز پُرس ہوگی۔''

قرآن مجید میں ہے کہ جب آدمی کو نامۂ اعمال ملے گا تو وہ اسے دیکھ کر کہے گا:

﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا﴾ (الکھف:٤٩)

''یہ کیسا نوشتہ ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی چیز نہیں چھوڑی جو اس میں درج نہ ہو!''

گویا نامۂ اعمال میں صرف بڑے بڑے گناہ ریکارڈ نہیں ہو رہے بلکہ چھوٹے گناہ بھی درج کیے جا رہے ہیں۔ محتاط طرزِ عمل ہمیشہ اچھا رہتا ہے۔ دریا میں معمولی پانی سمجھ کر اس میں قدم رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اگلے قدم پر کوئی گہرا گڑھا ہو اور وہ غرقابی کا باعث بن جائے۔ ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

لَا تُحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً ۔۔۔ اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰی

''کسی چھوٹی چیز کو حقیر نہ سمجھو' کیونکہ پہاڑ چھوٹے چھوٹے کنکروں سے مل کر بنتے ہیں''۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ قول بخاری شریف میں ہے کہ آج تم کئی گناہوں کو کرتے ہوئے اُن کو بال سے بھی کم سمجھتے ہو' حالانکہ ہم نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ مبارک میں اُن کو مہلک گناہوں میں شمار کرتے تھے۔ گناہ کو معمولی سمجھنے سے انسان اُس کے ارتکاب پر دلیر ہو جاتا ہے' حالانکہ گناہ ایسی چیز ہے کہ اس سے دُور رہنا ہی بہتر ہے' خواہ کتنا ہی چھوٹا

کیوں نہ ہو' کیونکہ برائی تو بہرحال برائی ہے۔اور پھر معمولی سی تکرار معمولی کو بھی غیر معمولی بنا دیتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((اِيَّاكُمْ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ كَقَوْمٍ نَزَلُوْا فِيْ بَطْنِ وَادٍ فَجَاءَ ذَا بِعُوْدٍ وَجَاءَ ذَا بِعُوْدٍ حَتّٰى اَنْضَجُوْا خُبْزَتَهُمْ وَاِنَّ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ مَتٰى يُؤْخَذْ بِهَا صَاحِبُهَا تُهْلِكْهُ)) (مسند احمد)

''چھوٹے گناہوں سے بھی بچو! چھوٹے گناہوں کی مثال اُس قافلے جیسی ہے جو ایک مقام پر نازل ہوا ہو' اُن میں ہر شخص ایک ایک لکڑی لا کر جمع کرتا ہے' پھر وہ لکڑیاں اتنی ہو جاتی ہیں کہ وہ ان سے اپنا کھانا پکا لیتے ہیں۔ اور (یاد رکھو) چھوٹے گناہ گرفت کے وقت انجام دینے والے کے لیے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں''۔

ظاہر ہے جس گناہ کو معمولی سمجھا جائے گا اُس کے متعلق احتیاط نہ ہوگی اور اس کا ارتکاب ہوتا رہے گا جو اُسے سنگین بنا دے گا' مگر جس گناہ کو آدمی بڑا سمجھے وہ اس کے قریب جانے سے باز رہے گا' اور اگر کبھی بڑا گناہ کر بیٹھا تو خوفِ خدا سے کانپ جائے گا' نادم ہوگا' استغفار کرے گا تو اُس کا وہی بڑا گناہ اللہ کے ہاں چھوٹا ہو جائے گا۔

فقیہہ ابواللیث سمرقندیؒ نے ''تنبیہہ الغافلین'' میں لکھا ہے کہ گناہ بڑا ہو یا چھوٹا دس عیوب سے خالی نہیں ہوتا۔ پہلا یہ کہ اس نے اپنے پروردگار کو ناراض کیا۔ دوسرا یہ کہ اللہ کے مغضوب ابلیس کو خوش کیا۔ تیسرا یہ کہ جنت سے دُور ہوا۔ چوتھا یہ کہ جہنم کے قریب ہو گیا۔ پانچواں یہ کہ اس نے اپنے محبوب نفس پر ظلم کیا۔ چھٹا یہ کہ اس نے اپنے نفس کو گندا کر دیا جس کو اللہ نے پاک پیدا کیا تھا۔ ساتواں یہ کہ اس نے اپنے ہم نشین فرشتوں کو اذیت پہنچائی جو کہ اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ آٹھواں یہ کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو قبر میں پریشان کیا۔ نواں یہ کہ اس نے رات اور دن کو اپنے اس برے عمل پر گواہ بنایا۔ دسواں یہ کہ اس نے تمام مخلوق سے خیانت کی (یعنی اس کے گناہ کی نحوست سے دوسری مخلوق متاثر ہوئی)۔

حضرت باقر ؒ کا قول ہے کہ اللہ کا غضب وغصہ گناہوں میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ کسی معصیت کو چھوٹا مت سمجھو، ہوسکتا ہے اسی میں آتشِ غضب پنہاں ہو۔

بدنظری ایسا گناہ ہے کہ جسے عام طور پر گناہ سمجھا ہی نہیں جاتا' اور اگر کوئی سمجھتا ہے تو بہت معمولی گناہ۔ مگر اس کی سنگینی دیکھئے۔ ابوبکر کتانیؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک دوست کو بعد از وفات خواب میں دیکھا۔ اُس سے پوچھا کیا معاملہ ہوا ہے؟ کہنے لگا ایک دفعہ ایک خوبصورت لڑکا میرے پاس سے گزرا' میں نے اس کی طرف دیکھ لیا' اس بدنظری کی پاداش میں شرم کے مارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ستر سال کھڑا رہا' پسینہ پسینہ ہوگیا تھا' پھر اللہ نے اپنے فضل سے معاف فرمادیا۔

حضرت بایزید بسطامی ؒ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عابد کی بزرگی کی تعریف وشہرت سنی تو میں اُس کی زیارت کے لیے گیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے قبلہ کی جانب تھوک پھینکی۔ میں اُس کی زیارت کیے بغیر واپس ہوگیا' کیونکہ جس شخص نے شریعت کے ظاہری آداب کا خیال نہیں رکھا وہ روحانی اسرار سے کب واقف ہوگا!

نیک کام کرتے وقت قبلہ رو ہونا سعادت مندی اور موجب نجات ہے' اسی طرح سمتِ قبلہ کی بے ادبی گناہ اور نحوست کا باعث ہے۔ مگر عام طور پر اس کو معمولی کام سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ: ''جو شخص قبلہ کی طرف تھوکتا ہے قیامت کے دن وہ ایسی حالت میں آئے گا کہ وہی تھوک اس کی آنکھوں کے درمیان چہرہ پر بُرے داغ کی صورت میں ہوگی۔'' (ابوداؤد)

کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا فَهُوَ التُّقٰى

''تو گناہ چھوڑ دے' خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے' بس یہی تقویٰ ہے۔''

رسول اللہ ﷺ نے بعض بظاہر چھوٹے چھوٹے اعمال پر بڑے ثواب کی خوشخبری سنائی ہے یا چھوٹے سے عمل پر بہت زیادہ اجر وثواب کی خبر دی ہے۔ بعض لوگ ایسی احادیث کو سنجیدگی سے نہیں لیتے اور تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک بات

ہے۔کسی معمولی عمل پر بہت زیادہ اجر وثواب عطا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ اسی طرح وہ کسی بظاہر چھوٹے سے عمل پر گرفت کر لے تو اس کا ہاتھ کوئی روک نہیں سکتا۔ امام طبرانیؒ فرماتے ہیں کہ ''ہم طالب علمی کے دور میں شہر بصرہ کی ایک گلی میں سے گزر کر تیز تیز چلتے ہوئے اپنے استاد کے پاس جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک غیر سنجیدہ طالب علم تھا' وہ اُس حدیث کا مذاق اڑاتے ہوئے جس میں کہا گیا ہے کہ طالب علم کے قدموں کے نیچے فرشتے پَر بچھاتے ہیں' کہنے لگا کہ اپنے قدموں کو اٹھالو کہیں تم فرشتوں کے پَر نہ توڑ دو۔اس نے مذاق کے انداز میں یہ بات کہی ہی تھی کہ اس کے پاؤں وہاں سے ہل نہ سکے' اس کی ٹانگیں سوکھ گئیں اور وہ زمین پر گر پڑا''۔ پس احکامِ شریعت یا قرآن وحدیث کی باتوں کی تحقیر اور اُن پر استہزاء کے انداز میں تبصرہ سے بچنا چاہیے۔

گناہ تو چھوٹا ہو یا بڑا آخر گناہ ہی ہے۔ پرہیز گار تو وہ ہیں جو مشکوک چیز سے بھی دُور رہتے ہیں کہ کہیں اُس کا تعلق گناہ سے نہ ہو۔ صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الْحَلَالَ بَیِّنٌ وَاِنَّ الْحَرَامَ بَیِّنٌ وَبَیْنَھُمَا مُشْتَبِھَاتٌ لَا یَعْلَمُھُنَّ کَثِیْرٌ مِّنَ النَّاسِ ، فَمَنِ اتَّقَی الشُّبُھَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِیْنِہٖ وَعِرْضِہٖ وَمَنْ وَقَعَ فِی الشُّبُھَاتِ وَقَعَ فِی الْحَرَامِ)) (صحیح البخاری۔وصحیح مسلم' کتاب المساقاۃ)

''یقیناً جو حلال ہے وہ واضح اور روشن ہے اور جو حرام ہے وہ بھی واضح ہے' اور ان دونوں کے درمیان کچھ ایسی چیزیں ہیں جو مشتبہ ہیں' بہت سے لوگ ان (کے شرعی حکم) کو نہیں جانتے۔پس جو شخص شبہ والی چیزوں سے بھی (احتیاطاً) پرہیز کرے وہ اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لے گا اور جو شخص شبہ والی چیزوں میں پڑے گا تو وہ حرام کی حدود میں جا گرے گا''۔

ترمذی شریف کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ:

''بندہ متقی اس وقت ہوتا ہے جب ان جائز امور کو بھی ترک کر دے جن کے ذریعے آگے ناجائز امور میں پڑنے کا خطرہ ہو''۔

جب شبہ والی چیز سے بھی دُور رہنے کا حکم دیا گیا ہے تو گناہ کی بات کا تو کسی طور پر بھی

ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے: ؎

واصنع كماش فوق ار ض الشوك يحذر ما يرى

یعنی ایسی زندگی گزار جس طرح کوئی شخص خاردار زمین پر چلتے ہوئے ہر چیز سے خطرہ محسوس کرتا ہے۔

مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے بیت الخلاء سے نکلتے ہوئے غلطی سے بایاں قدم باہر رکھ دیا تو فوراً بے ہوش ہو گئے کہ حدیث کی مخالفت سرزد ہو گئی' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تو یہ ہے کہ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں پہلے اندر رکھو اور نکلتے وقت دایاں پاؤں پہلے باہر نکالو' جبکہ مسجد کا حکم اس کے برعکس ہے۔

صحیحین کی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((دَخَلَتِ امْرَأَةٌ النَّارَ فِيْ هِرَّةٍ رَبَطَتْهَا فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَمْ تَدَعْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْأَرْضِ)) (صحيح البخاری' كتاب بدء الخلق)

''ایک عورت ایک بلی (نہایت ظالمانہ طریقے سے) مار ڈالنے کے جرم میں آگ میں داخل ہوئی۔اس نے اس بلی کو باندھ لیا' پھر نہ تو خود اسے کھانے کو کچھ دیا اور نہ اسے چھوڑا کہ وہ حشرات الارض سے اپنا پیٹ بھر لیتی۔''

جب انسان پر غسل فرض ہو جائے تو جلد از جلد پاکیزگی اختیار کر لینی چاہیے' کیونکہ جُنبی آدمی نہ نماز پڑھ سکتا ہے' نہ مسجد میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ قرآن مجید کو چھو سکتا ہے۔اس لیے جنابت کی حالت میں رہنا گناہ کی حالت میں رہنا ہے۔ایک شخص نے کسی کو خواب میں دیکھا۔خواب میں نظر آنے والے نے کہا مجھے چھوڑ دیجیے' میں بری حالت میں ہوں' کیونکہ ایک دفعہ میں نے غسلِ جنابت نہیں کیا تھا جس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے آگ کا کپڑا پہنا دیا' اس آگ کے لباس میں دن رات سرگرداں ہوں۔

کسی آدمی نے ایک فوت شدہ نمازی کو خواب میں دیکھا اور پوچھا موت کے بعد تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہوا؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے ایک دن وضو کے بغیر نماز

پڑھی تھی جس کی سزا مجھے یہ ملی کہ ایک بھیڑیا مجھ پر مسلط کر دیا گیا ہے جو مجھے ہر وقت قبر میں ڈراتا رہتا ہے۔ اِس خوفناک صورتِ حال کی وجہ سے میں بہت بری حالت میں ہوں۔

کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے' کیونکہ ناجائز لقمہ نری ہلاکت ہے۔ بزرگانِ دین اور صلحائے اُمت نے اس ضمن میں قابل تقلید مثالیں چھوڑی ہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ ایک بار کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دودھ پیش کیا۔ آپؓ نے پی لیا۔ پھر اس آدمی سے پوچھا کہ یہ دودھ تم نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟ اس نے کہا میں ایک چشمے پر گیا' وہاں صدقہ کی اونٹنیوں کو پانی پلایا جا رہا تھا۔ شتر بانوں نے ان کا دودھ دوہا اور اس میں سے کچھ مجھے بھی دیا۔ وہی دودھ میں نے لا کر آپؓ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً اُنگلی اپنے حلق میں ڈالی اور قے کر کے دودھ نکال دیا' کیونکہ وہ بیت المال کی اونٹنیوں کا اتنا سا دودھ بھی اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے تھے۔

ایک صالح نوجوان نہر کے کنارے سفر کر رہا تھا۔ نہر میں ایک سیب تیرتا ہوا آ رہا تھا' اُس نے پکڑا اور کھا لیا۔ بعد ازاں خیال آیا کہ نمعلوم یہ سیب کس کا تھا' اور میں نے مالک کی مرضی کے بغیر کھا لیا! اسی فکر میں آگے جا رہے تھے کہ دیکھا کہ نہر کے کنارے ایک باغ ہے جس کے درختوں کی شاخیں پانی پر جھکی ہوئی ہیں۔ سمجھ گئے کہ وہ سیب اسی باغ کے درخت سے پانی میں گرا تھا۔ چنانچہ وہ صالح نوجوان اس باغ کے مالک کے پاس گیا اور کہا میں نے آپ کے باغ کا ایک سیب جو کہ نہر کے پانی میں بہا جا رہا تھا' آپ کی اجازت کے بغیر کھا لیا ہے' آپ مجھے یہ خطا معاف کر دیں۔ باغ کا مالک بھی صاحب ادراک تھا۔ کہنے لگا میں تو معاف نہیں کروں گا۔ جب نوجوان نے منت سماجت کی تو کہنے لگا کہ معافی کی ایک صورت ہے' اور وہ یہ کہ میری بیٹی سے نکاح کر لو جو آنکھوں سے اندھی' کانوں سے بہری اور ٹانگوں سے معذور ہے۔ نوجوان نے چار و ناچار یہ شرط منظور کر لی۔ نکاح ہو گیا۔ جب نوجوان نے اس لڑکی کو دیکھا تو اس کے اندر کوئی بھی جسمانی عیب نہ تھا' وہ حیران ہوا اور لڑکی کے والد سے پوچھا کہ لڑکی نہ تو اندھی

ہے نہ بہری ہے اور نہ معذور ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میری لڑکی اندھی اِس معنی میں ہے کہ اس نے کسی غیر محرم کو نہیں دیکھا۔ بہری اِس معنی میں ہے کہ اس کے کان ناجائز اور حرام آوازیں سننے سے پاک رہے۔ ٹانگوں سے معذور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی معصیت کے کام کی طرف چل کر کبھی نہیں گئی۔ یہ صالح نوجوان اور اس کی خوش خصال اور پاک دامن بیوی ہی وہ جوڑا ہے جن کے ہاں حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جنم لیا۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک عقیدت مند انہیں ملنے کے لیے آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ٹرین میں سوار ہوکر عازمِ سفر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی ٹرین میں سوار ہوگیا۔ جلدی سے ٹکٹ بھی نہ خرید سکا۔ جب ٹرین کے ڈبے میں ٹکٹ چیک کرنے والا آیا تو نوجوان نے کہا کہ میں جلدی میں سوار ہو گیا ہوں اور ٹکٹ نہیں لے سکا' آپ مجھے ٹکٹ دے دیں۔ ٹکٹ چیکر نے نوجوان کے چہرے پر نظر ڈالی تو اسے معصوم سا چہرہ جس پر خوبصورت داڑھی تھی' بھلا معلوم ہوا' کہنے لگا نوجوان! ٹکٹ کی ضرورت نہیں' جہاں آپ اترنا چاہیں اتر جائیں۔ نوجوان مطمئن ہوکر بیٹھ گیا اور سفر ختم کر کے سٹیشن پر اتر گیا۔ مولانا تھانویؒ سے ملاقات ہوئی تو ضمناً سفر کا ذکر بھی آ گیا تو نوجوان نے ساری روئیداد بتادی۔ مولانا نے کہا کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اگرچہ ٹکٹ چیکر نے آپ کو کرایہ معاف کر دیا' مگر وہ تو کرایہ معاف کرنے کا مجاز نہ تھا۔ وہ ریل کا ملازم تھا۔ آپ نے کرایہ نہ دے کر محکمۂ ریلوے کو نقصان پہنچایا ہے۔ اب اتنی رقم کا ریل کا ٹکٹ خرید کر ضائع کر دو' متعلقہ محکمے کو کرایہ کی رقم پہنچ جائے گی۔

خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ اگرچہ قرآن وحدیث میں کچھ گناہوں کو چھوٹا اور کچھ کو بڑا کہا گیا ہے' مگر ہمیں تفصیلی طور پر اِن گناہوں کی تاثیر کا علم نہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بڑے گناہ کا انجام اِس قدر خطرناک اور ہلاکت خیز نہیں ہوتا جتنا کسی چھوٹے گناہ کا' لہٰذا جو کام گناہ کا ہے' خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اُس سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

چھوٹی چھوٹی نیکیوں پر اجر عظیم

نیکی کے کچھ کام بظاہر معمولی نظر آتے ہیں مگر اُن کا اجر و ثواب بہت زیادہ ہوتا ہے' لوگ ایسے کاموں کو حقیر سمجھ کر اُن کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اس طرح بہت بڑے اجر و ثواب سے محروم رہتے ہیں۔ حالانکہ معمولی اور آسان کام جو اجر کے اعتبار سے عظیم ہو اُس کی طرف تو دوڑ کر جانا چاہیے اور اُس کی انجام دہی کے لیے ہمہ وقت مستعد رہنا چاہیے۔ جیسا کہ ہم اُس کام کی طرف سب کام چھوڑ کر متوجہ ہو جاتے ہیں جس میں روپے پیسے کا غیر معمولی نفع نظر آ رہا ہو۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ دُنیا کے معمولی نفع کی خاطر انسان لمبے لمبے سفر اختیار کر لیتا ہے' بلکہ بڑے بڑے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ دُنیا کا مال و متاع اور مفاد جس قدر بھی ہو وہ متاعِ قلیل' غیر حقیقی اور فانی ہے' جبکہ آخرت کا نفع حقیقی' دائمی اور ابدی ہے جس کے مقابلہ میں دُنیوی مفاد کی کوئی حیثیت نہیں۔ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اُن آسان کاموں کی طرف دھیان دیں جن پر اسلامی تعلیمات کے اندر بڑے اجر و ثواب کے وعدے ہیں۔ کسی مسلمان بھائی کو خوش کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کے لیے بہت لمبی چوڑی جدوجہد کرنا پڑے' بلکہ بعض اوقات تو معمولی سی کاوش سے دوسرے کا دل خوش کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی شخص کا اپنے کسی عزیز رشتہ دار کے ساتھ اختلاف ہو گیا ہے اور وہ اس صورت حال میں پریشان ہے' ایک آدمی آگے بڑھ کر دونوں کے درمیان غلط فہمیوں کا ازالہ کر کے اُن کے درمیان اُلفت و مودّت کا رشتہ دوبارہ قائم کر دیتا ہے تو یہ چھوٹا سا عمل بہت بڑی نیکی ہے' کچھ عجب نہیں کہ اُس کا یہ عمل اُسے جنت میں لے جائے۔ ذیل میں ہم ایسے چند اعمال کا ذکر کرتے ہیں جو بظاہر چھوٹے نظر آتے ہیں مگر قرآن و حدیث کی رو سے ان کا اجر بہت عظیم ہے۔

دوسروں کو فائدہ پہنچانا

حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ قَضٰی لِاَحَدٍ مِنْ اُمَّتِیْ حَاجَةً یُرِیْدُ اَنْ یَسُرَّہٗ بِھَا فَقَدْ سَرَّنِیْ، وَمَنْ سَرَّنِیْ فَقَدْ سَرَّ اللّٰہَ، وَمَنْ سَرَّ اللّٰہَ اَدْخَلَہُ اللّٰہُ الْجَنَّةَ)) (۱)

''جس شخص نے میری اُمت میں سے کسی انسان کو خوش کرنے کے لیے اس کا کوئی کام کیا تو اُس نے مجھے خوش کیا، اور جس نے مجھے خوش کیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا، اور جس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل فرمائیں گے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

((مَنْ اَغَاثَ مَلْھُوْفًا کَتَبَ اللّٰہُ لَہٗ ثَلَاثًا وَسَبْعِیْنَ مَغْفِرَةً، وَاحِدَةٌ فِیْھَا صَلَاحُ اَمْرِہٖ کُلِّہٖ وَثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ لَہٗ دَرَجَاتٌ یَوْمَ الْقِیَامَةِ)) (۲)

''جو شخص کسی مصیبت زدہ انسان کی مدد کرے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے ۷۳ مغفرتیں لکھ دیتے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک مغفرت اس شخص کی اصلاحِ حال اور خوشحالی کے لیے کافی ہے اور باقی ۷۲ مغفرتیں اس کے لیے قیامت کے دن بلندیٔ درجات کا ذریعہ ہوں گی۔''

یتیم پر شفقت

یتیم بچہ شفقتِ پدری سے محروم ہے۔ وہ محزون اور مغموم ہے۔ اگر کوئی شخص اُس کی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل میں مدد کرے تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔ لیکن جس شخص کو اُس کی مالی امداد کی استطاعت نہیں، مگر وہ پیار اور شفقت کے جذبات کے ساتھ اُس کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتا اور محبت و رأفت کا ہاتھ اُس کے سر پر رکھتا ہے تو اُس کا یہ عمل بھی بے انتہا ثواب کا باعث بن جاتا ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ:

''جو شخص کسی یتیم بچے یا بچی کے سر پر صرف اللہ کی رضا کی خاطر شفقت سے ہاتھ پھیر دے تو جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرے گا اُن کی تعداد کے برابر اس شخص کو نیکیاں ملیں گی۔'' (۳)

پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں (انگشت شہادت اور اس کے ساتھ والی انگلی) کو ملایا اور فرمایا: ''جو شخص کسی یتیم بچے یا بچی کا نگران ہو اور اُس کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو مَیں اور وہ شخص جنت میں اِن دو انگلیوں کی مانند قریب ہوں گے۔'' دیکھئے یتیم کے سر پر پیار' محبت' ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ ہاتھ پھیرنا کتنا آسان کام ہے' مگر اس کا اجر وثواب کتنا عظیم ہے۔ ہاتھ کے نیچے تو لاکھوں کی تعداد میں بال ہوں گے' چنانچہ یہ معمولی سا عمل لاکھوں نیکیوں کا سبب بن جائے گا۔ اور اگر کسی نے ایک بے سہارا یتیم کو اپنے ہاں رکھ لیا اور اُس کے کھانے پینے اور لباس وغیرہ کی ذمہ داری قبول کر لی تو یہ عمل اُس کی مغفرت کا باعث بن جائے گا۔ اور یہ کام بھی زیادہ مشکل نہیں' کیونکہ جہاں وہ اپنے بچوں کی ضروریات پوری کرتا ہے اس یتیم کی کفالت بھی کر لے گا' اور سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی روزی میں برکت ڈال دے گا اور یتیم کا وجود اُس کے لیے بار نہیں ہو گا بلکہ سعادت کا باعث بن جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَبَضَ يَتِيمًا مِنْ بَيْنِ الْمُسْلِمِينَ اِلٰى طَعَامِهٖ وَشَرَابِهٖ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ اِلَّا اَنْ يَّعْمَلَ ذَنْبًا لَا يُغْفَرُ لَهٗ)) (۴)

''جو شخص کسی یتیم کو بلا کر اپنے کھانے پینے میں شریک کر لے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو جنت میں داخل فرما دیتے ہیں' سوائے اس کے کہ اس نے ناقابل بخشش گناہ (یعنی شرک و کفر) کیا ہو۔''

اور یہ بات تو اصولاً طے ہے کہ جس کی موت کفر اور شرک پر واقع ہو اُس کے لیے بخشش نہیں۔ حصولِ جنت کا کتنا آسان ذریعہ ہے کہ کسی یتیم کی کفالت اپنے ذمہ لے لی جائے اور اپنے بچوں کی طرح اُس کی ضروریات کو بھی پورا کیا جائے۔

بیت اللہ کو تکنا

بیت اللہ مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ روئے زمین پر بسنے والے مسلمان اُس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ ہر صاحب حیثیت پر بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے۔ جو شخص حج کی خاطر مکہ معظّمہ پہنچے گا وہ خوش نصیب خانہ کعبہ کا طواف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کو خصوصی فضیلت سے نوازا ہے۔ حرم شریف میں ذکر و اذکار، نماز اور طواف بلاشبہ بڑے اجر کے کام ہیں، مگر خانۂ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر اُسے تکتے رہنا بھی ثواب کا موجب ہے۔ حضرت حسان بن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ان الله خلق لهذا البيت عشرين ومائة رحمة ينزلها في كل يوم فستون منها للطائفين واربعون للمصلين وعشرون للناظرين.(٥)

''اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے لیے ایک سو بیس رحمتیں پیدا فرمائی ہیں جو وہ ہر روز اُس پر نازل فرماتا ہے۔ پس ان میں سے ساٹھ رحمتیں طواف کرنے والوں کے لیے ہوتی ہیں، چالیس رحمتیں نماز پڑھنے والوں کے لیے اور بیس رحمتیں خانہ کعبہ کو دیکھنے والوں کے لیے ہیں''۔

یوں جو شخص بیت الحرام تک پہنچ گیا وہ محض اللہ کے گھر کی طرف عقیدت کے ساتھ تکتا رہے تو بھی ثواب حاصل کرتا ہے۔

احترامِ قبلہ

حدیث میں ہے کہ جو شخص غلطی سے کعبہ کی جانب مُنہ کر کے رفع حاجت کے لیے بیٹھ گیا، پھر بیٹھے بیٹھے اُسے خانۂ خدا کی عظمت کا خیال آیا تو اُس نے اُسی وقت اپنا رُخ دوسری طرف پھیر لیا تو اُٹھنے سے پہلے اُس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ دیکھئے یہ کتنا معمولی سا عمل ہے مگر احترامِ حرم کے احساس نے اُس کو کتنا عظیم بنا دیا! (٦)

ماں باپ کو محبت سے دیکھنا

اللہ کی رحمت کا اندازہ لگایئے کہ خانہ کعبہ تک تو بہر حال وہی پہنچ سکتے ہیں جو صاحبِ استطاعت ہوں، مگر جو وہاں تک نہیں پہنچ پاتے اُن کے لیے بھی ثواب کمانے کا

آسان طریقہ ہے کہ جو شخص اپنے ماں باپ کی طرف محبت اور پیار کی نظر سے دیکھتا ہے تو وہ بڑا اجر و ثواب پاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ وَلَدٍ بَارٍّ یَنْظُرُ اِلٰی وَالِدَیْهِ نَظْرَةَ رَحْمَةٍ اِلاَّ کَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِکُلِّ نَظْرَةٍ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً)) قَالُوْا : وَاِنْ نَظَرَ کُلَّ یَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ؟ قَالَ : ((نَعَمْ ' اَللّٰهُ اَکْبَرُ وَاَطْیَبُ)) (۷)

''جو نیک بیٹا اپنے والدین کو بنظر رحمت دیکھے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے ہر نظر کے بدلے ایک مقبول حج کا ثواب لکھ لیتے ہیں''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اگر کوئی آدمی ایک دن میں سو مرتبہ دیکھے (تو کیا اسے سو حج مبرور کا ثواب ملے گا)؟ آپؐ نے فرمایا: ''ہاں' اللہ تعالیٰ بہت بڑے ہیں اور بہت پاکیزہ ہیں''۔

یوں نیکوکار بیٹے یا بیٹیاں بڑی آسانی سے اپنے گھر کے اندر رہ کر صبح و شام اجر عظیم حاصل کرتے رہتے ہیں۔

سلام کرنا

مسلمان آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو سلام کہتے ہیں۔ یہ سلام کہنا بذاتِ خود بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے' حالانکہ بظاہر یہ عمل بالکل معمولی نظر آتا ہے۔ اکثر لوگ اس آسان سے عمل کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی وجہ سے سلام کرنے کا عام رواج تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بلا ضرورت بازار جاتے اور لوگوں کو سلام کرتے اور بعض اوقات خرید و فروخت کے بغیر گھر واپس آجاتے۔ طفیل بن ابی بن کعبؒ فرماتے ہیں:

''میں ہر صبح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ پھر وہ مجھے صبح صبح بازار لے جاتے۔ بازار میں جس کے پاس سے گزرتے اُسے سلام کہتے' خواہ کوئی ردی بیچنے والا ہوتا یا کوئی بڑا تاجر ہوتا' یا کوئی مسکین ہوتا یا کوئی اور ہوتا' ہر ایک کو السلام علیکم کہتے تھے۔ طفیل کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس گیا' وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر بازار جانے لگے۔ میں نے اُن سے

پوچھا کہ آپ بازار میں کیا کریں گے؟ نہ تو آپ خرید وفروخت کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور نہ کسی سودے کے بارے میں پوچھتے ہیں' نہ کسی سے بھاؤ دریافت کرتے ہیں اور نہ بازار کی کسی محفل میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ پس آج آپ ہمارے پاس یہیں بیٹھیں اور باتیں کریں۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: ''اے طفیل! ہم روزانہ صبح صرف اس غرض سے بازار جاتے ہیں کہ جو مسلمان بھی ملے اُسے السلام علیکم کہیں (اور ثواب پائیں)۔''(۸)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا ''السلام علیکم!'' آپؐ نے اس کے سلام کا جواب دیا' جب وہ مجلس میں بیٹھ گیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''دس''۔ یعنی اس شخص کو دس نیکیاں ملیں۔ پھر ایک اور آدمی آیا اور اُس نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ!'' آپؐ نے اُس کے سلام کا جواب دیا' جب وہ آدمی بیٹھ گیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''بیس''۔ یعنی اس شخص کو بیس نیکیاں مل گئیں۔ پھر ایک تیسرا آدمی آیا اور اُس نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!'' آپؐ نے اس کے سلام کا جواب دیا' جب وہ مجلس میں بیٹھ گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''تیس''۔ یعنی اس کے لیے تیس نیکیاں لکھی گئیں۔(۹)

آپ نے دیکھا کہ اتنے آسان عمل کا کتنا بڑا ثواب ہے!

روزے دار کا اجر' جب اُس کے سامنے کھانا کھایا جائے

ایک شخص روزے سے ہے۔ اگر اُس کے پاس کوئی ایسا شخص کھانا کھاتا ہے جو کسی عذر کی بنا پر روزہ نہیں رکھ سکا تو اس روزہ دار کو بڑا ثواب ملتا ہے' اس لیے کہ پاس ایک شخص کھانے سے بھوک مٹا رہا ہے مگر اسے کھانے کی اجازت نہیں اور وہ اللہ کی رضا کے لیے بھوک پیاس برداشت کر رہا ہے۔ اس وقتی سے صبر پر بھی روزہ دار اجر پا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض بزرگوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ روزے کی حالت میں ہوتے تو کسی معذور غیر روزہ دار کو اپنے پاس بلا کر اسے کھانا کھلاتے اور پانی پلاتے تاکہ اجر عظیم حاصل کریں۔ حضرت اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ:

اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ دَخَلَ عَلَیْھَا فَقَدَّمَتْ اِلَیْهِ طَعَامًا فَقَالَ : ((کُلِیْ)) فَقَالَتْ : اِنِّیْ صَائِمَۃٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ : ((اِنَّ الصَّائِمَ تُصَلِّیْ عَلَیْهِ الْمَلَائِکَۃُ اِذَا اُکِلَ عِنْدَہٗ حَتّٰی یَفْرُغُوْا)) (۱۰)

''نبی اکرم ﷺ اُن کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے آپؐ کو کھانا پیش کیا' پس آپؐ نے فرمایا: ''اُمِ عمارہ! تم بھی کھاؤ''۔ انہوں نے کہا: میں تو روزے سے ہوں۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب روزہ دار کے پاس کچھ کھایا جائے تو کھانا کھانے والے کے فارغ ہونے تک فرشتے اس روزہ دار کے لیے رحمت اور بخشش کی دُعا کرتے رہتے ہیں''۔

اتراہوا لباس صدقہ کرنا

صدقہ وخیرات تو بڑے اجر وثواب کے کام ہیں۔ اسی طرح کسی ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنا بھی اعلیٰ درجے کی نیکی ہے۔ جب کوئی شخص نیا کپڑا پہنے اور اپنا پرانا کپڑا اتار کر کسی ضرورت مند کو دے دے تو اس معمولی سے عمل پر اللہ تعالیٰ اُسے اپنے سایۂ رحمت میں لے لیتا ہے۔ جب نیا کپڑا مل جائے تو پرانا کپڑا فالتو ہو جاتا ہے۔ یہ فالتو کپڑا صدقہ میں دے دینا کوئی بڑا عمل نہیں' مگر اس پر اجرِ عظیم اللہ تعالیٰ کی کمالِ رحمت کا مظہر ہے۔ حضرت ابوامامہ ؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر ؓ نے نیا لباس زیب تن کیا اور یہ الفاظ کہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانِیْ مَا اُوَارِیْ بِهٖ عَوْرَتِیْ وَاَتَجَمَّلُ بِهٖ فِیْ حَیَاتِیْ (۱۱)

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے کپڑا پہنایا جس سے میں اپنا ستر ڈھانپتا ہوں اور زینت حاصل کرتا ہوں۔''

پھر اپنے اتارے ہوئے پرانے کپڑے کو صدقہ کر دیا اور کہنے لگے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

((مَنْ لَبِسَ ثَوْبًا جَدِیْدًا فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ کَسَانِیْ مَا اُوَارِیْ بِهٖ عَوْرَتِیْ وَاَتَجَمَّلُ بِهٖ فِیْ حَیَاتِیْ ثُمَّ عَمَدَ اِلَی الثَّوْبِ الَّذِیْ اَخْلَقَ فَتَصَدَّقَ

بِهٖ كَانَ فِيْ كَنَفِ اللّٰهِ وَفِيْ حِفْظِ اللّٰهِ وَفِيْ سَتْرِ اللّٰهِ حَيًّا وَمَيِّتًا)) (۱۲)

''جو شخص کوئی نیا لباس پہنے' پھر مذکورہ بالا دعا پڑھے اور پرانا لباس اتار کر صدقہ کر دے تو وہ دنیا و آخرت میں اللہ تعالیٰ کے سایۂ رحمت اور اس کی حفاظت میں ہوگا۔''

کھانے کا برتن صاف کرنا

اسلام صفائی' ستھرائی' نظافت اور طہارت پر بڑا زور دیتا ہے۔ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کی تاکید کی گئی ہے' تاکہ کھانا کھانے والا صاف ستھرے ہاتھوں کے ساتھ بلاتکلف کھانا کھا سکے۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ کی انگلیوں کو چاٹ لینا بھی مستحسن عمل ہے۔ اس سے انگلیوں کے ساتھ لگی ہوئی غذا بھی ضائع نہیں ہوگی اور انگلیاں بھی صاف ہو جائیں گی۔ اسی طرح کھانے کے برتن کو بھی اچھی طرح صاف کر دینا چاہیے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھانے کے بعد انگلیاں اور برتن چاٹنے اور صاف کرنے کا حکم دیا اور فرمایا:

((اِنَّكُمْ لَا تَدْرُوْنَ فِي اَيَّةِ الْبَرَكَةُ)) (۱۳)

''تمہیں نہیں معلوم کہ کھانے کے کس حصے اور ذرے میں برکت ہے''۔

پس اس برے رواج کو چھوڑ دینا چاہیے کہ کھانے کے برتن میں کھانا چھوڑ دیا جائے یا اچھی طرح صاف نہ کیا جائے۔ اسی طرح کھانا کھا کر ہاتھ کی انگلیوں کو چاٹ لینا چاہیے۔ کئی دیگر حکمتوں کے علاوہ اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ جسم و جان کا رشتہ برقرار رکھنے والی غذا کی قدر کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ اَكَلَ فِيْ قَصْعَةٍ ثُمَّ لَحِسَهَا اسْتَغْفَرَتْ لَهُ الْقَصْعَةُ)) (۱۴)

''جو شخص کسی برتن میں کھانا کھا کر اُسے اچھی طرح صاف کر لے اور چاٹ لے تو وہ برتن اس شخص کے لیے بخشش و مغفرت کی دعا مانگتا ہے۔''

گرا ہوا لقمہ اٹھا کر کھا لینا

اگر کھانا کھاتے وقت لقمہ ہاتھ سے گر جائے تو اٹھا کر صاف کر کے کھا لینا برکت کا باعث ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ:

((اِنَّ الشَّیْطَانَ یَحْضُرُ اَحَدَکُمْ عِنْدَ کُلِّ شَیْءٍ مِنْ شَاْنِہٖ حَتّٰی یَحْضُرَہٗ عِنْدَ طَعَامِہٖ فَاِذَا سَقَطَتْ مِنْ اَحَدِکُمُ اللُّقْمَۃُ فَلْیُمِطْ مَا کَانَ بِھَا مِنْ اَذًی ثُمَّ لِیَاْکُلْھَا وَلَا یَدَعْھَا لِلشَّیْطَانِ فَاِذَا فَرَغَ فَلْیَلْعَقْ اَصَابِعَہٗ فَاِنَّہٗ لَا یَدْرِیْ فِیْ اَیِّ طَعَامِہٖ تَکُوْنُ الْبَرَکَۃُ)) (۱۵)

''شیطان اپنے ہر مناسب موقع پر تمہارے پاس حاضر ہو جاتا ہے' یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی حاضر ہوتا ہے' لہٰذا جب تم میں سے کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے تو اُسے چاہیے کہ گرد وغیرہ صاف کر کے کھا لے اور شیطان کے لیے نہ چھوڑے' پھر کھانا کھانے سے فارغ ہو کر اپنی انگلیاں چاٹ لے' کیونکہ اسے یہ پتا نہیں کہ کھانے کے کس حصے میں برکت ہے''۔

کھانا کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ لینا' برتن صاف کر دینا اور گرا ہوا لقمہ صاف کر کے کھا لینا چنداں مشکل نہیں' مگر اس پر مغفرت اور برکت کا حاصل ہونا کتنی بڑی بات ہے!

مریض کی عیادت

بیماری انسانی زندگی کا لازمہ ہے۔ مریض بیماری کی تکلیف میں ہمدردی اور حوصلہ افزائی کا طالب ہوتا ہے۔ چنانچہ مریض کی عیادت اگر پورے آداب کے ساتھ کی جائے تو بڑے اجر وثواب کا کام ہے' جبکہ مریض کی عیادت ایک آسان سا کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ اَتٰی اَخَاہُ الْمُسْلِمَ عَائِدًا مَشٰی فِیْ خَرَافَۃِ الْجَنَّۃِ حَتّٰی یَجْلِسَ' فَاِذَا جَلَسَ غَمَرَتْہُ الرَّحْمَۃُ' فَاِنْ کَانَ غُدْوَۃً صَلّٰی عَلَیْہِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَکٍ حَتّٰی یُمْسِیَ' وَاِنْ کَانَ مَسَاءً صَلّٰی عَلَیْہِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَکٍ حَتّٰی یُصْبِحَ)) (۱۶)

''جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی تیمارداری کے لیے آتا ہے گویا وہ ایک طرح سے جنت کی طرف آ رہا ہے یہاں تک کہ وہ مریض کے پاس بیٹھ جاتا ہے' پس جب وہ مریض کے پاس بیٹھتا ہے تو رحمت اس کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اگر وہ صبح کے وقت مریض کی عیادت کے لیے آتا ہے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں اور اگر وہ شام کو آئے تو صبح تک ستر ہزار

فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں''۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ وَعَادَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ مُحْتَسِبًا بُوْعِدَ مِنْ جَهَنَّمَ مَسِيْرَةَ سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا)) (۱۷)

''جو شخص اچھی طرح وضو کرے' پھر محض ثواب کی نیت سے اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کے لیے جائے تو وہ دوزخ سے ستر سال کی مسافت کے برابر دور کر دیا جاتا ہے۔''

اتنی معمولی سی بات پر دوزخ سے دُوری اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی کی ہی مظہر ہو سکتی ہے۔

نماز جنازہ میں شرکت

دوست احباب یا اعزہ واقارب میں سے جب کوئی فوت ہو جائے تو اُس پر نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ کسی کی نماز جنازہ میں شرکت کرنا ایک اخلاقی تقاضا' شرعی ذمہ داری اور میت کا حق ہے۔ چنانچہ اس فریضے کی ادائیگی بھی بڑے اجر وثواب کا باعث ہے' حالانکہ اس میں نہ زیادہ وقت لگتا ہے اور نہ ہی کوئی بڑی مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((مَنْ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ فَلَهٗ قِيْرَاطٌ ' فَاِنْ شَهِدَ دَفْنَهَا فَلَهٗ قِيْرَاطَانِ' اَلْقِيْرَاطُ مِثْلُ اُحُدٍ)) (۱۸)

''جو آدمی کسی (مسلمان میت) کی نماز جنازہ میں شرکت کرے تو اسے ایک قیراط ثواب ملے گا' اور اگر میت کے دفن ہونے تک ساتھ رہے تو اسے دو قیراط ثواب ملے گا۔ (آپؐ نے فرمایا) ایک قیراط کی مقدار اُحد پہاڑ کے برابر ہے۔''

اس قدر معمولی عمل پر اتنے بڑے ثواب کا تقاضا تو یہ ہے کہ آدمی نماز جنازہ میں ضرور شرکت کرے اور اگر ہو سکے تو دفن تک وہاں موجود رہے۔

نمازِ جمعہ کی تیاری اور شرکت

جیسا کہ اوپر بیان ہوا' اسلام میں طہارت اور نظافت کی بڑی اہمیت ہے۔

اعضائے وضو تو ہر نماز کے وقت دھونے ہوتے ہیں۔ البتہ غسل کرنا جمعہ کے دن نمازِ جمعہ کی تیاری کا حصہ ہے۔ جمعہ کے دن صبح اٹھ کر غسل کرنا' صاف ستھرے کپڑے پہننا' خوشبو لگانا' مسواک کرنا وغیرہ سارے صفائی اور ستھرائی کے کام ہیں جس سے انسان کی طبیعت میں بشاشت اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔ اس پر بھی کریم ورحیم پروردگار اپنی شان کے مطابق اجر وثواب سے نوازتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ كُفِّرَتْ عَنْهُ ذُنُوْبُهُ وَخَطَايَاهُ' فَإِذَا اَخَذَ فِي الْمَشْيِ كُتِبَ لَهُ بِكُلِّ خُطْوَةٍ عِشْرُوْنَ حَسَنَةً' فَإِذَا انْصَرَفَ مِنَ الصَّلَاةِ اُجِيْزَ بِعَمَلِ مِائَتَيْ سَنَةٍ)) (19)

''جو شخص جمعہ کے دن غسل کرلے اس کے گناہ اور خطائیں معاف کردی جاتی ہیں' پھر جب وہ چل کر (مسجد کی طرف) جاتا ہے تو اس کے ہر قدم کے بدلے بیس بیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں' پھر جب نماز سے فارغ ہو کر واپس گھر جاتا ہے تو اس کو دو سو سال کے عمل کا بدلہ دیا جاتا ہے۔''

نمازِ جمعہ کی تیاری کے ضمن میں غسل کرنا کس قدر معمولی عمل ہے' مگر اجر وثواب کے اعتبار سے یہ کام کتنی بڑی فضیلت کا حامل ہے کہ گناہوں اور خطاؤں کی بخشش کا ذریعہ بن جاتا ہے!

جمعہ کے دن جلدی مسجد جانا

ہفتے میں ایک دن یعنی یوم الجمعہ خصوصی عبادت اور فضیلت کا دن ہے۔ اس روز ظہر کی چار رکعتوں کے بجائے جمعہ کی نماز کی دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ نماز سے قبل خطیب وعظ کرتا ہے جس میں دین کی تعلیمات حاضرین کو سنائی جاتی ہیں۔ اگرچہ خود جمعہ بڑا بابرکت دن ہے مگر اس دن خطیب کے خطبہ شروع کرنے سے پہلے مسجد میں پہنچ جانا بڑے اجر وثواب کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

''جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو فرشتے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور شروع میں آنے والوں کے نام یکے بعد دیگرے لکھتے ہیں۔ اول وقت

دوپہر میں آنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اللہ کے حضور میں اونٹ کی قربانی پیش کرتا ہے' پھر اس کے بعد آنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو گائے پیش کرتا ہے' پھر اس کے بعد آنے والے کی مثال مینڈھا پیش کرنے والے کی ہے' اور اس کے بعد مرغی پیش کرنے والے کی اور اس کے بعد انڈا پیش کرنے والے کی۔ پھر جب امام خطبہ کے لیے منبر کی طرف جاتا ہے تو یہ فرشتے اپنے لکھنے کے دفتر لپیٹ لیتے ہیں اور خطبہ سننے میں شریک ہو جاتے ہیں۔''(۲۰)

راستے سے رکاوٹ دُور کرنا

دوسروں کی خیر خواہی اسلامی اخلاق کی ایک اہم شق ہے۔ اس خیر خواہی کے سلسلے میں ادنیٰ سے ادنیٰ عمل بھی ثواب سے خالی نہیں۔ راستے پر بعض اوقات کوئی روڑہ' پتھر کا ٹکڑا یا کانٹے دار درخت کی شاخ پڑی ہوتی ہے۔ اگر اس خیال سے وہ روڑہ' پتھر یا کانٹا راہ سے ہٹا دیا جائے کہ راہگیر پتھر سے ٹھوکر نہ کھائیں یا کسی کے پاؤں میں یا گاڑی کے ٹائر میں کانٹا نہ چبھ جائے' تو یہ معمولی سا عمل بڑے اجر کا باعث ہے۔ اور کیا عجب کہ یہی چھوٹا سا عمل کسی کی بخشش کا سبب بن جائے! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((بَيْنَمَا رَجُلٌ يَمْشِيْ بِطَرِيْقٍ وَجَدَ غُصْنَ شَوْكٍ عَلَى الطَّرِيْقِ فَاَخَّرَهٗ فَشَكَرَ اللّٰهُ لَهٗ فَغَفَرَ لَهٗ)) (۲۱)

''ایک شخص نے راستے میں کانٹے دار شاخ دیکھی اور ہٹا دی تو اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو قبول فرما کر اُسے بخش دیا۔''

تلاوتِ قرآن مجید

قرآن مجید کی تلاوت کس قدر آسان سا کام ہے! چند منٹوں میں درجنوں آیات بآسانی تلاوت کی جا سکتی ہیں۔ اس عمل کے اجر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((مَنْ قَرَاَ حَرْفًا مِنْ كِتَابِ اللّٰهِ فَلَهٗ بِهٖ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا لَا

اَقُوْلُ "الم" حَرْفٌ، وَلٰکِنْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِیْمٌ حَرْفٌ))(۲۲)

''جس نے کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھا اس نے ایک نیکی کمائی اور ایک نیکی اللہ کے ہاں دس نیکیوں کے برابر ہے' اور میں یہ نہیں کہتا کہ ''الٓمٓ'' ایک حرف ہے' بلکہ ''الف'' ایک حرف ہے' ''لام'' ایک حرف ہے اور ''میم'' ایک حرف ہے''۔

یوں الٓمٓ پڑھنے سے تیس نیکیاں ملیں۔ پس جو شخص چند منٹ تلاوت کر لے وہ ڈھیروں نیکیاں کما سکتا ہے۔

روزہ افطار کرانے کا ثواب

رمضان ماہِ صیام ہے۔ مسلمان اس میں روزہ رکھتے ہیں۔ صبح صادق کے وقت سحری کھا کر سارا دن کچھ کھانا پینا نہیں ہوتا۔ غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی افطاری کا وقت ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اُس وقت بھوک زوروں پر ہوتی ہے' ایسی حالت میں کسی روزہ دار کو کھانے پینے کا سامان فراہم کرنا (اگرچہ وہ سامان قلیل ہی ہو) بہت بڑی نیکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا کَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ غَیْرَ اَنَّهٗ لَا یَنْقُصُ مِنْ اَجْرِ الصَّائِمِ شَیْئًا))(۲۳)

''جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا اس کو روزہ دار ہی کے مثل ثواب ملے گا' اس حال میں کہ روزہ دار کے ثواب میں بھی کچھ کمی نہیں ہوگی''۔

ظاہر ہے کہ روزہ رکھنا تو مشقت کا کام ہے مگر افطار کرانا تو معمولی سی بات ہے جس پر پورے روزے کا ثواب اللہ کی رحمت اور مہربانی ہی کا مظہر ہے۔ اور روزہ تو محض پانی یا لسی کے ایک گھونٹ یا ایک کھجور سے بھی افطار کرایا جا سکتا ہے۔

باوضو سونا

صاف ستھرا رہنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اس سے انسان کی طبیعت تر و تازہ اور ہشاش بشاش رہتی ہے۔ اسلام میں نماز سے پہلے وضو کرنا ضروری ہے۔ وضو میں ہاتھ' پاؤں' چہرہ اور بازو دھوئے جاتے ہیں جس سے صفائی حاصل ہوتی ہے اور انسان

پاکیزگی اور تازگی محسوس کرتا ہے۔ وضو جہاں پاکیزگی کا باعث بنتا ہے وہاں اس سے اجر وثواب بھی ملتا ہے۔ صلحاء اور اتقیاء کا معمول ہے کہ وہ اکثر باوضو رہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

''جو شخص باوضو ہو کر اللہ کا ذکر کرتے ہوئے بستر پر سو جائے اور رات کو کروٹ بدلتے ہوئے یا ویسے ہی بیداری کے وقت اللہ تعالیٰ سے دنیا وآخرت کے نیک امور میں سے کسی چیز کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ وہ چیز اسے عنایت فرما دیتے ہیں اور ایک فرشتہ ساری رات اس کے پاس رہتے ہوئے اس کے لیے دعا کرتا رہتا ہے کہ اے اللہ! اب اس بندے کو بخش دے' کیونکہ یہ باوضو سویا ہے۔''(٢٤)

مقروض کو مہلت دینا

مسلم شریف کی ایک حدیث میں حضرت حذیفہ ؓ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

''اگلی اُمتوں میں سے ایک شخص سے اُس کی وفات کے بعد فرشتوں نے پوچھا: کیا تو نے کوئی نیک عمل کیا؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ فرشتوں نے کہا: یاد کر (شاید کوئی نیک عمل یاد آ جائے)۔ کہنے لگا: میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا' میں نے اپنے ملازموں کو تاکید کر رکھی تھی کہ تنگ دست کو مہلت دیا کرو اور آسودہ حال سے نرم برتاؤ کیا کرو۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی: (اے فرشتو!) تم بھی میرے بندے سے درگزر کرو''۔(٢٥)

دیکھیے قرض معاف تو نہیں کیا جا رہا' بلکہ تنگ دست سے سختی کے ساتھ تقاضا نہ کرنے اور کچھ مہلت دینے سے اللہ تعالیٰ نے بخشش کا فیصلہ فرما دیا۔

حضرت عمران بن حصین ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس آدمی کا کسی دوسرے آدمی پر کوئی حق (قرضہ وغیرہ) واجب الادا ہو اور وہ اس مقروض کو ادا کرنے کے لیے مہلت دے تو اس کو ہر دن کے عوض صدقہ کا ثواب ملے گا۔''(٢٦)

چونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے ساتھ بہت محبت ہے' لہٰذا جو شخص اُس کے بندوں کے

ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے اُس پر وہ خوش ہوتا ہے۔ خدمتِ خلق کے ضمن میں چھوٹے چھوٹے کاموں پر اللہ تعالیٰ بڑے بڑے اجر عطا کرتا ہے۔ کسی بھوکے کو کھانا کھلانا' یا کسی تنگ دست کو لباس مہیا کرنا اللہ کی خوشنودی کے کام ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ' وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ' وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ)) (۲۷)

''جس نے کسی شخص سے دنیا کے دکھوں میں سے ایک دُکھ دور کیا اللہ تعالیٰ قیامت کے دکھوں میں سے ایک دکھ اُس شخص سے دور کر دے گا' اور جس نے تنگ حال شخص پر آسانی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی فرما دے گا' اور جس شخص نے کسی مسلمان (کے عیب) پر پردہ ڈالا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا''۔

مسواک کرنا

مسواک کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ نہ اس میں جسمانی مشقت ہے اور نہ کوئی پیسہ خرچ ہوتا ہے' بلکہ اس عمل سے دانت مضبوط ہوتے ہیں' منہ میں تعفن پیدا نہیں ہوتا اور انسان کئی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ مگر اس معمولی سے کام کا اجر دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ نماز کے لیے وضو شرط ہے اور وضو کے موقع پر مسواک کی تاکید کی گئی ہے۔ اگرچہ مسواک کے بغیر بھی وضو ہو جاتا ہے' مگر مسواک کر کے جو وضو کیا جائے گا اُس وضو کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز کا مرتبہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ نماز جس کے لیے مسواک کی جائے اس نماز کے مقابلہ میں ستر گنا فضیلت رکھتی ہے جو بلا مسواک پڑھی جائے''۔(۲۸)

عربی محاورے میں ستر کا لفظ کثرت کے لیے بولا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی بعید نہیں کہ اس حدیث میں سبعین کا لفظ ستر ہی کے معنوں میں ہو۔ تو اگر بندہ ہر نماز کے ساتھ تازہ وضو کرے اور مسواک بھی کرے تو اس طرح ایک دن میں پڑھی جانے والی پانچ نمازیں اجر کے اعتبار سے ۳۵۰ نمازوں کے برابر شمار کی جائیں گی۔ اللہ کی رحمت تو بے حد وسیع

ہے وہ چاہے تو اس سے بھی زیادہ اجر و ثواب عطا فرما دے۔ رسول اللہ ﷺ کثرت سے مسواک استعمال کرتے۔ دن یا رات میں جب بھی آپؐ سوتے تو اٹھنے کے بعد وضو کرنے سے پہلے مسواک ضرور فرماتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ لَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ لَاَمَرْتُهُمْ بِالسِّوَاكِ عِنْدَ كُلِّ صَلَاةٍ)) (۲۹)

''اگر مجھے یہ احساس نہ ہوتا کہ میری اُمت پر بہت مشقت پڑ جائے گی تو میں ہر نماز کے وقت انہیں مسواک کا حتمی حکم دے دیتا۔''

فوت شدگان کے لیے استغفار

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ ہر شخص کو دار العمل سے دار البقاء کی طرف کوچ کرنا ہے۔ وہاں اپنے اعزہ و اقارب' دوست و احباب کچھ کام نہ آئیں گے' بلکہ صرف اعمال کی بابت پوچھا جائے گا۔ جو شخص وفات پا جاتا ہے اب اُس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کسی طور سے اپنے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ کر سکے۔ مگر زندہ لوگ مرنے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کر کے انہیں نفع پہنچا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں والدین اور جملہ مسلمانوں کے لیے ان الفاظ میں دُعا سکھائی ہے: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْ لِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ﴾ (ابرٰھیم) ''اے ربّ ہمارے! بخش دیجیو گناہ میرے' میرے والدین کے اور تمام مؤمنوں کے جس دن حساب کتاب قائم ہوگا''۔ صاف ظاہر ہے جب یہ دعا خود پروردگار نے سکھائی ہے تو لازماً یہ نتیجہ خیز ہوگی اور فوت شدگان کے حق میں گناہوں کی معافی کا سبب بنے گی۔ مگر رحمت حق کا اندازہ لگائیے کہ دعائے مغفرت کرنے والا اس معمولی سے کام پر کتنا بڑا اجر پاتا ہے۔ معجم کبیر طبرانی میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو بندہ عام ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگے گا اس کے لیے ہر مؤمن مرد اور عورت کے بدلے ایک ایک نیکی لکھی جائے گی''۔ (۳۰)

کلماتِ استغفار کی فضیلت دیکھئے کہ جس کے حق میں استغفار کیا جائے اُسے بھی

گراں قدر فائدہ پہنچتا ہے اور استغفار کرنے والا بھی بے شمار نیکیاں حاصل کر لیتا ہے۔

شہادت کا ثواب

شہید فی سبیل اللہ کے مقام و مرتبہ سے کون واقف نہیں! شہید فی سبیل اللہ وہ ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا مارا جائے۔ مقتول فی سبیل اللہ کی فضیلت قرآن و حدیث میں واضح کی گئی ہے۔ شہید کے سارے گناہ بخش دیے جاتے ہیں سوائے قرض کے۔ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے بہت سے چھوٹے چھوٹے اعمال پر شہادت کا اجر و ثواب عطا فرماتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اپنے وطن سے دُور حالتِ سفر کی موت بھی شہادت ہے۔ (۳۱)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک روز صحابہؓ کو مخاطب کرکے) فرمایا:

> ''تم لوگ اپنے میں کس کو ''شہید'' شمار کرتے ہو؟'' انہوں نے عرض کیا کہ (ہمارے نزدیک تو) جو بندہ راہِ خدا میں قتل کیا گیا وہی شہید ہے...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس صورت میں تو میری اُمت کے شہداء تھوڑے ہی ہوں گے...... (سنو!) جو بندہ راہِ خدا میں قتل کیا گیا وہ شہید ہے' اور جس بندے کا انتقال راہِ خدا میں ہوا (یعنی جہاد کے سفر میں جس کو موت آ گئی) وہ بھی شہید ہے' اور جس بندے کا طاعون میں انتقال ہوا وہ بھی شہید ہے' اور جس بندے کا پیٹ کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال ہوا (جیسے کہ ہیضہ' تخمہ' اسہال' استسقاء وغیرہ) وہ بھی شہید ہے''۔ (۳۲)

اگرچہ موت کی یہ کیفیات انسان کے اپنے بس میں نہیں مگر اس طرح کی حادثاتی اموات پر شہادت کا اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا مظہر ہے جس میں ذرا بھی تعجب نہیں۔

حواشی

(۱) استعظام الصغائر' از مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی۔

(۲) رواہ البیهقی فی شعب الایمان۔

(۳) مسند احمد و جامع الترمذی۔

(٤) سنن الترمذی' کتاب البر والصلة عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی رحمة الیتیم و کفالته۔
(٥) رواه ابن عباس رضی اللّٰه تعالیٰ عنهما مرفوعاً' تاریخ مکة' ص ٥۔
(٦) استعظام الصغائر' ص٢٧' از مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی۔
(٧) رواه البیهقی۔
(٨) رواه مالك والبیهقی فی شعب الایمان۔ ومشکوٰة' ج٢' باب السلام۔
(٩) جامع الترمذی و ابوداوٗد' بحواله معارف الحدیث' ج٣۔
(١٠)سنن الترمذی' کتاب الصوم عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی فضل الصائم اذا اکل عنده۔
(١١) سنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللهﷺ' باب فی دعاء النبیﷺ۔
(١٢) سنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللهﷺ' باب فی دعاء النبیﷺ۔
(١٣) صحیح مسلم' کتاب الاشربة' باب استحباب لقی الاصابع والقصعة واکل اللقمة الساقطة۔
(١٤) سنن الترمذی' کتاب الاطعمة عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی اللقمة تسقط۔ وسنن ابن ماجه' کتاب الاطعمة' باب تنقیة الصحفة۔ ومسند احمد۔
(١٥)صحیح مسلم' کتاب الاشربة' باب استحباب لعق الاصابع والقصعة واکل اللقمة والساقطة۔
(١٦) سنن ابن ماجه' کتاب ما جاء فی الجنائز' باب ما جاء فی ثواب من عاد مریضاً۔
(١٧) سنن ابی داوٗد' کتاب الجنائز' باب فی فضل العیادة علی وضوء۔
(١٨) صحیح مسلم' کتاب الجنائز' باب فضل الصلاة علی الجنازة واتباعها۔
(١٩) رواه الطبرانی فی الکبیر والاوسط کذا فی الترغیب والترهیب۔
(٢٠) معارف الحدیث' جلد٣' ص ٢٣٥۔
(٢١) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب فضل التهجیر الی الظهر۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب بیان الشهداء۔
(٢٢) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فیمن قرأ حرفا من القرآن ماله من الاجر۔
(٢٣) سنن الترمذی' کتاب الصوم عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی فضل من فطر صائما۔
(٢٤) طبرانی و ابن حبان۔ (٢٥) معارف الحدیث' ج٧' ص ٤٩٣۔
(٢٦) معارف الحدیث' ج٧' ص ٤٩٥۔
(٢٧) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار' باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن وعلی الذکر۔
(٢٨) شعب الایمان للبیهقی۔
(٢٩) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب السواك یوم الجمعة۔ وسنن الترمذی' کتاب الطهارة عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی السواك۔
(٣٠) معارف الحدیث' ج٥' ص ٢٠٦۔ (٣١) سنن ابن ماجه۔
(٣٢) صحیح مسلم' کتاب الامارة' باب بیان الشهداء۔

تلبیسِ ابلیس یعنی ابلیس کی چالیں

انسان فطرتاً کمزور پیدا کیا گیا ہے چنانچہ ہر انسان میں فطری کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ انسان کا امتحان یہ ہے کہ آیا وہ ان کمزوریوں کا شکار (victim) بن جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان فطری کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ مال اور اولاد کی محبت' حرص وہوا' حبِ جاہ' غصہ' جلد بازی' سہل پسندی' برتری کی خواہش اور دوسروں پر حاکم بننے کی تمنا' یہ وہ کمزوریاں ہیں جو ہر انسان میں موجود ہیں۔ کامیاب انسان وہ ہے جو اِن کمزوریوں کو اپنے مزاج کا حصہ نہ بنالے بلکہ اسلامی تعلیمات کی حدود کے اندر اندر رہتے ہوئے ان پر کنٹرول کرے۔ شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے' اُس کی ہر وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ بندے کی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے' اسے گمراہ کرے اور ناکام بنادے۔ پس ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ چوکنا اور ہوشیار رہے' شیطان کے حملوں سے خبردار رہے۔ یاد رہے کہ کوئی چھوٹا' بڑا' نمازی' پرہیز گار' صالح' متقی' عام مسلمان' عابد' زاہد' عالم' فاضل' پیر' مرید' امام اور مقتدی وغیرہ کوئی بھی شیطان کے حملوں سے محفوظ نہیں۔ اُس نے صاحبِ کرامت اولیاء پر بھی حملے کیے جن میں سے بالآخر کچھ کو ہلاکت میں ڈالنے میں کامیاب بھی ہوگیا' جس کی ایک مثال بنی اسرائیل کا ایک مستجاب الدعوات صالح شخص بلعم بن باعوراء ہے جسے شیطان اغوا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے حکم کے مطابق ذبح کرنے کے لیے لے کر چلے تو انہیں بھی شیطان نے بہکانے کی کوشش کی اور کہا: اس خیال پر عمل کرنے سے رک جاؤ! کیا کبھی کسی انسان نے اپنے بیٹے کو بھی ذبح کیا ہے؟ ایسے ہی ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے میں شیطان کی شیطنت کا قصہ تو

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ اُس نے آدم علیہ السلام کو سبز باغ دکھائے' جھوٹے وعدے کیے' قسمیں کھائیں اور انہیں شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے پر آمادہ کر لیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا قول قرآن مجید میں نقل ہوا ہے کہ: ﴿وَمَا اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ ......﴾ (یوسف:۵۳) ''اور میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا' یقیناً نفس تو برائی پر بہت اُبھارنے والا ہے......''

اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنۡکُمۡ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدۡ وُکِّلَ بِہٖ قَرِیۡنُہٗ مِنَ الۡجِنِّ)) قَالُوۡا وَاِیَّاکَ یَارَسُوۡلَ اللّٰہِ؟ قَالَ :((وَاِیَّایَ اِلَّا اَنَّ اللّٰہَ اَعَانَنِیۡ عَلَیۡہِ فَاَسۡلَمَ فَلَا یَاۡمُرُنِیۡ اِلَّا بِخَیۡرٍ)) (۱)

''تم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک شیطان مقرر کیا گیا ہے''۔ صحابہؓ نے کہا: اور آپ کے ساتھ بھی یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپؐ نے فرمایا: ''ہاں' مگر میں نے اللہ کی مدد سے اسے مسلمان کر لیا ہے' چنانچہ وہ مجھے بس نیکی ہی کا مشورہ دیتا ہے''۔

قرآن مجید میں شیطان کو اَلۡغَرُوۡر (بڑا دھوکے باز) کہا گیا ہے۔ اس کا ورغلانا اتنا سادہ نہیں کہ وہ کسی نمازی کو نماز چھوڑنے کا حکم دے یا بُت کو سجدہ کرنے کو کہے۔ اس کا حملہ عام طور پر بڑا باریک' لطیف اور خفیہ ہوتا ہے۔ نیکی کے کام کی مشقت اٹھانے والوں کو وہ یوں فریب دیتا ہے کہ اللہ بڑا غفور و رحیم ہے' اُس کی شانِ غفاریت پر پورا بھروسہ کرو' رات جاگ کر عبادت کرنے اور سردیوں میں صبح صبح ٹھنڈے پانی کے ساتھ وضو کرنے کی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں' اُس کو بھلا تمہاری عبادت کی کیا ضرورت ہے! چنانچہ انسان نفسانی خواہش کی اتباع میں شیطان کے وسوسے کا شکار ہو جاتا ہے۔

سورۃ فاطر میں ہے:

﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا ٝ وَلَا یَغُرَّنَّکُمۡ بِاللّٰہِ الۡغَرُوۡرُ ﴿۵﴾ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ لَکُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡہُ عَدُوًّا ؕ﴾ (آیات ۵'۶)

''اے لوگو! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے' پس تمہیں دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے

اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے معاملے میں تمہیں بڑا دھوکے باز (شیطان) دھوکے میں ڈالے۔ بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے' پس اس کو دشمن ہی سمجھو''۔

شیطان ماہر دھوکے باز ہے۔ وہ اس طرح دھوکہ دیتا ہے کہ آدمی کو بالکل احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ دھوکہ کھا رہا ہے۔ شیطان ہمدرد اور خیر خواہ بن کر دھوکہ دیتا ہے۔ وہ شر کے اندر خیر دکھاتا ہے۔ وہ دولت مند کو فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے روکتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ ابھی تمہاری مکان بنانے' اولاد کی شادیاں کرنے اور گاڑی خریدنے جیسی ضروریات ہیں۔ اگر یہ سب کچھ پہلے ہی سے میسر ہو تو بھی وہ دھوکہ دیتا ہے کہ یہ غریب لوگ خود محنت کیوں نہیں کرتے؟ خود محنت کریں اور کمائیں' جیسا کہ ہم نے محنت کی اور اتنی دولت اکٹھی کر لی' اگر یہ محنت نہیں کرتے تو ان کو بھوک پیاس برداشت کرنی چاہیے۔ شیطان کہتا ہے کہ یہ تمہارا محنت سے کمایا ہوا روپیہ ہے' زکوٰۃ دو گے تو ایک لاکھ میں سے اڑھائی ہزار چلے جائیں گے اور پھر لاکھ پورا نہیں رہے گا۔

نفس کے لالچ سے بچنا تو واقعی بڑی ہمت کا کام ہے۔ نوجوانوں کو شیطان موت کے لفظ سے وحشت دلاتا ہے۔ انہیں مطمئن کرتا ہے کہ یہ وقت تو عیش و عشرت کا ہے' ابھی سے تفکرات میں گھر جانا عقل مندی نہیں ہے' جیسے دل چاہے کرو' دوستوں میں بیٹھ کر دادِ عیش دو' اچھا کھاؤ' اچھا پہنو۔ رہا نماز روزہ تو یہ بزرگوں کے کرنے کے کام ہیں' جب بڑی عمر کے ہو جاؤ گے تو نماز روزہ کر لینا' ابھی تو بڑی زندگی پڑی ہے۔ شیطان موت کے تصور کو اُن سے دُور رکھتا ہے۔ یوں نوجوان بھولے سے بھی موت کو یاد نہیں کرتا۔ زبان سے تو سبھی کہتے ہیں کہ ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے' مگر اپنی موت کے وقت کو ہر کوئی دُور سمجھتا ہے۔

ایسے ہی درازیٔ عمر کی تمنا بوڑھوں کو نوجوانوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ شیطان اس انسانی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے اگرچہ تم بوڑھے ہو چکے ہو' اعضاء کمزور ہو گئے ہیں' مگر ابھی تو تم سے بڑی عمر کے لوگ بھی زندہ ہیں۔ تمہاری موت تو بہت دُور ہے۔ بوڑھے لوگ شیطان کے اس فریب میں آ کر توبہ کی طرف نہیں آتے۔ چہرے

پر داڑھی سجانا انبیاء کرام علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ ؐ کا حکم ہے' لیکن کتنے ہی بوڑھے ایسے ہیں کہ سفید بالوں والی داڑھی کو چہرے پر ظاہر نہیں ہونے دیتے' حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سفید بالوں کو سزا دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو حیا آتی ہے' یعنی یہ سفید بال بھی نجات کا باعث بن سکتے ہیں' مگر دھوکے باز شیطان کا فریب ایسا ہے کہ نجات کا یہ راستہ بھی بند کرا دیتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ خواہشات کم ہونے کے بجائے زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔ شیطان لمبی عمر کی اُمید دلا کر بوڑھوں کو معمول کی مصروفیات میں الجھائے رکھتا ہے۔ وہ صدقہ و خیرات اور نیکی کے دوسرے کاموں کو آنے والے وقت پر ٹالتے جاتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انہیں نیکی کرنے کی توفیق میسر نہیں آتی اور عزرائیل اچانک آ دھمکتا ہے' اُس وقت حسرت و یاس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور شیطان اپنی کارگزاری پر پھولا نہیں سماتا۔

جس طرح شیطان امیروں اور دولت مندوں کو دولت کی نمائش کے نت نئے طریقے سکھاتا ہے اسی طرح غریبوں کو بھی الٹی پٹیاں پڑھاتا ہے۔ انہیں کہتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کے پاس ڈھیروں دولت ہے جو انہوں نے غریبوں کا خون نچوڑ کر یا دیگر حرام ذرائع سے حاصل کی ہے۔ ان کی دولت کو ہر طرح سے لوٹنا جائز ہے۔ چنانچہ غریب اس فریب میں آ کر ڈاکے ڈالتے' چوریاں کرتے اور قتل و غارت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ شیطان امیروں کو اسراف و تبذیر کی ترغیب دیتا ہے اور اس کے بسبب غریبوں میں امیروں کے خلاف حسد کے جذبات پروان چڑھاتا اور نفرت پیدا کرتا ہے۔ اس طرح وہ دشمنی کے جذبات کے زیر اثر دولت مندوں کے نقصان پر خوش ہوتے ہیں' بلکہ انہیں نقصان پہنچا کر اطمینان محسوس کرتے ہیں' حالانکہ کسی دولت مند کی دولت چھیننا تو کسی طور بھی جائز نہیں۔

شیطان عالموں' واعظوں اور خطیبوں کو بھی راہِ راست سے ہٹانے سے نہیں چوکتا۔ وہ دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنے کو کافی سمجھتے ہیں' اس طرح بزعمِ خویش وہ بہت زیادہ ثواب اکٹھا کرتے ہیں' مگر اپنے نفس کی اصلاح کی طرف سے انہیں شیطان دُور رکھتا

ہے۔ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَتَامُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرة:۴۴) ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟'' چنانچہ اکثر واعظ اور خطیب بے عملی بلکہ بدعملی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لوگ اُن کے علم وفضل اور خطبہ ووعظ اور حسنِ صوت سے متأثر ہو کر اُن کے عقیدت مند ہو جاتے ہیں اور ادب و احترام بجالاتے ہیں' جس سے اُن کے اندر رعونت اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو واقعی دوسروں سے برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح شیطان کا حملہ علماء' فضلاء اور مذہبی راہنماؤں پر بھی کارگر ثابت ہوتا ہے' جبکہ وہ اپنے آپ کو شیطان کے حملوں سے محفوظ سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

عام مسلمانوں کو گمراہ کرنا تو شیطان کا بائیں ہاتھ کا کام ہے' وہ بڑی آسانی سے انہیں مشرکانہ کاموں اور بدعات میں ملوث کر لیتا ہے۔ نیک لوگ اور بزرگ فوت ہو جائیں تو اُن کی قبریں پختہ بنانے کو عقیدت اور احترام کی علامت بتاتا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے سختی کے ساتھ اس عمل سے روکا ہے اور خود آپ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے کہ آپؐ کی تین بیٹیاں آپؐ کے سامنے فوت ہوئیں' آپؐ نے اُن کا کفن دفن کیا مگر کسی کی قبر پختہ نہیں بنائی' بلکہ آپؐ نے حیاتِ دُنیوی کے آخری لمحات میں جو اہم باتیں تاکیداً ارشاد فرمائیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسْجِدًا)) (۲)

''اللہ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔''

جب انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی تاکیدی ممانعت ہے تو اولیاء اللہ اور صلحائے اُمت کی قبروں پر سجدے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟ مگر شیطان ہے کہ وہ کلمہ گو مسلمانوں کو فریب دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے' اور وہ گروہ در گروہ مزاروں پر حاضری دیتے' دعائیں مانگتے' حاجتیں طلب کرتے' قبروں کو بوسہ دیتے' چادریں چڑھاتے' غسل دیتے اور سجدہ کرتے ہیں۔ واقعی شیطان کا فریب بڑا کاری ہے' اس لیے کہ وہ

سب سے بڑا دھوکے باز ہے۔

بدعات کو رواج دینا شیطان کا دل پسند اور مؤثر ترین ہتھیار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بدعات سے سختی سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے: ((كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) ''ہر بدعت گمراہی ہے''۔ یہ ہدایت بڑی اہم ہے' کیونکہ دین تو مکمل ہو چکا ہے' اس میں کسی اضافے کی گنجائش پیدا کر لینا دین کو نامکمل سمجھنا ہے۔ ایک عید میلادہی کو لیجیے۔ اسلام میں تو صرف دو عیدیں ہیں' جن کے پروگرام ہمیں بتا دیے گئے ہیں۔ شیطان نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ محبت کا آسان طریقہ ایجاد کر کے مسلمانوں میں رائج کر دیا ہے' حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ سے سچی اور حقیقی محبت تھی۔ وہ آپؐ کی ہر سنت کو اپنانے والے تھے' مگر نہ تو رسول اللہ ﷺ نے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ عید منائی' مگر شیطان ہے کہ اس کو تیسری عید کے طور پر رائج کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ چونکہ اس عید کا پروگرام رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول نہیں ہے لہٰذا ہر کوئی اپنے ہی طریقے سے اسے منا رہا ہے۔ کوئی مصنوعی پہاڑیاں بنا رہا ہے' کوئی جلوس نکال رہا ہے' کوئی موسیقی کی دھنوں پر نعتیں گا رہا ہے اور کوئی میلاد کا جلسہ منعقد کر کے اس عید کو قرآن سے ثابت کرنے کی بے سود کوشش کر رہا ہے۔ بے سود اِس لیے کہ اگر یہ عید قرآن سے ثابت ہو تو ماننا پڑے گا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کی کچھ آیات پر عمل نہیں کیا' اور یہ محال ہے۔ اسی طرح دیگر بہت سی بدعات ہیں جن کو رواج دے کر شیطان نے اکثر مسلمانوں کو گمراہی کے تاریک غار میں دھکیل دیا ہے۔

شرک ایسا عمل ہے کہ آخرت میں اس کی بخشش نہیں۔ شرک کرنے والے کے تمام اعمال ضائع چلے جاتے ہیں' کیونکہ شرک بخشش کی راہ میں کافی رکاوٹ ہے۔ ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾

(النّساء:٤٨ و ١١٦)

''یقیناً اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے' البتہ اس کے ماسوا (گناہ) جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا''۔

اس بات کا شیطان کو بھی علم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرک کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے' لہٰذا شیطان کی یہ خواہش ہے کہ لوگوں سے شرک کا ارتکاب کرا کر انہیں اپنی پارٹی (حزب الشیطان) کا ایک فرد بنا لے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کلمہ گو تو مشرک نہیں ہوسکتا' مگر ایسا نہیں ہے۔ کلمہ گو کو شرکیہ افعال کرنے کی کھلی چھٹی نہیں ہے۔ اللہ پر ایمان رکھنے والا بھی مشرک ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَمَا يُؤْمِنُ اَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ ﴾ (یوسف)

''اور ان میں سے اکثر اللہ پر ایمان رکھنے کے باوجود مشرک ہیں''۔

مسلمانوں کو اس ناقابل بخشش گناہ سے دُور رہنے کی جتنی زیادہ ضرورت ہے اتنا ہی وہ شیطان کے فریب میں آ کر اس کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ وہ اللہ کے سوا دوسروں سے استمداد کرتے' دعائیں مانگتے' ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے اور اُن کی رضا کے طالب ہوتے ہیں۔ اللہ کی صفات مخلوق میں تسلیم کرتے ہوئے کسی کو قادر' کسی کو عالم الغیب' کسی کو دستگیر' کسی کو داتا' کسی کو مشکل کشا اور کسی کو نفع و نقصان کا مالک مان لیتے ہیں' حالانکہ یہ ساری صفات خاص (exclusively) اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ جب شیطان لوگوں سے شرکیہ اعمال کا ارتکاب کرا لیتا ہے تو اُس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی' کیونکہ وہ وعدۂ خداوندی کے مطابق ایسے شخص پر جنت کے دروازے بند کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ﴾ (المائدۃ:۷۲) ''یقیناً جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو اللہ نے اُس پر جنت حرام کر دی ہے اور اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔

درود شریف پڑھنے کے بڑے فضائل ہیں۔ درود شریف کے الفاظ تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ خود رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں موجود ہیں۔ پھر ان میں سب سے زیادہ فضیلت والا درود دَرودِ ابراہیمی ہے جس کے الفاظ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں شامل کر دیے ہیں۔ درود شریف کے وہ الفاظ جو رسول اللہ ﷺ نے اُمت کو سکھائے ہیں' بلاشبہ انتہائی خوبصورت اور افضل اور جامع ہیں' مگر شیطان نے یہاں بھی لوگوں کو

چلر دیا ہے۔ انہوں نے درود شریف کے نام سے خود بھی کچھ عبارتیں بنالی ہیں اور اُن کے خود ساختہ فضائل لوگوں کو بتائے ہیں۔ بھولے بھالے لوگ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے الفاظ کو چھوڑ کر انسانوں کے بتائے ہوئے درود شریف پڑھ رہے ہیں' اُن بیچاروں کو یہ نہیں پتا کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے مقابل کسی دوسرے کے الفاظ کی کوئی حیثیت نہیں۔ خود ساختہ درود شریف کو ہم نعت کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر اس میں بھی مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے شرکیہ الفاظ شامل ہو گئے تو وہ نعت بھی نہ رہی بلکہ ارتکابِ شرک کا موجب بن گئی۔ شیطان انسان کے ذہن سے یہ حقیقت آسانی سے مٹا دیتا ہے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کا مقام تمام کائنات سے بلند ہے اسی طرح آپؐ کے بتائے ہوئے درود شریف کے الفاظ یا اَوراد و وظائف بھی انتہائی جامع اور افضل ہیں۔ اُن کے ہوتے ہوئے لوگوں کے خود ساختہ الفاظ اپنانا فریبِ نفس کے علاوہ کچھ نہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر انسان اپنا جائزہ لیتا رہے اور خیال رکھے کہ اس کا عمل اسوۂ رسول اور تعلیمِ رسول ﷺ کے مطابق ہو۔ کیونکہ اُمت کا ہر فرد بڑا ہو یا چھوٹا بالفاظِ قرآن اس بات کا پابند ہے کہ جو رسول اللہ ﷺ دیں وہ لے لے اور جس سے وہ روکیں اُس سے رک جائے۔ یہ حیثیت اُمت میں سے کسی اور کی نہیں۔

حواشی

(۱) صحیح مسلم' کتاب صفة القیامة والجنة والنار' باب تحریش الشیطان وبعثه سرایاه لفتنة الناس...... الخ۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الجنائز' باب ما یکره من اتخاذ المساجد علی القبور ۔ وصحیح مسلم' کتاب المساجد ومواضع الصلاة' باب النهی عن بناء المساجد علی القبور واتخاذ الصور۔

اسلامی اور غیر اسلامی تہوار

دنیا میں ہر مذہب وملت کے اپنے اپنے تہوار ہیں جو مختلف یادگاروں کے طور پر منائے جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ تہوار بہت زیادہ خوشی یا وفورِ غم کے واقعات کی یاد تازہ کرتے ہیں یا پھر عظیم شخصیتوں کی پیدائش و وفات کی یاد میں منائے جاتے ہیں۔

اسلام میں بھی چند تہوار منائے جاتے ہیں' مگر اسلامی اور غیر اسلامی تہواروں میں ایک اصولی فرق ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اس لیے تمام اسلامی احکام اور ضابطے حد درجہ اعتدال پر ہیں۔ خوشی اور غمی کے واقعات کی یاد منانا اسلامی تعلیمات کی روح کے منافی ہے' کیونکہ دنیا میں خوشی اور غمی' رنج و راحت دوش بدوش چلتے ہیں اور اس قدر عمومی چیز کی یاد منانا کوئی معنی نہیں رکھتا' کیونکہ اسلامی عقیدہ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ تکلیف و آرام اللہ کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰىكُمْ﴾ (الحدید:۲۳)

''تا کہ تم رنجیدہ نہ ہو اُس چیز پر جو تم سے جاتی رہی اور نہ ہی اتراؤ اُس چیز پر جو تم کو عطا ہو۔''

یہی وجہ ہے کہ کسی کی وفات کی خبر سن کر جزع فزع یا گریہ و ماتم کرنے کی بجائے ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھنے کی تلقین ہے جس میں اس بات کا اقرار ہے کہ آج اگر یہ شخص رخصت ہو رہا ہے تو کل ہمیں بھی اسی راہ سے گزرنا اور خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہو گی۔

افراد خواہ کس قدر عظیم ہوں اسلام میں اُن کی پیدائش یا وفات کی یاد منانے کا حکم تو بڑی بات ہے جواز تک نہیں ہے۔ اسلام شخصیت پرستی کی جڑ کاٹتا ہے اور یہ بات عین فطری ہے۔ جو مذاہب وملل اپنے اکابر کی یاد اُن کے ایامِ پیدائش و وفات منا کر تازہ

کرتے ہیں اُن کی تاریخ میں یقیناً چند لوگ ہی قابل ذکر ہوں گے اور اکثر و بیشتر اُن کا ماضی مشاہیر سے تہی ہوگا' مگر اسلام جیسے معتدل مزاج' عالمگیر اور فطری دین میں محال کاموں کے احکام کے لیے ہرگز گنجائش نہیں ہے۔

اسلام میں کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار تو انبیاء و رُسل ہی ہیں جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ یادمنانے کے قابل ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر نگاہ ڈالیے۔ آپؐ کا اس دنیا میں ورودِ مسعود' نزولِ وحی کی ابتداء' ہجرت مدینہ' جنگ بدر میں کامیابی' جنگ اُحد' جنگ حنین' جنگ تبوک' فتح مکہ' دیگر بے شمار غزوات اور وفات' یہ واقعات ہیں کہ ان سے بڑھ کر اور کوئی واقعہ تاریخ عالم میں یادگار کے طور پر منانے کے قابل نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کے لاکھوں صحابہؓ اور کروڑوں کی تعداد میں شہداء' صالحین اور اولیاء اللہ اس قابل ہیں کہ ان کے دن منانے چاہئیں۔ اگر اسلام میں شخصی یادگاریں منانے کی اجازت ہوتو ایک مسلمان کی زندگی کا نہ صرف ہر دن بلکہ ہر دن میں ہر ساعت کسی نہ کسی عظیم شخصیت کی یاد منانے میں گزرے گی اور یہ بات انتہائی خلافِ عقل ہے کہ جس انسان کو دنیا میں حد درجہ مستعد زندگی گزارنے اور اسلام کا بول بالا کرنے کی جدوجہد کے لیے پیدا کیا گیا ہو اُس کے شب و روز دن منانے کی نذر کر دیے جائیں۔ اور اگر چند بزرگوں کے دن منائے جائیں تو دوسرے اکابرین سے بے انصافی ہوگی۔

قرونِ اولیٰ کی تاریخ شاہد ہے کہ اُس دور میں ایامِ پیدائش و وفات منانے کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آج آنحضرت ﷺ کا یومِ پیدائش جو عید میلادالنبی کے نام سے رواج پا رہا ہے' آپ ﷺ کی ۲۳ سالہ نبوی زندگی اور خلافتِ راشدہ کے تیس سالوں میں کبھی اس طرح نہیں منایا گیا' بلکہ اس دور میں تو صرف دو عیدیں تھیں' عید الفطر اور عید الاضحیٰ اور ان دونوں عیدوں کے احکام اور مسائل بھی اسلامی کتابوں میں ملتے ہیں مگر عید میلادالنبی کے نام سے کوئی تیسری عید اُس دور میں موجود نہ تھی۔ حالانکہ صحابہ کرام' تابعین اور تبع تابعین کو جس قدر معرفت رسولؐ اور حبِ نبیؐ حاصل تھی آج کس کو حاصل ہے؟

اسلامی اور غیر اسلامی تہواروں میں ایک اور اصولی فرق ہے۔ غیر اسلامی تہوار

شخصیتوں کی یاد میں یا قومی اہمیت کے عظیم واقعات کی یاد میں منائے جاتے ہیں جبکہ اسلامی تہوار اصولوں کی فتح کی بنیاد پر منائے جاتے ہیں اور اُن کے تقرر کا اختیار بھی صرف مالکِ حقیقی کو ہے اور اس نے اپنے رسول ﷺ کی زبان سے وہ مسلمانوں کو بتا دیے ہیں۔ اسلامی تہوار عید الفطر' عید الاضحیٰ' رمضان شریف' اجتماع حج' شب قدر وغیرہم سب کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہی حاکم اعلیٰ ہے' اس کی رضا چاہنا ہی حقیقی خوشی ہے اور اُس کی اطاعت حقیقی فلاح ہے۔ رمضان شریف اللہ تعالیٰ کے حکم پر بھوک اور پیاس برداشت کرنے اور نفسانی خواہشات پر قابو پانے کی تربیت کا مہینہ ہے۔ جب مسلمان اس تربیت سے کامیاب و کامران گزر جاتے ہیں تو اگلے روز عید الفطر کا تہوار مناتے ہیں جس میں مزید دو رکعت نماز باجماعت ادا کر کے خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ حج اسلام کا رکن ہے۔ عرفہ کا دن بڑی فضیلت کا حامل ہے جب سرزمین بیت اللہ پر ہر طرف اللہ اکبر کی صدائیں گونجتی ہیں۔ سعادت مند لوگ حج کرتے ہیں اور اگلے دن عید الاضحیٰ کے موقع پر عالمِ اسلام میں کروڑوں جانور اللہ کے نام پر ذبح کیے جاتے ہیں اور دو رکعت نماز باجماعت ادا کر کے خالق دو جہاں کی کبریائی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ باقی تمام اسلامی تہوار بھی اسی قبیل سے ہیں' کیونکہ ان ایام میں بھی رسول اللہ ﷺ نے کئی مخصوص دعائیں اور نمازیں اُمت کو سکھائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خلیل اللہ کے لقب سے نوازا۔ ان کے امتحانات اور کامیابیوں کا ذکر قرآن پاک میں جابجا موجود ہے جس سے ان کی فضیلت عیاں ہے۔ مگر ان کی' اُن کے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی یا ان کی زوجہ محترمہ کی پیدائش اور وفات کے دنوں کو کبھی نہ منایا گیا اور نہ منانے کا حکم دیا گیا۔ ہاں ان کے اعمال میں جو چیزیں مقاصد دین سے متعلق تھیں' ان کی یادگاروں کو نہ صرف محفوظ رکھا گیا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے فرض و واجب کا درجہ دے کر ان کو مذہب کا جزو قرار دے دیا گیا۔ قربانی' ختنہ' سعی' رمی' طواف انہی بزرگوں کے ایسے افعال کی یادگار ہیں جو انہوں نے اپنے نفسانی جذبات اور طبعی تقاضوں پر ضبط کر کے محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی

کے لیے کیے اور جن میں ہر دور کے لوگوں کے لیے عبرت ہے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنی محبوب ترین شے کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ آج مسلمانوں نے جہاں دوسرے بے شمار اصولِ دین سے بے توجہی اختیار کی ہے اسی طرح دوسری اقوام کی دیکھا دیکھی انہی کی طرز پر نئے تہوار ایجاد کر لیے ہیں۔ عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کے یوم پیدائش کو عید منائی تو ان کی تقلید میں کچھ مسلمانوں نے ختم المرسلین کی پیدائش کے دن کو عید میلاد النبی کا نام دے کر ایک نیا تہوار ایجاد کر لیا۔

آنحضرت ﷺ کے یومِ پیدائش کو عید میلاد النبی کا نام دینے اور خوشی منانے میں ایک اور امر بھی مانع ہے' اور وہ یہ کہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ آپؐ کی پیدائش کا دن اور مہینہ ہی آپؐ کی وفات کا دن اور مہینہ ہے۔ پیدائش پر خوشی کا اظہار بجا مگر رحمۃٌ للعالمینؐ کی وفات کا صدمہ کیا کچھ کم ہے کہ جہاں عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی بھی جذباتِ غم پر قابو نہ رکھ سکے۔ معلوم ہوا کہ قدرت کی طرف سے بھی تاریخ پیدائش اور وفات کو جمع کر کے خوشی اور غمی کو متوازن کر دیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی مسلمان اس دن خوشی منانے کا اہتمام کرتا ہے تو وہ آپؐ کی وفات کا سوگ کب منائے گا؟ اور اگر وفات کے دن سوگ منانے کا اہتمام کرتا ہے تو وہ پیدائش کی خوشی کب منائے گا؟ جبکہ آپؐ کی پیدائش کا دن ہی وفات کا دن ہے۔

مسلمانوں کو عبرت پکڑنی چاہیے کہ جس چیز کی کوئی اصل خیر القرون میں نہ ہو اسے بطور خود ایجاد کر کے شریعت میں داخل کرنا کتنی بڑی جسارت ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ نے خود دین اسلام کو اتمام اور کمال کے درجہ پر پہنچا دیا۔ اَکْمَلْتُ اور اَتْمَمْتُ کے الفاظ ہی اس بات پر دلیل قاطع ہیں کہ اسلام اپنے جملہ اجزاء کے ساتھ مکمل ہو چکا ہے اور اب کوئی جزو ایسا نہیں ہے کہ جس میں خیر کا پہلو موجود ہو اور وہ پہلے سے اسلام میں داخل نہ ہو۔ بندے کو یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ وہ آقا کا قلمدان لے کر بیٹھ جائے۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغ!

تعزیت کا اسلامی طریقہ

ہندو اور مسلمان سینکڑوں سال تک برصغیر میں اکٹھے رہتے رہے۔ چنانچہ مذہبی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے سماجی طور طریقوں سے متاثر ہوئے۔ آج ہم یہاں کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو اُن میں ایسے ایسے رسم و رواج ملتے ہیں جن کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں' بلکہ اسلامی لٹریچر میں جن چیزوں کا وجود نہیں وہ نہایت شدّ ومدّ کے ساتھ رائج ہیں۔ یہ رسم و رواج یہاں کے مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ خاص طور پر شادی بیاہ کے موقع پر اور موت ہو جانے کی صورت میں رسومات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو طرح طرح کی دشواریوں کا باعث بنتا ہے' لیکن کون ہے جو صحیح اسلامی احکامات پر عمل کر کے دکھائے اور مسلمانوں کی گردنوں سے یہ مصنوعی طوق اُتارے۔

میثاق کے صفحات اور مقامی اخبارات شاہد ہیں کہ مدیر میثاق جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے بچوں کی شادیاں نہایت سادگی کے ساتھ مسنون طریقے سے انجام دے کر عملاً عہد صحابہ کی یاد تازہ کر دی ہے۔ یہاں نہ کوئی بارات تھی نہ باجے گاجے' نہ کوئی جہیز تھا نہ سہرہ' نہ محفل نکاح کا غیر سنجیدہ ماحول تھا نہ لڑکی والوں کے ہاں کی دعوت۔ مسجد میں نکاح منعقد ہوا' حاضرین میں چھوہارے تقسیم کیے گئے اور قرآن پاک کی تلاوت کے روح پرور ریکارڈ سنائے گئے۔ لڑکے والوں نے سنت نبویؐ کے مطابق دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا جس میں اعزہ اور دوست احباب کو مدعو کیا گیا اور بس۔

شادی کی رسومات کا تذکرہ بے سود ہوگا' کیونکہ ہم سب ان سے واقف ہیں۔ اسی طرح غمی کے موقع پر بھی تعزیت کی رسومات مہینوں تک پھیل جاتی ہیں۔ میت کے پسماندگان کے ہاں دوست احباب اور رشتہ داروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

طرح طرح کے کھانوں سے اُن کی تواضع کی جاتی ہے۔ بعض اوقات عمر رسیدہ لوگوں کے جنازے پر باجے بجائے جاتے ہیں اور پیسے برسائے جاتے ہیں' رسومات کی ادائیگی کے لیے یومِ وفات سے اگلے دن' پھر ساتویں دن' پھر دسویں دن' چالیسویں دن اور پھر سال بعد اجتماعات منعقد کیے جاتے ہیں جن پر نمود و نمائش کی خاطر چار و ناچار بڑی بڑی رقوم خرچ کی جاتی ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ ثواب کی امید بھی رکھی جاتی ہے' حالانکہ ثواب کا کام تو صرف وہی ہو سکتا ہے جو شارع علیہ السلام کے اُسوۂ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل کے مطابق ہو۔

ممتاز صحابیٔ رسول حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا بیٹا فوت ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپؐ نے انہیں تعزیت نامہ لکھا جو معارف الحدیث جلد سوم از مولانا محمد منظور نعمانی میں حرف بحرف مذکور ہے۔ تعزیت نامے کی عربی عبارت کا ترجمہ مذکورہ کتاب سے درج ذیل ہے:

اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام

سلامٌ علیک!

میں پہلے تم سے اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں' (بعد ازاں) دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ پر اجر عظیم دے اور تمہارے دل کو صبر عطا فرمائے اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے مال اور ہمارے اہل و عیال یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے ہیں اور اس کی سپرد کی ہوئی امانتیں ہیں (اس اصول کے مطابق تمہارا لڑکا بھی تمہارے پاس اللہ کی امانت تھا) اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور جب اس کی مشیت ہوئی اپنی اس امانت کو تم سے واپس لے لیا۔ وہ تم کو اس کا بڑا اجر دینے والا ہے' اللہ کی خاص نوازش اور اس کی رحمت اور اس کی طرف سے

ہدایت (کی تم کو بشارت ہے) اگر تم نے ثواب اور رضاءِ الٰہی کی نیت سے صبر کیا۔ پس اے معاذ! صبر کرو اور ایسا نہ ہو کہ جزع وفزع تمہارے قیمتی اجر کو غارت کر دے اور پھر تمہیں ندامت ہو (کہ صدمہ بھی پہنچا اور اجر سے بھی محرومی رہی) اور یقین رکھو کہ جزع وفزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ اس سے رنج وغم دور ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے جو حکم اترتا ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے' بلکہ یقیناً ہو چکا ہے''۔ والسلام (بحوالہ معجم کبیر ومعجم اوسط للطبرانی)

تعزیت نامے کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے میت کے پس ماندگان کے حق میں اجرِ عظیم کی دعا کی ہے اور صبر وشکر کی تلقین کے ساتھ ساتھ جزع وفزع سے روکا ہے۔ غم واندوہ میں آنکھوں سے آنسو نکلنا فطری بات۔ یہ فوت ہونے والے کے ساتھ محبت کے تعلق کی وجہ سے ہے۔ اسی لیے اس سے نہیں روکا گیا۔

پس اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں میت کے پس ماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی اور تعزیت کے یہ موزوں ترین الفاظ ہیں جو ملاقات کی صورت میں زبانی اور بصورتِ دیگر بذریعہ خط کہے جا سکتے ہیں۔ ہر کسی کی وفات اللہ کے اِذن سے ہوتی ہے۔ اُس کو صبر کے ساتھ قبول نہ کرنا اور جذبات پر قابو نہ رکھ سکنا اللہ کی مشیت پر اعتراض ہے۔ اللہ تعالیٰ الحکیم ہے' اُس کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں' وہ جو بھی کرتا ہے درست کرتا ہے۔ وہ موت وحیات کا مالک ہے۔

اولاد کی تمنا میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا عین صواب ہے' مگر اولاد نہ ملنے کی صورت میں شکوہ وشکایت زبان پر لانا اور ہر وقت پریشان رہنا' غم واندوہ میں بے حال ہونا درست نہیں۔ بلکہ اولاد سے محرومی کو اللہ کا فیصلہ سمجھ کر صبر کرنا مناسب ہے۔ اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر اولاد ہوتی اور وہ نافرمان اور نالائق ہوتی تو ایسے میں جو پریشانی آتی وہ کیسے برداشت ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے اُسی میں مصلحت سمجھنی چاہیے۔

اسی طرح کسی فرد کی موت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس صدمے سے پس ماندگان غمگین اور افسردہ ہوتے ہیں۔ یہ طبعی امر ہے۔ مگر اس صدمے کو اگر

صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے اور آہ وفغاں' جزع فزع اور شکوہ وشکایت زبان پر نہ لائی جائے تو یہ صبر بڑے اجر کا باعث ہے' جیسا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ کے نام رسول اللہ ﷺ کے تعزیت نامے میں ذکر ہو چکا۔ قرآن مجید میں ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (البقرۃ) ''بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ حضرت صہیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

> ''بندۂ مؤمن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کے ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے۔ اگر اس کو خوشی اور آرام پہنچے تو وہ اپنے ربّ کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے' اور اگر اسے کوئی دکھ پہنچے تو وہ (اللہ کا فیصلہ سمجھتے ہوئے) اس پر صبر کرتا ہے تو یہ صبر بھی اس کے لیے سراسر خیر ہی کا موجب ہے''۔ (مسلم)

پس کسی عزیز کی وفات پر کسی طرح کی غم میں ڈوبی ہوئی اور اسراف وتبذیر کی موجب رسومات اپنانا اسلامی تعلیمات کے خلاف اور اجر کو ضائع کر دینے کا باعث ہے۔ جبکہ صبر کا اجر عاقبت کی حقیقی اور پائیدار زندگی میں فوز وفلاح کا سبب بنے گا۔ حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: اے ابن آدم! اگر تو نے شروعِ صدمہ میں صبر کیا اور میری رضا اور ثواب کی نیت کی تو میں تیرے لیے جنت سے کم کسی ثواب پر راضی نہ ہوں گا''۔ (ابن ماجہ)

کسی قریبی عزیز کی وفات کے صدمے پر فوری طور پر صبر کرنے سے اتنے بڑے ثواب کا وعدہ اہل ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صدمے کا یہ زخم خود بخود ہلکا ہو کر بالآخر مٹ جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا حکیمانہ نظام ہے۔

کسی کے ہاں موت ہو جائے تو عزیز واقارب کا فرض ہے کہ وہ مصیبت زدہ کو تسلی دیں' اظہار ہمدردی کریں' اُس کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کریں کہ یہ بھی اجر کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی مصیبت زدہ کی تعزیت کی تو اس کے لیے مصیبت زدہ

کا سا ہی اجر ہے''۔(جامع الترمذی' سنن ابن ماجہ)

میت پر سوگ صرف تین دن تک ہے۔اسی دوران عزیز و اقارب اور دوست احباب تعزیت کے لیے آئیں۔لواحقین کو صبر کی تلقین کریں اور ہمدردی کا اظہار کریں۔جو ایک بار تعزیت کر چکے اُسے دوبارہ تعزیت کے لیے نہیں آنا چاہیے۔تین دن کے بعد اہل خانہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جائیں۔صرف عورت اپنے شوہر کی وفات پر چار ماہ دس دن تک سوگ کی حالت میں رہے گی۔پس ماندگان کو چاہیے کہ وہ فوت شدہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کریں جس سے اسے بھی فائدہ ہو اور خود کو بھی۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:''جو بندہ عام ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگے گا اُس کے لیے ہر مؤمن مرد و عورت کے حساب سے ایک ایک نیکی لکھی جائے گی''۔(معجم کبیر للطبرانی)

پس ہمارے لیے ہر معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔جس کام کو جس انداز سے آپؐ نے انجام دیا یا حکم دیا وہی اچھا اور موجب ثواب ہے۔فضول قسم کے اضافے اور تکلفات بدعات کے ضمن میں آتے ہیں اور بدعات تو نری گمراہی ہیں۔

❁❁❁

فَصَبۡرٌ جَمِيۡلٌ

انسان کی زندگی میں جہاں خوشی اور مسرت کے لمحات آتے ہیں وہاں اسے رنج وغم اور مصیبت کے لمحات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ خوشی کے مواقع فرح اور انبساط پیدا کرتے ہیں جبکہ رنج وغم سے انسان افسردہ اور پریشان ہو جاتا ہے۔ مکمل ضابطۂ حیات ہونے کے ناطے اسلام خوشی ومسرت اور رنج وغم کے مواقع پر متوازن اور معتدل رویہ اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿ لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ۝ ﴾ (الحدید)

''تاکہ جو تم سے فوت ہو گیا ہو اُس کا غم نہ کھایا کرو اور جو تم کو اس نے دیا اس پر اترایا نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی بھگارنے والے کو محبوب نہیں رکھتا۔''

یہ اس لیے کہ خوشی اور غمی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے' اس کے فیصلہ کے مطابق ہی ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے بندوں کا یہ حال رہنا چاہیے کہ جب کوئی دکھ اور مصیبت پیش آ جائے تو وہ مایوسی اور پریشانی کا شکار نہ ہوں بلکہ صبر وثبات کے ساتھ اس کو برداشت کریں اور دل میں اس یقین کو تازہ کریں کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے' جو ہمارا رحیم وکریم اور مہربان ربّ ہے' اور وہی ہمیں اس مصیبت سے نجات دینے والا ہے۔ اسی طرح جب ہر طرح کی نعمتیں میسر ہوں اور راحت وآرام کے ساتھ حالات سازگار رہوں تو بھی اس کو اپنے زورِ بازو اور عقل ودانش کا نتیجہ نہ سمجھیں' بلکہ اُس وقت بھی اپنے دل میں یہ یقین تازہ کریں کہ خوشی اور مسرت کے یہ سارے سامان محض اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کی عطا ہے اور وہ جب چاہے یہ نعمت واپس لے سکتا ہے۔ یہ طرزِ عمل اختیار کر کے بندہ اپنے ربّ کے دامن سے وابستہ رہتا ہے اور اس پر

خدا فراموشی اور آزاد خیالی طاری نہیں ہوتی۔ نیز وہ مصائب و آلام کو حکیم وعلیم خدا کی جانب سے سمجھ کر اُن کو برداشت کرتا اور مایوسی اور دل شکستگی سے بچا رہتا ہے۔

صبر اور شکر اسلامی اخلاق کے دو اہم عنوان ہیں۔شکر مؤمن کے اس رویے کا نام ہے جب وہ خوشی اور مسرت کے لمحات سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اس کو خدا کا عطیہ جان کر اس کی حمد کے ترانے گاتا ہے۔اور صبر اس کیفیت سے عبارت ہے جب مؤمن کو دکھ' رنج یا مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ اس صدمے کو اللہ حکیم وعلیم کی مشیت اور رضا سمجھ کر قبول کرتا ہے اور شکوہ وشکایت یا جزع وفزع نہیں کرتا۔آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ خَيْرٌ ' وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ ' اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهٗ ' وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهٗ)) (رواہ مسلم)

''بندۂ مؤمن کا معاملہ بھی عجیب ہے' اس کے ہر معاملہ اور ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور یہ نعمت صرف مؤمن کو ہی نصیب ہے۔اگر اس کو خوشی اور راحت وآرام پہنچے تو وہ اپنے ربّ کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے' اور اگر اسے کوئی دکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کے لیے سراسر خیر اور برکت کا موجب ہوتا ہے۔''

ابن ماجہ میں وارد ایک حدیث قدسی میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((يَقُوْلُ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ ابْنَ اٰدَمَ اِنْ صَبَرْتَ وَاحْتَسَبْتَ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰى لَمْ اَرْضَ لَكَ ثَوَابًا دُوْنَ الْجَنَّةِ))

''اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتا ہے: اے فرزند آدم! اگر تو نے شروعِ صدمہ میں صبر کیا اور میری رضا اور ثواب کی نیت کی تو میں نہیں راضی ہوں گا کہ جنت سے کم کوئی اور ثواب تجھے دیا جائے۔''

صدمہ کے وقت اس کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔اس وقت صبر کرنا مشکل ہوتا ہے۔ بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود ہی صبر آ جاتا ہے۔ چنانچہ صدمہ پہنچنے کے وقت اللہ کی رضا کے لیے صبر کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے۔اسی لیے اس کا بھرپور اجر دینے کا

وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (البقرۃ)

''بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

صحیحین کی ایک حدیث میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی (حضرت زینبؓ) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہلا بھیجا کہ میرے بچے کا آخری دم ہے اور چل چلاؤ کا وقت ہے' لہٰذا آپؐ اِس وقت تشریف لے آئیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں سلام کہلا بھیجا اور پیام دیا کہ بیٹی! اللہ تعالیٰ کسی سے جو کچھ لے وہ بھی اسی کا ہے اور کسی کو جو کچھ دے وہ بھی اسی کا ہے۔ الغرض ہر چیز ہر حال میں اسی کی ہے اور ہر چیز کے لیے اس کی طرف سے ایک مدت اور وقت مقرر ہے' پس چاہیے کہ تم صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس صدمہ کے اجر وثواب کی طالب بنو۔ صاحبزادی زینبؓ نے پھر آپؐ کے پاس پیام بھیجا اور قسم دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اس وقت ضرور تشریف لائیں۔ پس آپؐ اٹھ کر چل دیے اور آپؐ کے اصحابؓ میں سے سعد بن عبادہ' معاذ بن جبل' اُبی بن کعب' زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور کچھ اور لوگ بھی آپؐ کے ساتھ ہو لیے۔ پس وہ بچہ اٹھا کر آپؐ کی گود میں دیا گیا اور اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ اس کے اس حال کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس پر سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا: حضرت یہ کیا؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ رحمت کے اس جذبے کا اثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دیا ہے اور اللہ کی رحمت ان ہی بندوں پر ہوگی جن کے دلوں میں رحمت کا یہ جذبہ موجود ہو''۔

معلوم ہوا کہ صدمے کے اثر سے آنکھوں سے آنسو جاری ہونا رقتِ قلب کی علامت اور جذبۂ رحمت کا لازمی نتیجہ ہے جو کہ صبر کے منافی نہیں' البتہ جزع فزع اور شکوہ وشکایت کے الفاظ زبان پر لانا بے صبری ہے۔

مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہمہ وقت آزمائش میں سمجھے۔ خوشی اور مسرت کی حالت بھی آزمائش ہے اور جذبۂ شکر کے ساتھ ساتھ خدا کی نعمتوں کا خدا

کے حکم کے مطابق استعمال اور خدا کی حمد وثنا اس کی کامیابی ہے۔ رنج والم اور دکھ تکلیف کی حالت بھی آزمائش ہے جبکہ اسے خدا کی مشیت اور فیصلہ جان کر قبول کرنا اور اپنے اوپر صبر کی کیفیت طاری کرنا اس کی کامیابی ہے۔

سب سے بڑا صدمہ کسی عزیز کی وفات ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر صدمہ سے دوچار خاندان کے ساتھ اظہارِ تعزیت مسنون ہے، مگر تعزیت کے خود ساختہ طریقے چنداں سودمند نہیں۔ صاحب خانہ کو صبر کی تلقین اور رجوع الی اللہ کی یاد دہانی ہی اصل تعزیت ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا بیٹا فوت ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تعزیتی خط لکھوا کر بھیجا۔ اس خط کا متن مع ترجمہ اس طرح ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰى معاذ بن جبل۔ سَلَامٌ عَلَيْكَ ، فانى احمد اليك الله الذى لا اله الا هو ۔ اما بَعد فاعظم الله لكَ الاجر واَلْهَمَك الصَّبر۔ ورزقنا واياك الشكر۔ فان انفسنا واموالنا واهلنا مِنْ مواهب الله الهنيئة وعوارية المستودعة۔ متعك الله الذى به فى غبطة وسرور وقبضه منك باجر كبير۔ الصلوٰة والرحمة والهدى ان احتسبته ، فَاصْبِرْ ولا يُحْبِطُ جَزَعُك اَجْرَكَ فَتَندَم۔ وَاعلم ان الجزع لا يردّ ميتاً ولا يدفع حَزَناً وَمَا هو نازلٌ فكان قَدْ۔ والسلام ۔ (رواه الطبرانى فى الكبير الاوسط)

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام ۔ پہلے میں اس اللہ کی حمد تم سے بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں ۔ بعد ازاں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ کا اجر عظیم دے اور تمہارے دل کو صبر عطا فرمائے اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں، ہمارے مال اور ہمارے اہل وعیال یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے اور اس کی سونپی ہوئی امانتیں ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور جب اس کی مشیت ہوئی اپنی اس امانت کو تم سے واپس لے لیا اور وہ تم کو اس کا بڑا اجر دینے والا ہے، اللہ کی خاص نوازشیں، اس کی رحمت اور اس کی طرف

سے ہدایت (کی تم کو بشارت ہے)'اگر تم نے ثواب اور رضاءِ الٰہی کی نیت سے صبر کیا۔(پس اے معاذ!) صبر کرو اور ایسا نہ ہو کہ جزع وفزع تمہارے اجر کو غارت کر دے اور پھر تمہیں ندامت ہو۔ اور یقین رکھو کہ جزع اور فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ اس سے دل کا رنج وغم دور ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آتا ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے' بلکہ یقیناً ہو چکا ہے۔ والسلام''

اس تعزیت نامے میں جناب رسول اللہ ﷺ نے انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں حضرت معاذ بن جبلؓ کے بیٹے کی وفات پر تعزیت بھی کی ہے' صبر جمیل کی تلقین بھی کی ہے اور جزع وفزع سے روک کر صحیح طرزِ عمل کی طرف راہنمائی بھی کی ہے۔ گویا اس تعزیت نامے میں ہر اُس شخص کے لیے تعزیت' خیر خواہی' تسلی اور تشفی کا پورا سامان ہے جس کو کوئی صدمہ پہنچے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی مصیبتوں میں اپنے ہادی ورہبرؐ کی ایمان افروز نصیحت سے صبر وسکون حاصل کریں۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہوگا کہ چند دن قبل امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے چھوٹے بھائی جناب اقتدار احمد کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم بہت خوبیوں کے مالک اور ڈاکٹر صاحب کی تنظیمی اور دعوتی سرگرمیوں میں ہمہ تن ان کے معین ومؤید تھے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پر بیعت بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی فکر کی نشر واشاعت کے لیے زرِ کثیر صرف کر کے انہوں نے ''ندا'' جاری کیا' جسے بعد ازاں ''ندائے خلافت'' کی صورت دی اور بڑی جدوجہد اور کاوش کے ساتھ اس کو چلایا۔ گہرے خاندانی روابط کے علاوہ وہ صحیح معنوں میں ڈاکٹر صاحب کے دست راست' اچھے مشیر' غمگسار اور خیر خواہ تھے۔ ایسے بھائی کی جدائی ڈاکٹر صاحب کے لیے یقیناً بہت بڑا صدمہ تھا۔ مگر ہم نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب اس موقع پر بھی صبر وثبات کے پہاڑ اور سراپا تسلیم ورضا تھے۔ انہوں نے وہ دعوتی وتنظیمی پروگرام جو پہلے سے طے شدہ تھے' بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ بروقت انجام دیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر یہ طرزِ عمل ڈاکٹر صاحب کے علاوہ کسی دوسرے میں کم ہی نظر آیا ہے۔

[یہ تحریر ماہنامہ میثاق لاہور بابت ماہِ جولائی 1995ء میں شائع ہوئی تھی]

مقامِ صحابہؓ

صاحب کے لغوی معنی دوست، ساتھی اور پیرو کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں ''صحابی'' اُن افراد کو کہا جاتا ہے جنہوں نے ایمان کی حالت میں رسول کریم ﷺ کو دیکھا اور زندگی بھر اسلام پر قائم رہے۔ اس طرح عہدِ رسالت کے کافر، مشرک اور منافق لوگوں کو اصحابِ رسولؐ نہیں کہا جاتا۔

اصحابِ رسولؐ کا مقام انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے بلند ہے، کیونکہ انہوں نے محبوبِ خداؐ کے ساتھ وفاداری کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے رسول پاکؐ کے اشاروں پر اپنی جانیں نچھاور کیں، دکھ برداشت کیے، تکلیفیں جھیلیں اور اسلام کے پودے کو اپنے خونِ جگر کے ساتھ سینچا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جاں نثاری کے واقعات تاریخِ اسلام کے اوراق پر پھیلے ہوئے ہیں جن کو پڑھ کر غیر مسلم بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ محمد (ﷺ) کے ساتھی غیر معمولی انسان تھے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے آقا کی اطاعت میں ایسے نقوش چھوڑے ہیں کہ کوئی دوسرا ان کی گردِ راہ کو بھی نہیں پا سکتا۔ رسول پاکؐ وضو کرتے تھے تو وہ پانی نیچے نہ گرنے دیتے۔ وہ آپؐ کے اشارے پر کٹ مرنے کو فخر سمجھتے تھے۔ یہاں صرف دو حضرات کے واقعات سنتے جایئے۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی ہیں۔ ان کی شادی ہوئی، رات گزاری تو صبح غسل کی تیاری کر رہے تھے۔ کان میں خبر پڑی کہ مسلمانوں کو میدانِ اُحد میں شکست ہو رہی ہے۔ غسل کو چھوڑا اور اُسی وقت میدانِ کارزار کی طرف لپکے، خوب دادِ شجاعت دی۔ دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچا دی۔ بالآخر جامِ شہادت نوش کیا۔ جب اُن کو دفن کرنے لگے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''میں دیکھتا ہوں کہ فرشتے حنظلہ رضی اللہ عنہ کو غسل دے رہے ہیں''۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حنظلہؓ کو تاریخ میں ''غسیلِ ملائکہ'' کہتے

ہیں۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے قبل ناز ونعمت کی زندگی گزارتے تھے۔نوجوان ہی تھے کہ گھر والوں سے چھپ کر مسلمان ہو گئے ۔گھر والوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے باندھ دیا۔ایک دن موقع پا کر بھاگ گئے ۔ پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی بعد ازاں ہجرتِ مدینہ سے بھی مشرف ہوئے اور زہد وفقر کی زندگی میں ناز ونعم والی زندگی سے زیادہ مسرور نظر آتے ۔ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اُن کی چادر میں کپڑے کی بجائے چمڑے کا پیوند لگا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پہلی اور اس حالت کا تذکرہ فرماتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے ۔ جنگ اُحد میں مہاجرین کا جھنڈا اُن کے ہاتھ میں تھا۔ایک کافر نے تلوار کا وار کیا اور اُن کا ہاتھ کٹ گیا' فوراً جھنڈے کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیا۔اس نے پھر تلوار ماری اور دوسرا ہاتھ بھی کاٹ ڈالا۔انہوں نے دونوں بازوؤں کو جوڑ کر سینہ سے جھنڈے کو چمٹا لیا تا کہ گر نہ جائے' بالآخر ایک تیر لگا اور آپؓ شہید ہو گئے ۔جھنڈا پھر ایک دوسرے شخص نے اٹھا لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خدا کے حکم سے تبلیغ کا آغاز کیا تو گویا آپؐ نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔ مکہ کے لوگ آپؐ کے مخالف ہو گئے اور طرح طرح سے اذیتیں دینے لگے ۔اس حالت میں کوئی کمزور کردار کا انسان آپؐ کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اسلام میں داخل ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینا دنیا بھر کو دشمن بنا لینے کے مترادف ہے۔ چنانچہ اُس وقت جو لوگ ایمان لائے انہوں نے پیغمبر اسلامؐ کے ساتھ ہو کر مصیبت کے دن گزارے' وہ کسی بھی وقت پھسلنے والے نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ شکور ہے' وہ کسی کے صلے کو نہیں روکتا۔ اُس نے اپنی بے نیازی کے باوجود قرآن پاک میں اصحابِ رسولؐ کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کیا تا کہ قیامت تک نسل انسانی ان کو خراجِ تحسین پیش کرتی رہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اصحابِ رسولؐ کے ایمان کو سند کی حیثیت سے پیش کیا اور فرمایا کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح لوگ یعنی ''اصحابِ رسولؐ'' ایمان لائے ہیں۔ گویا اصحابِ رسول کا ایمان بارگاہِ ربّ العزت میں مقبول تھا۔

قرآن کے اوّلین مخاطب اہل مکہ تھے۔ ان میں جو ایمان لاتے گئے پیغمبر اسلامؐ

کے ساتھی بنتے گئے۔ جب یہ ایک جماعت بن گئی تو اللہ تعالیٰ نے یوں خطاب فرمایا: ''تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی۔ تم بھلائی کی تلقین کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو!'' (آل عمران:۱۱۰) اگرچہ خیرِ اُمت کے مصداق تمام صالح مسلمان ہیں تاہم اس اعزاز کے اوّلین مخاطب تو اصحابِ رسولؐ ہی ہیں۔

رسولِ پاکؐ کے ساتھیوں کی جماعت نے دین کی تعلیم براہِ راست پیغمبر علیہ السلام سے حاصل کی۔ اُس پر خود دیانت داری کے ساتھ عمل پیرا رہے اور وہی تعلیم بعد میں آنے والوں تک پہنچا دی۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یہ صحابہ کرامؓ ہی ہیں جن کی بدولت قرآن ہم تک پہنچا اور ہم خدا اور اُس کے رسولؐ سے متعارف ہوئے۔ اس لحاظ سے ہر مسلمان جماعتِ صحابہؓ کا زیرِ بارِ احسان ہے کہ انہوں نے اسلام ہم تک پہنچایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((اَصْحَابِیْ كَالنُّجُوْمِ فَبِاَيِّهِمُ اقْتَدَيْتُمْ اِهْتَدَيْتُمْ))

''میرے صحابی ستاروں کی مانند ہیں' پس جس کی پیروی تم کرو گے ہدایت پاؤ گے۔''

یعنی صحابہ کا عمل اُمت مسلمہ کے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے رسولِ پاکؐ کی پاکیزہ زندگی کا نمونہ موجود تھا۔ اور وہ خدا کے اس حکم کے مطابق کہ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے' ہر کام میں پیغمبر اسلامؐ کی اتباع کرتے تھے۔ اُن کے تمام کام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم کے مطابق تھے۔ مثال کے طور پر نماز ہی کو لیجیے۔ نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہونے' رکوع و سجود کی کیفیت' قعدہ اور جلسہ کی حالت اور سلام پھیرنے کا طریقہ ہم پر بالکل واضح ہے' ہم نے صحابہؓ کی تعلیمات سے سیکھا ہے اور صحابہؓ کو یہ حکم تھا کہ ''نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو!'' آج ہماری نمازوں کے طریقہ ادائیگی کے صحیح ہونے کی دلیل یہی ہے کہ وہ صحابہؓ کی تعلیم اور نمونے کے مطابق ہوں۔ کیونکہ ان کا طریق بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ کے مطابق تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے رسول مقبولؐ کو ارشاد فرمایا کہ ''اُن سے مشورہ کیجیے!'' دستور یہ تھا کہ احکام و فرائض کا ذکر قرآن پاک میں آ جاتا تھا۔ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آ جاتا جس کی صورت قرآن پاک میں واضح نہ ہوتی تو حضورؐ اپنے صحابہؓ سے اُس کام کے بارے میں مشورہ لیتے اور قبول کرتے۔ نبی اکرم ﷺ کا اپنا فیصلہ حددرجہ صائب اور صحیح ہوتا تھا۔ ﴿شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ سے تو اصحابِ رسولؐ کی فضیلت مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ﴾ (البیّنة:٨)

''اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے!''

یہ خطاب اصحابِ رسولؐ کو ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت نے اطاعتِ رسولؐ اور احکامِ خداوندی پر چلنے کا حق ادا کر دیا۔ خدا تعالیٰ بھی اپنے بندوں سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ وہ اُس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کریں۔ صحابہؓ نے اپنی زندگیاں محض رضائے خدا کے لیے وقف کی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ وہ اُس سے راضی ہو گئے۔ دراصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خدا کی خوشنودی دلانے والا عمل یہ تھا کہ وہ ربّ سے راضی تھے۔ ہر مشکل اور تکلیف کو جو وہ پیغمبر اسلام کے شانہ بشانہ برداشت کرتے تھے' اُسے اللہ تعالیٰ کے علم و رضا کے مطابق جانتے تھے۔ تبھی تو کسی وقت نہ گھبراتے اور خوف نہ کھاتے تھے۔ ان کا اس بات پر گہرا یقین تھا کہ: ''کوئی مصیبت وارد نہیں ہوتی بجز اللہ تعالیٰ کے حکم سے!'' یہی صبر کا مقام ہے کہ انسان مصیبت میں اپنے جذبات کو بے قابو نہ ہونے دے۔ بڑے سے بڑے دنیاوی نقصان پر بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے' بلکہ رضائے الٰہی سمجھ کر اسے اپنے حق میں نہ صرف خدائی فیصلہ سمجھے بلکہ بہترین فیصلہ جانے اور یہ کہے کہ: ''ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اُسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں!'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری زندگی میں خدا کے فیصلوں پر گہری رضامندی کا ظہور ملتا ہے۔ اور اُسی کے صلے میں انہیں بارگاہِ صمدیت

سے خوشنودی کا اعزاز ملا ہے۔ یہ اعزاز اُن ہی کا حصہ ہے۔ کیونکہ آج تو بڑے سے بڑا عابد و زاہد بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسے خدا کی خوشنودی حاصل ہے۔ اگر دعویٰ کرے گا تو دلیل کہاں سے لائے گا؟ کیونکہ اعمال کی قبولیت اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں۔ مگر جس جگہ وہ اپنی رضا دے چکا وہاں خلاف کے وقوع کا کیا سوال؟ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ (آل عمران)

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں وعدہ فرمایا ہے کہ وہ نبیوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ نبی تو خدا کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں' اُن کی رسوائی تو منطقی طور پر خارج از امکان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کے ساتھ اُس کے ساتھیوں کی رسوائی کی نفی کر کے اصحابِ رسولؐ کو عدمِ اہانت کی بشارت میں نبی کے ساتھ شریک ٹھہرا دیا ہے۔ بالفاظِ قرآنی:

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِى اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ (الحدید:۸)

''جس دن اللہ رسوا نہیں کرے گا نبی کو اور نہ ہی ان ایمان والوں کو جو اُس کے ساتھ ہیں!''

ظاہر ہے کہ جو شخص فیصلہ کے دن رسوائی سے بچ گیا وہ کامیاب ہوا اور اُس نے بڑی ہی فلاح پائی۔ صحابہؓ کے علاوہ بارگاہِ الٰہی سے اس قسم کی بشارت بجز انبیاء علیہم السلام کے کسی دوسرے کو نہیں ملی۔

یکم ذی قعدہ ۶ ہجری کو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف بقصدِ عمرہ سفر اختیار کیا۔ تقریباً ۱۵۰۰ مہاجرین اور انصار آپؐ کے ساتھ تھے' چونکہ ارادہ جنگ کا نہ تھا اس لیے کسی قسم کا سامانِ حرب ساتھ نہ لیا۔ صرف وہ ہتھیار لیے جو ایک مسافر کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچ کر سب نے احرام باندھا اور ایک شخص کو جاسوس بنا کر قریش کی خبر معلوم کرنے کے لیے آگے روانہ فرمایا۔ جاسوس نے آ کر اطلاع دی کہ قریش مکہ کو مسلمانوں کی آمد کی خبر ہو چکی ہے اور انہوں نے مقابلہ کے لیے لشکر تیار کر لیا ہے۔ نیز ان کا ارادہ ہے کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو وہ راستہ چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کیا اور حدیبیہ کے

اعزاز ہے جو رسول اکرم ﷺ کو دیا جائے گا اور آپؐ صرف ان لوگوں کے حق میں شفاعت کریں گے جن کے لیے اللہ تعالیٰ اجازت دے گا اور جن کی بخشش کرنا چاہے گا۔ آج کسی فردِ بشر کے پاس ایسا کوئی ذریعہ نہیں ہے جس سے وہ معلوم کر سکے کہ اس کے بارے میں رسول پاکؐ کو شفاعت کا اِذن دیا جائے گا۔ شفاعت کے بارے میں یہی نقطۂ نظر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا تھا۔ اسی لیے وہ لوگ ہمہ وقت نیک اعمال میں منہمک رہے اور نظریۂ شفاعت نے ان کے اندر کسی بھی درجے میں بے عملی اور کوتاہی پیدا نہیں کی' ورنہ رسول پاکؐ کے ہمہ وقت ساتھی ہونے کے ناطے وہ آپؐ کی شفاعت کے اوّلین امیدوار ہونے کی بجائے اُسوۂ حسنہ کی پیروی میں اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالتے اور مشقت اور تکلیف کے بجائے آرام و راحت کی زندگی بسر کرتے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے قبریں پختہ بنانے سے منع فرمایا۔ اس میں بھی اسی بات کی پیش بندی کی گئی ہے کہ نیک اور صالح لوگوں کی قبریں اگر باقی رہیں گی تو شخصیت پرستی کے جذبے کے تحت لوگ ان قبروں کے ساتھ وابستگی رکھیں گے اور طرح طرح کی خرافات میں لگ جائیں گے۔ اسی طرح کسی خاص قبر کی زیارت کے لیے سفر کرنا آپؐ کے اُسوۂ حسنہ میں نظر نہیں آتا۔ خود عرب کے اندر شہر جدہ میں اماں حوا کی قبر بتائی جاتی ہے مگر آپ کا جدہ کی طرف سفر بغرضِ زیارت ثابت نہیں ہے۔ آپ کی زندگی میں آپ کے بیٹے فوت ہوئے' بیٹیاں فوت ہوئیں' دیگر رشتہ دار اور دوست فوت ہوئے مگر آپؐ نے کسی کی قبر کو پختہ نہیں کیا اور نہ باقی رکھنے کی ہدایت کی۔ ہاں قبرستان میں جانا' اہل قبور کی مغفرت کے لیے دعا کرنا اور اپنی موت کو یاد کرنے کا عمل نہ صرف آپؐ سے ثابت ہے بلکہ اس کا آپؐ نے حکم دیا ہے۔

شخصیت پرستی انسان کو فریب نفس میں مبتلا کر کے شرک کی نجاست سے آلودہ کر دیتی ہے جبکہ شخصیت پرستی سے کامل اجتناب نہ صرف توحید پر پختہ یقین اور اُسوۂ حسنہ کی پیروی میں مستعدی پیدا کرتا ہے' بلکہ اُمت کے اندر افتراق و انتشار اور فرقہ پرستی کو ختم کرنے کا نہایت مؤثر ذریعہ ہے۔ فرقوں کی بنیاد عموماً مختلف نامور اشخاص کے ساتھ حد

درجہ وابستگی پر قائم ہوگئی ہے۔ جب اُمت کے تمام افرادِ اُمت کے نیک اور صالح افراد کے ساتھ یکساں وابستگی رکھیں، ان کی تحقیقات اور صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں، مگر رسول اللہ ﷺ کے سوا کسی کو مطاعِ نہ سمجھیں، یعنی واجب الاطاعت ہستی بلا اختلاف رسول اللہ ﷺ کی ہی تسلیم کریں تو جھگڑے ختم اور فرقے بھی ختم۔ اور یہی حکم اللہ تعالیٰ کا ہے:

﴿فَاِنْ تَنَازَعْتُمْ فِیْ شَیْءٍ فَرُدُّوْهُ اِلَی اللّٰهِ وَالرَّسُوْلِ﴾ (النساء:۵۹)

''پس اگر کسی معاملے میں تمہارے درمیان جھگڑا پیدا ہو جائے تو اس کو اللہ اور (اس کے) رسول کی طرف لوٹا دو''۔

یعنی قرآن حکیم اور اُسوۂ حسنہ سے اس کا حل تلاش کرو۔ پس یہی دو چیزیں اتحاد و اتفاقِ اُمت کی بنیاد ہیں۔ قولِ رسولؐ اور آیت قرآن کے مقابلے میں کسی دوسرے شخص کی تحقیق کو اہم سمجھنا نہ صرف نادانی، جہالت اور گمراہی ہے بلکہ اُمت کے اندر انتشار و افتراق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے۔ امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مشہور قول ہے کہ رسول پاکؐ کے فرمان کے مقابلے میں میری بات کو ترک کر دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ خود امام صاحب تلقین کر رہے ہیں کہ میری تحقیقات سے فائدہ تو اٹھاؤ مگر آنکھیں بند کر کے نہیں، کیونکہ قولِ فیصل میری بات نہیں بلکہ فرمانِ رسول ﷺ ہے۔ قریب قریب یہی بات اُمت کے صلحاء نے بھی کہی ہے۔ کسی نے اپنی بات کو اس انداز میں پیش نہیں کیا کہ اسے حرفِ آخر سمجھ کر قبول کیا جائے۔

اگر آج ہم صلحائے اُمت میں سے کسی ایک دو کا انتخاب نہ کریں بلکہ سب لوگوں کی تحقیق سے فائدہ اٹھائیں، جس بزرگ کے ساتھ کسی شخص کو زیادہ نسبت ہو جائے وہ دوسرے لوگوں کو اس بزرگ کے ساتھ ویسی ہی نسبت رکھنے پر مجبور نہ کرے بلکہ ان کی دوسرے بزرگوں کے ساتھ عقیدت اور محبت کو برداشت کرے تو مسلمانوں کے درمیان اتحاد و اتفاق کی طرف مثبت پیش رفت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح بزرگوں کی قبروں کے ساتھ اگر وہی معاملہ کیا جائے جو سنت مطہرہ سے ثابت ہے تو قبر پرستی کی جڑ کٹ جاتی

ہے اور یہی ہمارے لیے راہِ صواب ہے۔ آپؐ نے اپنی آخری بیماری کے دوران فرمایا کہ ''(لوگو! تم میری قبر کو صنم نہ بنانا) یہود و نصاریٰ پر خدا کی لعنت ہو کہ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنالیا تھا''۔ (رواہ البخاری)

پس آج مسلمانوں کو چاہیے کہ شخصیت پرستی اور قبر پرستی کو چھوڑ کر اُسوۂ حسنہ کو دل و جان سے فیصلہ کن تسلیم کریں اور اس کے بدلے میں اتفاق و اتحاد کی نعمت سے بھی حظ اٹھائیں اور اپنی عاقبت بھی سنوار لیں۔

مسئلہ شفاعت

مسئلہ شفاعت اُن مسائل میں سے ہے جن کی وضاحت اگرچہ قرآن پاک میں موجود ہے لیکن عام طور پر اُن کی توجیہہ غیر معقول انداز میں کی جاتی ہے۔ درحقیقت یہاں ٹھوکر صرف اُن افراد نے کھائی ہے جنہوں نے شفاعت کو عام مشاہدے میں آنے والی دُنیوی سفارش ہی کی طرح سمجھ لیا ہے جس میں ایک مقتدر آدمی کسی مجرم کی سفارش کرتا ہے اور اسے سزا سے بچالیتا ہے اور اس طرح بااثر اور مقتدر لوگوں کے ساتھ تعلقات رکھنے والے لوگ قانون کی گرفت سے بے خوف ہوکر جرائم کرتے ہیں۔ اسی قسم کی غلط فہمی یہود کے ایک گروہ کو ہوئی تھی جو ﴿نَحۡنُ اَبۡنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ﴾ (المائدۃ:۱۸) کا دعویٰ کرتے تھے اور اسی دعویٰ کو اپنی نجات کے لیے کافی سمجھتے تھے۔ اس مغضوب طبقے کے افراد کی طرح کچھ مسلمانوں نے بھی بس کلمہ طیبہ کے اقرار باللسان کو نجات کے لیے کافی خیال کر کے فرار کی راہ اختیار کر لی ہے۔ حالانکہ قرآن پاک کلمہ گو مسلمانوں سے اسلامی احکام پورے کے پورے عملاً اختیار کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَآفَّةً﴾ (البقرۃ:۲۰۸)

''اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔''

اس طرح قرآن پاک میں ایمان لانے والوں کو بھی ایمان لانے کو کہا گیا ہے' جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ زبان سے توحید و رسالت کا اقرار کرنے والو! قلب کی گہرائیوں میں کلمہ طیبہ پر یقین پختہ کرو جس کے نتیجہ میں تمہارے اعمال تقویٰ کی غربال سے چھن کر نکلیں۔ صرف یہی نہیں بلکہ کلمہ طیبہ پڑھنے والوں کو طرح طرح کی آزمائشوں سے گزارے بغیر نہیں چھوڑا جائے گا' یعنی کلمہ پڑھ کر جس عقیدہ توحید و رسالت کا انہوں نے اقرار کیا ہے' اس کی پختگی کا اندازہ مختلف امتحانات کے ذریعے کیا جائے گا۔ گویا کلمہ

طیبہ کا زبانی اقرار انسان کو قانونی طور پر مسلمان تو بنا دیتا ہے مگر اعمالِ صالحہ سے فارغ نہیں کرتا۔ ارشادِ خداوندی ہے:

﴿اَحَسِبَ النَّاسُ اَنْ يُّتْرَكُوْٓا اَنْ يَّقُوْلُوْٓا اٰمَنَّا وَهُمْ لَا يُفْتَنُوْنَ ﴿۲﴾ وَلَقَدْ فَتَنَّا الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَلَيَعْلَمَنَّ اللّٰهُ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَلَيَعْلَمَنَّ الْكٰذِبِيْنَ ﴿۳﴾﴾ (العنکبوت)

''کیا لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ وہ بس اتنا کہنے پر چھوڑ دیے جائیں گے کہ ہم ایمان لائے اور ان کو آزمایا نہ جائے گا؟ حالانکہ ہم اُن سب لوگوں کی آزمائش کر چکے ہیں جو ان سے پہلے گزرے ہیں۔ پس اللہ کو تو ضرور یہ دیکھنا ہے کہ سچے کون ہیں اور ضرور معلوم کرنا ہے کہ جھوٹے کون ہیں۔''

اسی مضمون کو قرآن پاک میں کئی جگہ مختلف پیرایوں میں بیان کیا گیا ہے جس سے بات پوری طرح واضح ہوگئی ہے۔ مثلاً:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۴۲﴾﴾ (آل عمران)

''کیا تم نے سمجھ رکھا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ گے؟ حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے جہاد میں جان لڑانے والے اور ثابت قدم رہنے والے کون ہیں۔''

معلوم ہوا کہ ہمیشہ سے اللہ تعالیٰ کا طریقہ یہی رہا ہے کہ وہ ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کی آزمائش کرتا ہے اور ظاہر ہے کہ سنت اللہ تبدیل نہیں ہوا کرتی۔ اب اس دور میں ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو آزمائش میں ڈال کر ان کے دعویٰ کی عملی صداقت کیوں نہ دیکھی جائے گی اور اُن کے زبانی اقرار کو سنت اللہ کے خلاف کیسے قبول کرلیا جائے گا؟ جبکہ تکالیف و مصائب کی بھٹیوں سے خود رسولؐ اور اصحابِ رسولؐ کو بھی گزارے بغیر نہ چھوڑا گیا۔ حکیم الامت علامہ اقبال نے آزمائش کے خوف کا اظہار اس طرح کیا ہے: ؎

چوں می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را!

اب وہ حدیث ملاحظہ ہو جس میں کلمہ گو کو جنت کی بشارت ہے۔ حضرت زید بن ارقم رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کرتے ہیں:

((مَنْ قَالَ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ مُخْلِصًا دَخَلَ الْجَنَّةَ)) قِيْلَ وَمَا اِخْلَاصُهَا؟ قَالَ:

((اَنْ تَحْجِزَهٗ عَنْ مَحَارِمِ اللّٰهِ)) (طبرانی فی الاوسط الکبیر)

''جو شخص اخلاص کے ساتھ لا الٰہ الا اللہ کہے وہ جنت میں داخل ہوگا''۔ آپؐ سے پوچھا گیا کہ کلمے کا اخلاص کیا ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ کہ وہ اسے حرام کاموں سے روک دے''۔

اس حدیث سے یہ سمجھنا کہ کلمۂ طیبہ زبان سے پڑھ لینا حصولِ جنت کے لیے کافی ہے' پرلے درجے کی نافہمی ہے۔ قولِ رسولؐ تو سورۃ العنکبوت کی محولہ بالا آیت کی سرتاسر تائید کر رہا ہے کہ نافع کلمہ صرف وہی ہے جو قائل کی زندگی میں انقلاب پیدا کر کے اسے متقی (پرہیزگار) بنا دے' یعنی وہ حرام کاموں سے پرہیز کرنے لگے۔

شفاعت کا مسئلہ بھی اسی قبیل سے ہے۔ یوں سمجھئے کہ کچھ اعمال ایسے ہیں جو کسی مسلمان کی شفاعت کا تقاضا کریں گے اور اس طرح اس کی شفاعت کی جائے گی۔ مگر اس بات کو تو اللہ ہی جانتا ہے کہ شفاعت کا اعزاز کس کو ملے گا اور شفاعت کن کے حق میں نافع ہوگی۔ اگر ہر مدعیٔ اسلام کے حق میں شفاعت کو نافع سمجھ لیا جائے تو:

﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى﴾ (الانعام:١٦٤)

''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا''۔

اور:

﴿اَلَّا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى ﴿٣٨﴾ وَاَنْ لَّيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى ﴿٣٩﴾ وَاَنَّ سَعْيَهٗ سَوْفَ يُرٰى ﴿٤٠﴾ ثُمَّ يُجْزٰهُ الْجَزَآءَ الْاَوْفٰى ﴿٤١﴾﴾ (النجم)

''کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی کا بوجھ نہیں اٹھاتا' اور انسان کے لیے وہی کچھ ہے جس کی اس نے کوشش کی۔ اور یہ کہ اس کی سعی و کوشش عنقریب دیکھی جائے گی (یا اس کو دکھا دی جائے گی)' پھر بدلہ دیا جائے گا اس کو پورا بدلہ''۔

اور:

﴿لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ﴾ (البقرۃ:٢٨٦)

''ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اُس کا پھل اُس کے لیے ہے اور جو بدی سمیٹی ہے
اُس کا وبال اسی پر ہے۔''

کے قبیل کی آیات کی نہ صرف تکذیب ہوتی ہے بلکہ اس بات سے عدلِ خداوندی پر بھی حرف آتا ہے۔ جناب رسالت مآب ﷺ کو خود وحیٔ الٰہی کے ذریعے حکم ملا کہ:

﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ﴾ (الشُّعراء)

''اور اپنے قریب ترین رشتہ داروں کو ڈراؤ۔''

اس پر جناب رسول کریم ﷺ نے اپنے دادا کی اولاد کو جمع کیا اور مخاطب کر کے فرمایا:

''اے بنی عبدالمطلب! اے عباس' اے صفیہ رسول اللہ کی پھوپھی' اے فاطمہ محمد کی بیٹی! تم لوگ آگ سے اپنے آپ کو بچانے کی فکر کر لو۔ مَیں خدا کی پکڑ سے تم کو نہیں بچا سکتا' البتہ میرے مال میں سے تم لوگ جو کچھ چاہو مانگ سکتے ہو۔'' (صحیحین)

قرآن پاک کی رو سے کفار کو تو کسی قسم کی شفاعت بھی نفع نہ دے گی۔ جب کفار دوزخ میں جھونک دیے جائیں گے تو وہ کہیں گے:

﴿وَمَآ اَضَلَّنَآ اِلَّا الْمُجْرِمُوْنَ ۞ فَمَا لَنَا مِنْ شَافِعِيْنَ ۞ وَلَا صَدِيْقٍ حَمِيْمٍ ۞﴾ (الشُّعراء)

''اور وہ مجرم لوگ ہی تھے جنہوں نے ہم کو اس گمراہی میں ڈالا۔ اب نہ ہمارا کوئی سفارشی ہے اور نہ کوئی جگری دوست۔''

اسی طرح سورۃ المدثر میں ذکر ہے کہ کافر کو کسی کی شفاعت نفع نہ دے گی:

﴿فَمَا تَنْفَعُهُمْ شَفَاعَةُ الشّٰفِعِيْنَ ۞﴾

''پس سفارش کرنے والوں کی سفارش اُن کو فائدہ نہ دے گی۔''

رہے ایمان دار لوگ تو اُن کے حق میں سفارش قبول کی جائے گی' لیکن وہ سفارش دنیا کی سفارش پر قیاس نہیں کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور جس کا جی چاہے اور جس کے حق میں جی چاہے سفارش کر دے۔ ایسی بے سر و پا سفارش احکم الحاکمین کے حضور تو گمان بھی نہیں کی جا سکتی۔ قرآن شاہد ہے کہ:

﴿مَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَّكُنْ لَّهٗ نَصِيْبٌ مِّنْهَا ۚ وَمَنْ يَّشْفَعْ شَفَاعَةً

سَیِّئَۃً یَّکُنْ لَّہٗ کِفْلٌ مِّنْھَا ط﴾ (النساء:۸۵)

''جو بھلائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا اور جو برائی کی سفارش کرے گا وہ اس میں سے حصہ پائے گا''۔

اب ایسا کون ہے جو خدا کی گرفت سے بے نیاز ہو کر مغضوب لوگوں کی سفارش کر کے اپنے آپ کو خدا کے غضب کا نشانہ بنا لے؟ اسی لیے قرآن حکیم کی تعلیم اس ضمن میں یہ ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر کوئی سفارش نہیں کر سکے گا' بلکہ سفارش کرنے والے کو بھی بارگاہِ خداوندی سے جس کے حق میں سفارش کی اجازت دی جائے گی وہ صرف اسی کے حق میں سفارش کر سکے گا۔ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ سفارش کا مطلق حق صرف ربّ العالمین ہی کو ہے۔ سورۃ الزمر میں اسی حقیقت کا بیان ہے:

﴿قُلْ لِّلّٰہِ الشَّفَاعَۃُ جَمِیْعًا ط﴾ (آیت ۴۴)

''کہہ دیجیے سفارش تو پوری کی پوری اللہ کے اختیار میں ہے۔''

قرآن کی رو سے شفاعت تو ایک قسم کا اعزاز ہے جسے ربّ العالمین اپنے بعض بندوں کو عنایت فرمائے گا' لیکن یہ اعزاز اُسی صورت میں ہے جبکہ شافع کی شفاعت کو شرفِ قبولیت بخشا جائے' مگر خدا کے بندوں میں سے کوئی عالم الغیب تو ہے نہیں جو کسی انسان کی زندگی کے تمام ظاہری و باطنی احوال و اعمال سے واقف ہو' اور اس واقفیت کی بنا پر جان لے کہ فلاں کے حق میں وہ سفارش کرے تو وہ یقیناً قبول ہو گی۔ لہٰذا عالم الغیب ہی اس بات کو جانتا ہے کہ کون شخص شفاعت کے لائق ہے' چنانچہ اُسی کے حق میں اللہ تعالیٰ اپنے اس معزز بندے کو شفاعت کا حق دے گا اور پھر اُس کی شفاعت کو شرفِ قبولیت بخش کر بھرے اجلاس میں اس عبدِ شافع کے حق میں اپنی شانِ شکوری کا اظہار فرما کر اسے سرفراز فرمائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں جہاں جہاں شفاعت کا اثبات کیا گیا ہے وہاں عموماً عالم الغیب کا اِذن ضروری قرار دیا گیا۔ سورۃ البقرۃ میں ہے:

﴿مَنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗٓ اِلَّا بِاِذْنِہٖ ط یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ وَمَا خَلْفَھُمْ ج﴾ (آیت ۲۵۵)

''کون ہے جو اُس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر سفارش کر سکے؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے اسے بھی وہ جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے اس سے بھی وہ واقف ہے۔''

پھر سورۂ طٰہٰ میں فرمایا:

﴿يَوْمَئِذٍ لَّا تَنفَعُ الشَّفَاعَةُ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَرَضِيَ لَهُ قَوْلًا ﴿١٠٩﴾ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وَلَا يُحِيطُونَ بِهِ عِلْمًا ﴿١١٠﴾﴾

''اس روز شفاعت کارگر نہ ہوگی اِلّا یہ کہ کسی کو رحمٰن اس کی اجازت دے اور اس کی بات سننا پسند کرے۔ وہ لوگوں کا اگلا پچھلا سب حال جانتا ہے اور دوسروں کو اس کا پورا علم نہیں''۔

پس شفاعت کو مشروط باذن اللہ کرنا دراصل شافعین کو اہانت سے محفوظ رکھنے اور اُن کی تکریم کو حتمی بنانے کے لیے ہے۔ کیونکہ جس طرح یہ بات شافع کے لیے حد درجہ اکرام کا باعث ہے کہ اُسے بارگاہِ خداوندی سے شفاعت کی اجازت ملے اور پھر اس کی شفاعت شرفِ قبولیت پائے' اسی طرح اگر کسی کی شفاعت میدانِ حشر میں ردّ کر دی جائے تو یہ اس کے لیے رسوائی کا باعث ہوگی۔ اس لیے شفاعت کو باذن اللہ مشروط کر کے ربّ شکور نے اپنے برگزیدہ اور نیک بندوں کے لیے میدانِ حشر میں رسوائی کے امکان ہی کو ختم کر دیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک میں جہاں جہاں بھی شفاعت کا ذکر ہے وہاں باذن اللہ کی شرط بھی لگائی گئی ہے۔ سورۃ البقرۃ اور سورۂ طٰہٰ کی مذکورہ بالا آیات کے علاوہ سورۃ الانبیاء کی آیت ملاحظہ ہو:

﴿وَلَا يَشْفَعُونَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضَىٰ وَهُم مِّنْ خَشْيَتِهِ مُشْفِقُونَ ﴿٢٨﴾﴾

''اور وہ کسی کی سفارش نہیں کرتے بجز اُس شخص کے جس کے حق میں سفارش سننے پر رحمٰن راضی ہو اور وہ اس کے خوف سے ڈرے ڈرے رہتے ہیں''۔

اس کے علاوہ سورۃ النبا میں روزِ محشر کا نقشہ اور شفاعت کا ذکر اس طرح ہے:

﴿يَوْمَ يَقُومُ الرُّوحُ وَالْمَلَائِكَةُ صَفًّا ۖ لَّا يَتَكَلَّمُونَ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَٰنُ وَقَالَ صَوَابًا ﴿٣٨﴾﴾

''وہ دن جبکہ روح اور ملائکہ سب صف بستہ کھڑے ہوں گے' ذرا بات نہ کریں گے' صرف وہی بول سکے گا جسے رحمٰن اجازت دے اور جو ٹھیک ٹھیک بات کہے۔''

فرشتے بھی بارگاہِ خداوندی میں بایں ہمہ تقرب بدون اجازت لب کشائی نہ کر سکیں گے:

﴿وَكَمْ مِّنْ مَّلَكٍ فِي السَّمٰوٰتِ لَا تُغْنِيْ شَفَاعَتُهُمْ شَيْـًٔا اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ اَنْ يَّاْذَنَ اللّٰهُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيَرْضٰى﴾ (النجم)

''اور کتنے ہی فرشتے آسمانوں میں ہیں جن کی سفارش کچھ بھی مفید نہیں ہو سکتی بجز اس کے کہ اللہ سے اجازت ملنے کے بعد کی جائے اور ایسے شخص کے حق میں کی جائے جس کے لیے وہ سفارش سننا چاہے اور پسند کرے۔''

نتیجہ اس ساری گفتگو کا یہ نکلا کہ اُصولی طور پر قیامت کا دن دوستیاں نبھانے یا سفارشیں کرنے کا نہیں ہے۔ جیسا کہ خود قرآن کہتا ہے: ﴿وَّلَا خُلَّةٌ وَّلَا شَفَاعَةٌ﴾ (البقرۃ:۲۵۴) بلکہ عدل و انصاف کا دن ہے۔ اُسی عدل کا تقاضا ہے کہ احکم الحاکمین کی بارگاہ میں غیر معمولی فرماں بردار اور برگزیدہ بندوں کو خصوصی اکرام و اعزاز سے نوازا جائے۔ چنانچہ انبیاء و رُسل اور نیک لوگوں کو بعض دوسرے افراد کے حق میں سفارش کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے گی اور اسے شرفِ قبولیت بخشا جائے گا۔ کیونکہ عالم الغیب اور شفاعت کا مطلق مختار اللہ تعالیٰ ہے اس لیے کوئی نہیں کہہ سکتا کہ کس کے حق میں سفارش کرنے کی کسی نبی یا ولی کو اجازت ملے گی۔ لہٰذا شفاعت پر بھروسہ کر کے نیک اعمال اور فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی قرآن کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے۔ بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ آیاتِ شفاعت پر غور کرنے سے یہ بات سامنے آتی ہے کہ انسان کو زندگی میں خدا اور رسول کے احکامات کی ہر قدم پر پابندی کر کے اپنے آپ کو اس کا اہل بنانے کی کوشش کرنی چاہیے کہ ربّ العزت کے ہاں سے رسول اللہ ﷺ کو اس کی شفاعت کا اذن مل جائے اور اس طرح اس کی لغزشوں اور کوتاہیوں پر ستار العیوب پردہ ڈال دے۔ گویا مسئلہ شفاعت ان قرآنی تعلیمات کا اہم جزو ہے جن میں جدوجہد اور پرہیزگاری پر زور دیا گیا ہے۔ مکافاتِ اعمال سے غفلت کا جواز کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔ وَمَا عَلَيْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ۔

مَا سَلَکَکُمْ فِیْ سَقَرَ

سورۃ المدثر میں مذکور ہے کہ حساب کتاب کے بعد جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں بھیج دیے جائیں گے تو جنتی دوزخ میں پڑے لوگوں سے پوچھیں گے کہ تمہیں کون سی چیز دوزخ میں لے گئی ؟ تو وہ جواب میں چار چیزوں کا ذکر کریں گے اور کہیں گے کہ اوّل ہم نماز نہیں پڑھا کرتے تھے۔ دوم مسکین کو کھانا نہیں کھلاتے تھے۔ سوم فضول قسم کی محفلوں میں بیٹھا کرتے تھے۔ چہارم فیصلے کے دن کا انکار کرتے تھے۔ اسی حال میں ہماری مہلتِ عمر ختم ہوگئی یعنی موت آ گئی۔ گویا وہ لوگ اپنی آپ بیتی سناتے ہوئے اقرار کررہے ہیں کہ دیگر جرائم وآثام کی نسبت یہ چاروں کام دوزخ کا مستحق بنانے کی خصوصی تاثیر رکھتے ہیں۔ اب قرآن تو آیات پر غور وفکر اور تذکر وتدبر کی دعوت دیتا ہے۔ جب کوئی قاری ان آیات پر غور کرے گا تو یہ بات سمجھ میں آئے گی کہ دوزخیوں اور جنتیوں کے مابین یہ گفتگو اُمت مسلمہ کے افراد کو دوٹوک انداز میں اسبابِ دخولِ جہنم کی نشاندہی کرتی ہے تاکہ قرآن پڑھنے والے دخولِ جہنم کے اسباب کو اچھی طرح جان لیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کرلیں' ورنہ پیمانہ لبریز ہوجانے کے بعد خدا کے حضور اپنے گناہوں کا اقرار واعتراف کچھ فائدہ نہ دے گا۔

ترکِ صلوٰۃ

جہنم میں لے جانے والی ان چار باتوں میں پہلی بات ترکِ صلوٰۃ ہے۔ نماز ارکان اسلام میں سے ایک رکن' حقوق اللہ میں سے ایک حق اور لا الٰہ الّا اللہ کے اقرار کی مظہر ہے۔ فرمان نبویؐ کے مطابق جان بوجھ کر نماز چھوڑنے والا گویا کفر کا ارتکاب کرتا ہے۔ یعنی نماز مؤمن اور کافر کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ نماز مسلمان کی شناخت ہے۔ قرآن کریم میں ہے کہ نماز قائم کرو اور مشرکوں میں سے نہ ہوجاؤ۔ آنحضرت ﷺ

نے نماز کو اپنی آنکھوں کی ٹھنڈک قرار دیا ہے۔ نماز قائم کرنے کا حکمِ خداوندی قرآن کریم میں متعدد مرتبہ آیا ہے جس سے اس کی اہمیت واضح ہے۔ پھر خود رسول پاکؐ کا طرزِ عمل ملاحظہ ہو کہ آپؐ نے پوری زندگی آخری سانس تک نماز پنجگانہ کی پابندی کی ہے' بلکہ آپؐ کو نماز کے ساتھ اس قدر الفت تھی کہ راتوں کو نفل نمازوں میں اس قدر لمبا قیام کرتے کہ پاؤں مبارک پر ورم آ جاتا۔ نماز عبد اور معبود کے تعلق کو نمایاں کرتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں کہ حالتِ سجدہ میں انسان اللہ تعالیٰ کے قریب ترین ہوتا ہے۔ غور کیجیے تارکِ صلوٰۃ معرفتِ حق تک کیسے پہنچ سکتا ہے؟ وہ رسول پاک ﷺ کی محبوب عبادت کو چھوڑ کر خدا کا پیارا کیسے بن سکتا ہے؟ خالی زبانی دعوؤں اور خوشامدی جملوں سے نہ خدا کو دھوکہ دیا جا سکتا ہے اور نہ اس کے نبی ﷺ کو۔ سچ تو یہ ہے کہ مسلمان وہی ہے جس کی پسند و ناپسند اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی پسند و ناپسند کے تابع ہو گی۔

آج دیکھیے مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد نماز کی اہمیت سے غافل ہے۔ اپنی اپنی مصروفیتوں میں نماز کو بھولے بیٹھے ہیں اور کچھ فرقہ پرست مولویوں کے طرزِ عمل کو آڑ بنا کر نماز اور مسجد سے بے تعلقی اختیار کیے ہوئے ہیں۔ وہ مولویوں کو دین کا نمائندہ سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ یہ دھوکہ ہے۔ ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ خود رسول پاک ﷺ ہیں' ہمیں ان کے نقشِ قدم پر چلنا ہے اور بس! ایسے لوگ داڑھی رکھنے' نماز پڑھنے اور شلوار کو ٹخنوں سے اونچا رکھنے کو محض قدامت پسندی اور جنونیت سمجھتے ہوئے حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ یہ غفلت بڑی خطرناک ہے۔ سورۃ المدثر کی زیرِ بحث آیات پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ دوزخی اہل ایمان میں سے ہوں گے' کیونکہ اگر کافر ہوتے تو مطلق کفر ہی کو دخولِ جہنم کا سبب بتاتے۔ مولانا مودودیؒ اس آیت کی تشریح میں لکھتے ہیں:

> ''......اس مقام پر یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ نماز کوئی شخص اس وقت تک پڑھ ہی نہیں سکتا جب تک کہ وہ ایمان نہ لایا ہو' اس لیے نمازیوں میں سے ہونا آپ سے آپ ایمان لانے والوں میں سے ہونے کو مستلزم ہے' لیکن نمازیوں میں نہ ہونے کو دوزخ میں جانے کا سبب قرار دے کر یہ بات واضح کر

دی گئی کہ ایمان لاکر بھی آدمی دوزخ سے نہیں بچ سکتا اگر وہ تارکِ نماز ہو''۔

(تفہیم القرآن' جلد ششم' ص ۱۵۴)

پس مسلمان کا کسی بھی عذر سے تارکِ صلوٰۃ ہونا انتہائی خودفریبی ہے۔ ترکِ نماز تو دور کی بات ہے' نماز کو پورے اہتمام اور تکلف سے پڑھنے کی تلقین ہے۔ غفلت اور سستی کے ساتھ ادا کردہ نماز پر بھی بڑے عذاب کی تنبیہہ کی گئی ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ خود بھی نماز پڑھیں اور اپنے گھر والوں کو بھی نماز پڑھنے کی تاکید کریں۔ دیکھئے قرآن پاک میں ہے:

﴿وَاْمُرْ اَهْلَكَ بِالصَّلٰوةِ وَاصْطَبِرْ عَلَيْهَا﴾ (طٰہٰ:۱۳۲)

''اور (اے نبیؐ!) اپنے اہل خانہ کو نماز کا حکم دیجیے اور خود بھی اس پر جمے رہیے۔''

نماز کی اس قدر اہمیت اور تاکید کے باوجود اگر کوئی مسلمان تارکِ صلوٰۃ ہو تو یہ بات اسی طرح ناقابلِ فہم ہے جس طرح کسی مسلمان کا جہنم میں پھینکا جانا سمجھ میں نہیں آتا۔

مسکین کو کھانا نہ کھلانا

اہل دوزخ اپنا دوسرا بڑا جرم مسکین کو کھانا نہ کھلانا بتاتے ہیں۔ نماز کی طرح قرآن کریم میں مسکین کو کھانا کھلانے کی تاکید بھی کئی مرتبہ بیان ہوئی ہے۔ صاحبِ حیثیت لوگوں کا فرض ہے کہ وہ مفلس اور نادار لوگوں کا خیال رکھیں' ان کی ضروریات پوری کریں' ان کی تنگدستی دور کرنے کی کوشش کریں' بھوکوں کو کھانا کھلائیں۔ رزق کی کثرت و قلت اللہ کے اختیار میں ہے' وہ کچھ لوگوں کو کشادہ روزی دیتا ہے جبکہ کچھ دوسروں کا رزق تنگ ہوتا ہے۔ پس کشادہ روزی والے نعمتوں اور آسائشوں کی فراوانی پا کر احساسِ برتری میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور غریبوں اور مسکینوں کو قابل نفرت اور حقیر سمجھنا شروع کر دیتے ہیں۔ حالانکہ قرآن کی تعلیم کے مطابق امیر لوگوں کی روزی میں ناداروں کا حصہ بھی شامل ہوتا ہے۔ اسی لیے امیروں کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ مفلسوں اور غریبوں کو اُن کا حق ادا کریں۔ اور اگر وہ یہ حق نہیں ادا کرتے تو گویا وہ حق تلفی کے گناہ کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ سورۃ الذّٰریٰت میں ہے:

﴿وَفِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾

''اور اُن کے مالوں میں سوالی اور نادار کا حق ہے''۔

اسی طرح سورۃ المعارج میں ہے:

﴿وَالَّذِيْنَ فِيْٓ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ مَّعْلُوْمٌ ۝ لِّلسَّآئِلِ وَالْمَحْرُوْمِ﴾

''اور وہ لوگ جن کے مالوں میں سائل اور محروم کا مقرر حق ہے۔''

یوں دولت مندوں پر واضح کر دیا کہ ان کے مالوں میں ضرورت مندوں کا حق شامل ہے جو انہیں ضرور ادا کرنا ہے۔ پھر سورۃ الماعون میں یومُ الدِّین کو جھٹلانے والے شخص کی نشانیاں بتاتے ہوئے کہا گیا ہے کہ وہ دوسروں کو مسکین کا کھانا دینے پر نہیں اکساتا۔ گویا دولت مندوں کو اس بات کی تلقین کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے کشادہ رزق میں سے لازمی طور پر ناداروں کا حصہ ادا کریں۔ یہاں قابلِ غور بات یہ بھی ہے کہ سورۃ الماعون میں ''اطعام المسکین'' کی بجائے ''طعام المسکین'' یعنی ''مسکین کا کھانا'' مرکب اضافی کی صورت میں آیا ہے جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ دولت مند مسکینوں کو ان کا کھانا لوٹائیں جو اُن کے پاس بطور امانت رکھا گیا ہے۔

اگر ہم اپنی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اَسلاف میں نہ صرف ضرورت مندوں کی ضرورت پوری کرنے کا جذبہ تھا بلکہ وہ دوسروں کی ضروریات کو اپنی ضروریات پر ترجیح دیتے تھے۔ سورۃ الحشر میں انصارِ مدینہ کے ایثار کا نقشہ اِن الفاظ میں کھینچا گیا ہے:

﴿وَيُؤْثِرُوْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ﴾ (الحشر:۹)

''اور وہ دوسرے ضرورت مندوں کو اپنی ذات پر ترجیح دیتے ہیں اور اگرچہ وہ خود بھوکے ہوتے ہیں۔''

یعنی رسول پاک ﷺ کے تربیت یافتہ افراد کا طرزِ عمل یہ تھا کہ وہ خود بھوکے رہ کر دوسروں کی بھوک مٹاتے تھے چہ جائیکہ اپنی ضروریات اور سہولتوں کی فراہمی میں اپنے اردگرد کے نادار اور غریب لوگوں کو نظر انداز کیا جائے۔

یہ گھاٹی عبور کرنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ نفس کا لالچ تو ہر انسان کو خود غرض بناتا ہی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّیْ ؕ﴾ (یوسف:٥٣)

''بے شک نفس تو پوری قوت کے ساتھ برائی پر آمادہ کرتا ہی ہے سوائے اس شخص کے جس پر میرے ربّ نے رحم کیا۔''

جب بھی انسان فی سبیل اللہ خرچ کرنے کا ارادہ کرے شیطان اسے مال کے کم ہونے کے خدشے میں مبتلا کر کے اس کا ہاتھ روکتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿اَلشَّیْطٰنُ یَعِدُکُمُ الْفَقْرَ﴾ (البقرۃ:٢٦٨)

''شیطان تمہیں افلاس سے ڈراتا ہے۔''

ایسے موقع پر اہل اللہ ہی نفس کو کچلنے میں کامیاب رہتے ہیں۔ اور جو اس میں کامیاب رہے بس وہی حقیقت میں کامیاب ہیں۔ از روئے الفاظِ قرآنی:

﴿وَمَنْ یُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۝﴾ (الحشر)

''اور جو نفس کے لالچ سے بچالیا گیا پس ایسے ہی لوگ فلاح پانے والے ہیں۔''

ورنہ نفس کا حملہ تو آخری وقت تک جاری رہتا ہے۔ اگر انسان ضرورت مندوں پر مال خرچ کرنے کا ارادہ کر ہی لے تو نفس نمود و نمائش کی ترغیب دیتا ہے تا کہ یہ انفاق اکارت چلا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿کَالَّذِیْ یُنْفِقُ مَالَهٗ رِئَآءَ النَّاسِ وَلَا یُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ﴾

(البقرۃ:٢٦٤)

''مانند اس شخص کے جو اپنا مال خرچ کرتا ہے لوگوں کے دکھلاوے کے لیے اور وہ نہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور نہ یومِ آخر پر۔''

یا پھر بچا کھچا اور ناقص مال خرچ کرتا ہے جو قبول نہیں ہوتا:

﴿لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ؕ﴾ (آل عمران:٩٢)

''تم ہرگز نیکی کو نہیں پا سکتے یہاں تک کہ اس شے میں سے خرچ کرو جسے تم پسند کرتے ہو۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''وہ شخص مجھ پر ایمان نہیں لایا جو خود تو پیٹ بھر کر سو جائے اور اس کے پہلو میں اس کا ہمسایہ بھوکا ہو اور اسے علم بھی ہو''۔ (معارف الحدیث' جلد ششم)

معلوم ہوا کہ بھوکے کو کھانا کھلانا انتہائی ضروری ہے۔ اسلامی نظریۂ حیات کے مطابق صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ ثروت مند لوگ غریبوں اور مسکینوں کی تضحیک وتحقیر کی بجائے ان کے ساتھ ہمدردی اور اعانت کا رویہ اپنائیں تاکہ وہ احساسِ کمتری میں مبتلا ہو کر معاشرے کا عضوِ معطل نہ بنیں' بلکہ برابری کے احساس کے ساتھ اپنی صلاحیتیں بروئے کار لاکر ملک وملت کے لیے مفید ثابت ہوسکیں۔

فضول بحث ومشاغل میں اُلجھنا

لایعنی باتوں کے پیچھے پڑنا اور فضول مشاغل میں وقت صرف کرنا بھی دخولِ جہنم کے اسباب میں سے ایک سبب ہے۔ اگر ہم سیرتِ نبویؐ کا مطالعہ کریں تو ہمیں اُسوۂ حسنہ میں ایک بھرپور عملی زندگی نظر آتی ہے جو سراسر جدوجہد اور سعی وجہاد سے پُر ہے۔ حیاتِ طیبہ کا ایک لمحہ بھی ایسا نہیں گزرا جسے بامقصد نہ گزارا گیا ہو۔ یہی اُسوۂ حسنہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنایا اور یہی صلحائے اُمت کا شعار تھا۔ اسلام میں تضییع اوقات کا کوئی تصور نہیں۔ کسی مسلمان کے پاس فالتو وقت نہیں ہوتا جس میں وہ کسی عبث کام میں الجھے۔ اہل دوزخ کہہ رہے ہیں: ﴿وَكُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَآئِضِينَ ﴾ (المدثر) ''اور ہم مشغول رہتے تھے مشغول رہنے والوں کے ساتھ''۔ اور ''خوض'' وہ مشغلہ ہے جو نتیجہ خیز نہ ہو۔ گویا جس قسم کی بھی محفل دیکھی اسی میں شامل ہو گئے' یہ نہ سوچا کہ اس مشغولیت میں کوئی دینی یا دنیاوی منفعت بھی متوقع ہے یا نہیں۔

یہ مشغولیت اگرچہ معصیت کے تحت تو نہیں آتی' لیکن مسلمان کی زندگی کے لمحات بڑے قیمتی ہوتے ہیں۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک طالب علم امتحان گاہ میں بیٹھا ہے۔ اسے محدود وقت دیا گیا ہے۔ اگر وہ طالب علم اپنے وقت سے بھرپور انداز میں استفادہ کرتا ہے اور پرچہ میں دیے گئے سوالوں کے جوابات میں پوری طرح منہمک

رہتا ہےتو اس کا نتیجہ اچھا رہے گا۔ اس کے برعکس اگر طالب علم کمرۂ امتحان میں بیٹھ کر نہ تو دھیان سے پرچۂ امتحان ہی پڑھے اور نہ ہی سنجیدگی کے ساتھ سوالات کے جوابات لکھے' بلکہ اپنی جوابی کاپی پر الٹی سیدھی لکیریں لگانے میں وقت ختم کر دے' تو ایسے طالب علم نے کارِ عبث کیا اور نتیجہ کے وقت اسے حسرت اور مایوسی کے سوا کچھ نہ ملے گا۔ حدیث نبویؐ کے مطابق دنیا آخرت کی کھیتی ہے ۔ جو کسان بوائی کے موسم میں بیج کاشت کرنے کی بجائے اِدھر اُدھر کے کاموں میں مشغول رہا وہ کٹائی کے موسم میں لازماً محروم رہے گا۔

مسلمان کو تو زندگی گزارنے کا مکمل پروگرام دیا گیا ہے' جو الفاظ کی صورت میں قرآن پاک ہے اور عمل کی صورت میں رسولِ خدا کی زندگی ہے جو سراسر حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی سے تعبیر ہے۔ حقوق اللہ میں تمام عبادات اور حقوق العباد میں تمام معاشرتی ذمہ داریاں شامل ہیں۔ کون شخص ایسا ہوگا جو عبادت کا حق بھی ادا کر چکا اور معاشرتی ذمہ داریاں بھی پوری کر چکا اور اب لغویات کے لیے بھی اس کے پاس وقت بچ گیا ہے؟ ع ''ایں خیال است و محال است وجنوں''۔

کھیل تماشے' ناچ گانے اور اسی طرح کی دوسری لغویات نفس کے لیے تو پرکشش ہیں' مگر کارِ عبث ہونے کی وجہ سے اسلام میں ان کی کوئی گنجائش نہیں۔ مسلمان کی زندگی میں وقت کاٹنے کا کوئی تصور نہیں' کیونکہ اس کی زندگی میں کرنے کے بہت اہم کام موجود ہیں جن سے مطلق خیر برآمد ہوتی ہے۔ وہ اللہ کے ذکر میں اور قرآن سیکھنے سکھانے میں مصروف رہے گا۔ پھر روزی کمانے اور اہل خانہ کی تربیت اور نگہداشت کا فریضہ ادا کرے گا۔ ملک وقوم کی بہتری اور فلاح و بہبود کے کاموں میں شرکت کرے گا۔ اس کے پاس تاش کھیلنے اور لہو ولعب کے لیے وقت ہی کہاں ہوگا!

جہالت اسلام کی ضد ہے' اس لیے کوئی مسلمان جاہل نہیں ہوسکتا۔ اسلام میں صحت کی بحالی کی خاطر سیر وتفریح اور ورزش کا تو جواز ہے' کیونکہ صحت خود بہت بڑی نعمت ہے۔ صحت ہوگی تو فرائض کی ادائیگی ہو سکے گی۔ اگر مسلمان کو سفر درپیش ہو تو وہ

﴿سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ﴾ کے حکم کے موافق چشمِ عبرت وا رکھے گا تاکہ قدرت کی نشانیاں دیکھے اور ایمان ویقین کو مزید پختہ کرے۔ اگر وہ روزی کمانے کے لیے محنت کرتا ہے تو اس لیے کہ وہ دوسروں کے لیے مفید ثابت ہو سکے' نہ صرف اپنا اور اہل وعیال کا بوجھ اٹھائے بلکہ مستحقین کی خبر گیری بھی کر سکے۔ یہ ساری مصروفیات بامقصد ہیں۔ پھر لایعنی مشاغل کے لیے اس کے پاس وقت کہاں سے آئے گا! اگر وہ فضول کاموں میں وقت لگائے گا تو اہم اور ضروری فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کرے گا اور یہی چیز اسے برے نتیجے تک پہنچائے گی۔ قرآن شریف میں مسلمان کا طرزِ عمل یہ بتایا گیا ہے کہ اگر کسی وقت اسے فضولیات کے پاس سے گزرنے کا اتفاق ہو تو وہ بڑے وقار کے ساتھ گزر جاتا ہے چہ جائیکہ خود ان لغویات اور لہو ولعب کا حصہ بن جائے۔ سورۃ الفرقان میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ لَا یَشْهَدُوْنَ الزُّوْرَ وَاِذَا مَرُّوْا بِاللَّغْوِ مَرُّوْا كِرَامًا ﴾ (الفرقان)

''اور جو لوگ شامل نہیں ہوتے جھوٹے کام میں اور جب گزرتے ہیں کھیل کی باتوں پر تو نکل جائیں بزرگانہ۔'' (ترجمہ شیخ الہند)

یعنی وہ لایعنی مجالس attend نہیں کرتے۔

علامہ قرطبی نے حضرت عکرمہؓ کے حوالے سے لکھا ہے کہ لعب کو جاہلیت میں ''زور'' کہتے تھے۔ مشہور مفسر مولانا عبدالماجد دریابادی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

''اس کے تحت زمانے کے میلے ٹھیلے' مختلف بازیوں کے جمگھٹے' ناچ رنگ کی محفلیں' تھیٹر' سینما وغیرہ داخل ہیں۔''

کیونکہ یہ تمام امور خیر سے خالی اور رغبت الی المعصیہ کا باعث بنتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُمت مسلمہ کے اکابرین' مشاہیر' ائمہ' محدثین اور صالحین کی زندگیاں اپنے اپنے دور میں رائج الوقت ہر قسم کے لہو ولعب سے یکسر پاک تھیں۔ سینما اور تھیٹر تو سلف صالحین کے وقت موجود نہ تھے مگر میلے ٹھیلے اور ناچ گانے کی محفلیں تو دورِ نبویؐ اور عہدِ صحابہ میں بھی موجود تھیں' لیکن نہ کبھی رسول اللہ ﷺ نے ان میں حصہ لیا اور نہ ہی صحابہ کرامؓ نے ان

میں شمولیت کی۔ مگر آج کے مسلمان لہو ولعب کے ان کاموں میں بڑے انہماک کے ساتھ مشغول ہیں۔ نہ صرف اس میدان میں اپنی توانائیاں پیسہ اور وقت صرف کر رہے ہیں بلکہ دوسروں کی ترغیب کا ذریعہ بھی بن رہے ہیں۔ کاش وہ قرآن پاک سمجھ کر پڑھنے کی کوشش کریں اور سورۃ المدثر کی تلاوت کے دوران دوزخیوں کی آواز ان کے کانوں تک پہنچ کر دل میں اتر جائے کہ وہ کہہ رہے ہیں:

﴿كُنَّا نَخُوضُ مَعَ الْخَآئِضِينَ﴾ (المدثر)

''مشغلہ میں رہنے والوں کے ساتھ ہم بھی مشغلہ میں پڑے رہتے تھے۔''

(ترجمہ عبدالماجد دریابادی)

ٹیلی ویژن نے رہی سہی کسر پوری کر دی ہے کہ ناچ گانے کی محفلیں ہر گھر میں پہنچ گئی ہیں۔ متقی اور صالح گھرانے بھی دانستہ یا نادانستہ ان محافل کے ''شاہد'' ہو رہے ہیں۔ چونکہ باطل امور نفس کو بہت مرغوب ہوتے ہیں اس لیے بہت جلد انسان ان کی طرف مائل ہو جاتا ہے۔ اسی انسانی کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے دورِ نبویؐ میں نضر بن الحارث مختلف ملکوں سے لٹریچر کی کتب لاتا' وہاں کے بہادروں کے افسانے اور قصے سناتا اور لوگوں کو کہتا کہ ان کو سنو اور ان میں جی لگاؤ' قرآن کے وعظ میں کیا رکھا ہے؟ اور ساتھ ہی ایک حسین و جمیل ناچنے والی لڑکی رکھتا۔ اس طرح وہ لوگوں کو اسلام اور قرآن سے دور رہنے کی ترغیب دیتا۔ اب بھی جو لوگ مسلمان ہونے کے باوجود فحاشی اور لہو ولعب کی نشر و اشاعت اور تشہیر میں لگے ہوئے ہیں وہ دشمنِ خدا و رسول نضر بن الحارث ملعون کے طریقے پر چل کر فسق و فجور پھیلا رہے ہیں' اگرچہ وہ اپنے تئیں بہت عقل مند سمجھ رہے ہوں' کیونکہ وہ اس راہ سے بین الاقوامی شہرت اور ڈھیروں دولت کما رہے ہیں۔ مگر سچ پوچھیے تو یہی لوگ انتہا درجہ کے احمق اور بے وقوف ہیں جو چند روزہ حیاتِ مستعار کی تزئین کی خاطر ابدالآباد کی حیاتِ اُخروی کے لیے عذاب در عذاب جمع کر رہے ہیں اور خوش ہو رہے ہیں۔ ﴿فَاعْتَبِرُوْا يٰاُولِی الْاَبْصَارِ﴾ (الحشر:۲)

''عبرت پکڑو اے دیکھنے والو!''

فیصلے کے دن کا انکار

اہل جنت کے پوچھنے پر اہل دوزخ جو چوتھی بات بتائیں گے وہ یہ ہے کہ:

﴿وَكُنَّا نُكَذِّبُ بِيَوْمِ الدِّيْنِ﴾ (المدثر)

''اور ہم فیصلے کے دن کا انکار کرتے تھے۔''

یوم آخرت پر ایمان اسلام کے بنیادی اور اہم ترین عقائد میں سے ہے جس کی بنا پر ہر مسلمان کا یقین ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندگی ملے گی۔ قیامت کے روز سب لوگوں کا حساب کتاب ہوگا' دنیا میں کیے گئے اعمال کی پڑتال ہوگی اور نتیجہ کے طور پر نیکوکاروں کو جنت میں جگہ ملے گی' جہاں ہرطرح کا آرام' چین اور سکھ ہوگا' جبکہ بداعمال لوگوں کو دوزخ میں ڈالا جائے گا جہاں دہکتی ہوئی آگ کا عذاب ہوگا۔

عقیدۂ آخرت کا استحضار انسان کو گناہوں سے دور رکھتا ہے جبکہ آخرت کی طرف سے عدم توجہی آدمی کو شتر بے مہار بنادیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تقویٰ کی زندگی پسند ہے اور تقویٰ یہ ہے کہ انسان دنیا میں ہر قدم پھونک پھونک کر رکھے اور محتاط زندگی گزارے اور احتسابِ آخرت کو کبھی ذہن سے محو نہ ہونے دے' تاکہ اگلی زندگی میں اس کے لیے ابدی راحت و آرام ہو اور وہ عذابِ الٰہی سے بھی بچ جائے۔ قرآن کریم میں بتایا گیا ہے:

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ﴾ (الحُجُرات:۱۳)

''بے شک تم میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سے سب سے زیادہ متقی ہے۔''

پس خدا کا محبوب بننے کے لیے تقویٰ کی زندگی بہت ضروری ہے۔ اس ضمن میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی ہمارے لیے اُسوۂ حسنہ ہے۔ آپؐ نے پوری زندگی رضائے الٰہی کے مطابق گزاری اور کبھی ذاتی خواہش کو اہمیت نہ دی۔ آپؐ کے طریقہ پر چل کر صلحائے اُمت کا بھی یہی معمول رہا۔ انہوں نے اپنی زندگیاں رضائے الٰہی کے تابع رکھیں اور یہ صرف ایمان بالآخرت سے ہی ممکن ہوا۔ جوں جوں ایمان بالآخرت میں ضعف پیدا ہوتا جائے گا توں توں اعمال میں بے احتیاطی راہ پاتی جائے گی۔ اگر عمل

کرتے وقت اس کے نتیجے کا احساس بیدار ہو تو آدمی گناہ سے بچ جاتا ہے اور نیکی کی طرف مائل ہو جاتا ہے' کیونکہ اسے معلوم ہے کہ فرمان رسول ﷺ کے مطابق دنیا آخرت کی کھیتی ہے' جو یہاں آج بویا جائے گا وہی وہاں کل کاٹنا ہوگا۔

سورۃ الحدید میں بڑی خوبصورتی کے ساتھ یومِ آخرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے' جب ایمان والے مردوں اور عورتوں کا نور اُن کے سامنے اور دائیں روشن ہوگا اور وہ اطمینان کے ساتھ اس روشنی میں چل کر جنت کی طرف رواں دواں ہوں گے۔ ان کے پیچھے منافق مرد اور عورتیں ہوں گی جو اُن کو آواز دے کر کہیں گے کہ ذرا رک جاؤ تاکہ ہم بھی تمہاری روشنی سے کچھ استفادہ کرلیں۔ اس پر اُن کو جواب ملے گا کہ ''واپس جاؤ اور روشنی لے کر آؤ''۔ اُس وقت دنیا میں واپسی تو ممکن نہ ہوگی لہٰذا ان کو یاس وحسرت کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا اور بالآخر وہ جہنم میں ڈال دیے جائیں گے۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہوں نے دنیا کی زندگی فکر آخرت کے بغیر گزاری' من مانی کی' خواہشِ نفس کے غلام بنے رہے' ''بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' پر عمل پیرا رہے' دنیا کمانے اور سجانے کی دوڑ میں اپنا سارا وقت اور توانائی خرچ کر ڈالی اور کبھی نہ سوچا کہ فیصلے کے دن ہمیں روشنی کی ضرورت پڑے گی۔ یہی لوگ ہیں جو عملی طور پر یومِ آخرت کے انکاری رہے۔

سورۃ المنافقون کے اخیر میں بتایا گیا ہے کہ غیر محتاط زندگی گزارنے والوں کو جب اپنا انجام معلوم ہو جائے گا تو وہ خواہش کریں گے کہ اللہ تعالیٰ انہیں تھوڑی مدت کے لیے دوبارہ واپس دنیا میں بھیج دے تو وہ بہت خیرات کریں گے اور نیکوکار بن جائیں گے۔ مگر افسوس کہ اللہ تعالیٰ ان کو موقع نہ دے گا' کیونکہ ان کی موت کے ساتھ مہلتِ عمر بیت چکی۔ اور اسی حسرت ویاس کی حالت میں ان کو آگ کے عذاب میں جھونک دیا جائے گا۔

ہر طرزِ عمل کا انجام قرآن کریم میں کھول کھول کر بیان کر دیا گیا ہے' مگر فکرِ آخرت کو نظر انداز کرنے سے انسان کی آنکھوں کے سامنے پردہ آجاتا ہے جس سے وہ بدعملی کا واضح انجام نہیں دیکھ سکتا اور برائیوں میں آگے بڑھتا جاتا ہے۔ آج جو ہر طرف برائیوں

کا دور دورہ ہے اس کی بڑی وجہ یہی عقیدۂ آخرت کی کمزوری ہے۔ بلاشبہ ہر مسلمان آخرت پر یقین رکھتا ہے مگر یہ یقین نظریے کی حد تک رہ گیا ہے عملی طور پر وہ دنیا کی چمک دمک پر فریفتہ ہو کر عقیدۂ آخرت کا انکاری ہو چکا ہے۔ ورنہ مسلمان اور یہ بدعملی؟ کون سا جرم اور گناہ ہے جو اِس وقت نہیں ہو رہا؟ قاتل کی سزا جہنم ہے مگر بے گناہوں کے گلے کون کاٹ رہا ہے؟

یومِ آخرت کا ذکر قرآن پاک میں جابجا موجود ہے' مگر خود قرآن پاک کی تلاوت کرنے والوں میں کتنے ہیں جن کو فکرِ آخرت دامن گیر ہے؟ قرآن کی ایک یاد دہانی ملاحظہ ہو:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَلْتَنْظُرْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ لِغَدٍ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰىهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝ لَا يَسْتَوِيْٓ اَصْحٰبُ النَّارِ وَاَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۭ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ۝﴾ (الحشر)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کا تقویٰ اختیار کرو' اور چاہیے کہ ہر شخص دیکھ لے کہ کل کے لیے کیا آگے بھیجتا ہے' اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بے شک اللہ تعالیٰ جانتا ہے جو تم کرتے ہو۔ اور تم ان لوگوں کی مانند نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا' پھر اللہ نے ان کو خود ان کے جی بھلا دیے' وہی لوگ فاسق ہیں۔ نہیں برابر آگ والے اور جنت والے' رہے جنت والے تو وہی ہیں مراد پانے والے۔''

ہوش مندی کا تقاضا ہے کہ آخرت پر ایمان لانے والے انجام کار کی پشیمانی' پچھتاوے' حسرت اور عذابِ جہنم سے بچنے کے لیے قرآن پاک کی آفاقی تعلیمات پر عمل کرتے ہوئے رسالت مآب ﷺ کے اُسوۂ حسنہ کو ہر وقت پیش نظر رکھیں۔ دوسری شخصیات کے کردار کی جانچ کے لیے بھی اُسوۂ حسنہ ہی کو معیارِ حق سمجھیں' ورنہ رسول پاک ﷺ کے آستانہ کو چھوڑ کر دوسری ''بڑی'' شخصیات کو محبوب بنانے کا نتیجہ تو بس محرومی اور ناکامی ہی نکلے گا۔ قرآن پاک ایسے لوگوں کی حالت زار اس طرح بیان کرتا ہے:

﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِي اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا ۝ يٰوَيْلَتٰى لَيْتَنِيْ لَمْ اَتَّخِذْ فُلَانًا خَلِيْلًا ۝ لَقَدْ اَضَلَّنِيْ عَنِ الذِّكْرِ بَعْدَ اِذْ جَآءَنِيْ ؕ وَكَانَ الشَّيْطٰنُ لِلْاِنْسَانِ خَذُوْلًا ۝ وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا ۝﴾ (الفرقان)

''اُس دن ستم گر شخص اپنے ہاتھوں کو چبا چبا کر کہے گا: ہائے کاش کہ میں نے رسولؐ کی راہ لی ہوتی! ہائے افسوس' کاش کہ میں نے فلاں کو دوست نہ بنایا ہوا ہوتا! اس نے تو مجھے الذکر (یعنی قرآن) سے گمراہ کر دیا اس کے بعد کہ وہ میرے پاس آ پہنچا تھا۔ اور شیطان انسان کو وقت پر دغا دینے والا ہے۔ اور رسولؐ کہے گا: اے میرے پروردگار! بے شک میری اُمت نے اس قرآن کو چھوڑ رکھا تھا۔''

وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ

ذکر کا مطلب ہے اللہ کی یاد۔ اللہ تعالیٰ جو ساری کائنات کا خالق و مالک ہے اس قابل ہے کہ اسے ہمہ وقت یاد کیا جائے اور یاد رکھا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر زبان سے بھی ہے اور عمل سے بھی۔ اس دور کے بعض مادہ پرست ذہن جنہیں روحانی بالیدگی میسر نہیں ہے' کہہ اٹھتے ہیں کہ زبان سے اللہ کا ذکر چہ معنی دارد؟ مگر یہ ان کی غلط فہمی ہے' کیونکہ صرف زبان سے اللہ کا ذکر بھی اعلیٰ درجہ کی تاثیر کا حامل ہے۔ اگر اسے مادی مثال سے ہی سمجھنا ہو تو ایک سنگلاخ چٹان پر پانی کا قطرہ قطرہ گرتے دیکھئے۔ یہ قطرہ بظاہر نہایت کمزور' حقیر اور ملائم سی چیز ہے' مگر جب یہ لگاتار ایک مدت تک ایک ہی جگہ گرتا رہے تو سنگلاخ چٹان میں سوراخ کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ بعض اوقات بظاہر چھوٹا سا عمل پیہم مشق سے حیرت انگیز نتائج پیدا کرتا ہے اور پھر ذکر اللہ تو چھوٹا عمل بھی نہیں۔ خالق کائنات نے قرآن پاک میں اللہ کے ذکر کو سب چیزوں سے بڑا قرار دیا ہے' ملاحظہ ہو سورۃ العنکبوت ﴿وَلَذِكْرُ اللّٰهِ اَكْبَرُ ﴾ (آیت ۴۵) ''اور اللہ کا ذکر تو سب سے بڑی چیز ہے''۔

کہتے ہیں کہ قیامت کے دن جنتیوں کے لیے سب سے بڑی نعمت دیدارِ الٰہی ہوگا۔ اس میں ایسی لذت ہوگی کہ ناظرین رؤیت باری تعالیٰ سے نظر اِدھر اُدھر کرنا گوارا نہ کریں گے۔ بھلا اس ہستی کا ذکر بے اثر ہو سکتا ہے؟

دنیا میں ہمیں کسی شخص سے اس کے باکمال ہونے یا باکردار ہونے کی وجہ سے محبت پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ مشاہدہ ہے کہ جب کسی محفل میں ہماری اس پسندیدہ شخصیت کا ذکر ہو گا تو ہماری دلچسپی اس میں بڑھتی جائے گی۔ نیز ہم کسی محفل میں بیٹھے ہوں تو ہمارا دل چاہے گا کہ کسی نہ کسی طور اپنی محبوب شخصیت کا تذکرہ شروع کریں' یعنی اس کا ذکر اپنے

احباب کے سامنے کریں۔ یہی تو ذکر ہے۔ بلکہ ایک شخص کو ایک خاص فن محبوب ہے، وہ اس فن کا شیدائی ہے تو اپنے محبوب فن کا ذکر اور تذکرہ اس کے لیے دلچسپی کا باعث ہوگا۔

اب سمجھئے کہ انسان کو اشرف المخلوقات بنانے والا کون ہے؟ اسے موزوں قد و قامت، حسین شکل وصورت، ذہنی اور دماغی صلاحیتیں جن سے وہ کائنات کو مسخر کرنے کے قابل ہوا، کس نے دیں؟ اللہ نے۔ تو بس جو شخص کائنات کی اس اشرف صنف یعنی بشریت سے تعلق رکھتا ہے اس کا سب سے بڑا محسن اللہ تبارک وتعالیٰ ہے اور محسن کے سامنے اظہارِ نیازمندی اخلاق کی ایک معروف خوبی ہے۔ محسن کے ساتھ محبت اور لگاؤ فطرتِ سلیمہ کا مسلمہ تقاضا ہے۔ اگر کوئی شخص انسانیت سے عاری نہ ہو تو اللہ کے ساتھ اس کی انتہائی محبت عالمگیر سچائی کا درجہ رکھے گی۔ اسی حقیقت کو قرآن شریف میں اس طرح بیان کیا گیا ہے کہ جو لوگ ایمان والے ہیں ان کو سب سے زیادہ محبت اللہ کے ساتھ ہے۔ دیکھئے سورۃ البقرۃ:

﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۶۵)

''اور بعض لوگ وہ ہیں جو بناتے ہیں اللہ کے برابر اوروں کو۔ ان سے محبت ایسی رکھتے ہیں جیسی محبت اللہ کی، اور ایمان والوں کو اس سے کہیں زیادہ ہے محبت اللہ سے''۔

ظاہر ہے کہ خدا کی محبت اسی کو ہوگی جو حق شناس اور حقیقت آشنا ہوگا۔ پھر انبیائے کرام علیہم السلام فہم وبصیرت، عقل وسمجھ، حق شناسی اور حقیقت آشنائی کی معراج پر ہوتے ہیں۔ چنانچہ ان کی زندگیوں کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کی محبت کا مرکز ومحور ذاتِ الٰہی اور دن رات کا وظیفہ ذکرِ الٰہی ہوتا تھا۔ چونکہ انبیاء ورُسل مقصدِ حیات سے آگاہ تھے اسی لیے انہوں نے نہ صرف خود اللہ کے ذکر کو ہمہ وقت کا معمول بنایا بلکہ نصح و خیرخواہی کے جذبے کے تحت تمام انسانوں کو بھی ذکرِ الٰہی کی طرف دعوت دی۔ ایک شخص کو جس چیز کی معرفت ہوگی وہی اس کی قدر کر سکے گا ع قدرِ گوہر شاہ داند یا بداند گوہری!

ایک ہی چیز کی مختلف اشخاص کے ذہنوں میں قدر و قیمت مختلف ہوگی' یعنی افراد کو اس شے کی معرفت کے تناسب سے ہی قدر ہوتی ہے اور ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معرفت سب سے زیادہ انبیاء و رُسل کو ہوتی ہے' چنانچہ وہی اس عظیم الشان ہستی کے صحیح قدر دان ہوتے ہیں اور ہمیشہ ذکر الٰہی میں مشغول نظر آتے ہیں۔

چونکہ انسان کا محسنِ اعظم اللہ تبارک و تعالیٰ ہے لہٰذا شدید ترین محبت اسی کا حق ہے۔ اگر کوئی شخص محسنِ حقیقی کو چھوڑ کر شدید ترین محبت کا حق کسی دوسرے کے لیے تسلیم کرتا ہے تو یہ سب سے بڑی حماقت ہے اور اسی کو شرک کہتے ہیں اور یہ بدترین گناہ ہے جو اللہ کے غضب کو بھڑکاتا ہے۔ دنیا میں ہم صاحبِ کمال لوگوں سے ان کی صلاحیتوں کے مظاہرے پر متأثر ہوتے ہیں اور ان کی محبت اور کشش کا پیدا ہو جانا بھی فطری امر ہے' مگر یہ حقیقت کبھی نظر سے اوجھل نہیں ہونی چاہیے کہ ان صاحبِ کمال لوگوں کی یہ صلاحتیں اسی خدائے واحد کی عطا کردہ ہیں جس کے قبضہ میں عزت دینا اور ذلت دینا ہے۔ یہ صلاحیتیں کسی کی ذاتی نہیں ہیں' بلکہ خدا کی عطا کردہ ہیں۔ وہ کسی کو صلاحیت دے بھی سکتا ہے اور چھین بھی سکتا ہے۔ اگر یہ حقیقت انسان کو مستحضر رہے تو اس کے جادۂ حق سے بھٹکنے کا امکان ختم ہو جاتا ہے۔

اللہ کا ذکر روح کی غذا اور قلب کی تسکین ہے۔ اس کی لذت سے وہی شخص آشنا ہے جسے اس کا تجربہ ہے۔ ذکر اللہ کا سب سے بڑا مظہر خود قرآن پاک یعنی کلامِ الٰہی ہے' اسے ''الذکر'' کہا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو سورۃ الحجر:

﴿اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ﴾

''بے شک ہم نے ہی اس ذکر (یعنی قرآن) کو نازل کیا اور ہم ہی اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔''

گویا قرآن پاک سراسر ذکر ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمان قرآن کی عظمت کے کماحقہ قائل تھے۔ ان کے ہاں بہترین مشغولیت قرآن کا سیکھنا اور سکھانا تھا۔ بخاری شریف میں حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ))

''تم میں سب سے بہتر وہ ہے جو قرآن کا علم حاصل کرے اور دوسروں کو اس کی تعلیم دے''۔

یہی قرآن سینوں کی بیماریوں یعنی اخلاقی کمزوریوں کا علاج ہے۔ دیکھئے سورۂ یونس:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُمْ مَّوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِي الصُّدُوْرِ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾

''اے لوگو تمہارے پاس نصیحت آئی ہے تمہارے ربّ کی طرف سے اور یہ شفا ہے اس کے لیے جو سینوں میں ہے اور ہدایت اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے''۔

نیز دیکھئے سورۂ بنی اسرائیل:

﴿وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ﴾ (آیت ۸۲)

''اور ہم نے اتارا قرآن جو شفا اور رحمت ہے ایمان والوں کے لیے۔''

اللہ کے ذکر سے طمانیتِ قلبی نصیب ہوتی ہے۔ دیکھئے سورۃ الرعد:

﴿الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَتَطْمَئِنُّ قُلُوْبُهُمْ بِذِكْرِ اللّٰهِ ۭ اَلَا بِذِكْرِ اللّٰهِ تَطْمَئِنُّ الْقُلُوْبُ ﴿٢٨﴾﴾

''وہ لوگ جو ایمان لائے اور چین پاتے ہیں ان کے دل اللہ کی یاد سے۔ سنتا ہے! اللہ کی یاد سے ہی چین پاتے ہیں دل۔''

علاوہ ازیں سنن بیہقی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''بنی آدم کے قلوب پر اسی طرح زنگ چڑھ جاتا ہے جس طرح پانی لگ جانے سے لوہے پر زنگ آجاتا ہے''۔ عرض کیا گیا: حضور صلی اللہ علیہ وسلم! دلوں کے اس زنگ کے دور کرنے کا ذریعہ کیا ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''موت کو زیادہ یاد کرنا اور قرآن کی تلاوت!''

بات ہو رہی ہے اللہ کے ذکر کی۔ تو قرآن میں نماز کو بھی اللہ کا ذکر کہا گیا ہے۔ دیکھئے سورۂ طٰہٰ:

﴿اِنَّنِيْٓ اَنَا اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّآ اَنَا فَاعْبُدْنِيْ ۙ وَاَقِمِ الصَّلٰوةَ لِذِكْرِيْ ﴿١٤﴾﴾

''بیشک میں اللہ ہوں' کوئی معبود نہیں سوائے میرے' پس میری عبادت کرو اور
قائم کرو نماز میرے ذکر کے لیے۔''

قرآن پاک میں ہے کہ ہر حال میں اللہ کا ذکر کرتے رہو۔ دیکھئے سورۃ النساء:

﴿فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِكُمْ﴾ (آیت ۱۰۳)

''اللہ کا ذکر کرو کھڑے' بیٹھے اور اپنے پہلوؤں کے بل لیٹے۔''

ترمذی شریف کی روایت کے مطابق آنحضرت ﷺ نے ذکر اللہ کو ''افضل الاعمال'' فرمایا ہے:

''حضرت عبداللہ بن بسرؓ سے روایت ہے کہ ایک اعرابی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوچھا: یارسول اللہ! آدمیوں میں کون بہتر ہیں؟ آپؐ نے فرمایا: ''جن کی عمر زیادہ ہو اور عمل اچھے ہوں''۔ پھر اس نے پوچھا: اعمال میں کون سا عمل بہتر ہے؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ کہ تم دنیا سے رخصت ہو اور اس وقت تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر ہو''۔

ظاہر ہے کہ یہاں زبان کے ذکر ہی کی فضیلت بیان ہوئی ہے۔

اللہ کے ذکر یعنی اس کی حمد وثنا کے لیے موزوں ترین کلمات کون سے ہیں؟ اوّل تو قرآنی آیات ہیں جو ذکر کا اوّلین مصداق ہیں' کیونکہ قرآن تو ہے ہی الذکر' دوسرے وہ جملے جو حدیث کی کتابوں میں آنحضرت ﷺ کے تعلیم کردہ ہیں' اصلاً وہ بھی آیاتِ قرآنی سے ماخوذ ہیں' مثلاً تسبیح' تحمید' تمجید' تکبیر' تہلیل' استغفار وغیرہ۔

جہاں تک اوقاتِ ذکر کا تعلق ہے تو ذکر الٰہی کے لیے ہر وقت موزوں ہے' البتہ خصوصی طور پر صبح وشام کے اوقات اور فراغت کا کوئی بھی وقت مناسب ہے۔ جس طرح ہر کام کے لیے کچھ پیشگی شرائط ہوتی ہیں جو اس کام کے مثبت نتائج کے لیے لوازم کا درجہ رکھتی ہیں اسی طرح ذکر اللہ کے لیے بھی کچھ لوازمات ہیں۔ اوّل زندگی کے معمولات معصیت سے پاک ہوں' یعنی خشیت الٰہی کا عنصر اقوال وافعال میں نمایاں ہو۔ دوم رزق حلال کا اہتمام اور آخری بات یہ کہ ذکر اللہ میں خلوص ہو اور یہ معمولی سی ریاکاری اور ادنیٰ سی نمائش سے بھی پاک ہو اور اس کا مقصد صرف حصولِ رضائے الٰہی ہو اور بس!

كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ

بدعت کا لفظی معنی نئی چیز' ایجاد اور انوکھے کے ہیں' لیکن اسلامی اصطلاح میں یہ لفظ ایسے امور پر بولا جاتا ہے جو دین میں نئے نکالے گئے ہوں۔ اُمور دین میں ہر قسم کے اضافے کو مذموم قرار دیا گیا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی دُنیوی زندگی کے آخری ایام میں تکمیل و اتمامِ دین کی خوشخبری سنا کر یہ بات بالکل واضح کر دی گئی کہ اُمور دین میں اب کسی قسم کی کوئی خامی باقی نہیں رہی' بلکہ دین تکمیل اور اتمام کے درجے کو پہنچ چکا ہے۔ مشاہدہ بھی یہی بتاتا ہے کہ درجۂ کمال صرف ایک ہی ہوتا ہے جو کمی بیشی کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ جس طرح کمی درجۂ کمال میں نقص پیدا کرتی ہے اسی طرح اضافہ بھی قصور پیدا کرتا ہے' کیونکہ جس شے میں اضافے کو قبول کرنے کی گنجائش موجود ہو وہ کامل نہیں ہو سکتی۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

> ''جس نے ہمارے اس دین میں کوئی نئی بات نکالی جو اس میں نہیں ہے پس وہ مردود ہے''۔ (رواہ بخاری و مسلم)

حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ پیش بندی نہ کی جاتی تو دین مشکل سے مشکل تر ہوتا جاتا اور اس میں تکمیلی شان بھی باقی نہ رہتی' جو چاہتا حسن و خوبی کے نام پر اس میں اضافہ کرتا اور یہ اضافے اصل دین کا اسی طرح حلیہ بگاڑ دیتے جس طرح یہود و نصاریٰ نے تورات و انجیل کی تعلیمات کا ستیاناس کیا۔

دین کا پورا نظام عہد رسالت کے آخری ایام میں جاری و ساری ہو گیا اور پھر خلافت راشدہ کے دور میں بھی رائج رہا۔ اگر دورِ صحابہؓ میں چند چیزیں دین میں اضافہ معلوم ہوتی ہیں تو ان کی حقیقت یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے باہمی مشورے سے کسی کام کو منشأ رسالت سمجھا اور یہ بھی جانا کہ عہد رسالت میں اس کی ترویج میں کیا چیز حائل تھی'

چنانچہ اس کو رائج کیا۔ ایسے امور کو اوّل تو ہم اس لیے بدعت نہیں کہتے کہ صحابہ کرامؓ مزاج شناسِ رسول تھے۔ یہ بات محال ہے کہ وہ کسی بدعت پر اجماع کرتے۔ دوم اس لیے کہ خود رسول پاک ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طریق کار کو اپنی سنت اور اُمت کے لیے قابلِ تقلید قرار دیا ہے۔ آپ ؐ نے فرمایا تم پر میری سنت اور میرے خلفائے راشدین کی سنت کو اختیار کرنا لازم ہے۔ مثال کے طور پر تراویح کا نظام نہ عہد رسالت میں رائج تھا اور نہ ہی عہد صدیقی میں۔ مگر حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے اپنے عہد خلافت میں نماز تراویح کا نظام قائم کر دیا جس پر تمام صحابہ کا اجماع ہوا اور کسی نے مخالفت نہ کی اور اُمت نے اس کو سنت کے طور پر اپنایا۔ نظامِ تراویح کی ترویج کے ضمن میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے یہ بات بالکل واضح تھی کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں رمضان شریف کی راتوں میں عبادت نہایت پسندیدہ ہے' نیز یہ کہ نظامِ تراویح کے قیام سے آنحضرت ﷺ کو اس بات کا قوی امکان تھا کہ یہ عبادت اپنی عظمت کی وجہ سے فرضیت کے درجے میں آ جائے گی اور یہ بات اُمت کے عام افراد پر بھاری ہوگی۔ دورِ رسالت کے اختتام پر سلسلۂ وحی بند ہو جانے کے باعث رمضان کی راتوں کے قیام کا فرض ہونا ممکن نہ رہا تو امیر المؤمنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے جملہ صحابہ کرامؓ کے مشورے سے رسول پاک ؐ کی پسندیدگی کے باعث اور حصولِ رضائے خداوندی کے لیے نظامِ تراویح کو رائج کر دیا۔ وگرنہ عہد صحابہ میں بدعت کی روک تھام کا پورا انتظام کیا گیا اور کسی ایسی بات کو دین میں داخل نہ ہونے دیا گیا جس کی نظیر عہد رسالت میں نہ ملتی ہو۔ کیونکہ اس ضمن میں جب لوگوں نے بیعت رضوان والے ببول کے درخت کا احترام کرنا اور زیارت کے لیے جانا شروع کر دیا تو حضرت عمر فاروق ؓ نے اس درخت کو جڑوں سمیت اُکھاڑ پھینکا کہ مبادا اس طرح کوئی بدعت رواج پا جائے۔

حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''سب سے بہتر بات خدا کی کتاب اور بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے' اور بدترین کام وہ ہیں جن کو دین میں نیا نکالا گیا ہو' اور ہر بدعت (یعنی دین میں نئی

نکالی ہوئی چیز) گمراہی ہے''۔ (رواہ مسلم)

جو لوگ بدعت کی برائی میں لچک پیدا کرتے ہیں اور حسنِ ظن اور حسنِ نیت کی دلیل پیش کرتے ہیں ان کا خیال صحیح نہیں' کیونکہ بدعت تو کہتے ہی اس کام کو ہیں جو دین کا کام سمجھ کر اور حصولِ رضائے الٰہی کے لیے اختیار کیا جائے' لیکن اس کی مثال سنت میں نہ ملتی ہو۔ کیونکہ دین میں نئی چیز کا اطلاق اس چیز پر تو ہو نہیں سکتا جس میں فی نفسہ برائی موجود ہو۔ بلکہ برائی کی تو دین میں سرے سے گنجائش ہی نہیں رکھی گئی۔ البتہ بزعمِ فکر انسانی دین میں اچھائی کے اضافے کا امکان موجود تھا جسے آنحضرت ﷺ نے پوری صراحت کے ساتھ ختم کر دیا' تا کہ دین اپنی اصلی صورت میں اور تکمیلی شان کے ساتھ قائم رہے۔

اسلامی ممالک میں عام طور پر اور برصغیر میں خاص طور پر جن بدعات کو اختیار کیا گیا ہے' ان کے پیچھے بھی حبِ رسول ؐ اور حصولِ رضائے الٰہی کے جذبے کا دعویٰ کیا جاتا ہے' لیکن اس بات کو فراموش کر دیا جاتا ہے کہ حبِ رسول اور رضائے الٰہی کی بہترین صورت تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اختیار کر رکھی تھی۔ اگر حبِ رسول ؐ اور حصولِ رضائے الٰہی کے کچھ تقاضے ان بدعات کو اپنا کر پورے کیے جا رہے ہیں جو صحابہ کے دور میں رائج نہ تھیں تو اس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اسلام میں نعوذ باللہ خامی لازم آتی ہے جو محال ہے' کیونکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت کے طرزِ عمل کو نبی پاک ﷺ نے قابلِ اعتماد جانا ہے اور خدائے بزرگ و برتر نے اس طائفہ کی تعریف کی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے حبِ رسول ؐ اور دینی استقامت کے تقاضے پورے کرنے کے لیے چھوٹی سے چھوٹی سنت کو مضبوطی سے پکڑا اور عملاً اختیار کیا۔ انہوں نے پوری زندگی قرآن و سنت کے مطابق بسر کی' البتہ حبِ رسول اور دینی استقامت کی نمائش کے لیے جلوس اور میلاد کی محافل منعقد نہ کیں۔ ذکرِ نبی ؐ تو خود خدا نے بلند کر دیا جو عہدِ رسالت' عہدِ صحابہ اور موجودہ دور میں بھی بلند ہی ہے اور بلند رہے گا' لیکن اگر بلند بانگ نعروں' بے ہنگم اجتماعات' پر از تعصب مجالس اور نمائشی جلسوں سے وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ کا تقاضا پورا ہوتا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ تقاضا نہ عہدِ رسالت میں پورا ہوا نہ عہدِ صحابہ میں۔ لہٰذا تسلیم کرنا پڑے گا کہ استقامت فی الدین کے

تقاضے جس طرح جماعت صحابہؓ نے پورے کیے وہی جامع اور مکمل ہیں۔ آج بھی اگر حبِ رسولؐ اور رضائے الٰہی کے جذبہ کے تحت بدعات کو رواج دینے والے لوگ اپنے دیگر امور میں تابع سنت نظر آئیں تو ان کے جذبے کو حسنِ ظن کے تحت لانے کا جواز پیش کیا جا سکتا ہے' لیکن جب ان نمائشی محافل میں اکثریت بےعمل بلکہ بدعمل لوگوں کی ہوتی ہے جو نماز کی پابندی' وعدے کی پاسداری' اخلاق کی بلندی' کسب رزقِ حلال کی اہمیت سے بھی بےخبر ہوتے ہیں تو ایسے لوگوں کو کسی نمائشی جلوس میں نعرے لگاتے دیکھ کر اللہ کا نبیؐ اور خود خدائے علیم وخبیر تو دھوکہ نہیں کھا سکتے' البتہ بےشعور لوگوں میں وہ اپنے عاشقِ رسول ہونے کا رعب جما سکتے ہیں۔

اصل بات تو یہ ہے کہ دین میں شامل تمام امور کے تقاضے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے بطریق احسن پورے کر دیے اور اُمت کی راہنمائی کر دی۔ اب دین میں کسی امر کا اضافہ خواہ وہ کتنی ہی حسن نیت اور حصولِ رضائے الٰہی کے لیے ہو' قابل قبول نہیں۔ قرآن پاک کی سورۃ الحدید کے آخری رکوع میں مذکور ہے کہ نصاریٰ نے گناہوں سے بچنے اور حصولِ رضائے الٰہی کی خاطر ترکِ دنیا کی بدعت اختیار کی جو اللہ تعالیٰ نے ان پر لازم نہ کی تھی' چنانچہ وہ اس کو نباہ نہ سکے۔ معلوم ہوا کہ گناہوں سے بچنے اور رضائے الٰہی کے حصول کے لیے وہ کوشش اور طرزِ عمل بھی بدعت ہے جو شارع نے دین میں شامل نہ کیا ہو۔ اگرچہ گناہوں سے بچنا اور حصولِ رضائے الٰہی امر محمود ہے' مگر کوئی بات بھی محمود نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس کا طریقہ تعلیماتِ نبویؐ کے مطابق نہ ہو۔ تین دن کے بھوکے کو روزے کا ثواب نہ ملے گا مگر سنت نبویؐ کے مطابق چند گھنٹے کا روزہ مقبول ومبرور اور کارِ ثواب ہوگا۔

حدیث پاک میں بار بار کتاب وسنت پر انحصار کرنے کی تعلیم دی گئی ہے۔ حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''پس تم میں سے جو شخص میرے بعد زندہ رہے گا وہ اختلافِ کثیر دیکھے گا۔ ایسی حالت میں تم پر لازم ہے میرے اور میرے خلفائے راشدین المہدیین کا

طریقہ۔تم اس کے ساتھ چمٹ جاؤ اور اس کو دانتوں سے مضبوط پکڑے رہو۔ اور تم دین میں نئی باتیں پیدا کرنے سے بچو' اس لیے کہ ہر نئی بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔ (رواہ ابوداؤد و ترمذی)

حبِ رسول اور حصولِ رضائے الٰہی کا مسنون طریقہ تو یہ ہے کہ اُسوۂ حسنہ کو اپنایا جائے۔اظہارِ دین کے پیغمبرانہ مشن کو پورا کرنے میں کوشش کی جائے۔مسلمانوں میں اتفاق واتحاد پیدا کر کے ناقابلِ شکست قوت بنا دیا جائے۔اگر یہ بات نہیں ہے تو تمام نمائشی اور اضافی امور بے معنی اور فریبِ محض ہیں کیونکہ اگر ہم حبِ رسول اور استقامت چاہتے ہیں تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل سے اچھی مثال کہیں اور سے نہیں مل سکتی۔

دین اسلام خالق کائنات کا مرتب کردہ دین ہے اور انسانوں کے لیے ہے جنہیں خود اس علیم وخبیر نے بنایا ہے لہٰذا اس دین کا کامل ہونا واضح ہے اگر غور کیا جائے تو اس کی ہر بات میں تکمیلی شان نظر آتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ دین اسلام نے دوسرے ادیان باطلہ کی کسی چیز کو اخذ نہیں کیا بلکہ دوسرے ادیان اور نظاموں نے دین اسلام سے بہت سی باتیں اخذ کیں لیکن یہ دین اسلام کے پیروکاروں کا زوال اور دین کی تکمیلی شان سے بے خبری ہے کہ ان کو دوسرے نظاموں میں حسن اور کشش نظر آنے لگی۔برصغیر میں ہندو اور مسلمان سینکڑوں سال ساتھ ساتھ رہے۔ہندو اپنے ایک تہوار پر اپنی عمارات پر روشنی کرتے تھے مسلمانوں نے بھی ایک تہوار ایجاد کر لیا اور اپنی عمارتوں پر چراغاں کے علاوہ آتش بازی کا مظاہرہ بھی کرنا شروع کیا وہ یہ بات بھول گئے کہ دین اسلام تو فضول خرچی اور ریاکاری (نمود ونمائش) سے روکتا ہے۔عیسائیوں نے یومِ ولادتِ مسیحؑ پر جشن کا اہتمام کیا مسلمانوں نے ان کی نقالی کی اور لغویات میں نصاریٰ کو پیچھے چھوڑ گئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جس طرح عیسائیوں نے جذبہ فراریت کے تحت عیسیٰ علیہ السلام کی اصل تعلیمات کو چھوڑ کر نمائش محبت رسول پر اکتفا کیا' اسی طرح مسلمان بھی کتاب وسنت کے احکام کی پیروی چھوڑ کر ناقص مسلمان ہو گئے تو اس نقص کو چھپانے کے لیے وہ بھی نمائشی اظہارِ محبت کے ذریعے بدعملی کے باوجود بزعمِ خویش اتقیاء واصفیاء بن رہے ہیں۔

دین اسلام کی تعلیم تو یہ تھی کہ رسول پاکؐ کے طریقوں کو اپنایا جائے اور آپؐ کے اور آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہ کی زندگیوں کے مطابق طرزِ عمل اختیار کر کے صحت مند اسلامی معاشرہ استوار کیا جائے لیکن سہل انگاری، غفلت، سستی، کم ہمتی اور ضعف ایمان نے اصل سے توجہ ہٹا کر خود ساختہ رسوم کی پیروی پر آمادہ کر دیا۔ اور چند نمائشی طریقوں سے حصول مقصد کی موہوم اُمید پیدا کر دی۔ رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے جسے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں:

''جس شخص نے میری اُمت کے بگڑنے کے وقت میری سنت کو اپنا راہنما بنایا اس کو سو شہیدوں کا ثواب ملے گا''۔ (مشکوٰۃ)

بدعات کے خوگر لوگوں پر جب بدعات کی مذمت واضح کی جاتی ہے تو وہ کہتے ہیں اگر نئی چیزیں مثلاً عینک، لاؤڈ سپیکر، ہوائی جہاز، جدید طرزِ تعمیر کو اختیار کرنا جائز ہے تو گیارہویں شریف، عرس اور تعزیے، محافل میلاد کیوں ناجائز ہوئیں جبکہ ان میں انفاق فی سبیل اللہ اور درود و سلام بھی ہوتا ہے لیکن یہ بات کہتے ہوئے وہ بھول جاتے ہیں کہ دین میں نئی چیز بدعت ہوتی ہے مگر دنیا کی نئی چیزیں ایجادات کہلاتی ہیں جن سے فائدہ اٹھانا جائز ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ کہتے ہیں کہ جب معروف سیاسی، سماجی، مذہبی اور قومی راہنماؤں کی سالگرہ منائی جاسکتی ہے تو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے میلاد منانے میں کیا حرج ہے تو یہاں بھی غلط فہمی واضح ہے کہ سیاسی اور قومی اہمیت کی شخصیات کے نام اور کارناموں کو زندہ رکھنے کے لیے ہم ان کی یاد میں ایام مناتے ہیں اور اگر ایسا نہ کیا جائے تو ان نامور ہستیوں کے معدوم ہو جانے کا اندیشہ ہوتا ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت ان لوگوں سے مختلف ہے کیونکہ آپؐ کے ذکر کی بلندی اور دوام کا خودکار نظام خالق کائنات نے دنیا میں جاری فرما دیا ہے لہٰذا اس بات کی حاجت ہی نہیں رہی کہ مصنوعی طریقوں سے آپؐ کے ذکر کو بلند کیا جائے بلکہ ایسا کرنے سے حسن نیت کے باوجود منفی نتائج برآمد ہونا لازمی ہیں کیونکہ دیگر شخصیات کے ساتھ ہمارا جو تعلق ہے وہ محض دنیاوی ہے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جو تعلق ہے وہ سراسر دینی ہے اور دینی تعلق کے تقاضے دنیاوی تقاضوں سے

مختلف ہیں۔اس فرق کو بھی ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔یہی وجہ ہے کہ آنحضرت ﷺ کے ساتھ کمالِ محبت کے باوجود خلافت راشدہ میں کبھی ربیع الاول کے مہینے میں ذکر رسول کی خاطر اجتماعی محافل میلاد کا اہتمام نہیں کیا گیا۔

بعض لوگ نفلی نوعیت کی عبادات کو مستقلاً اختیار کر لیتے ہیں'اس حد تک تو یہ بات مستحسن ہے'لیکن جب اپنے نفلی معمولات کو پوری اُمت پر لازم قرار دینے کی کوشش کی جائے اور اختیار نہ کرنے والوں کو مطعون کیا جائے تو یہ امر بدعت کہلاتا ہے' کیونکہ یہ دین میں نئی بات ہے۔پوری اُمت کے لیے عبادات اور وظائف کو لازم قرار دینا صرف پیغمبر خدا کا منصب ہے۔مذکورہ عمل اختیار کرنے والے یہ بات فراموش کر دیتے ہیں کہ وہ اپنے اختیار سے تجاوز کر کے پیغمبر کی حیثیت اپنا رہے ہیں جو شرک فی الرسالت کا ارتکاب ہے۔

خود رحمتہ للعالمینؐ کا اُسوہ یہ ہے کہ آپؐ نے اپنے نفلی معمولات اُمت پر واضح تو فرما دیے لیکن لازم نہ کیے' بلکہ اختیاری رکھے' تاکہ اُمت پر بوجھ نہ ہو۔تو آج کون شخص پوری اُمت کے لیے کوئی نیا عمل تجویز کر کے رائج کر سکتا ہے؟

آج کے دور میں بدعات کو ختم کر کے صحیح اسلامی طرزِ زندگی اپنانے کی ضرورت ہے۔پس سنت کے احیاء میں جس قدر محنت ہو سکے' کرنی چاہیے۔یہی طریقہ حصولِ حبِ رسولؐ کے لیے مستند اور مجرب ہے۔

مقامِ رسالت اور اس کے تقاضے

محاورہ ہے کہ ''گر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی'' اگر تجھے لوگوں کے مقام و مرتبے میں فرق نہیں تو تُو حق شناس نہیں ہے۔ یعنی لوگوں کے منصب اور حیثیت سے واقف ہونا ضروری ہے تا کہ حقوق کی ادائیگی بطریق احسن ہو سکے۔ والدین کے حقوق وہی شخص پورے طور پر ادا کر سکے گا جو والدین کی عظمت سے آگاہ ہوگا۔ اسی اصول کی وضاحت ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے کہ ''قدرِ زر زرگر بداند قدرِ جوہر جوہری''۔ یعنی سونے کی قدر اسی کو ہوگی جو سونے کی شناخت رکھتا ہو' اسی طرح جواہرات کی قیمت تو جواہر شناس ہی لگا سکتا ہے۔ ہم اپنے استاد کو راہ چلتا دیکھتے ہیں تو ادب کے ساتھ اس کے سامنے جھک جاتے ہیں' مگر اسی اُستاد کے پاس سے سینکڑوں دوسرے لوگ بغیر ادب آداب کے گزر جائیں گے' کیونکہ وہ اس کو پہچانتے نہیں۔ پس بادنیٰ تأمل یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے کہ جب ہم کسی شخص کے مقام و مرتبہ سے واقف نہ ہوں گے تو اس شخص کے ساتھ اپنے تعلق کی نوعیت ہم کیسے متعین (determine) کریں گے؟ چنانچہ مقامِ رسالت سے آگاہی ہر مسلمان پر لازم ہے تا کہ وہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اپنا تعلق صحیح بنیادوں پر استوار کر سکے۔

سادہ انداز میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جو شخص کلمہ طیبہ پڑھ لیتا ہے اس پر مقامِ رسالت تو واضح ہو جاتا ہے۔ تاہم یہ بات کچھ تشریح طلب ہے' کیونکہ مسلمانوں میں بہت سوں کو رسول اللہ ﷺ کی شرعی حیثیت اور مقام و مرتبہ کے متعلق کئی طرح کی غلط فہمیاں ہیں۔ جب تک وہ غلط فہمیاں دور نہ ہوں اور مقامِ رسالت سے آگہی نہ ہو حقوق کی ادائیگی کما حقہٗ کیسے ہو سکتی ہے!

اطاعت

حضرت محمد ﷺ کی ممتاز ترین حیثیت اللہ کے رسول کی ہے۔ اللہ نے آپ کو برگزیدہ کیا' وحی کے ساتھ سرفراز کیا' منصبِ رسالت پر مأمور کیا اور لوگوں پر آپ ؐ کی اطاعت لازمی قرار دی' بلکہ رسول کی اطاعت کو خود اللہ کی اطاعت قرار دیا:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ ۚ﴾ (النساء: ۸۰)

''جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے درحقیقت اللہ کی اطاعت کی۔''

رسول ﷺ کے علاوہ یہ کسی کا منصب نہیں۔ ماں باپ کا بہت بڑا درجہ ہے لیکن وہ بھی رسول ؐ کے حکم کے تابع ہے۔ اگر وہ بھی کوئی ایسا حکم دیں جس کی رسول اجازت نہ دیتا ہو تو ان کا حکم بھی نہیں مانا جائے گا۔ اس کی وجہ بھی قرآن پاک میں بتا دی گئی کہ:

﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ اِنْ هُوَ اِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم)

''پیغمبر اپنی خواہش سے نہیں بولتا۔ وہ صرف وہی کہتا ہے جو اس کی طرف وحی کی جاتی ہے۔''

جب رسول اللہ ﷺ کی زبان پر سراسر حق جاری ہے تو اُن کی اطاعت ربّ ہی کی اطاعت ہوئی۔ اسی لیے قرآن پاک میں اس مضمون کی بے شمار آیات موجود ہیں۔ ان میں سے چند ایک یہ ہیں:

﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْۤا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْۤا اَعْمَالَكُمْ ۝﴾ (محمد)

''اے ایمان والو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول کی اطاعت کرو اور (بصورتِ دیگر) اپنے اعمال ضائع نہ کردو''۔

سورۃ الشعراء میں متعدد رسولوں کا اپنی قوم سے یہ خطاب نقل ہوا:

﴿فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوْنِ ۝﴾

''پس اللہ کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو''۔

﴿وَاِنْ تُطِيْعُوْهُ تَهْتَدُوْا ۭ﴾ (النور: ۵۴)

''اور اگر تم اس کی پیروی کرو گے تو ہدایت پالو گے''۔

﴿وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ﴾

(النساء:۱۳)

''اور جس نے اللہ کی اور اس کے رسول کی اطاعت کی اللہ اسے باغات میں داخل کرے گا جن کے دامن میں نہریں بہہ رہی ہوں گی۔''

اسی طرح رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے منہ موڑنے کے بھیانک نتائج سے بھی قرآن پاک میں جا بجا خبردار کیا گیا ہے۔ دیکھئے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾﴾ (النساء)

''اور جو کوئی خلاف کرے رسول کے بعد اس کے کہ اس پر ہدایت واضح ہو گئی اور پیروی کرے مسلمانوں کی راہ کے علاوہ کسی دوسری راہ کی تو ہم پھیر دیں گے اس کو جدھر کو وہ پھرا اور ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے' اور وہ بری جگہ ہے پھر جانے کی''۔

سورۂ محمد میں پیغمبر کی مخالفت کا انجام حبطِ اعمال بتایا گیا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَشَآقُّوا الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْهُدٰى ۙ لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيُحْبِطُ اَعْمَالَهُمْ ﴿۳۲﴾﴾

''بے شک جو لوگ کافر ہوئے اور اللہ کی راہ سے روکتے رہے اور انہوں نے رسول کی مخالفت کی بعد اس کے کہ ان پر ہدایت واضح ہو چکی تھی وہ اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے' البتہ وہ عنقریب ان کے اعمال ضائع کر دے گا''۔

جو لوگ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت سے غافل رہے اور اِدھر اُدھر بھٹکتے رہے روزِ محشر ان کی رسوائی دیدنی ہو گی' مگر اُس وقت ان کی آہ وزاری' اعترافِ گناہ' پشیمانی اور پچھتاوا کسی کام نہ آئیں گے۔ بالفاظِ قرآنی:

﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا ﴿۶۶﴾﴾ (الاحزاب)

''جس دن پھیرے جائیں گے مُنہ اُن کے آگ کے اندر' کہیں گے اے کاش ہم نے فرماں برداری کی ہوتی اللہ کی اور اطاعت کی ہوتی رسول کی!''

پھر رسول اللہ ﷺ کا نافرمان روزِ قیامت اپنے ہاتھ کاٹے گا' افسوس کرے گا' مگر بے فائدہ۔ دیکھئے سورۃ الفرقان:

﴿وَيَوْمَ يَعَضُّ الظَّالِمُ عَلٰى يَدَيْهِ يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِى اتَّخَذْتُ مَعَ الرَّسُوْلِ سَبِيْلًا﴿۲۷﴾﴾

''اور جس دن ظالم اپنے ہاتھ کاٹے گا' کہے گا اے کاش میں رسول کی ہمراہی اختیار کرتا''۔

ادب واحترام

جس ہستی کو اللہ کا فرستادہ' حق کا ترجمان اور واجب الاطاعت تسلیم کرلیا جائے تو اس کا ادب واحترام کرنا ضروری ہوجاتا ہے۔ اگرچہ یہ بات ظاہر وباہر ہے تاہم خود ربّ کائنات نے اس کی اہمیت اجاگر کردی ہے' تاکہ لوگ اس ضمن میں کسی بے احتیاطی کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں۔ اگرچہ یہ مضمون قرآن پاک میں کئی جگہ آیا ہے لیکن سورۃ الحجرات میں اس سلسلہ کی راہنمائی واضح ترین صورت میں آئی ہے جہاں رسول اللہ ﷺ کے ہاں آنے والوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ آپؐ کے گھر کے دروازے پر کھڑے ہوکر آپؐ کو آواز نہ دیں' بلکہ کھڑے کھڑے انتظار کریں' اگر آپؐ خود تشریف لے آئیں تو مدعا بیان کرلیں' ورنہ واپس چلے جائیں۔ سورۃ الحجرات میں ارشاد ہوا:

﴿اِنَّ الَّذِيْنَ يُنَادُوْنَكَ مِنْ وَّرَآءِ الْحُجُرٰتِ اَكْثَرُهُمْ لَا يَعْقِلُوْنَ﴿۴﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ صَبَرُوْا حَتّٰى تَخْرُجَ اِلَيْهِمْ لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ﴿۵﴾﴾

''یقیناً وہ لوگ جو حجروں کے باہر سے آپ کو آوازیں دیتے ہیں' ان میں بہت سے عقل سے عاری ہیں۔ اور اگر وہ رک جاتے یہاں تک کہ آپ خود نکل کر اُن کے پاس آجاتے تو یہ اُن کے لیے بہتر ہوتا' اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے''۔

پھر اسی سورۃ الحجرات میں رسول اللہ ﷺ کی محفل میں بیٹھنے والوں کو اس بات کا

پابند کیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی موجودگی میں ان کی آواز سے اپنی آواز بلند نہ کریں اور جیسے وہ بلند آواز میں ایک دوسرے کو پکارتے ہیں اس طرح چلا چلا کر آپؐ کو ہرگز نہ پکاریں۔ ورنہ اتنی سی بات سے ہی ان کے تمام اعمال اکارت چلے جائیں گے جبکہ وہ اس فعل کو معمولی سمجھ رہے ہوں گے۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿يَآ أَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ اَنْ تَحْبَطَ اَعْمَالُكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تَشْعُرُوْنَ ۝﴾

''اے ایمان والو! اپنی آوازوں کو نبی کی آواز سے بلند مت کرو اور اُن سے اونچی آواز میں بات نہ کرو' جیسا کہ اونچی آواز میں تم ایک دوسرے سے بات کر لیتے ہو' بصورتِ دیگر تمہارے اعمال ضائع ہو جائیں گے اور تم کو خبر بھی نہ ہوگی''۔

یوں ایک مسلمان آپؐ کے ادب و احترام میں کوتاہی کا سوچ بھی نہیں سکتا اور نہ ہی آپؐ کے متعلق ایسے الفاظ استعمال کر سکتا ہے جن سے ذرّہ برابر بھی ادب کے تقاضے میں فرق آتا ہو۔

محبت

رسول اللہ ﷺ سے بڑھ کر انسان کا محسن کون ہو سکتا ہے جن کے ذریعے سے دولت ایمان نصیب ہوئی جو بخشش کا وسیلہ بن جائے گی! پھر انہوں نے انسانوں کے سروں سے وہ بوجھ اتار کر انہیں ہلکا پھلکا کر دیا جو خود انہوں نے اپنے اوپر ڈال رکھے تھے۔ اس طرح انسانوں کو وہ دین یعنی طریق حیات نصیب ہوا جو فطرت کے انتہائی قریب اور انسانی نفسیات کو ملحوظ رکھے ہوئے ہے۔ اس میں آسانیاں ہیں' مشکلات نہیں:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لیے تنگی پسند نہیں کرتا''۔

یہ رسول اللہ ﷺ کا بہت بڑا احسان ہے۔ اس دین کی سادہ اور عام فہم تعلیمات پر عمل کرنا سہل بھی ہے اور مفید بھی۔ چنانچہ اس احسان کا تقاضا یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ

انتہائی محبت کا تعلق رکھا جائے۔اگرچہ یہ بات بھی منطقی اور عام فہم ہے تاہم اللہ تعالیٰ نے قرآن شریف میں اس کی بھی وضاحت کردی ہے کہ رسول اللہ ﷺ کا حق لوگوں پر خود اُن کی اپنی جانوں سے بھی زیادہ ہے:

﴿اَلنَّبِیُّ اَوْلٰی بِالْمُؤْمِنِیْنَ مِنْ اَنْفُسِهِمْ﴾ (الاحزاب:٦)

''بلاشبہ نبی (کا حق) تو ایمان والوں کے لیے ان کی اپنی جانوں پر بھی مقدم ہے''۔

یعنی رسول اللہ ﷺ کی ذات کو ہر مؤمن خود اپنے جسم و جان پر ترجیح دے گا اور مخلوق کے ہر فردِ بشر سے زیادہ محبت رسول اللہ ﷺ سے رکھے گا۔حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں:

((لَا یُؤْمِنُ اَحَدُکُمْ حَتّٰی اَکُوْنَ اَحَبَّ اِلَیْهِ مِنْ وَلَدِهٖ وَوَالِدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِیْنَ)) (صحیح البخاری و صحیح مسلم)

''تم میں سے کوئی اس وقت تک ایمان والا نہیں ہوسکتا جب تک میں اسے اس کے بیٹے، باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب اور پیارا نہ ہوجاؤں''۔

ایک دفعہ حضرت عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ نے رسول اکرم ﷺ سے عرض کیا: اے اللہ کے رسولؐ! آپؐ یقیناً مجھے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہیں سوائے میری اپنی جان کے۔تو نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''نہیں، اُس ذات کی قسم جس کے ہاتھ میں میری جان ہے! یہاں تک کہ میں تمہیں تمہاری اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہوجاؤں (تب بات بنے گی)'' تو حضرت عمرؓ نے اپنا مزید جائزہ لینے کے بعد عرض کیا: ''یقیناً اب آپ مجھے اپنی جان سے بھی زیادہ محبوب ہیں۔تو آپؐ نے فرمایا: ((اَلْآنَ یَا عُمَرُ!)) یعنی اے عمر! اب تم مؤمن کامل بنے ہو! (صحیح البخاری ومسلم) چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے مقام و مرتبہ سے آگاہی کا تقاضا ہے کہ مسلمان کے دل میں رسول اللہ ﷺ کی محبت مخلوق کی ہر شے بلکہ خود اپنی ذات سے بھی زیادہ ہو۔یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم نے آپؐ کے اشارے پر اپنا جان و مال اور اولاد کو قربان کردیا۔آج بھی مسلمانوں میں یہ جذبہ موجود ہے اور وقت آنے پر ہر مسلمان اپنی جان آپ ﷺ پر فدا کرنے کو سعادت سمجھتا ہے۔

اسلامی تاریخ اس قسم کے فدایانہ کارناموں سے بھرپور ہے۔

ختم نبوت

اللہ تعالیٰ جو اپنے بندوں پر مہربان ہے' انسانوں کی ہدایت کے لیے وقتاً فوقتاً پیغمبر بھیجتا رہا ہے۔ ہر پیغمبر کسی مخصوص خطے یا قوم کی طرف بھیجا جاتا۔ ایک وقت میں ایک سے زیادہ پیغمبر بھی زمین پر موجود رہے' مگر حضرت محمد ﷺ کو قیامت تک آنے والے تمام انسانوں کی طرف نبی بنا کر بھیجا گیا:

﴿وَمَا اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَآفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا:۲۸)

''اور ہم نے آپ' کو تمام لوگوں کے لیے خوشخبری دینے والا اور تنبیہ کرنے والا بنا کر بھیجا ہے۔''

آپ ﷺ پر دین اسلام کی تکمیل کر دی گئی۔ اب اس ضابطۂ حیات میں کسی قسم کی کمی بیشی نہیں ہو سکتی۔ جس طرح اس دین میں کمی کرنا مذموم ہے اسی طرح اس میں ادنیٰ سا اضافہ بھی اس کی تکمیلی شان کو عیب دار ٹھہراتا ہے۔ اب کوئی دوسرا نبی بھی نہیں آئے گا اور نہ ہی وحی نازل ہوگی۔ آپ کی نبوت اب قیامت تک کے لیے ہے۔ اس حقیقت کو بھی قرآن میں واضح کر دیا گیا:

﴿مَا كَانَ مُحَمَّدٌ اَبَآ اَحَدٍ مِّنْ رِّجَالِكُمْ وَلٰكِنْ رَّسُوْلَ اللّٰهِ وَخَاتَمَ النَّبِيّٖنَ﴾ (الاحزاب:۴۰)

''محمد (ﷺ) تم مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں' لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور نبیوں پر مہر''۔

اپنی زندگی میں رسول اللہ ﷺ نے کئی مرتبہ اس بات کو کھول کر بیان کیا کہ میرے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس عنوان کی احادیث تفہیم القرآن' جلد چہارم' ص ۱۴۰ تا ۱۴۴ پر دیکھی جا سکتی ہیں۔ مثال کے طور پر صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے فرمایا: ''کیا تم اس پر خوش نہیں ہو کہ میرے لیے تم ایسے ہو جیسے موسیٰ کے لیے ہارون تھے' لیکن (فرق یہ ہے کہ) میرے بعد کوئی نبی نہیں ہوگا''۔

پس آج اگر کوئی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ کذاب ہے۔ جیسا کہ آپؐ نے اپنے بعد بہت سے نبوت کے جھوٹے دعوے داروں کی پیشین گوئی کی تھی۔ چنانچہ دنیا جانتی ہے کہ آپؐ کے بعد نبوت کا دعویٰ کرنے والے سارے کے سارے کذاب تھے اور اُن کے کردار و عمل میں پیغمبرانہ عصمت و عظمت کا کوئی نشان نہیں ملتا تھا' بلکہ قدم قدم پر اُن کا جھوٹ اور دروغ گوئی ظاہر تھی۔ ان میں سے اکثر نے رسول اللہ ﷺ کی رسالت کو بھی تسلیم کیا مگر خود پر وحی آنے کے دعوے دار بھی ہوئے' لیکن کسی ایک کو بھی عالمِ اسلام میں پذیرائی نہ ملی' بلکہ ذلیل وخوار ہو کر مرے۔ اب قیامت تک کلمہ طیبہ ''لا الٰہ الاّ اللہ محمدٌ رسول اللہ'' ہی رہے گا اور اسی کلمے کا اقرار کرنے والے اور دل سے یقین اور اعضاء و جوارح سے اس پر عمل کرنے والے ہی بالآخر فلاح سے ہم کنار ہوں گے۔ اس وحیٔ الٰہی کا اعلان رسول اللہ ﷺ نے حجۃ الوداع کے خطبے میں فرمادیا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو مکمل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر تمام کر دی اور میں نے تمہارے لیے دین اسلام کو پسند فرمایا''۔

پس مقامِ رسالت سے آگاہی کا تقاضا ہے کہ آپؐ کی رسالت کو اختتامی اور تکمیلی شان کے ساتھ مانا جائے اور آپؐ کے بعد کسی بھی قسم کی نبوت یا رسالت کو پوری قوت کے ساتھ مسترد کر دیا جائے۔ کیونکہ جب آخری زمانے میں عیسیٰ علیہ السلام آسمان سے نازل ہوں گے تو وہ نبی کی حیثیت سے نہیں آئیں گے' بلکہ رسول اللہ ﷺ کے اُمتی ہوں گے اور آپؐ ہی کا کلمہ پڑھیں گے۔

اُسوۂ حسنہ

رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو تمام انسانوں کے لیے مثالی قرار دیا گیا ہے۔ جب ہم سیرت کا مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ حیاتِ طیبہ میں کوئی لمحہ ایسا نہیں گزرا جسے ذرا سا بھی غیر معیاری قرار دیا جاسکے۔ کوئی ایسی اخلاقی خوبی نہیں ہے جو آپؐ کے کردار

میں نہ پائی جاتی ہو اور کوئی ناپسندیدہ بات ایسی نہیں ہے جس کا صدور کبھی آپؐ کی ذات سے ہوا ہو۔ زندگی میں پیش آنے والے تمام نشیب و فراز سے آپؐ گزرے ہیں مگر ہر قسم کے حالات میں آپؐ کا طرزِ عمل مثالی رہا۔ انتہائی خوشی کے لمحات میں بھی رسول اللہ ﷺ کبھی معیار سے فروتر نہیں ہوئے اور اسی طرح کبھی غصے کی حالت میں بھی آپؐ سے غیر معیاری انداز نہیں دیکھا گیا۔ آپؐ نے غریبوں کے لیے نمونہ چھوڑا کہ نادار اور مفلس لوگ بھی پریشان ہو کر ناشکری کا ارتکاب نہ کر بیٹھیں۔ کئی کئی دن آپؐ کے ہاں چولہا نہ جلتا تھا۔ امیروں اور دولت مندوں کے لیے آپؐ کی زندگی مشعل راہ ہے کہ ایک وقت وہ بھی آیا کہ عرب کی دولت آپؐ کے قدموں میں آ پڑی اور آپؐ مدینہ کی ریاست کے سربراہ ہو گئے' مگر اس حال میں بھی آپؐ نے عیش و عشرت کا انداز نہیں اپنایا بلکہ انتہائی سادہ زندگی اختیار کی اور دولت کو اپنی ذات پر خرچ کرنے کی بجائے ضرورت مندوں میں تقسیم کیا۔ انہی دنوں کی بات ہے کہ آپؐ کی پیاری بیٹی فاطمہؓ نے آپؐ سے ایک خادم کا مطالبہ کیا تو آپؐ نے انہیں خادم تو نہیں دیا البتہ تسبیحاتِ فاطمہ کے الفاظ سکھا دیے کہ یہ غلام و کنیز سے بہتر ہیں۔ آپ ﷺ نے مظلومیت کے دن بھی گزارے جن میں ہر دَور کے مظلومین کے لیے حوصلہ مندی اور ثابت قدمی کی تعلیم ہے' کیونکہ آپؐ نے اور آپؐ کے باصفا ساتھیوں نے نہایت صبر و ثبات کے ساتھ مکی زندگی میں ہونے والے مظالم کو برداشت کیا۔

پھر ایک وقت آیا کہ رسول اللہ ﷺ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے جہاں سے آپؐ کو نکل جانے پر مجبور کر دیا گیا تھا' مگر اب بھی آپؐ جذبۂ شکر و امتنان کے ساتھ اپنے ربّ کے حضور سجدہ ریز تھے۔ آپؐ کی جان کے دشمن اور خون کے پیاسے جنہوں نے آپؐ کے ساتھ بدسلوکی کی انتہا کر دی تھی' آپؐ کے سامنے دست بستہ کھڑے تھے۔ آپؐ جس طرح چاہتے ان سے انتقام لے سکتے تھے مگر آپؐ نے فرمایا: ''جاؤ تمہیں معاف کیا' آج تم سے کوئی بدلہ نہیں لیا جائے گا''۔ بطورِ سپہ سالار آپؐ نے کئی عسکری مہمیں اختیار کیں مگر تاریخ گواہ ہے کہ کسی لڑائی کے موقع پر آپؐ نے نہ تو کسی بوڑھے'

بچے اور عورت پر ہاتھ اٹھانے دیا اور نہ ہی پرامن دشمن کو نشانہ بنایا' بلکہ مقابلہ پر آنے والے جنگجوؤں کے ساتھ ہی لڑائی کی اور فتح حاصل ہونے پر قیدیوں کے ساتھ حسن سلوک کی وہ مثالیں قائم کیں کہ قیدیوں نے اس قید کو آزادی پر ترجیح دی۔

رسول اللہ ﷺ کرسیٔ عدالت پر بیٹھنے والوں کے لیے بھی مثالی شخصیت تھے۔ آپؐ نے عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرتے وقت اپنے پرائے' دوست دشمن' امیر غریب کی تفریق ختم کر دی۔ حسب ونسب اور جاہ ومنصب کا بھی کوئی خیال نہ رکھا' بلکہ بے بس اور کمزور کو اس کا حق دلایا۔ صاحب جاہ ومنصب کو دوسروں پر زیادتی سے روک دیا۔ جب بنی مخزوم قبیلے کی ایک عورت پر چوری ثابت ہوئی اور اس کو سزا سنائی گئی تو لوگوں نے آپؐ کے چہیتے حضرت اُسامہ بن زید رضی اللہ عنہ کو آپؐ کے پاس سفارش کے لیے آمادہ کر لیا۔ جب انہوں نے آپؐ کے سامنے مخزومی عورت کی سزا معاف کرنے کو کہا تو آپؐ نے فرمایا: ''اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا''۔ (رواہ البخاری ومسلم)

عبادت گزاروں کے لیے بھی آپؐ کے نقوش قدم راہنما تھے۔ آپؐ نے ہر جگہ عمل میں اعتدال کو اختیار کیا اور اُمت کے لیے پسند کیا۔ جن لوگوں نے ارادہ کیا کہ وہ گناہوں سے بچنے کی خاطر بیوی بچوں کے چکر میں پڑنے کی بجائے تجرد کی زندگی اختیار کریں گے' اسی طرح ساری ساری رات نمازیں پڑھیں گے اور ہمیشہ روزہ رکھیں گے تو آپؐ نے ان کو اس طرزِ عمل سے یہ کہہ کر روک دیا کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے: نکاح میری سنت ہے' میں رات کو عبادت کے لیے جاگتا بھی ہوں' آرام بھی کرتا ہوں' نفل روزے رکھتا بھی ہوں اور چھوڑتا بھی ہوں۔ ہر شخص پر اُس کے اپنے نفس کا بھی حق ہے' اسے بیوی بچوں کے حقوق ادا کرنے بھی ضروری ہیں اور معاشرے کے دوسرے افراد کا خیال بھی رکھنا ہے۔ گویا آپؐ نے زندگی بھرپور انداز میں بسر کرنے کا نمونہ چھوڑا ہے۔

سربراہِ خانہ کی حیثیت سے بھی آنحضور ﷺ کی زندگی مثالی ہے۔ آپؐ کی ازواجِ

مطہرات انتہائی عسرت کی زندگی میں بھی آپؐ سے خوش تھیں۔ آپؐ اپنی ازواجِ مطہرات، اولاد اور خادموں کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ ڈانٹنا ڈپٹنا آپؐ کے مزاج میں نہ تھا، بلکہ ہر فرد آپؐ کے حسنِ سلوک سے متاثر تھا۔

الغرض ہر شخص کے لیے آپ ﷺ کی زندگی مشعلِ راہ ہے۔اسی لیے خالق کائنات نے ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (بے شک رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں تمہارے لیے بہترین نمونہ ہے) فرما کر تمام انسانوں کو آپؐ کی پیروی کی ہدایت کی۔

بشریت

رسول اللہ ﷺ اولادِ آدم میں سے ایک فرد تھے۔ آپؐ مخلوقِ خدا میں سب سے اونچے مقام پر فائز تھے۔ آپؐ امام الانبیاء ہیں۔ تمام نبی انسان تھے اور انسان اشرف المخلوقات ہے۔ پس جو ہستی پوری کائنات میں اعلیٰ مقام پر ہو گی وہ بھی انسان ہی ہو گی۔ دوسرے انبیاء کی طرح انسانی کمزوریاں آپؐ کے ساتھ بھی تھیں۔ آپؐ خوشی کے موقع پر خوش ہوتے تھے، ناخوشگوار صورت حال میں ناراض ہوتے تھے۔ کبھی کبھی آپؐ بیمار بھی ہوئے ہیں۔ آپؐ کو زخم آئے اور آپؐ نے درد کی اذیت محسوس کی۔ بھوک اور پیاس کی تکلیف بھی آپؐ محسوس کرتے تھے۔ دشمنوں کے مظالم، چیرہ دستیاں، طعن و تشنیع اور الزام تراشی آپؐ کے دل کو آزردہ کرتی تھی۔ اپنے بیٹوں اور بیٹیوں کی پیدائش پر آپؐ نے خوشی کا اظہار کیا اور اُن کی وفات پر آپؐ سخت غمگین ہوئے ہیں۔

ان ساری کیفیات اور داعیات کے باوجود رسول اللہ ﷺ ہمیشہ مالک کی رضا پر راضی رہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی میں کبھی کمی نہ کی۔ آپؐ کی اسی صفت کی وجہ سے آپؐ کی زندگی کو انسانوں کے لیے نمونہ اور قابلِ تقلید قرار دیا گیا، کیونکہ انسان کے علاوہ مخلوق کی کوئی دیگر نوع انسان کے لیے مثال نہیں بن سکتی۔ اگر کسی فرشتے کی زندگی کو انسانوں کے لیے نمونہ بنایا جاتا تو وہ اس کی پیروی کیسے کرتے؟ فرشتے کو نہ بیوی بچوں کی ضرورت، نہ کھانے پینے کی فکر۔ انسانوں کے لیے تو انسان ہی اُسوۂ حسنہ ہو سکتا

ہے جس میں تمام انسانی کمزوریاں موجود ہوں مگر وہ ان کمزوریوں کو اپنے کردار و عمل پر منفی طور پر اثر انداز نہ ہونے دے' بلکہ اپنی زندگی کو ہمیشہ معیاری رکھے' تاکہ دوسرے لوگوں کو حوصلہ ملے اور وہ بھی اچھا اور پسندیدہ رویہ اختیار کرنے کی کوشش کریں۔ قرآن کریم میں ایک سے زیادہ مرتبہ اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ تمام انبیاء انسان ہی تھے اور اسی طرح رسول اللہ ﷺ بھی انسان ہی تھے۔ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو آسمان سے کسی فرشتے ہی کو رسول بنا کر بھیجا جاتا۔ قرآن کریم میں ارشادِ ربانی ہے:

﴿وَمَا مَنَعَ النَّاسَ اَنْ يُّؤْمِنُوْٓا اِذْ جَآءَهُمُ الْهُدٰٓى اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَبَعَثَ اللّٰهُ بَشَرًا رَّسُوْلًا ﴿٩٤﴾ قُلْ لَّوْ كَانَ فِي الْاَرْضِ مَلٰٓئِكَةٌ يَّمْشُوْنَ مُطْمَئِنِّيْنَ لَنَزَّلْنَا عَلَيْهِمْ مِّنَ السَّمَآءِ مَلَكًا رَّسُوْلًا ﴿٩٥﴾﴾ (بنی اسراءیل)

''جب لوگوں کے پاس ہدایت پہنچ گئی تو انہیں ایمان لانے سے یہ بات مانع ہوئی کہ وہ کہنے لگے کہ کیا آدمی کو اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے؟ (اے پیغمبر!) کہہ دیجیے: اگر زمین میں فرشتے چلتے پھرتے اور آباد ہوتے تو ہم اُن پر لازماً آسمان سے کسی فرشتے کو ہی رسول بنا کر بھیجتے''۔

پھر سورۃ الکہف میں فرمایا:

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ يُوْحٰٓى اِلَيَّ اَنَّمَآ اِلٰهُكُمْ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ﴾

(الکہف: ۱۱۰)

''(اے پیغمبر!) کہہ دیجیے میں تو ایک انسان ہوں تمہاری طرح' البتہ مجھ پر وحی نازل ہوتی ہے کہ تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے''۔

سورۃ الکہف کے یہ الفاظ بعینہٖ سورۃ حم السجدۃ کی چھٹی آیت میں بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ قرآن مجید کی اور آیات میں بھی آپ کی بشریت کا واضح ذکر موجود ہے۔

اَخلاقِ نبویؐ

اسلامی تعلیمات میں اَخلاقیات کو نمایاں مقام حاصل ہے۔ اسلام بنی آدم کو صحیح معنوں میں انسان بنانا چاہتا ہے، تاکہ معاشرہ اچھے افراد سے بھر جائے، اَخلاقی خوبیاں عام ہوں اور معاشرہ امن وسلامتی کی تصویر بن جائے۔ مکارمِ اَخلاق سیرت وکردار کی بلندی کے مظہر ہوتے ہیں جبکہ دوسرے لوگ اُن سے متأثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ رسول پاک ﷺ سرتاپا اَخلاقی خوبیوں سے متصف تھے۔ یہ آپؐ کے سیرت وکردار کی بلندی ہی تھی جس نے اوّلین اہل مکہ کو متأثر کیا اور وہ آپ کو صادق اور امین کے لقب سے پکارنے لگے۔ جب آپؐ نے نبوت کا اعلان کیا تو وہی لوگ آپؐ کے شدید ترین مخالف ہو گئے۔ یہ مخالفت صرف آپؐ کے پیش کردہ نظام کی تھی جس میں بڑے چھوٹے کی تمیز ختم ہو رہی تھی۔ ورنہ نبی اکرم ﷺ کے سابقہ کردار پر کوئی کٹر سے کٹر مخالف بھی کبھی انگلی نہ اٹھا سکا۔

چالیس سال کی عمر میں رسول اکرم ﷺ پر نزولِ وحی کا آغاز ہوا تو آپؐ پیغامِ رسالت لوگوں تک پہنچانے لگے۔ اب آپؐ کی ہر بات خدا کی تعلیم کردہ تھی، جو کہ انتہائی صاف ستھری، مبنی بر انصاف اور معاشرے سے گندگی اور غلاظت کو ختم کرنے والی اور امن وسکون فراہم کرنے والی تھی۔ مگر آپؐ تو قبل از اعلانِ نبوت کی زندگی میں بھی اَخلاق وکردار کی انتہائی بلندیوں پر تھے۔ ایک شخص نے آپؐ کے ساتھ کوئی لین دین کا معاملہ کیا اور یہ کہہ کر چلا گیا کہ یہاں ٹھہریے میں ابھی آتا ہوں۔ آپؐ اس کے انتظار میں وہاں کھڑے ہو گئے۔ شاید وہ شخص جا کر بھول گیا اور واپس نہ آیا۔ تین دن کے بعد اتفاق سے اِدھر سے گزرا تو دیکھا آپؐ اسی جگہ کھڑے ہیں۔ وہ شخص شرمندہ ہوا، مگر آپؐ نے

صرف اتنا کہا کہ تمہاری وجہ سے مجھے بہت تکلیف اٹھانی پڑی ہے۔ یہ واقعہ اُس وقت کا ہے جب آپؐ پر ابھی نزولِ وحی کا آغاز نہیں ہوا تھا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی عمر کے چالیس سال انتہائی سادگی کے ساتھ مکہ کے جاہلی معاشرے میں گزارے۔ وہاں ہر طرف اَخلاق باختہ عادات و اطوار کا ماحول تھا' مگر آپؐ نے اپنے دامن کو کسی ادنیٰ سی برائی سے بھی آلودہ نہ ہونے دیا۔ یہاں جس قدر بھی تعجب کیا جائے کم ہے کہ اہل مکہ آپؐ سے معجزہ کا مطالبہ کرتے رہے۔ کیا انہیں نظر نہیں آ رہا تھا کہ آپؐ جیسا اَخلاق و کردار پورے ماحول میں کسی کا نہ تھا۔ کیا یہ معجزہ نہ تھا! اگر دینِ آبائی کی زنجیریں اور اپنے مفادات کے طوق اُن کے لیے رکاوٹ نہ بنتے تو مکہ کا ہر شخص آپؐ کے اخلاق و کردار کی عظمت سے متأثر ہو کر اسلام قبول کر لیتا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم رحمۃ للعالمین تھے۔ آپؐ نے بے کسوں کی دست گیری' بیواؤں کی خبر گیری اور یتیموں پر شفقت کرنے کا حکم دیا۔ آپؐ ضعیفوں اور کمزوروں کے کام آئے۔ معذوروں اور محتاجوں کی ضروریات کا خیال رکھا۔ عدل و انصاف کے معاملے میں اپنے پرائے کا فرق ختم کر دیا۔ عورت کی عزت و وقار کو بلند کیا۔ مَردوں کو اس بات کی تلقین کی کہ وہ عورتوں کے حقوق کا خیال رکھیں۔ بچوں کے ساتھ محبت و پیار اور بڑوں کے لیے احترام کے جذبات رکھنے کی تعلیم دی۔ ہمسایوں کے ساتھ اچھے تعلقات رکھنے' بلکہ اُن کی خبر گیری کو ضروری ٹھہرایا اور فرمایا کہ جس شخص نے خود سیر ہو کر کھایا اور اُس کا ہمسایہ بھوکا سویا تو وہ ہم میں سے نہیں۔ ہمسائے کے حقوق پر اس قدر زور دیا کہ بقول صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایسا معلوم ہونے لگا کہ شاید ہمسائے کو وراثت میں حصہ دار ٹھہرا دیا جائے گا۔ معاشرے میں امن و سکون کی بحالی کے لیے فرمایا کہ مؤمن تو حقیقت میں وہ ہے جس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ یعنی نہ تو مسلمان کے ہاتھ کسی پر زیادتی کے لیے اٹھیں اور نہ ہی وہ زبان سے کسی کو ستائے۔ کسی دوسرے کی چیز پر غاصبانہ قبضہ تو بہت دور کی بات ہے' بغیر اجازت کسی کی کوئی چیز استعمال کرنے سے بھی منع فرمایا۔ آپؐ نے تعلیم دی کہ اپنا کام خود کیا جائے اور حتی الوسع کسی دوسرے پر اپنے کام کا بوجھ نہ

ڈالا جائے۔آپؐ نے تو جانوروں سے کام لینے کے بھی ضابطے بتادیے تاکہ اُن پر بھی کسی طرح کا ظلم نہ ہونے پائے۔آپؐ نے تعلیم دی کہ اپنے جانوروں کو خوراک اُن کی ضرورت کے مطابق دو اور ان سے کام ان کی استطاعت کے مطابق لو۔حلال جانور کا گوشت کھانا جائز ہے مگر جانور کے ذبح کرنے میں بھی آپؐ کی تعلیمات رأفت ورحمت کا مظہر ہیں۔جانور کو بھوکا پیاسا رکھ کر ذبح نہ کیا جائے۔ذبح میں استعمال ہونے والی چھری کو پہلے سے تیز کر کے رکھا جائے تاکہ جانور کو کم سے کم تکلیف ہو۔مذبوحہ کا جسم بے حرکت ہو جائے تو پھر اُس کی کھال کھینچی جائے' جبکہ اس معاشرے میں یہ رواج بھی تھا کہ زندہ جانور کے جسم سے گوشت کا ٹکڑا کاٹ لیتے تھے۔

رسول اللہ ﷺ نے ازدواجی زندگی کو تجرد کی زندگی پر ترجیح دی' بلکہ تجرد کی زندگی کو ناپسند فرمایا' کیونکہ یہ فطری تقاضوں کو فنا کرنے کے مترادف ہے۔آپؐ نے بھرپور اور مصروف زندگی کو پسند کیا جس میں اللہ کے حقوق کے ساتھ ساتھ بندوں کے حقوق کی بھی پوری پوری پاسداری کی جائے۔والدین پر لازم کیا کہ وہ اولاد کے حقوق کا خیال رکھیں اور اولاد کو والدین کے آرام اور سکھ کا خیال رکھنے کی تلقین کی۔اس طرح آپؐ نے معاشرے کے کسی فرد کو بھی بے یارومددگار اور unattended نہیں چھوڑا۔

رسول اللہ ﷺ کی اخلاقی تعلیمات کا دائرہ بہت وسیع ہے۔صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپؐ کی صحبت میں بیٹھنے والے تھے۔انہوں نے آپؐ کے اخلاق کو خود آنکھوں سے دیکھ کر بیان کیا ہے۔حضرت زید رضی اللہ عنہ آپؐ کے غلام تھے۔اُن کے والد اور کچھ رشتہ دار آپؐ کے پاس آئے اور زید کو آزاد کرنے کی اپیل کی۔آپؐ نے فرمایا زید کو لے جاؤ۔وہ زید کی طرف متوجہ ہوئے تو زید نے اُن کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور نبی اکرم ﷺ کی خدمت میں رہنے کو آزادی پر ترجیح دی۔یہ آپؐ کے حسنِ اخلاق ہی کا نتیجہ تھا۔

محمدؐ کی غلامی ہے سند آزاد ہونے کی
خدا کے دامن توحید میں آباد ہونے کی

رسول اللہ ﷺ نے غلاموں کے ساتھ اچھے برتاؤ کی تعلیم دی۔فرمایا جو خود کھاؤ وہ انہیں

کھلاؤ‘ جو خود پہنو انہیں بھی پہناؤ۔ یہ کیسی غلامی ہے! اس پر تو واقعی آزادی قربان کی جا سکتی ہے۔ آپؐ نے ہر شخص کو ذمہ دار ٹھہرایا اور اسے ماتحتوں کے ساتھ نرمی اور عفو کا معاملہ کرنے کی تلقین کی۔ کسی حکمران اور مقتدر کو اپنے زیردستوں پر زیادتی کی اجازت نہ دی‘ بلکہ انہیں احساس دلایا کہ ہر وقت یاد رکھو کہ جس نے آج تمہیں اقتدار اور حکومت دی ہے وہ کل تم سے تمہارے اختیارات کے بارے میں ضرور پوچھے گا‘ لہٰذا ماتحتوں کے بارے میں آخرت کی جواب دہی کے لیے ہر وقت تیار رہو۔

الغرض زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں جہاں آپؐ نے تعلیم نہ دی ہو یا عملی نمونہ پیش نہ کیا ہو۔ آپؐ کے اخلاقِ حسنہ پر کئی کتابیں بھی لکھی جائیں تو موضوع کا حق ادا نہ ہو گا‘ مگر نصیحت حاصل کرنے کے لیے اشارات ہی کافی ہوتے ہیں۔ اخلاق کی یہ خوبیاں آپؐ کی شخصیت کا جزو لاینفک تھیں‘ کیونکہ قرآن کی ساری الہامی تعلیمات پر آپؐ نے عمل کر کے دکھا دیا۔ بقول اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا آپؐ چلتا پھرتا قرآن تھے اور ایسا کیوں نہ ہو‘ آپؐ نے خود فرمایا ہے کہ مجھے اخلاقی خوبیوں کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہے۔

ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اُسوۂ حسنہ سے سبق سیکھے اور مسنون اخلاقی خوبیوں کو اپنانے کی طرف سنجیدگی سے دھیان دے۔

۞۞۞

مساواتِ مَر دوزَن

مرداورعورت اولادِ آدم کی دو اصناف ہیں۔ ہرصنف کی اپنی اہمیت ہے۔ دونوں ایک دوسرے کے لیے ناگزیر ہیں۔ تاہم شکل وشباہت' حقوق وفرائض اور دائرہ عمل میں دونوں کے درمیان واضح فرق ہے۔ عورت کوحسن ظاہری میں مرد سے زیادہ حصہ ملا ہے' نیز اس کی صوتی آہنگ میں نرمی اور ملائمت عیاں ہے' جبکہ مرد کونسبتاً توانا' جفاکش اور متحمل بنایا گیا ہے۔ الغرض عورت کی چال ڈھال' گفتگو اور اندازِ نشست و برخاست سے نسوانیت ٹپکتی ہے جبکہ مرد کی حرکات وسکنات اور کیفیات سے رجولیت مترشح ہوتی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دونوں کی انفرادی خصوصیات ان کے اپنے اپنے دائرہ کار کے لیے انتہائی مفید اور ضروری ہیں۔

جس طرح کوئی سی بھی دو چیزوں میں مساوات کا حکم لگانا آسان کام نہیں اسی طرح مردوزن کے درمیان محض مساوات کا لفظ لگا دینا کافی نہیں' بلکہ دونوں کے حقوق وفرائض اور دائرۂ کار کا تعین بھی ضروری ہے جس میں مساوات کا پہلو بھی سامنے آجائے گا۔ مرد و عورت انسان ہونے اور مخصوص حقوق رکھنے کے ناطے تو بہرحال مساوی ہیں' مگر یہ مساوات تو اپنی نوعیت میں اس قدر سادہ ہے کہ بہت سی مختلف چیزوں میں موجود ہے۔ مثلاً چرندے' پرندے اور درندے بھی ربّ کی مخلوق اور جاندار ہونے میں انسان کے مساوی ہیں۔ اگرچہ دائرۂ کار ہر کسی کا الگ الگ ہے اور جب دائرۂ کار کو زیر بحث لایا جائے گا تو مجموعی اعتبار سے انسان کی دوسرے جانداروں پر فضیلت سامنے آئے گی۔ لیکن ایک صنف کی دوسری اصناف پر فضیلت دوسری اصناف کی مخصوص اہمیت کو چنداں متاثر نہیں کرتی۔ اسی طرح جب مرد وعورت کے دائرۂ کار' عملی زندگی میں حقوق وفرائض اور وظیفہ ہائے زندگی کو زیر بحث لایا جائے گا تو مجموعی طور پر مرد کی عورت پر فضیلت ثابت

ہوگی مگر اس کا یہ مطلب ہرگز نہ ہوگا کہ صنف نازک کو غیر اہم قرار دے دیا جائے۔

ماحول پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں پولیس کے اہلکار' فوجی جوان' کالج کے اساتذہ' انتظامیہ کے افسران' محکمہ ڈاک اور ٹیلی فون کے ملازمین نظر آئیں گے۔ان میں اس اعتبار سے تو مساوات ہے کہ یہ سب حکومت کے کارندے ہیں مگر فرائض کی نوعیت اور اختیارات کی کمی بیشی ان کے درمیان مساوات کا حکم لگانے میں سراسر مانع ہے' اگرچہ ہرگروہ کی اہمیت مسلمہ ہے۔

مرد کی اپنی اہمیت ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے چند مخصوص فرائض کی انجام دہی کے لیے بنایا ہے اور اس کی تخلیق میں طاقت اور شجاعت جیسی صلاحیتیں رکھی ہیں۔تاریخ گواہ ہے کہ دفاعِ وطن یا عزت و ناموس کی حفاظت کی خاطر ہمیشہ مردوں نے ہی اپنی جان جوکھوں میں ڈالی اور میدانِ کارزار میں متصادم ہوئے۔اسی طرح جسمانی مشقت کے کام ہمیشہ سے مرد ہی کرتے چلے آئے ہیں' مگر عورت کی اپنی اہمیت ہے کہ امورِ خانہ داری میں حسن ترتیب اور سلیقے کے ساتھ نہ صرف وہ مرد کو عظیم الشان کاموں کے لیے تیار کرتی ہے بلکہ نئی نسل کے ذکور و اناث کی صلاحیتیں اسی کی گود میں نشوونما پاتی ہیں۔

اسلام منظم اجتماعی زندگی پر یقین رکھتا ہے۔اسلامی تعلیمات کے مطابق چند افراد مل کر سفر کریں تو انہیں اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کر لینا چاہیے۔پس خاندان کے نظام کو منظم رکھنے کے لیے صاحبِ خانہ مرد کو سربراہی سونپی گئی ہے[۱] اور مرد و زن دونوں کو یہ فیصلہ خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا چاہیے کہ یہ ربّ العالمین کی مشیت ہے۔ہم یہاں قرآن و حدیث کی روشنی میں مرد و زن کی امتیازی خصوصیات کا جائزہ لیتے ہیں جس سے اندازہ ہو سکے گا کہ مَرد و زَن میں مساوات کس درجہ کی ہے۔

۱) قرآن پاک میں اوامر و نواہی کے مخاطب عام طور پر مرد ہی ہیں جبکہ تبعاً وہی احکام عورتوں کے لیے بھی ہیں۔ایسا نہیں ہوا کہ مخاطب عورتیں ہوں اور تبعاً مرد بھی ان میں شامل ہوں۔[۲]

۲) قرآن پاک میں واضح طور پر مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت دی گئی ہے۔

سورۃ البقرہ' آیت ۲۲۸ میں ہے: ''عورتوں کے لیے بھی معروف طریقے پر ویسے ہی حقوق ہیں جیسی اُن پر ذمہ داریاں ہیں' البتہ مردوں کو اُن پر ایک درجہ (فضیلت) حاصل ہے''۔

۳) نکاح مرد وعورت کے درمیان ایک معاہدہ ہے جس میں بااختیار فریق مرد کو بنایا گیا ہے۔ نکاح کی ڈور بلا استثناء (exclusively) مرد کے ہاتھ میں ہے' یعنی مرد کو یہ قانونی اختیار ہے کہ وہ جس وقت چاہے عورت کو طلاق دے کر الگ کر سکتا ہے۔ اس کے برعکس اگر عورت اپنے خاوند سے علیحدگی چاہے تو اس کو عدالت میں اپنی مظلومیت ثابت کرنا ہوگی۔(۳)

۴) اسلامی قانونِ شہادت میں بعض معاملات میں دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر سمجھا گیا ہے۔(۴)

۵) اسلامی قانونِ وراثت میں لڑکے کو لڑکی سے دوگنا حصہ ملتا ہے۔(۵)

۶) عورتوں کا گھروں میں بیٹھنا اور چاردیواری کے اندر کے امور انجام دینا پسندیدہ ہے جبکہ مرد کو روزی کی تلاش میں بیرونِ خانہ کی سرگرمیوں کا مکلّف ٹھہرایا گیا ہے۔(۶)

۷) عورت کی نماز مسجد کی نسبت گھر میں پڑھنا پسندیدہ اور افضل ہے اور برآمدے کی نسبت کمرے کے اندر پڑھنا بہتر ہے جبکہ مرد کے لیے لازم ہے کہ وہ مسجد میں جا کر پنج گانہ نماز ادا کرے۔(۷)

۸) مرد کو منتظم خانہ ہونے کے ناطے اپنی عورت کو تادیبی سزا دینے کی اجازت ہے جبکہ عورت اپنے مرد کی اصلاح کے لیے اسے جسمانی سزا نہیں دے سکتی۔ قرآن کریم میں ہے: ''اور جن عورتوں سے تمہیں سرکشی کا اندیشہ ہو انہیں سمجھاؤ' خواب گاہوں میں ان سے علیحدہ رہو اور مارو۔ پھر اگر وہ تمہاری مطیع ہو جائیں تو خواہ مخواہ ان پر دست درازی کے لیے بہانے تلاش نہ کرو''۔(النساء:۳۴)

۹) عورت کا نان ونفقہ اور رہائش کی سہولت مرد کی ذمہ داری ہے۔ عورت پر یہ

ذمہ داری نہیں کہ وہ افراد خانہ کے قیام وطعام کا بندوبست کرے۔(النساء:۳۴)

۱۰) میدانِ جنگ میں جہاد وقتال مردوں کی ذمہ داری ہے اور عورتیں اس سے کلیتاً مستثنیٰ ہیں۔اس کی وجہ صاف ظاہر ہے کہ عورتیں جسمانی کمزوری کے سبب جنگ و جدال' نیزہ اور تیر وتفنگ اٹھانے کے قابل نہیں۔

۱۱) نبوت اور رسالت اللہ تعالیٰ نے صرف مردوں میں رکھی ہے' کسی عورت کو یہ منصب نہیں عطا ہوا۔اس حقیقت پر تاریخِ انسانیت شاہد ہے۔البتہ یہ حقیقت اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے کہ انبیاء ورُسل نے عورتوں کے ہاں ہی جنم لیا۔

۱۲) نماز باجماعت میں امامت صرف مرد ہی کی ذمہ داری ہے۔عورت نماز باجماعت میں آگے کھڑی ہو کر امامت نہیں کر سکتی۔البتہ اگر عورتیں ہی مل کر نماز پڑھ رہی ہوں تو اگلی صف کے درمیان کھڑی عورت ان کی امامت کر سکتی ہے' مگر وہ بھی صف سے آگے نکل کر اکیلی کھڑی نہیں ہوگی۔[۸]

۱۳) نماز جمعہ اور عیدین چونکہ گھر سے باہر نکل کر ادا کرنا ہوتی ہیں اس لیے عورتوں پر فرض نہیں' صرف مردوں پر فرض ہیں۔[۹]

۱۴) مردوں کے لیے صرف ستر کے احکام ہیں جبکہ عورتوں کے لیے ستر کے علاوہ حجاب (پردہ) کے احکام بھی ہیں۔وہ مردوں کی طرح بلا تکلف گھر سے باہر نہیں نکل سکتیں۔[۱۰]

۱۵) شادی شدہ عورت کو قرآن میں محصنہ کہا گیا ہے' یعنی جو کسی مرد کے زیرِ حفاظت آچکی ہو۔گویا مرد عورت کو حفاظت (Protection) فراہم کرنے والا ہے۔[۱۱]

۱۶) ایک مرد ایک ہی وقت میں چار عورتوں کو نکاح میں رکھ سکتا ہے جبکہ ایک عورت کو اجازت نہیں کہ وہ بیک وقت کئی مردوں سے نکاح کر سکے۔[۱۲]

۱۷) حج ارکانِ اسلام میں سے ہے۔مرد کو استطاعت ہو تو جب چاہے سفرِ حج اختیار کر سکتا ہے۔مگر عورت استطاعت کے باوجود حج کا سفر اختیار نہیں کر سکتی جب تک

کوئی محرم مرد اس کے ساتھ جانے والا نہ ہو۔(۱۳)

۱۸) مرد جب چاہے نفلی روزہ رکھ لے۔ مگر شادی شدہ عورت اپنے موجود شوہر کی اجازت سے ہی نفلی روزہ رکھ سکتی ہے۔(۱۴)

۱۹) رسول پاک ﷺ کا فرمان ہے: ''اللہ کے سوا کسی کو سجدہ روا نہیں۔ اگر خدا کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ کرنا جائز ہوتا تو میں عورتوں کو کہتا کہ اپنے شوہروں کو سجدہ کریں''۔(۱۵)

۲۰) جس عورت کو طلاق ہو جائے یا اس کا شوہر فوت ہو جائے تو وہ عدت کی مدت گزار کر ہی دوسرے مرد سے نکاح کر سکتی ہے' مگر کسی مرد کی بیوی فوت ہو جائے یا وہ اسے طلاق دے دے تو وہ بلا انتظار کسی دوسری عورت سے نکاح کر سکتا ہے۔(۱۶)

۲۱) نماز جنازہ صرف مردوں پر فرض ہے' عورتوں پر نہیں۔ یہ بھی اس لیے کہ عورتوں کا گھروں سے باہر نکلنا پسندیدہ نہیں۔(۱۷)

مذکورہ بالا شواہد سے مرد اور عورت کے دائرہ ہائے کار اور حقوق و فرائض کا تعین چنداں مشکل نہیں رہا۔ رہا یہ سوال کہ جدید دور ہے اور اس کے جدید تقاضے ہیں' اس میں آبادی کے نصف حصے کو گھر کی چاردیواری میں پابند رکھنا مناسب نہیں جبکہ عورت نے وہ تمام کام کر دکھائے ہیں جو مرد کرتا ہے۔ تو اس سوال کا جواب یہ ہے کہ مندرجہ بالا شواہد اسلامی تعلیمات پر مبنی ہیں جن کے اصول خود خالقِ کائنات نے وضع کیے ہیں' وہ ہر دور کے تقاضے جانتا ہے' اس لیے یہ اعتراض سرے سے غلط ہے کہ اسلامی تعلیمات جدید تقاضوں کا ساتھ نہیں دے سکتیں۔ البتہ یہ ممکن ہے کہ انسانی ذہن خالقِ فطرت کے وضع کردہ قوانین کو از خود غلط سمجھ بیٹھے' مگر ایسا انسان بھی راہِ گم گشتہ کی کیفیت سے نکل کر اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ خالقِ کائنات کے دیے ہوئے قوانین ہی بہترین ہیں۔ عورت کے حقوق و فرائض کے تعین میں افراط و تفریط کا یہ نیا تجربہ نہیں بلکہ اس سے قبل یہ کئی مرتبہ آزمایا گیا ہے' مگر ہر دفعہ نتائج بد سے بدتر نکلے۔ آج بھی مغرب میں مخلوط معاشرے کا رواج اور عورت پر بیرونِ خانہ کی ذمہ داریاں ڈال کر خاندانی زندگی کو تہہ و

بالا کر دیا گیا ہے اور نتیجتاً یہ یورپی دانشور اپنی غلطی تسلیم کر رہے ہیں اور زبانِ حال سے پکار کر کہہ رہے ہیں کہ مرد و عورت کے وہی حقوق و فرائض جو اسلام نے پیش کیے ہیں متوازن' معتدل اور اقرب الی الفطرت ہیں۔ مشہور فرانسیسی دانشور روسو نے اپنی معرکتہ الآ راء کتاب ''عمرانی معاہدہ''(Social Contract) میں لکھا ہے:

''یہ عورت کے رول میں ہے کہ وہ گھر میں رہے' گھر کو درست رکھے' بچوں کی نگہداشت کرے' گھر کے مردوں کو اس قسم کی تعلیم دے کہ وہ اچھے شہری بن سکیں' مگر عورت کو اس میدان میں خود کبھی دخل نہیں دینا چاہیے''۔

نوبل انعام یافتہ ڈاکٹر ایلیکس کیرل نے اپنی مشہور کتاب ''انسان نا دریافت'' میں لکھا ہے:

''عورتوں کو چاہیے کہ وہ اپنی صلاحیتوں کو خود اپنی فطرت کے مطابق ترقی دیں اور مردوں کی نقل کرنے کی کوشش نہ کریں۔ تہذیب کی ترقی میں ان کا حصہ اس سے زیادہ ہے جتنا مردوں کا ہے۔ ان کو اپنے مخصوص عمل کو نہیں چھوڑنا چاہیے۔''

زمانہ قدیم سے عورت کی حیثیت' مقام اور حقوق و فرائض کے تعین میں افراط و تفریط رہی۔ ہر دفعہ نتیجہ یہی نکلا کہ عورت کی سرگرمیاں گھریلو نوعیت کی ہیں' اسے مردوں کے شانہ بشانہ بیرونِ خانہ کے پرمشقت کاموں میں الجھانا ہمیشہ انتشار و فساد کا باعث ہوا۔ مشہور یونانی فلسفی ارسطو (جس کی وفات ۳۲۲ قبل مسیح میں ہوئی) نے اپنی کتاب ''سیاسیات'' میں لکھا ہے:

''سیاست میں عورت کا کوئی رول نہیں ہے۔ اس کا ان فیصلوں میں کوئی ہاتھ نہیں ہونا چاہیے جو خاندان سے باہر خلقِ خدا کی بہتری کے لیے کیے جاتے ہیں''۔

آج اگر چند عورتوں نے بیرونِ خانہ کے وہ کام جو مردوں کے شایانِ شان ہیں' کر دکھائے ہیں تو اس میں چنداں تعجب کی بات نہیں۔ عورتوں کی ایک قلیل تعداد میں غیر معمولی صلاحیتوں کا پایا جانا مستثنیات میں شمار ہوتا ہے اور مستثنیات کو عموم کا درجہ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کے برعکس عورتوں کی اس کارکردگی نے جو منفی اثرات پیدا کیے ہیں وہ کہیں زیادہ ہیں۔ مغربی معاشرے میں جہاں عورتوں کو کھلے بندوں مردوں کے ساتھ مسابقت

(compete) کرنے کے مواقع ہیں وہاں بھی جن عورتوں کی کارکردگی عمدہ قرار دی جاسکتی ہے ان کی تعداد نہ ہونے کے برابر ہے۔ سائنس کا نوبل پرائز پانے والے ۲۷۸ افراد میں سے صرف چھ عورتیں ہیں۔ امریکہ میں سب سے بڑے سائنسی ادارے نیشنل اکیڈمی آف سائنس کے منتخب ممبران میں عورتوں کی تعداد ڈیڑھ فیصد سے زیادہ نہیں۔ اورتو اور کسی ترقی یافتہ ملک میں بھی زچگی کی ماہرین ڈاکٹر خواتین کی تعداد بھی اس ملک کی ضرورت کے مطابق نہیں بلکہ مرد ماہر ڈاکٹروں کو یہ کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

اگر ان تمام تصریحات کے باوجود کوئی شخص اس بات پر مصر ہو کہ مرد اور عورت میں کامل مساوات اور برابر کی صلاحیتیں ہیں اور عورتوں کو بیرونِ خانہ کے پرمشقت کاموں میں مرد کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے تو یہ اس کی خود فریبی ہے یا پھر اسے ذہنی اور فکری انتشار کا عارضہ لاحق ہے۔

حواشی

(۱) ''مرد عورتوں پر قوام (حکمران ونگران) ہیں اس بنا پر کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس بنا پر کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں''۔ (النساء:۳۴)

(۲) ''اے لوگو جو ایمان لائے ہو تم پر روزے فرض کیے گئے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیے گئے تا کہ تم پرہیز گار بنو'' (البقرۃ:۱۸۳) اور اس طرح کی بے شمار آیات۔

(۳) البقرۃ:۱۴۶،۱۴۴۔

(٤) ''......اور اپنے مردوں میں سے دو آدمیوں کی اس پر گواہی کرالو اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تا کہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے''۔ (البقرۃ:۲۸۲)

(٥) ''تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تمہیں ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے''۔ (النساء)

(٦) ''اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو''۔ (الاحزاب:۳۳)

(۷) ''عورت کا اپنی کوٹھڑی میں نماز پڑھنا اس سے بہتر ہے کہ وہ اپنے کمرے میں نماز پڑھے اور اس کا اپنے اندرونی کمرے میں نماز پڑھنا بیرونی کمرہ میں پڑھنے سے بہتر ہے''۔ (ابوداؤد عن ابن مسعودؓ)

(۸) سنن ابی داؤد۔ دارقطنی۔ بیہقی۔

(۹) سنن ابی داؤد' عن طارق بن شہاب۔

(۱۰) الاحزاب:۵۹۔

(۱۱) النساء:۲۴۔

(۱۲) النساء:۳۔

(۱۳) ترمذی۔ سنن ابی داؤد' عن ابی ہریرہؓ۔

(۱۴) احسن الفتاویٰ از مفتی رشید احمد' جلد چہارم' ص ۵۲۲۔

(۱۵) معارف الحدیث' ج۴' ص ۲۹۴۔

(۱۶) البقرۃ:۲۲۸'۲۳۴۔

(۱۷) بخاری عن اُم عطیہ۔

عورت کا دائرۂ کار

عورت عربی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے پردہ میں رہنے کی چیز۔یعنی وہ شے جو چھپانے کے قابل ہو اور اس کا نظروں کے سامنے آنا طبعاً ناپسندیدہ اور ناگوار ہو۔اسی لیے یہ لفظ انسان کے ان اعضاء کے لیے بھی بولا جاتا ہے جو ہمیشہ چھپائے جاتے ہیں۔عربی زبان میں لفظ عورت مرد (رَجُل) کی مؤنث کے لیے نہیں بولا جاتا۔البتہ اردو زبان میں یہ لفظ زَن (woman) کے معنوں میں مستعمل ہے اور یہ لفظ حوا کی بیٹی کے لیے اسی لیے اختیار کیا گیا ہے کہ وہ ہمہ تن چھپانے کی چیز ہے۔زن کے لیے فارسی میں لفظ مستور استعمال کیا جاتا ہے جس کی جمع مستورات ہے جو اردو میں عام مستعمل ہے۔مستور کا معنی بھی بالکل وہی ہے جو عورت کا معنی عربی زبان میں اوپر مذکور ہوا' یعنی چھپی ہوئی چیز۔

جس شخص نے اسلامی لٹریچر کا تھوڑا بہت بھی مطالعہ کیا ہوگا اس پر یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ عورتوں کا اصل مقام ان کا گھر ہے جہاں ان پر غیر محرم افراد کی نظر نہیں پڑ سکتی۔حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((اَلْمَرْاَۃُ عَوْرَۃٌ)) (سنن الترمذی) یعنی عورت چھپائے جانے کے لائق ہے۔نیز دوپٹہ کے لیے قرآن شریف میں لفظ ''خمار'' استعمال ہوا ہے جس کا لفظی معنی ہے چھپا دینے والی چیز۔عورت گھر سے باہر نکلے تو پردے کے لیے جلباب اوڑھ کر نکلے۔لفظ جلباب قرآن شریف میں مذکور ہے اور اس کا معنی ہے وہ بڑی چادر جو اصل لباس کو بھی ڈھانپ لے' تو گویا قرآن وحدیث کی ان تصریحات کے مطابق عورت لاریب وہ ہے جو پردہ نشین اور ستر و حجاب کی پابندی کرنے والی ہے۔

مسلمانوں کی زندگی میں مخلوط معاشرے کا کوئی تصور نہیں۔یہاں مرد روزی کمانے کے لیے گھر سے باہر بھاری اور پرمشقت کام کرتا ہے جبکہ عورت گھر کے اندر ہلکے پھلکے

کام کرنے کی ذمہ دار ہے۔ عورتوں کے فرائض منصبی گھر کی چار دیواری کے اندر تک محدود ہیں۔ ان کا کام مردوں کے لیے گھر کے اندر پرسکون ماحول کی فراہمی اور اولاد کی صحیح خطوط پر تربیت کرنا ہے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن کو خطاب فرماتا ہے:

﴿وَقَرْنَ فِيْ بُيُوْتِكُنَّ وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْاُوْلٰى﴾ (الاحزاب:٣٣)

''اپنے گھروں میں ٹک کر رہو اور سابق دورِ جاہلیت کی سی سج دھج نہ دکھاتی پھرو''۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ترمذی شریف میں اس طرح نقل ہوا ہے:

''عورت مستور رہنے کے قابل شے ہے' جب وہ باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کو تاکتا ہے''۔

چنانچہ عورتوں کو ان کاموں کا مکلف ہی نہیں ٹھہرایا گیا جن کا تعلق گھر سے باہر کی دوڑ دھوپ سے ہو۔ یہاں تک کہ عورتوں کو جہاد پر جانے سے روک دیا گیا ہے۔ حافظ ابوبکر بزار حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ عورتوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ساری فضیلتیں تو مرد لوٹ کر لے گئے۔ وہ جہاد کرتے ہیں اور خدا کی راہ میں بڑے بڑے کام کرتے ہیں' ہم کیا عمل کریں کہ ہمیں بھی مجاہدین کے برابر اجر مل سکے۔ آپؐ نے جواب میں فرمایا: ''جو تم میں سے گھر بیٹھے گی وہ مجاہدین کے عمل کو پا لے گی''۔ مطلب یہ ہے کہ خاتون خانہ اپنے مرد کو اطمینان کے ساتھ جہاد پر جانے کا موقع دے گی اور اسے اپنے گھر کی طرف سے پورا اطمینان ہوگا کہ اس کی بیوی اس کے گھر اور بچوں کو سنبھالے بیٹھی رہے گی اور اس کی عدم موجودگی میں اپنی عفت و عصمت کی بھی حفاظت کرے گی تو اس کا یہ عمل جہاد ہی سمجھا جائے گا۔

جہاد تو بڑی دُور کی بات ہے' مسلمان عورتوں کو تو جمعہ کی نماز سے بھی مستثنیٰ قرار دے دیا گیا ہے' کیونکہ یہ نماز گھر سے نکل کر صرف مسجد ہی میں ادا ہو سکتی ہے۔ حالانکہ

نمازِ جمعہ وہ نماز ہے جس کے ادا کرنے کی مردوں کو سخت تاکید کی گئی ہے۔ ایک موقع پر رسول پاک ﷺ نے فرمایا: ''میں چاہتا ہوں کہ ان لوگوں کے گھروں کو آگ لگا دوں جو بلاعذر جمعہ کی نماز کے لیے مسجد میں نہیں آتے''۔ مردوں کے لیے روزانہ کی نماز پنج گانہ بھی محلے کی مسجد میں پابندیٔ وقت کے ساتھ جماعت کی صورت میں ادا کرنا فرض قرار دیا گیا ہے جبکہ عورت کو پانچوں نمازیں گھر پر ادا کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ مسند احمد اور طبرانی میں مذکور ہے کہ اُم حمید ساعدیہؓ کہتی ہیں کہ میں نے عرض کیا یارسول اللہ مجھے آپؐ کے پیچھے نماز پڑھنے کا بہت شوق ہے۔ آپؐ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''تمہارا اپنے کمرے میں نماز پڑھنا برآمدے میں پڑھنے سے بہتر ہے اور تمہارا اپنے گھر میں نماز پڑھنا اپنے محلے کی مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے اور تمہارا اپنے محلے کی مسجد میں نماز جمعہ پڑھنا جامع مسجد میں پڑھنے سے بہتر ہے''۔ حضرت اُم سلمہ رضی اللہ عنہا کی ایک روایت میں جو احمد اور طبرانی میں ہے' آنحضور ﷺ کے الفاظ یہ ہیں:

((خَيْرُ مَسَاجِدِ النِّسَاءِ قَعْرُ بُيُوْتِهِنَّ))

''عورتوں کے لیے بہترین مسجدیں ان کے گھروں کے اندرونی حصے ہیں''۔

چونکہ عورت کا دائرۂ کار اور اس کی سرگرمیاں گھر کی چار دیواری کے اندر تک محدود ہیں اس لیے بیرون خانہ کے کاموں کی ذمہ داری اس پر ڈالی ہی نہیں گئی۔ اس کے جملہ اخراجات اور ضروریات کی کفالت مرد کے ذمہ ہے۔ قرآن پاک میں جہاں مردوں کی عورتوں پر ایک گونہ فضیلت کا ذکر ہے وہاں اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ وہ (مرد) ان پر اپنا مال خرچ کرتے ہیں' یعنی ان کی کفالت کے ذمہ دار ہیں۔ گویا عورت کو معاشی ذمہ داریوں سے آزاد رکھا گیا ہے۔

عورت سرتاپا چھپانے کی چیز ہے' یہاں تک کہ اس کی آواز بھی غیر محرم مردوں کے کانوں تک نہیں پہنچنی چاہیے۔ اور اگر کبھی ایسا ضروری ہو جائے تو قرآن پاک میں تعلیم (بحوالہ آیت ۳۲' سورۃ الاحزاب) یہ ہے کہ ایسے موقع پر عورت کا لہجہ اور اندازِ گفتگو غیر ملائم اور بھاری سا ہونا چاہیے تاکہ مخاطب کو نہ تو آواز میں دلکشی اور نسوانیت محسوس ہو اور

نہ اسے کسی طرح کے لالچ کی راہ نظر آئے۔ اسی بنا پر عورت کے لیے اذان دینا ممنوع ہے۔ بلکہ اگر کبھی ایسی صورت پیدا ہو جائے کہ نماز باجماعت میں پیچھے کوئی عورت بھی موجود ہو اور امام غلطی کرے تو مرد کی طرح اسے ''سبحان اللہ'' کہنے کی اجازت نہیں بلکہ اسے ہاتھ پر ہاتھ مار کر آواز پیدا کرنی چاہیے تا کہ امام متنبہ ہو جائے۔

سورۃ النور کی آیت ۳۱ میں مسلمان عورتوں کو تلقین کی گئی ہے کہ وہ اپنے پاؤں زمین پر مارتی ہوئی نہ چلا کریں کہ اپنی جو زینت انہوں نے چھپا رکھی ہے اس کا لوگوں کو علم ہو جائے۔ مزید یہ کہ اگر اشد ضرورت کے تحت عورت کو گھر سے باہر نکلنا ہو تو زیورات کی جھنکار کے اظہار کی بھی اسے ممانعت ہے اور خوشبو لگانے سے بھی روکا گیا ہے۔

سورۃ الاحزاب کی آیت ۵۹ کی تفسیر میں امام ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے نقل کرتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ مسلمان عورتوں کو حکم دیتا ہے کہ جب وہ اپنے کسی کام کے لیے گھر سے باہر نکلیں تو جلباب اوڑھ کر اپنا چہرہ ڈھانپ لیں۔ اور جلباب کا معنی اوپر مذکور ہوا' یعنی وہ چادر جو جسم پر اس طرح لپیٹ لی جاتی ہے کہ اس سے لباس بھی چھپ جاتا ہے۔

مذکورہ بالا توضیحات سے یہ بات اظہر من الشّمس ہے کہ قرآن وسنت کی تعلیمات کے مطابق عورت کا دائرہ کار گھر کے اندر تک محدود ہے اور اگر اسے ناگزیر حالات میں گھر سے باہر جانا پڑے تو اسے ایک بڑی چادر سے اپنے جسم بلکہ کپڑوں تک کو ڈھانپ کر نکلنا چاہیے۔ تاریخِ اسلام کا مطالعہ کرنے والوں پر یہ چیز مخفی نہیں کہ عہدِ رسالت مآبؐ اور دورِ خلافت راشدہ میں مسلمان عورتیں منشائے اسلام کے مطابق پردے کی سخت پابندی کرتی تھیں۔ البتہ چند واقعات ایسے بھی ملتے ہیں جن سے اگرچہ کسی طرح کی غلط فہمی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہیں تاہم کج رو اور زیغ پسند طبائع ان سے فائدہ اٹھانے کی ناکام کوشش کر سکتے ہیں' چنانچہ یہاں ان کا تذکرہ کر دینا بھی بات کو مزید واضح کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے۔

(۱) حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا کی زندگی میں معاشی جدوجہد کی مثال ملتی ہے' مگر

اوّل تو یہ ان کے رسول پاک ﷺ کی زوجیت میں آنے اور قبولِ اسلام سے پہلے کی بات ہے لہٰذا یہ حجت نہیں' دوم یہ کہ وہ معاشی جدوجہد گھر کے اندر بیٹھ کر کرتی تھیں اور خود باہر نہیں گھومتی تھیں۔ سوم یہ اُس وقت کا ذکر ہے جب ان کے شوہر فوت ہو چکے تھے اور اُن کی کفالت کرنے والا کوئی نہیں تھا مگر جب وہ آنحضرت ﷺ کی زوجیت میں آئیں تو اب کفالت کی ذمہ داری آپؐ نے لے لی اور اُم المؤمنینؓ نے معاشی جدوجہد ترک کر دی۔ اسی طرح ازواجِ مطہرات اور صحابیات رضی اللہ عنہن میں شاید ہی کوئی عورت ہو جو معاشی جدوجہد میں مصروف نظر آتی ہو۔

(۲) جنگ بدر میں چند صحابیاتؓ نے میدانِ جنگ میں زخمیوں کی مرہم پٹی کی تو سمجھ لینا چاہیے کہ اوّل تو جنگ بدر کا یہ واقعہ سورۃ النور اور سورۃ الاحزاب (جن میں پردے کے احکام نازل ہوئے) کے نزول سے پہلے کا واقعہ ہے لہٰذا حجت نہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ صورت بھی اضطراری تھی' کیونکہ یہ کفر و اسلام کے درمیان پہلی جنگ تھی اور مسلمانوں کے لیے تخت یا تختہ والا معاملہ تھا۔ تیسرے یہ کہ بعد کے کسی غزوے میں عورتوں کا اس طرح میدانِ جنگ میں کام کرنا ثابت نہیں بلکہ بعد کی ایک جنگ کے موقع پر کچھ عورتیں اس مقصد کے لیے گھروں سے نکلیں' آنحضور ﷺ کو معلوم ہوا تو آپؐ نے ناگواری کا اظہار کیا اور انہیں واپس گھروں کو بھیج دیا اور پھر کبھی مسلمان عورتوں کو میدانِ جنگ میں نہ جانے دیا۔

(۳) جنگ جمل میں حضرت عائشہ الصدیقہ رضی اللہ عنہا نے بذاتِ خود حصہ لیا مگر معلوم ہونا چاہیے کہ خود حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا خیال اس بارے میں کیا تھا۔ عبداللہ بن احمد بن حنبلؒ نے زوائد الزھد میں اور ابن المنذر' ابن ابی شیبہ اور ابن سعد نے اپنی کتابوں میں مسروق رحمۃ اللہ علیہ کی روایت نقل کی ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب قرآن پاک کی تلاوت کرتے ہوئے اس آیت وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ...... الخ پر پہنچتی تھیں تو بے اختیار رو پڑتی تھیں یہاں تک کہ ان کا دوپٹہ بھیگ جاتا تھا' کیونکہ انہیں اس پر وہ غلطی یاد آ جایا کرتی تھی جو اُن سے جنگ جمل میں ہوئی تھیں۔

(۴) عورت کے لیے ستر وحجاب کی یہ پابندی فحاشی اور زنا کاری کی روک تھام کے لیے تھی مگر اس کے باوجود عہدِ رسالت مآبؐ میں زنا کے اِکا دُکا واقعات پیش آئے اور مجرموں کو سزا بھی دی گئی ۔تو اس میں تو کوئی شک نہیں کہ رسالت مآبؐ کے پاکیزہ عہد میں ستر وحجاب کی پابندی کے نتیجہ میں نہایت مطہر معاشرہ قائم ہو چکا تھا مگر جاننا چاہیے کہ وہ لوگ بھی آخر انسان ہی تھے اور انسانوں کا معاشرہ جرائم سے قطعی پاک نہیں ہوسکتا۔ دوسرے یہ کہ اگر یہ واقعات پیش نہ آتے تو آنحضرت ﷺ مجرموں پر حد جاری نہ کرتے اور بعد میں اعتراض ہوسکتا تھا کہ قذف وزنا کی اتنی سخت سزا نظری طور پر تو درست ہوسکتی ہے مگر اس پر عمل درآمد ممکن نہیں اور ناممکن کا حکم حکمت کے خلاف ہے۔ چنانچہ عہدِ رسالت میں قذف وزنا کے مجرموں کو سزا دے کر حدود پر عمل درآمد کی مثال قائم کر دی گئی۔ آج تو معاشرہ اتنا صاف ستھرا نہیں تو ایسے میں تو ستر وحجاب کی پابندی اور بھی ضروری ہو جاتی ہے۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ گھر عورت کے لیے قید خانہ نہیں بنایا گیا' بلکہ جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' ضرورت کے تحت وہ بڑی چادر اوڑھ کر باہر نکل سکتی ہے' لہٰذا گھر کے باہر کی تمام ناگزیر سرگرمیوں میں وہ حصہ لے سکتی ہے۔ بچیاں سکول جائیں' خواتین انہیں پڑھانے کے لیے تعلیمی اداروں کی طرف چل کر جائیں۔ طالبات طب کی تعلیم حاصل کر کے زنانہ ہسپتالوں میں ملازمت اختیار کریں یا اپنے کلینک کھول لیں وغیرہ۔ مگر ان ناگزیر صورتوں سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے نوجوان لڑکیوں کو بینک' ڈاک خانے اور دوسرے دفاتر میں حسن وزیبائش کی نمائش کرتے ہوئے مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنے کی اجازت دینا ہرگز ہرگز قرین انصاف نہیں۔ پھر ہمارے ہاں تو مرد جو بنیادی طور پر کفیلِ خانہ ہیں' ہر قسم کی صلاحیت اور تعلیم کے باوجود تلاشِ روزگار میں پریشان اور سرگرداں ہیں اور اس صورتِ حال نے تعلیم یافتہ بے روزگار نوجوانوں میں بغاوت کا جذبہ پیدا کر دیا ہے اور یہ ہونہار نوجوان جرائم کا راستہ اختیار کرنے پر اپنے آپ کو مجبور پا رہے ہیں۔ ایسے میں اگر مردوں کو نظر انداز کر کے عورتوں کو ملازمتیں دی جائیں تو اس

سے اچھے نتائج کی توقع قطعاً کارِ عبث ہے۔

خلاّقِ کون و مکاں نے حسن و جمال میں عورت کو وافر حصہ عطا کیا ہے اور وہ فطرتاً خوبصورت نظر آنا چاہتی ہے۔ قدرت نے جس حکمت کے تحت عورت میں یہ دلکشی رکھی ہے وہ کسی صاحبِ بصیرت سے مخفی نہیں۔ چنانچہ اس جذبے کی تسکین کے لیے اسلام میں عورت کو زیورات پہننے' سجاوٹ کرنے اور جسمانی زینت و آرائش اختیار کرنے کی اجازت دی گئی ہے مگر اس زیب و زینت کا اظہار گھر کی چار دیواری کے اندر صرف شوہر کے سامنے جائز ہے اور ان افرادِ خانہ کے سامنے جو اس کے محرم ہیں' یعنی جن کے ساتھ اس کا نکاح کسی حال میں نہیں ہوسکتا' مثلاً باپ' بھائی' بیٹا' چچا وغیرہ۔ اس طرح عورت کے فطری جذبہ کی تسکین بھی ہو جاتی ہے اور کسی فتنے کا بھی کوئی امکان نہیں رہتا۔ مگر عورت کا پوری دلکشی اور رعنائی کے ساتھ نیم عریاں لباس' ننگے سر' سراپا نمائش گھر سے نکلنا اسلامی معاشرے میں کسی طرح فٹ نہیں بیٹھتا۔ اسلام تو اس انداز کو جاہلیت کی سج دھج قرار دیتا ہے۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب کی آیت ۳۲ کے تحت دورِ جدید کے مفسر مولانا ابوالاعلیٰ مودودیؒ لکھتے ہیں:

''......اب یہ ذرا سوچنے کی بات ہے کہ جو دین عورت کو غیر مرد سے بات کرتے ہوئے بھی لوچدار اندازِ گفتگو اختیار کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور اسے مردوں کے سامنے بلاضرورت آواز نکالنے سے بھی روکتا ہے' کیا وہ کبھی اس کو پسند کرسکتا ہے کہ عورت سٹیج پر آ کر گائے' ناچے' تھرکے' بھاؤ بتائے اور ناز و نخرے دکھائے؟ کیا وہ اس کی اجازت دے سکتا ہے کہ ریڈیو پر عورت عاشقانہ گیت گائے اور سریلے نغموں کے ساتھ فحش مضامین سنا سنا کر لوگوں کے جذبات میں آگ لگائے؟ کیا وہ اسے جائز رکھ سکتا ہے کہ عورتیں ڈراموں میں کبھی کسی کی بیوی اور کبھی کسی کی معشوقہ کا پارٹ ادا کریں؟ یا ہوائی میزبان (Air Hostess) بنائی جائیں اور انہیں خاص طور پر مسافروں کا دل لبھانے کی تربیت دی جائے؟ یا کلبوں اور اجتماعی تقریبات اور مخلوط مجالس میں بن ٹھن کر آئیں اور مردوں سے خوب گھل مل کر بات چیت اور ہنسی مذاق کریں؟ یہ کلچر آخر کس قرآن سے برآمد

کی گئی ہے؟ خدا کا نازل کردہ قرآن تو سب کے سامنے ہے' اس میں کہیں اس کلچر کی گنجائش نظر آتی ہو تو اس مقام کی نشاندہی کر دی جائے ...... اللہ تعالیٰ جس طرزِ عمل سے عورتوں کو روکنا چاہتا ہے وہ ان کا اپنے حسن کی نمائش کرتے ہوئے گھروں سے باہر نکلنا ہے۔ وہ ان کو ہدایت فرماتا ہے کہ اپنے گھروں میں ٹک کر رہو' کیونکہ تمہارا اصل کام گھر میں ہے نہ کہ اس کے باہر۔ لیکن اگر باہر نکلنے کی ضرورت پیش آئے تو اس شان کے ساتھ نہ نکلو جس کے ساتھ سابق دورِ جاہلیت میں عورتیں نکلا کرتی تھیں۔ بن ٹھن کر نکلنا' چہرے اور جسم کے حسن کو زیب و زینت اور چست لباسوں یا عریاں لباسوں سے نمایاں کرنا اور ناز و انداز سے چلنا ایک مسلم معاشرے کی عورتوں کا کام نہیں ہے۔ یہ جاہلیت کے طور طریقے ہیں جو اسلام میں نہیں چل سکتے۔ اب یہ بات ہر شخص خود دیکھ سکتا ہے کہ جو ثقافت ہمارے ہاں رائج کی جا رہی ہے وہ قرآن کی رو سے اسلام کی ثقافت ہے یا جاہلیت کی ثقافت۔ البتہ اگر کوئی اور قرآن ہمارے کارفرماؤں کے پاس آ گیا ہے جس سے اسلام کی یہ روح نکال کر مسلمانوں میں پھیلائی جا رہی ہے تو دوسری بات ہے''۔ (تفہیم القرآن' جلد چہارم' ص۸۹ تا ۹۲)

فاعتبروا یا اولی الابصار

بدعات کیوں قابلِ مذمت ہیں؟

اسلام اللہ تعالیٰ کا پسندیدہ دین ہے۔ یہی اُس نے انسانوں کے لیے منتخب کیا ہے۔ جو کوئی بھی اسلام کے علاوہ کوئی اور طریقۂ زندگی اختیار کرے گا تو وہ قبول نہیں کیا جائے گا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾ (آل عمران:۸۵)

''اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا تو وہ اُس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔''

وجہ اس کی یہ ہے کہ دین اسلام کے قواعد وضوابط اور اوامر ونواہی خود انسان کے خالق نے بنائے ہیں اور خالق اپنے علم' قدرت' اختیار اور حکمت میں بے مثل و بے مثال ہے۔ اس کی تخلیق میں کسی طرح کا عیب یا نقص نہیں ہو سکتا' کیونکہ وہ خود ہر کمزوری اور عیب سے پاک ہے۔ اس نے جو ضابطۂ حیات انسان کے لیے پسند کیا ہے وہ ہر لحاظ سے مکمل ہے۔ اس بات کا اعلان خود اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ دُنیوی کے آخری ایام میں ان الفاظ کے ساتھ کر دیا تھا:

﴿اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا ۭ﴾ (المائدۃ:۳)

''آج کے دن مَیں نے تمہارے لیے تمہارا دین (ضابطۂ حیات) مکمل کر دیا' اور تمہارے اوپر اپنی نعمت تمام کر دی اور تمہارے لیے اسلام کو بطورِ دین پسند کر لیا''۔

یوں اللہ تعالیٰ نے دین اسلام کی تکمیل رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ میں کر دی۔ اب قرآن اسلامی تعلیمات کا سرچشمہ ہے اور رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ اُس کا عملی نمونہ۔ چنانچہ قرآن پاک میں جگہ جگہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے اور

آپ ؐ کی زندگی کو بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ......﴾ (الاحزاب: ۲۱)

''بے شک تمہارے لیے رسول اللہ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے''۔

پھر فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَلَا تُبْطِلُوْٓا اَعْمَالَكُمْ﴿۳۳﴾﴾ (محمد)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! اللہ کی اطاعت کرو اور رسول ؐ کی اطاعت کرو اور (اس کے خلاف کر کے) اپنے اعمال ضائع نہ کرو۔''

اب مسلمان کا کام یہ ہے کہ وہ اپنے شب و روز کے مشاغل میں سیرتِ طیبہ سے راہنمائی حاصل کرے' کیونکہ سیرتِ طیبہ ہی وہ طرزِ زندگی ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ آپ ؐ کے طرزِ عمل کے خلاف کام کرنے سے سختی کے ساتھ منع کر دیا گیا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿وَمَنْ يُّشَاقِقِ الرَّسُوْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ۭ وَسَاۗءَتْ مَصِيْرًا﴿۱۱۵﴾﴾ (النساء)

''اور جو کوئی خلاف کرے رسول کے' بعد اس کے کہ اس پر ہدایت واضح ہو چکی' اور پیروی کرے مسلمانوں کی راہ کے علاوہ کسی دوسری راہ کی تو ہم پھیر دیں گے اس کو جدھر کو وہ پھرا اور ہم اس کو جہنم میں داخل کریں گے' اور وہ بری جگہ ہے پھر جانے کی''۔

اسی پر بس نہیں بلکہ اللہ اور رسول کی خلاف ورزی پر قیامت کے دن کی رسوائی اور ندامت کا نقشہ بھی آنکھوں کے سامنے کر دیا کہ اُس وقت اپنے خلافِ سنت عمل پر پچھتاوا کسی کام نہ آئے گا۔ آج موقع ہے کہ وہی کام کیے جائیں جو رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر کیے اور جن کے کرنے کا حکم دیا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿يَوْمَ تُقَلَّبُ وُجُوْهُهُمْ فِي النَّارِ يَقُوْلُوْنَ يٰلَيْتَنَآ اَطَعْنَا اللّٰهَ وَاَطَعْنَا الرَّسُوْلَا﴿۶۶﴾﴾ (الاحزاب)

''جس دن پھیرے جائیں گے اُن کے چہرے آگ کے اندر' کہیں گے اے
کاش! ہم نے فرمانبرداری کی ہوتی اللہ کی اور اطاعت کی ہوتی رسول کی''

پس دانش مندی کا تقاضا یہی ہے کہ ہر مسلمان رسول اللہ ﷺ کی سادہ اور صاف زندگی کو نمونہ بناتے ہوئے وہی کام کرے جو آپ ؐ نے کیے ہیں یا اُن کا حکم دیا ہے۔ یہاں یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ آپ ؐ نے خلفائے راشدین کے عمل کو بھی سند کا درجہ دیا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر کوئی چیز کتاب و سنت میں واضح نہ ہو تو صحابہ کرام ؓ کے مجمع علیہ عمل کی پیروی کرو۔ آپ ؐ نے فرمایا:

((فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِيْنَ الْمَهْدِيِّيْنَ)) (ابو داوٗد' ترمذی)

''پس تمہارے اوپر لازم ہے کہ میرا طریقہ اختیار کرو اور میرے ہدایت یافتہ اور
راست رو خلفاء کا طریقہ اختیار کرو''۔

یوں آپ ؐ نے اُمت کے لیے مزید آسانی پیدا کر دی کہ اگر کسی معاملے میں سنت سے راہنمائی نہ مل رہی ہو تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا عمل دیکھ لیا جائے' کیونکہ صحابہ وہ لوگ تھے جنہوں نے خود رسول اللہ ﷺ سے دین سیکھا۔ وہ قرآن کو خوب سمجھتے تھے اور رسول اللہ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ ان کے سامنے تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی ہمہ وقت صحبت نے انہیں مزاجِ رسول کا شناسا بنا دیا تھا' لہٰذا ان کا طریقہ بھی سنت کی طرح مستند اور محفوظ ہے۔ اس کے علاوہ آپ ؐ نے کسی کے عمل کو سند کا درجہ عطا نہیں کیا۔ تو اب ضروری ہوا کہ کتاب و سنت اور تعامل صحابہ تک محدود رہا جائے' کیونکہ اس کے علاوہ کسی عمل کو سند حاصل نہیں ہے کہ اسے اختیار کیا جائے۔

بدعت اُس کام کو کہتے ہیں جو بظاہر اچھا اور خوشنما ہو مگر نہ تو قرآن و سنت میں موجود ہو اور نہ ہی صحابہ کرام ؓ کے عمل و کردار کا حصہ رہا ہو۔ ایسا کام خوشنما نظر آنے کے باوجود شریعت اسلامیہ میں ناپسندیدہ بلکہ گمراہی ہے۔ ایک صحیح حدیث میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((...... مَنْ يَعِشْ مِنكُمْ بَعْدِيْ فَسَيَرَى اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ' فَعَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الْمَهْدِيِّيْنَ الرَّاشِدِيْنَ' تَمَسَّكُوْا بِهَا وَ عَضُّوْا عَلَيْهَا

بِالنَّوَاجِذِ ' وَاِيَّاكُمْ وَمُحْدَثَاتِ الْاُمُوْرِ ' فَاِنَّ كُلَّ مُحْدَثَةٍ بِدْعَةٌ وَكُلَّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) (ابو داوٗد' ترمذی)

''جو کوئی تم میں سے میرے بعد زندہ رہے گا وہ عنقریب بہت سے اختلافات دیکھے گا۔ پس تم پر میرے اور میرے ہدایت یافتہ اور راست رو خلفاء کے طریقے کی پیروی لازم ہے' اس کے ساتھ چمٹ جاؤ اور اسے اپنے دانتوں سے مضبوطی سے پکڑے رہنا' اور نئے نئے کاموں سے بچتے رہنا' کیونکہ ہر نیا کام بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔

بدعت اس لیے مردود و مسترد ہے کہ یہ دین میں مداخلت ہے۔ دین تو مکمل ہو چکا' زندگی کے شب و روز گزارنے کا مستند اور محفوظ طریقہ ہمارے پاس موجود ہے' اب اس میں کسی طرح کے اضافے کی گنجائش نہیں۔ جس طرح دین میں کسی طرح کی کمی کرنا جائز نہیں اسی طرح اضافہ بھی جائز نہیں' کیونکہ متناسب اور مکمل چیز وہی ہوتی ہے جس میں کمی بھی اُس کے کمال میں نقص پیدا کر دے اور اضافہ بھی بگاڑ پیدا کرے۔ عام طور پر کمی کا نقص پیدا کرنا تو سمجھ میں آ جاتا ہے مگر اضافہ ناگوار معلوم نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا میں ہم انسان کی بنائی ہوئی کسی بھی مکمل اور خوبصورت چیز میں اضافے کی گنجائش موجود پاتے ہیں' اسی طرح دین کو بھی مزید مزین کرنے کی کوشش کو ناپسندیدہ نہیں سمجھتے' حالانکہ ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دین تو اللہ کا بنایا ہوا اور مکمل کیا ہوا ہے' اس میں اب ذرّہ برابر اضافہ بھی اُسی طرح اس کے حسن کو متأثر کرے گا جس طرح اس میں سے کسی شے کو کم کر دینا۔ دین اسلام کی تکمیل کو انسان کی مکمل کردہ شے کی طرح سمجھنا سخت نادانی ہے۔ ایک شخص اپنا مکان تعمیر کرتا ہے' اس پر کثیر رقم خرچ کر کے ضرورت کی ہر شے مہیا کرتا ہے' عمارت کے ظاہری حسن کو قیمتی پتھروں اور رنگ برنگے شیشوں کے ساتھ مزین کرتا ہے' بجلی کے قمقموں کے ساتھ روشنی کا وافر بندوبست کرتا ہے' گویا اس کو ہر لحاظ سے مکمل کر لیتا ہے۔ یہ کام ایک انسان نے انتہائی جدوجہد کر کے اور ضروری وسائل استعمال کر کے مکمل کیا ہے' مگر عین ممکن ہے کہ اس کا کوئی دوست اس کے ہاں آئے اور صاحب خانہ کو کوئی خامی بتائے اور مزید بہتر کرنے کی تجویز دے جسے صاحب خانہ بھی

تسلیم کرلے۔مگر دین میں جو خدا کا بنایا ہوا ہے اور مکمل کیا ہوا ہے اس میں اس طرح کی قطعاً گنجائش نہیں ہے کہ کوئی شخص اس میں اضافہ تجویز کرے اور وہ قبول بھی کرلیا جائے۔

اللہ تعالیٰ نے انسان کو احسن تقویم بنایا۔ خوبصورت شکل وصورت اور متناسب اعضاء وجوارح عطا کیے۔ اگراس کے کسی عضو میں خامی واقع ہو جائے تو اس کے جسم میں نقص پیدا ہو جائے گا۔ مثال کے طور پر انسان کے چہرے پر دو آنکھیں سجائی گئی ہیں' اگر خدانخواستہ ایک آنکھ ضائع ہو جائے یا بالکل بند ہو جائے تو انسان کا وہی خوبصورت چہرہ بھیانک صورت اختیار کرلے گا۔ اسی طرح انسان کی متناسب اور موزوں ترکیب میں اضافہ بھی نقص اور برائی پیدا کردے گا۔ غور کیجیے اگر کسی آدمی کے چہرے پر دو کی بجائے تین آنکھیں ہوں تو کیا اس ایک آنکھ کا اضافہ اس کو حسین تر کردے گا؟ ہرگز نہیں' بلکہ وہ تو اسے بدصورت بنا دے گا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو چیز کمال کی انتہا پر ہو اُس میں کسی اضافے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ صاف ظاہر ہے کہ جس چیز میں ابھی مزید بہتری کی گنجائش ہو اسے اکمل اور مکمل تو نہیں کہا جاسکتا۔ پہلے ذکر ہو چکا کہ انسان کی بنائی ہوئی کوئی شے اکمل اور مکمل ایک حد تک تو ہوسکتی ہے' مگر ایسا نہیں ہوسکتا کہ اس میں مزید خوبی پیدا کرنے کی گنجائش نہ ہو' کیونکہ انسان بہرحال انتہا درجے کی ذہانت اور صلاحیت کے باوجود کمزوریاں رکھتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کا یہ معاملہ نہیں' وہ ہر طرح کے عیب اور کمزوری سے پاک ہے۔ اس لیے اس کا ہر کام کمالِ حکمت کا مظہر ہے۔ اس نے جس چیز کو تکمیل کے آخری مرحلے پر پہنچا دیا اب اس میں کمی کرنا اور زیادتی کرنا دونوں ایک جیسے جرم ہیں۔

دین اسلام کو اللہ تعالیٰ نے مکمل کر دیا۔ اب جو چیزیں اس میں داخل کر دی گئی ہیں بس وہی اس کے اجزاء ہیں۔ اگر اس کے اجزاء میں اضافہ کیا جائے گا تو وہ دین کے چہرے کو مزید خوشنما نہیں بنائے گا بلکہ بدنما کر دے گا۔ اسی لیے جو شخص رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو انسانیت کے لیے اُسوۂ حسنہ سمجھتا ہے اس کے دل میں تو کبھی یہ خیال نہیں گزر سکتا کہ رسول اللہ ﷺ کی مسنون چیزوں کے علاوہ بھی کوئی چیز دین کا جزو بن کر محلِ ثواب ہو سکتی ہے۔ آپؐ کی زندگی میں بچوں کی پیدائش اور خوشی کے دیگر مواقع بھی آئے'

چھوٹوں اور بڑوں کی وفات کا غم بھی آپ ؐ کو پیش آیا۔ ایسے مواقع پر رسول اللہ ﷺ کا طرزِ عمل ہی پسندیدہ' جامع اور مکمل ہے' اس پر کسی طرح کا اضافہ نہ صرف یہ کہ قابل تحسین نہیں بلکہ مذمت کے لائق ہے۔

دین مکمل ہو چکا۔ اب ہمارا فرض ہے کہ اس کے اوامر پر عمل کریں اور نواہی سے رکیں' اپنی طرف سے دین کے کسی کام میں ہرگز نہ کوئی کمی کریں اور نہ اضافہ' یہ دونوں ہی مذموم ہیں۔ کمی کا برا ہونا تو ظاہر ہے مگر زیادتی بھی اتنی ہی بری ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اَحْدَثَ فِيْ اَمْرِنَا هٰذَا مَا لَيْسَ مِنْهُ فَهُوَ رَدٌّ)) (متفق عليه)

''جس شخص نے ہمارے اس دین میں کوئی ایسی بات پیدا کی جو دین میں نہیں تو وہ نامقبول ہے''۔

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ بدعت کی تعریف اس طرح کرتے ہیں:

''ایسا کام کرنا جس کی اصل کتاب وسنت اور قرونِ مشہود لہا بالخیر میں نہ ہو اور اس کو دین اور ثواب کا کام سمجھ کر کیا جائے۔''

پس دین کے اندر کچھ تہواروں اور رسوم کا اپنی طرف سے اضافہ بدعت ہی ہے۔ اس کی ایک واضح پہچان یہ ہے کہ ان تہواروں کے منانے یا رسوم کی ادائیگی کا پروگرام شریعت سے نہیں ملے گا' بلکہ خود انسانوں کو اپنی خواہش کے مطابق ترتیب دینا ہوگا۔ غور کیجیے عید الفطر اور عید الاضحیٰ اسلامی تہوار ہیں۔ ان تہواروں کو منانے کا طریقہ اور پروگرام آپ کو قرآن وسنت اور عمل صحابہؓ سے مل جائے گا۔ اس کے علاوہ اگر کسی دن کو عید کا نام دیا جائے تو اس دن کا پروگرام کہاں سے لیا جائے گا؟ ظاہر ہے کہ انسان اپنی پسند کے مطابق وہ پروگرام وضع کرے گا۔ تو کسی انسان کا وضع کردہ پروگرام دین کا حصہ کیسے بن سکتا ہے! پھر اسلام کی تعلیمات میں اور بہت کچھ ڈالا جا سکتا تھا' مگر دانستہ طور پر خالق نے اوامر کو مختصر اور سادہ رکھا تاکہ اس پر عمل کرنا عوام الناس کے لیے آسان ہو۔ یہ تو بنی اسرائیل کا طریقہ تھا کہ انہوں نے بہت سے رسوم ورواج دین کے نام پر شروع کر دیے

تھے اور اس طرح دین کو مشکل بنا دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو بھیج کر اُن اِصر واَغلال (دیکھئے الاعراف:۱۵۷) کے بوجھ سے انسان کو آزاد کیا اور دین میں آسانی پیدا کی' اور یہی اللہ کی مرضی بھی ہے۔ ارشادِ ربانی ہے:

﴿يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ﴾ (البقرۃ:۱۸۵)

''اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے اور وہ تمہارے لیے تنگی نہیں چاہتا''۔

پس دین کے اندر اضافے کر کے دین کی سادگی کو قائم نہ رہنے دینا اور مشکلات پیدا کرنا ہرگز محمود عمل نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ انسانوں کو قرآن کے الفاظ میں حکم دیتا ہے یا رسول اللہ ﷺ کی زبان سے احکام صادر فرماتا ہے۔ ایسے احکام کی تعمیل لوگوں پر لازم ہوتی ہے۔ یا پھر صحابہ کا عمل لوگوں کے لیے اختیار کرنا جائز ہے۔ اس کے علاوہ آج کون ہے جو اپنی طرف سے اُمت محمدؐ کو کسی کام کے بجالانے کا حکم خود اپنی خواہش کے مطابق دے سکے اور اُمت اُس کے اختیار کرنے کی بھی اسی طرح پابند ہو جیسے کتاب وسنت کے احکام کی؟ یہ طرزِ عمل تو خود کو رسولؐ کے مقام پر لا کھڑا کرنے کے مترادف ہے جو نری ہلاکت ہے۔ پس بدعات سے بچنا نہایت ضروری ہے۔ ہمارے لیے وہی اعمال بہت کافی ہیں جو شریعت میں ہمارے لیے مقرر کر دیے گئے ہیں۔ اگر ہم ان کو صحیح انداز میں اپنا سکیں تو فھو المطلوب۔

بدعت انتہائی نامعقول عمل ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ وَكُلُّ ضَلَالَةٍ فِي النَّارِ)) (سنن النسائی)

''ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی آگ میں ڈالے جانے کے لائق ہے''۔

یہی تو انسان کا امتحان ہے کہ وہ اپنی پسند و ناپسند کو احکامِ شریعت کے تابع رکھے۔ شریعت کی روشنی کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے مطابق جو بھی عمل کیا جائے خواہ وہ کتنا ہی بھلا معلوم ہو اور نیت کتنی ہی اچھی ہو' نفسانی خواہش کی پیروی کی وجہ سے مردود و مسترد ہے۔ یہاں اس سوال میں کوئی معقولیت نہیں کہ ریل اور ہوائی جہاز پر سواری کیوں کی جاتی ہے جبکہ ان پر سواری نہ تو رسول اللہ ﷺ نے کی نہ صحابہ کرامؓ نے' اس کا جواب یہ ہے کہ ریل اور

ہوائی جہاز دنیاوی چیزیں ہیں دین نہیں۔ مادی ایجادات سے شریعت کے اصولوں کے مطابق فقہاء کرام کی راہنمائی میں استفادہ کرنا بالکل جائز ہے' مگر بزعم خویش اچھی سے اچھی رسم ایجاد کرنا اور دوسروں کو اس عمل کی تلقین کرنا اور اس عمل کو کارِثواب سمجھنا بدعت ہے۔آج مسلمان مساجد میں نئی نئی رسموں کی ادائیگی کے لیے مجالس منعقد کرتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ ان میں شامل ہو کر ثوابِ دارین حاصل کریں۔ ایسی خود ساختہ مجالس کا انعقاد ہی جائز نہیں تو ان پر ثواب کیسا؟ مگر ع دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے! انسان کو فریب نفس سے ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے' ورنہ شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ سبز باغ دکھا کر انسان کو غلط کام پر آمادہ کر لیتا ہے۔ جب آدمی فی سبیل اللہ خرچ کرنے لگتا ہے جو سراسر فائدے کی بات ہے تو شیطان نمود و نمائش پر اکساتا ہے تاکہ یہ عمل اکارت چلا جائے' یا پھر سرے سے خرچ کرنے ہی سے یہ کہہ کر روک دیتا ہے کہ خرچ کرو گے تو مفلس ہو جاؤ گے' یا پھر ایسی جگہ خرچ کرنے کی ترغیب دیتا ہے جہاں خرچ مشروع نہ ہو۔ چنانچہ صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ جو کام بھی کیا جائے اُس کی شرعی حیثیت معلوم کرنے کے لیے قرآن وسنت اور عمل صحابہؓ کی طرف رجوع کیا جائے' تاکہ فریب نفس اور اغوائے شیطان سے محفوظ رہا جا سکے۔

قرض کا لین دین اور اسلامی تعلیمات

قرض لینا اچھی بات نہیں، مگر دنیا میں رہتے ہوئے ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ قرض لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں اس ناگزیر ضرورت کا لحاظ رکھتے ہوئے قرض کے لین دین کی گنجائش رکھی گئی ہے۔ قرآن مجید میں جہاں دوسرے احکام بیان کیے گئے ہیں۔ وہاں قرض کے معاملات کے سلسلہ میں آداب و ہدایات سورۃ البقرۃ میں بتائے گئے ہیں۔ یہاں قرض کے معاملات کو گواہوں کی موجودگی میں لکھ لینے کی تاکید کی گئی ہے، تاکہ رقم کی مقدار اور ادائیگی کے طریق کار میں بھول چوک کا امکان نہ رہے۔ پھر قرض کے لین دین میں مدت کا تعین بھی کئی الجھنوں سے محفوظ رکھتا ہے۔ اسی طرح قرض کے معاملے میں کوئی چیز رہن رکھنے کی بھی اجازت ہے، البتہ احادیث کی روشنی میں یہ بات واضح ہوتی ہے کہ شے مرہونہ سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں۔

قرض لینا بھاری ذمہ داری ہے۔ قرض دار کو قرضہ کی رقم واپس کرنا ہوتی ہے۔ جب تک وہ قرض کی رقم واپس نہیں کرتا وہ زیر بار رہتا ہے۔ اگر کوئی شخص فوت ہو جائے اور اس کے ذمہ قرض کی رقم ہو تو اُس وقت تک وہ سبکدوش نہیں ہوتا جب تک اس کے وارث وہ رقم ادا نہ کریں۔ رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ جب کوئی جنازہ آتا تو پوچھ لیتے کہ اس کے ذمہ کوئی قرض تو نہیں ہے! اگر قرض ہوتا تو اس کا جنازہ پڑھنے سے گریز کرتے۔ ایک دفعہ ایک جنازہ آیا، آپ ﷺ نے پوچھا: ''اس کے ذمہ قرض ہے؟'' بتایا گیا نہیں۔ تو آپؐ نے اس کا جنازہ پڑھا دیا۔ پھر ایک اور جنازہ لایا گیا۔ آپؐ نے پوچھا: ''اس کے ذمہ قرض ہے؟'' بتایا گیا ہاں۔ پوچھا: ''یہ کچھ چھوڑ کر مرا ہے؟'' بتایا گیا کہ ہاں تین دینار۔ پس آپؐ نے اس کا جنازہ پڑھا دیا۔ پھر تیسرا جنازہ لایا گیا۔ آپؐ نے پوچھا: ''اس کے ذمہ قرض ہے؟'' بتایا گیا ہاں تین دینار۔ آپؐ نے

پوچھا: ''کیا اس نے کوئی ترکہ چھوڑا؟'' لوگوں نے کہا نہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ''تم خود ہی اپنے ساتھی کا جنازہ پڑھ لو''۔ یہ سن کر ابوقتادہؓ نے عرض کی: یارسول اللہ ﷺ! اس کا جنازہ پڑھا دیجیے! اس کے قرض کا ذمہ مَیں لیتا ہوں۔ چنانچہ آپؐ نے اس کی نمازِ جنازہ پڑھا دی۔(١)

ابتدا میں تو یہ صورت حال رہی' مگر بعدازاں جب افلاس و ناداری کا دور ختم ہو گیا تو آپؐ نے اعلان فرما دیا کہ جو شخص اس حال میں مر جائے کہ اس کے ذمہ قرض ہو تو اس کے قرضے کی ادائیگی میں کر دیا کروں گا۔ اس سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ اس بات کو پسند نہیں فرماتے تھے کہ مرنے والا اپنے سر پر قرضہ لے کر مرے۔

رسول اللہ ﷺ نے ایک طرف تو خوشحال لوگوں کو ترغیب دی کہ وہ ضرورت مند بھائیوں کو قرض دیں اور اس کی وصولی میں سختی نہ کریں' بلکہ سہولت کا رویہ اپنائیں' دوسری طرف قرض لینے والوں کو ہدایت کی کہ وہ جلد از جلد قرضے کی ادائیگی کی کوشش کریں۔ اگر خدانخواستہ وہ قرض ادا کیے بغیر اس دنیا سے چلے گئے تو آخرت میں یہ معاملہ ان کے لیے سنگین نوعیت کا ہو گا اور اس کی معافی بھی نہ ہو سکے گی۔

حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اَعْظَمَ الذُّنُوْبِ عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ يَّلْقَاهُ بِهَا عَبْدٌ بَعْدَ الْكَبَائِرِ الَّتِيْ نَهَى اللّٰهُ عَنْهَا اَنْ يَمُوْتَ رَجُلٌ وَعَلَيْهِ دَيْنٌ لَا يَدَعُ لَهُ قَضَاءً))(٢)

''ان کبیرہ گناہوں کے بعد جن سے اللہ تعالیٰ نے سختی سے منع فرمایا ہے' سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اس حال میں مرے کہ اس پر قرض ہو اور اس کی ادائیگی کا سامان نہ چھوڑ گیا ہو۔''

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

١) صحیح البخاری' کتاب الحوالات' باب ان احال دین المیت علی رجل جاز۔

٢) سنن ابی داوٗد' کتاب البیوع' باب فی التشدید فی الدّین۔

((نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهٖ حَتّٰى يُقْضٰى عَنْهُ))[۳]

''مؤمن بندے کی روح اس کے قرضہ کی وجہ سے بیچ میں معلق رہتی ہے جب تک وہ قرض ادا نہ کر دیا جائے جو اُس پر ہے۔''

اس لیے ایسے شخص کے بارے میں کہا گیا ہے کہ اس کے وارث جلدی سے جلدی اس کا قرض ادا کر دیں تاکہ مرنے والا راحت اور رحمت کے اس مقام پر پہنچ سکے جو مؤمنین صالحین کے لیے موعود ہے۔

قرض کا معاملہ اتنا سنگین ہے کہ شہید ہونے والے مردِ مؤمن کے تمام گناہ بخش دیے جاتے ہیں سوائے قرض کے۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((يُغْفَرُ لِلشَّهِيْدِ كُلُّ ذَنْبٍ اِلَّا الدَّيْنَ))[٤]

''شہید ہونے والے مردِ مؤمن کے سارے گناہ (راہِ خدا میں جان کی قربانی دینے کی وجہ سے) بخش دیے جاتے ہیں بجز قرض کے۔''

یہ اس لیے کہ حقوق العباد کا معاملہ بڑا سخت ہے۔ جس کے حقوق تلف کیے گئے ہوں وہ خود ہی بخشے گا تو بخشے جائیں گے۔ اسی طرح یا تو قرضہ ادا کیا جائے یا پھر دائن قرضے کی رقم معاف کر دے ورنہ وہ قرضہ مؤمن کے لیے انتہائی مصیبت کا باعث بنے گا۔

حضرت ابو قتادہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ ایک آدمی نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ! مجھے بتلایئے کہ میں اللہ کے راستے میں صبر اور ثابت قدمی کے ساتھ اور اللہ کی رضا اور ثوابِ آخرت کی خاطر جہاد کروں اور مجھے اس حالت میں شہید کر دیا جائے کہ میں پیچھے نہ ہٹ رہا ہوں (بلکہ پیش قدمی کر رہا ہوں) تو کیا (اس شہادت اور قربانی کی وجہ سے) اللہ تعالیٰ میرے سارے گناہ معاف کر دے گا؟ آپؐ نے جواب میں فرمایا: ''ہاں''۔ پھر جب وہ آدمی لوٹنے لگا تو آپؐ نے اس کو پھر پکارا

---

۳) سنن الترمذی' کتاب الجنائز عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء عن النبی ﷺ انه قال: ((نَفْسُ الْمُؤْمِنِ مُعَلَّقَةٌ بِدَيْنِهٖ))

٤) صحيح مسلم' كتاب الامارة' باب من قتل فی سبيل الله كفرت خطاياه الا الدّين۔

اور فرمایا:

((نَعَمْ وَاَنْتَ صَابِرٌ مُحْتَسِبٌ مُقْبِلٌ غَيْرُ مُدْبِرٍ اِلَّا الدَّيْنَ ، فَاِنَّ جِبْرِيْلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ قَالَ لِيْ))(۵)

''ہاں' بشرطیکہ تم ثابت قدم ہو' اللہ تعالیٰ سے اجر و ثواب کی امید رکھو' میدانِ جنگ میں آگے بڑھنے والے بنو نہ کہ پیچھے ہٹنے والے' سوائے قرض کے' یہ بات مجھ سے جبرئیل علیہ السلام نے کہی ہے''۔

جب قرض کا معاملہ اتنا سنگین ہے تو انتہائی مجبوری کے سوا قرض ہرگز نہیں لینا چاہیے۔ مکان کی تعمیر یا کاروبار کرنے کے لیے کچھ قرض لینا پڑے تو مناسب حد تک قرض لیا جا سکتا ہے اور وہ بھی اتنی مقدار میں جسے واپس کرنا ممکن نظر آ رہا ہو۔ مگر شادی بیاہ اور مرگ کی فضول رسموں کی ادائیگی اور بدعات کے لیے رقم قرض لینا ہرگز عقل مندی نہیں۔ ایک تو فضول رسمیں بذاتِ خود گناہ کا کام ہیں اور پھر اس گناہ کے کام پر ادھار کی رقم خرچ کرنا تو انتہائی حماقت ہے۔ یہ تو دنیا کی خاطر عاقبت برباد کرنے کے مترادف ہے۔

اوپر ذکر ہوا کہ انتہائی ناگزیر صورت میں قرض لینے کی اجازت ہے۔ یہ قرض اتنی مقدار میں ہو کہ لینے والے کے لیے مستقبل میں اس کا ادا کرنا ممکن ہو اور اُس کی نیت بھی ادا کرنے کی ہو۔ ان حالات میں اور اس نیت کے ساتھ قرضہ لیا جائے تو اللہ تعالیٰ اس کی واپسی کے لیے سازگار حالات پیدا فرما دیتا ہے۔ جو شخص اس نیت سے قرضہ لیتا ہے کہ اس کا ارادہ واپس کرنے کا نہیں ہوتا تو اسے نہ تو واپسی کی توفیق ہوتی ہے اور نہ ہی وہ قرضے سے فارغ ہوتا ہے' بلکہ وہ قرضہ دنیا میں بھی اس کے لیے وبال بن جاتا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ اَخَذَ اَمْوَالَ النَّاسِ يُرِيْدُ أَدَاءَ هَا اَدَّى اللّٰهُ عَنْهُ وَمَنْ أَخَذَ يُرِيْدُ اِتْلَافَهَا اَتْلَفَهُ اللّٰهُ))(۶)

---

۵) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب من قتل فی سبیل اللہ کفرت خطایاہ الا الدَّین۔

٦) صحیح البخاری' کتاب فی الاستقراض واداء الدیون والحجر والتفلیس' باب من اخذ اموال الناس یرید اداء ھا او اتلافھا۔

''جو شخص لوگوں سے ادھار مال لے اور اس کی نیت اور ارادہ ادا کرنے کا ہو تو اللہ تعالیٰ اسے اپنی توفیق سے اس سے ادا کرا دے گا' اور جو کوئی کسی سے ادھار لے اور اس کا ارادہ ہی ہڑپ کر لینے کا ہو تو اللہ تعالیٰ اس کو تلف اور تباہ کر دے گا۔''

مقروض کو چاہیے کہ وہ قرض دینے والے کا شکر گزار ہو اور اس کے ساتھ حسن سلوک کا مظاہرہ کرے۔ نہ صرف ادائیگی خوش اسلوبی سے کرے بلکہ کچھ زائد رقم بھی دے دے تو یہ مستحسن ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہی طرزِ عمل تھا۔ حضرت جابرؓ سے روایت ہے' وہ فرماتے ہیں کہ:

كَانَ لِىْ عَلَى النَّبِيِّ ﷺ دَيْنٌ فَقَضَانِىْ وَزَادَنِىْ (۷)

''میرا رسول اللہ ﷺ پر کچھ قرض تھا تو آپؐ نے جب وہ ادا فرمایا تو کچھ رقم زیادہ واپس کی۔''

اس طرح کی زائد رقم پر ربا کا اطلاق نہیں ہوتا' کیونکہ یہ رقم نہ تو کسی شرط کے تحت طے شدہ ہوتی ہے اور نہ ہی اس کا مطالبہ کیا جاتا ہے' بلکہ یہ تو محض حسن سلوک کے طور پر رضاکارانہ ہوتی ہے۔ اس لیے یہ سود نہیں بلکہ تبرع اور احسان ہے۔ اس طرح کی سنتوں کو رواج دینا آج کی ضرورت ہے۔

ایک ضرورت مند شخص ادھار مانگتا ہے۔ ایسے شخص کی مدد کرنا اور اسے قرض کی رقم فراہم کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ مقروض کو ایسے شخص کے احسان کو یاد رکھنا چاہیے اور رقم کی جلد از جلد واپسی کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر مقروض وقت پر رقم ادا نہ کر سکے اور اس کی بدحالی اور مجبوری کے پیش نظر قرض کا تقاضا کرنے والا اس کے ساتھ ہمدردی کرتے ہوئے اسے مہلت دیتا ہے اور نرمی اختیار کرتا ہے تو بہت بڑا ثواب حاصل کرتا ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((رَحِمَ اللّٰهُ رَجُلًا سَمْحًا اِذَا بَاعَ وَاِذَا اشْتَرٰى وَاِذَا اقْتَضٰى))(۸)

---

۷) سنن ابی داوٗد' کتاب البیوع' باب فی حسن القضاء۔

۸) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب السهولة والسماحة فی الشراء والبیوع ومن طلب حقا۔

''اللہ کی رحمت ہو اُس بندے پر جو بیچنے میں' خریدنے میں اور اپنے حق کا تقاضا کرنے اور وصول کرنے میں نرم اور فراخ دل ہو''۔

بخاری اور مسلم میں ایک حدیث ہے کہ ایک شخص سے اُس کی موت کے بعد پوچھا جائے گا کہ اپنی دُنیوی زندگی پر نظر ڈال اور بتا کہ تیرا کوئی نیک عمل ہے جو تیرے لیے وسیلۂ نجات بن سکے؟ وہ عرض کرے گا کہ میرے علم میں میرا کوئی ایسا عمل نہیں' سوائے اس کے کہ میں لوگوں کے ساتھ کاروبار اور خرید و فروخت کا معاملہ کیا کرتا تھا تو میرا رویہ ان کے ساتھ درگزر اور احسان کا ہوتا تھا۔ میں مال دار کو بھی مہلت دیتا تھا اور غریبوں اور مفلسوں کو معاف بھی کر دیتا تھا۔ اس پر اللہ تعالیٰ اس شخص کے لیے جنت میں داخلہ کا حکم فرما دے گا۔(۹)

ضرورت مند کو قرض دے کر تقاضا کرنے میں نرمی اختیار کرنا اللہ تعالیٰ کے ہاں بڑا ہی محبوب اور مقبول عمل ہے۔ حضرت ابوالیسر رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے سنا' آپؐ ارشاد فرماتے تھے:

((مَنْ اَنْظَرَ مُعْسِرًا اَوْ وَضَعَ عَنْهُ اَظَلَّهُ اللّٰهُ فِيْ ظِلِّهٖ))(۱۰)

''جو بندہ کسی غریب تنگدست کو مہلت دے یا معاف کر دے تو اللہ تعالیٰ اس کو اپنے سایۂ رحمت میں لے لے گا۔''

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ لَهٗ عَلٰى رَجُلٍ حَقٌّ فَمَنْ اَخَّرَهٗ كَانَ لَهٗ بِكُلِّ يَوْمٍ صَدَقَةٌ))(۱۱)

''جس آدمی کا کسی دوسرے بھائی پر کوئی حق (قرضہ وغیرہ) واجب الادا ہو اور وہ اس مقروض کو ادا کرنے کے لیے دیر تک مہلت دے دے تو اُس کو ہر دن کے عوض صدقہ کا ثواب ملے گا۔''

اسی طرح قرض دے کر کسی ضرورت مند کی مدد کرنا بہت بڑا کارِ ثواب اور اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبول عمل ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

---

۹) صحیح البخاری' کتاب احادیث الانبیاء' باب ما ذکر عن بنی اسرائیل۔

۱۰) صحیح مسلم' کتاب الزھد والرقائق' باب حدیث جابر الطویل وقصۃ ابی الیسر۔

۱۱) مسند احمد' کتاب اوّل مسند البصریین' باب حدیث عمران بن حصین۔

((دَخَلَ رَجُلٌ الْجَنَّةَ فَرَاٰى عَلٰى بَابِهَا مَكْتُوبًا : اَلصَّدَقَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا وَالْقَرْضُ بِثَمَانِيَةَ عَشَرَ))(۱۲)

''ایک آدمی جنت میں داخل ہوا تو اس نے جنت کے دروازے پر لکھا دیکھا کہ صدقہ کا اجر و ثواب دس گنا ہے اور قرض دینے کا اٹھارہ گنا۔''

یہ کسی مردِ صالح کا خواب ہو سکتا ہے یا پھر خود آپ ﷺ کا مشاہدہ۔ اس دوسرے احتمال کی تائید ابن ماجہ کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جس کے آخر میں آپ ﷺ نے فرمایا:

''میں نے جبریل سے پوچھا قرض میں کیا خاص بات ہے کہ وہ صدقہ سے افضل ہے؟ تو انہوں نے بتایا کہ سائل اس حالت میں بھی سوال کرتا اور صدقہ لے لیتا ہے جبکہ اس کے پاس کچھ ہوتا ہے اور قرض مانگنے والا قرض جب ہی مانگتا ہے جب وہ محتاج اور ضرورت مند ہوتا ہے''۔(۱۳)

بعض اوقات آدمی مفلسی کے ہاتھوں مجبور ہوتا ہے' مگر اس کی عزتِ نفس یہ گوارا نہیں کرتی کہ وہ کسی سے صدقہ وخیرات یا زکوٰۃ لے کر اپنی اور بچوں کی ضرورت پوری کر لے' بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی صاحب خیر سے رقم بطورِ قرض مل جائے۔ تو ایسے محتاج کو قرض دینا یقیناً صدقہ اور خیرات سے بھی افضل ہے۔

حاصل کلام یہ کہ عام حالات میں قرض لینے سے ضرور بچنا چاہیے' کیونکہ قرض بہت بھاری ذمہ داری ہے۔ اگر اس کو واپس نہ کیا جائے تو اس کی معافی کی کوئی صورت نہیں سوائے اس کے کہ خود صاحب مال معاف کر دے' مگر قیامت میں کون معاف کرے گا جب کہ نفسانفسی کا عالم ہو گا؟ خاص طور پر شادی بیاہ اور مرگ کی فضول رسومات کو قرض لے کر پورا کرنا دُنیوی اور اُخروی دونوں اعتبارات سے خسارے کا موجب ہے۔ پھر خود ساختہ بدعات کے لیے قرض لے کر خرچ کرنا تو اور بھی برا ہے۔ قرض انتہائی مجبوری میں لینا چاہیے اور واپس کرنے کی نیت سے لینا

---

۱۲) رواہ الطبرانی فی الکبیر۔

۱۳) سنن ابن ماجہ' کتاب الاحکام' باب القرض۔

چاہیے۔ ایسے قرضے کی واپسی کے لیے اللہ تعالیٰ کی خصوصی مدد شامل حال ہو جاتی ہے۔ حقیقی ضرورت مند کو قرض دینا بہت بڑی نیکی ہے' بلکہ جیسا کہ اوپر گزرا' ایسا قرض صدقے سے بھی افضل ہے۔

قرض کے لین دین کی دستاویز تیار کرنا ضروری ہے۔ عام طور پر اس حکم کو نظرانداز کر دیا جاتا ہے اور مروّت کے پیش نظر قرض کی رقم اور شرائط ادائیگی پر مشتمل تحریر کی ضرورت محسوس نہیں کی جاتی۔ مگر بعدازاں جب جھگڑے اٹھتے ہیں تو اس حکم کی اہمیت اور اسے نظرانداز کرنے کے نقصانات سامنے آتے ہیں۔ اس لیے قرض کا معاملہ چاہے اپنوں کے ساتھ ہو یا غیروں کے ساتھ' اسے گواہوں کی موجودگی میں تحریر کر لینا ضروری ہے۔ بعض اوقات مقروض بروقت قرض ادا نہیں کر سکتا اور مزید مہلت کا خواستگار ہوتا ہے۔ ایسی صورت میں اسے مہلت دینا بہت بڑی نیکی ہے' کیونکہ ایسا کرنے والا یہ سمجھتا ہے کہ جو مال و دولت اس کے پاس ہے اصل میں وہ اللہ ہی کا مال ہے اور اس مال و دولت کے سلسلہ میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا یہ اچھا طریقہ ہے کہ ضرورت مند اور محتاج بندوں کو مال ادھار دیا جائے اور انہیں واپس ادائیگی میں سہولت دی جائے۔

مَتَاعُ الْغُرُوْرِ

متاعُ الغُرور کا معنی ہے دھوکے کا سامان۔ قرآن حکیم میں دنیا کی زندگی کو متاعُ الغُرور کہا گیا ہے۔ غَرَّ یَغُرُّ دھوکہ دینے کے معنوں میں آتا ہے۔ سورۃ الانفال میں ہے: ﴿غَرَّ هٰٓؤُلَآءِ دِيْنُهُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۳۰) ''دھوکہ دیا اُن کو اُن کے دین نے''۔ سورۃ الانعام میں فرمایا: ﴿وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ (آیت: ۱۳۰) ''اور دنیا کی زندگی نے انہیں دھوکہ دیا''۔ اسی طرح ان معنوں میں یہ لفظ قرآن حکیم میں کئی جگہ آیا ہے۔ اسی سے غرور اور مغرور کے الفاظ بنے ہیں جن کا معنی بالترتیب ''دھوکہ'' اور ''دھوکہ کھایا ہوا'' ہیں۔ یہ دونوں لفظ اردو میں بھی مستعمل ہیں مگر اردو میں غرور تکبر کے معنوں میں اور مغرور متکبر کے معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ تکبر اصل میں دھوکہ ہی ہے' کیونکہ جو تکبر کرتا ہے اُسے اپنی بڑائی کا زعم ہو رہا ہوتا ہے' حقیقت میں وہ بڑا نہیں ہوتا۔ اُس کی بڑائی عارضی اور ناپائیدار ہے' وہ آناً فاناً اپنی بڑائی سے محروم ہو سکتا ہے۔ پس مغرور اصل میں وہی شخص ہے جسے اپنی کسی صلاحیت یا فضیلت پر دھوکہ ہو رہا ہو۔

دنیا کی زندگی بہت بڑی حقیقت ہے جسے قرآن میں متاعُ الغُرور (دھوکے کا سامان) کہا گیا ہے۔ انسان دنیا میں امتحان کی غرض سے بھیجا گیا ہے۔ اسے متنبہ کر دیا گیا ہے کہ اس کی دُنیوی زندگی کا خاتمہ موت کے ساتھ ہو جائے گا اور حتمی' یقینی اور نہ ختم ہونے والی زندگی کا آغاز ہو جائے گا۔ پھر یا تو ابدی آرام و راحت ہو گا یا دردناک عذاب۔ دنیا کی زندگی دھوکہ ان معنوں میں ہے کہ انسان یہاں کی رونق' دلکشی اور لہو و لعب کو حقیقت سمجھ کر اُن پر ریجھ جاتا ہے۔ اُس کی ساری تگ و دو کا محور پیسہ اکٹھا کر کے اچھی رہائش' اچھی سواری' اچھا لباس اور اچھی بود و باش فراہم کرنا ہوتا ہے اور اس

مشغولیت میں وہ اس قدر الجھ جاتا ہے کہ آنے والی حقیقی زندگی کو یکسر فراموش کر دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں جابجا انسان کو حقیقت حال سے آگاہ کر دیا ہے۔ سورۃ آل عمران (آیت ۱۸۵) اور پھر سورۃ الحدید (آیت ۲۰) میں ارشاد ہوا: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ ''اور دنیا کی زندگی تو بس دھوکے کا سامان ہے''۔ یعنی یہاں کی چمک دمک نرا دھوکہ ہے' اس سے بچ کر رہیے!

انسان کو دھوکے میں ڈالنے کے لیے شیطان بہت بڑا کردار ادا کرتا ہے۔ اسی لیے اُسے قرآن مجید میں ''اَلْغَرُوْرُ'' (غ پر زبر کے ساتھ) ''بہت بڑا دھوکے باز'' کہا گیا ہے اور اُس کے دھوکے میں نہ آنے کی تلقین کی گئی ہے۔ سورۃ الحدید میں ارشاد ہوا: ﴿وَغَرَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ﴾ ''اور اُس بڑے دھوکے باز (شیطان) نے تمہیں اللہ کے بارے میں دھوکے میں مبتلا کیے رکھا''۔ وہ اتنا زبردست دھوکے باز ہے کہ وہ انسانِ اوّل علیہ السلام کو سبز باغ دکھانے میں کامیاب ہو گیا۔ انسان جو بداعمالیاں کرتا ہے شیطان اُسے مطمئن کرتا ہے کہ یہ گناہ کے کام نہیں' بلکہ اچھے کام ہیں۔ اُن برے کاموں کے جواز میں وہ طرح طرح کے عذر سکھاتا ہے۔ قرآن میں ہے: ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ (الانعام) ''اور شیطان نے انہیں اُن کاموں کو جو انہوں نے کیے ہیں' مزین کر کے دکھایا''۔ اسی طرح متعدد جگہ پر فرمایا گیا ہے: ﴿وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ﴾ ''اور مزین کر کے دکھائے شیطان نے ان لوگوں کو اُن کے اعمال''۔ یہ الفاظ قرآن مجید کی چار سورتوں الانفال' النحل' النمل اور العنکبوت میں آئے ہیں۔

دنیاوی زندگی میں حسن و جمال' رعنائی' خوش نمائی اور دلکشی پیدا کی گئی ہے۔ یہ بھی اسی لیے کہ انسان کا امتحان ہو جائے۔ گویا ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کے وہ یہ کہتے ہیں
اِدھر آتا ہے دیکھیں یا اُدھر پروانہ جاتا ہے!

اسی حقیقت کو قرآن مجید میں اس طرح واضح کیا گیا ہے:

﴿زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ

الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ۗ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ﴾ (آل عمران)

''مزین کر دی گئی لوگوں کے لیے مرغوب چیزوں کی محبت' جیسے عورتیں' بیٹے سونے اور چاندی کے جمع کیے ہوئے خزانے اور نشان زدہ گھوڑے اور مویشی اور کھیتی۔ یہ سامان ہے دنیا کی زندگی کا' اور اللہ ہی کے پاس ہے اچھا ٹھکانہ''۔

پس دنیا کی زندگی میں حد درجہ کشش اور محبت رکھی گئی ہے۔ تاہم دنیا کی حقیقت بھی اُسی زور کے ساتھ واضح کر دی گئی ہے کہ ساز و سامانِ دنیا کی کشش میں کھو جانا نری ناکامی ہے۔ جسے اس امتحان میں ناکامی منظور ہو وہ دنیا کی زینت میں بے شک کھب جائے۔ جیسا کہ علامہ اقبال نے کہا: ؎

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے
مؤمن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق!

مگر حقیقت شناس لوگ ہمیشہ vigilant رہیں گے کہ نقد راحت و آرام کی تلاش میں سرگرداں ہونے کے بجائے یہاں حقیقی اور جاوداں زندگی کے حصول کے لیے کوشش کی جائے۔ البتہ آزاد منش' غیر سنجیدہ اور نادان لوگ جن کے سامنے حیاتِ دُنیوی کا مقصد واضح نہیں' یا جانتے بوجھتے انہوں نے اُسے بھلا دیا ہے' وہ اس زندگی کو ہی سب کچھ سمجھے بیٹھے ہیں' ایسے ہی لوگ خسارے میں ہیں۔ کافروں کا یہی حال ہے اور کافرانہ اندازِ زندگی بھی اسی طرح ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿زُيِّنَ لِلَّذِيْنَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا﴾ (البقرہ:۲۱۲) ''مزین کر دی گئی ہے کافروں کے لیے دنیا کی زندگی''۔ یہ وہ لوگ ہیں جو انجام سے غافل گمراہی میں پڑ کر صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے ہیں اور دنیاوی زندگی ہی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے ہیں۔ اُن کا ایمان آخرت پر اوّل تو ہے ہی نہیں اور اگر ہے تو وہ اس قدر کمزور ہے کہ وہ کوئی نتیجہ برآمد نہیں کر سکتا۔

دنیا کی زندگی کی حقیقت کو جاننا بہت ضروری ہے۔ قرآن اسے دھوکے کا سامان کہتا ہے۔ یہاں بدکردار لوگ دندناتے پھرتے ہیں' ظالموں نے ظلم و ستم کا بازار گرم کر

رکھا ہے' مالدار غریبوں کے ساتھ ناانصافی کر رہے ہیں' سرمایہ دار' جاگیردار اور صنعت کار مزدوروں کا خون نچوڑ رہے ہیں' طاقت وروں نے کمزوروں کو غلام بنا رکھا ہے' حاکموں نے محکوموں کی زندگی اجیرن کر رکھی ہے۔ اس طرح بڑے لوگوں نے عیش وعشرت میں پڑ کر خود کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے کہ ع بابر بعیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست! یعنی بابر عیش کر لو' دنیا میں بار بار نہیں آنا! دنیا کے ساز وسامان سے بھرپور فائدہ اٹھا لو' آخرت کی فکر کو ذہن پر سوار کر کے زندگی میں تلخی' مشقت اور تکدر کیوں پیدا کیا جائے!

دھوکہ کسے کہتے ہیں؟ یہی نا کہ کسی چیز کی حقیقت کو چھپا لینا! ظاہر کچھ اور ہو اور اندر کچھ اور۔ کامیابی دکھائی دے مگر اصل میں ناکامی ہو' مفید نظر آئے مگر ہو مضر۔ اب دیکھئے دنیا کی زندگی کس طرح دھوکے کا سامان ہے۔ سادہ سی مثالوں سے یہ بات واضح ہو جائے گی۔

ایک دولت مند ہے' اُس نے جائز یا ناجائز طریقے سے دولت اکٹھی کی ہے۔ گلی' محلے کے لوگ اُس سے مرعوب ہیں' اُسے جھک کر سلام کرتے ہیں اور جی حضور کہتے ہیں۔ اُس کے ہاں شادی کی تقریب ہے۔ وہ پانی کی طرح دولت بہاتا ہے۔ رقص وسرود کی محفل جماتا ہے' گھر کو رنگا رنگ روشنیوں کے ساتھ بقعۂ نور بنا دیتا ہے' آتش بازی کا مظاہرہ کرتا ہے' بلند آواز میں گانے بجا کر دُور دُور تک لوگوں کی نیندیں حرام کر دیتا ہے' تقریب ختم ہوئی' لوگوں کے دلوں میں اُس کا رعب اور زیادہ ہو گیا۔ دولت کی نمائش سے اُسے باوقار' خوشحال اور معزز لوگوں کی فہرست میں نمایاں مقام مل گیا۔ اب وہ پھولا نہیں سما رہا۔ غرور سے اس کی گردن تن گئی ہے۔ موت تو آئے گی' پھر ربّ کے حضور حاضر ہونا ہو گا۔ اس سے پوچھا جائے گا دولت کو کہاں استعمال کیا؟ فضول خرچی کی؟ فضول خرچ تو شیطان کے بھائی ہوتے ہیں! تم نے قرآن میں نہیں پڑھا تھا کہ ﴿اِنَّ الْمُبَذِّرِیْنَ کَانُوْٓا اِخْوَانَ الشَّیٰطِیْنِ﴾ (بنی اسرائیل:۲۷) تمہاری دولت میں مسکینوں' غریبوں کا حق تھا' وہ ادا نہیں کیا۔ انجامِ کار اس غفلت کی سزا بھگتنی پڑے گی اور اس اکڑی ہوئی گردن والے طرے باز کو گھسیٹ کر ذلت کے عذاب سے دوچار کر دیا جائے

گا۔ دیکھا دنیا کی شان وشوکت حقیقت کے اعتبار سے ذلت نکلی!

اسی طرح ایک آدمی کی چوری ہو جاتی ہے۔ بڑی تفتیش ہوئی مگر چوروں کا سراغ نہ ملا۔ جس کی چوری ہوئی اُس کا نقصان ہوا' گلی محلے کے لوگ' دوست احباب اُس کے پاس اظہارِ ہمدردی کے لیے آ رہے ہیں اور وہ اپنے نقصان پر افسردہ اور غمگین ہے۔ چوروں کا حال یہ ہے کہ جی میں پھولے نہیں سماتے' لوٹی ہوئی دولت سے عیش کر رہے ہیں' خوش ہو رہے ہیں' اتنی کامیاب چوری پر اپنے آپ کو شاباش دے رہے ہیں۔ موت آ گئی' مَالِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ کے سامنے پیش ہوئے۔ اللہ عَلِيْمٌ بِذَاتِ الصُّدُوْرِ ہے۔ چوروں کو حکم دے گا کہ چوری کا مال اس کے مالک کو واپس کرو۔ وہ کہاں سے واپس کریں گے؟ اچھا اگر کوئی نیکیاں ہیں تو مال کے بدلے وہ مال کے مالک کو دے دو۔ اگر نیکیاں نہیں' یا ختم ہو گئی ہیں تو مال کے مالک کے گناہ اپنے سر لو۔ جب مال کے مالک کے گناہ چوروں کے کھاتے میں ڈالے جائیں گے تو چور حسرت و یاس کے ساتھ ہاتھ ملتے رہ جائیں گے اور ذلت کے عذاب میں پڑیں گے' جبکہ جس کی چوری ہوئی تھی اور مال لٹ گیا تھا بدلے میں اُس کو نیکیاں ملیں اور گناہ دور ہوئے۔ یہ لوٹا ہوا مال اُس کے لیے نجات کا باعث بن گیا۔ ہوسکتا ہے وہ اپنے اعمال کے بل بوتے پر جنت میں نہ جا سکتا' مگر لوٹے ہوئے مال کے بدلے جو کچھ اسے ملا وہ اُسے جنت میں لے گیا۔ یہ شخص جو دنیا میں مال لٹ جانے پر افسردہ اور غمگین تھا' اب خوش ہو گیا۔ اب اُس نے جانا کہ دنیا کا غم اصل غم نہ تھا بلکہ غم کے بھیس میں حقیقی نجات کا سامان تھا۔

اس کے برعکس ایک ایسا مسکین اور نادار ہے جس پر فکرِ آخرت کا غلبہ ہے۔ وہ تقویٰ اختیار کیے ہوئے ہے۔ وہ اپنی مشکلات پر قابو پانے کے لیے کوئی ناجائز طریقہ اختیار نہیں کرتا' زندگی حلال وحرام کی مکمل پابندی کے ساتھ گزار رہا ہے' تو اس شخص کا اگرچہ دنیاوی اعتبار سے کوئی مقام نہیں' لوگوں کے دل میں اُس کی کوئی عزت اور حیثیت نہیں' مگر یہ وہ شخص ہے جس نے دنیا کی زندگی کو واقعی مَتَاعُ الْغُرُوْرِ (دھوکے کا سامان) سمجھا ہے' دنیا کی چمک دمک اس کو غلط روی کی طرف لے جانے میں ناکام رہی ہے۔ یہ شخص

اپنی پوری بے بضاعتی کے باوجود فیصلے کے دن عزت کے مقام پر کھڑا ہوگا جبکہ بڑے بڑے منصب دار اور دولت مند ذلت اور رسوائی سے دوچار ہوں گے۔

اسی طرح ایک دولت مند آدمی ہے۔ اپنی دولت کو اللہ کا عطیہ جانتا ہے۔ اپنی دولت کو خدا کی رضا والے کاموں میں خرچ کرتا ہے۔ فضول خرچی کے قریب نہیں جاتا۔ اچھا کھاتا ہے' اچھا پیتا ہے' مگر بے محل خرچ نہیں کرتا۔ رشتہ داروں اور نادار لوگوں کی خوب مدد کرتا ہے۔ تقویٰ شعار' عبادت گزار اور خواہشاتِ نفس پر مکمل کنٹرول رکھنے والا ہے۔ یہ صاحب ثروت آدمی وہ ہے جس نے دنیا کی زندگی کو دھوکے کا سامان سمجھا' خبردار رہا اور اس دھوکے سے بچا رہا۔ یہ بھی فیصلے کے دن عزوشرف کے مقام پر ہوگا۔

رسول اللہ ﷺ نے بھی دنیا کی زندگی کی حقیقت پورے طور پر واضح کر دی تاکہ افرادِ اُمت خبردار رہیں اور اُن کے پاؤں پھسلنے نہ پائیں۔ آپ ﷺ کا اپنا طرزِ عمل دوسروں کے لیے ہمت افزا ہے۔ ایک دفعہ آپؐ چٹائی پر سو کر اٹھے تو بدن پر چٹائی کے نشان تھے۔ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ پاس تھے' دیکھ کر عرض کیا کہ ہم آپؐ کے لیے کیوں نہ ایک بچھونا بنا دیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ''مجھے اس دنیا سے کیا سروکار! میری مثال اس دنیا میں اُس سوار کی سی ہے جو دن کے وقت کسی درخت کے سایہ میں کچھ دیر بیٹھا اور پھر اسے چھوڑ کر چل دیا''۔ (مسند احمد)

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا مؤمن کا قید خانہ اور کافر کی جنت ہے''۔ (مسلم) یعنی مؤمن کو تو شرعی پابندیوں کے ساتھ زندگی گزارنی ہے' مگر کافر کو اگلی زندگی کی کوئی فکر نہیں' وہ یہاں عیش وعشرت کے مزے لوٹتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی تو آپ ﷺ کے ترکہ میں نہ درہم و دینار تھے نہ لونڈی غلام' صرف سواری کا ایک سفید خچر اور اسلحہ تھا اور زمین تھی جو مسافروں کے لیے صدقہ کر دی تھی۔ (بخاری)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا کی حقیقت اللہ تعالیٰ کے نزدیک اگر مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو وہ کافر کو ایک گھونٹ پانی تک نہ دیتا''۔ (ترمذی)

آپ ﷺ نے فرمایا: ''دنیا مردار ہے اور اس کے چاہنے والے کتے ہیں''۔ یعنی اس دنیا کی رونق' چہل پہل اور کشش محض فریبِ نظر ہے۔ حقیقت میں یہ بالکل گھٹیا سی شے ہے۔ اس کے مقابلے میں آخرت اصل اہمیت کی چیز ہے۔ آخرت کی فکر سے آزاد ہوکر خواہشاتِ نفس کی پیروی میں زندگی گزارنے والا حیوان ہی تو ہے! قرآن مجید میں دنیا کی زندگی کو لہو ولعب کہا گیا ہے۔ لہو ولعب کا مطلب ہے کھیل تماشا۔ کھیل تماشا بچوں اور نادانوں کی وقتی سی مصروفیت ہوتی ہے' اس سے کسی طرح کی پائیدار منفعت حاصل نہیں ہوتی۔ بچے کھلونوں سے کھیلتے ہیں' پھر جی بھر جاتا ہے تو انہیں پھینک دیتے ہیں۔ لہو ولعب میں کوئی ذی شعور جی نہیں لگاتا۔ کرنے کے کام تو وہ ہیں جو فلاح اور کامیابی پر منتج ہوں۔ ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَمَا هٰذِهِ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا لَهْوٌ وَّلَعِبٌ ؕ وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ﴾ (العنکبوت)

''اور یہ دنیا کی زندگی تو صرف بہلا وا اور کھیل ہے' اصل زندگی تو عالمِ آخرت کی ہے' کاش وہ لوگ جانیں!''

انسان کی حیثیت ایک مسافر کی ہے۔ مسافر راستے میں ٹھنڈی چھاؤں پاتا ہے تو تھوڑی دیر کے لیے سائے میں لیٹ جاتا ہے اور پھر اٹھ کر منزل کی طرف چل دیتا ہے۔ وہ مسافر نادان ہے جو اُسی سائے کو منزل سمجھ بیٹھے اور اصل منزل کو بھول جائے۔ دنیا کی زندگی ایک وقفہ ہے۔ ع ''یعنی آگے بڑھیں گے دم لے کر''۔ انسان کو جہاں جانا ہے اور جہاں جا کر ہمیشہ کے لیے رہنا ہے اُس زندگی کی فکر کرنا چاہیے۔ حیاتِ مستعار کے وقفے کو سب کچھ سمجھ لینا انتہائی نادانی اور حماقت ہے۔

قرآن مجید میں جگہ جگہ بتایا گیا ہے کہ انسان کے لیے دنیا امتحان کی جگہ ہے۔ یہاں امتحان کی تیاری کرنا ہے' مگر یہاں مرغوب چیزوں کی کشش اس راہ میں رکاوٹ ہے۔ عقل مند انسان وہ ہے جو یہاں کی پُرکشش چیزوں یعنی عورتوں' بچوں اور دولت وغیرہ کے ساتھ واجبی سی محبت رکھے' ان کی محبت میں اس قدر نہ کھو جائے کہ عاقبت کی فکر

ذہن سے محو ہو جائے اور انہی چیزوں پر فریفتہ قبر میں چلا جائے جہاں نہ بیوی بچے کام آئیں گے نہ مال و دولت۔ ایسا انسان اپنی بے عقلی پر حسرت و یاس کے آنسو بہائے گا مگر لاحاصل۔ کسی نے سچ کہا ہے: ؎

جگہ جی لگانے کی دنیا نہیں ہے
یہ عبرت کی جا ہے' تماشا نہیں ہے!

چونکہ دولت ہی انسان کو آزاد خیال اور خواہشات کا غلام بناتی ہے لہٰذا جو شخص حصولِ دولت اور صرفِ دولت میں راہِ راست پر رہا بس وہی کامیاب ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا تھا: ''اللہ کی قسم! مجھے اس بات کا خوف نہیں کہ تم فقر میں گرفتار ہو گے' بلکہ خوف اس بات کا ہے کہ دولت تم پر ایسے نہ چھا جائے جیسے تم سے پہلی اقوام پر چھا گئی اور تم اُن کی طرح اسے ایک دوسرے سے بڑھ کر چاہنے لگو اور یہ تمہیں بھی اسی طرح ہلاک کر دے جیسے سابقہ اقوام کو کیا تھا''۔ (بخاری و مسلم)

حاصل کلام یہ ہے کہ کسی مسلمان کے شایانِ شان نہیں کہ وہ شریعت کی پابندیوں کو نظر انداز کر کے خواہشات کی پیروی میں لگ جائے۔ ایسا کرنے سے وہ ابدی خسارے کا شکار ہو کر رہ جائے گا۔ جب وہ یومِ حساب اپنی بداعمالیوں کے سبب بُرے انجام سے دوچار ہوگا تو اُس کے بیوی بچے اور اعزہ و احباب اس کے کچھ بھی کام نہ آئیں گے۔ اس کے برعکس سچا مؤمن وہ ہے جو احکامِ شریعت پر چلنے کی سعی کرتا رہے' فرائض سے غفلت اختیار نہ کرے' حلال و حرام کی پابندیاں قبول کرے' دولت کا صحیح استعمال کرے اور کبھی بھی موت اور آخرت کو فراموش نہ کرے۔ اس کے ساتھ ساتھ اپنی کوتاہیوں پر استغفار کرتا رہے۔ ایسا انسان خواہ دنیا میں کیسی ہی پُر مشقت زندگی گزارے' وہ دائمی آرام و آسائش کی زندگی سے ہمکنار ہوگا' جہاں تمام نعمتیں میسر ہوں گی' کوئی نعمت کسی بھی وقت چھینی نہ جائے گی۔

غُرورُالغَرور

(بڑے دھوکے باز کا دھوکہ)

ابلیس جب اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی کر کے بارگاہِ خداوندی سے رجیم (مردود) ٹھہرا تو اُس نے مہلت مانگی تا کہ اولادِ آدم کو قیامت تک گمراہ کرتا رہے۔ چنانچہ اسے یوم القیامۃ تک مہلت دے دی گئی' لیکن خدائے رحمٰن ورحیم نے اپنے بندوں کو بھی آگاہ کر دیا کہ شیطان ہر وقت اُن کو گمراہ کرنے کی تاک میں لگا رہے گا اور جونہی وہ موقع پائے گا انہیں گمراہ کر کے خدا کے حضور ذلیل وخوار کر دے گا۔ بالفاظِ قرآنی:

﴿قَالَ فَبِمَآ اَغْوَيْتَنِیْ لَاَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَاطَكَ الْمُسْتَقِيْمَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ لَاٰتِيَنَّهُمْ مِّنْۢ بَيْنِ اَيْدِيْهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ اَيْمَانِهِمْ وَعَنْ شَمَآئِلِهِمْ ؕ وَلَا تَجِدُ اَكْثَرَهُمْ شٰكِرِيْنَ ﴿١٧﴾ قَالَ اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُوْمًا مَّدْحُوْرًا ؕ لَمَنْ تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَاَمْلَئَنَّ جَهَنَّمَ مِنْكُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿١٨﴾﴾ (الاعراف)

''بولا (شیطان) چونکہ آپ نے مجھے گمراہ کر دیا ہے تو میں بھی لوگوں کے لیے آپ کی سیدھی راہ پر بیٹھ کر رہوں گا' پھر ان کو اُن کے سامنے سے بھی آلوں گا اور اُن کے پیچھے سے بھی اور ان کے داہنے سے بھی اور اُن کے بائیں سے بھی' اور آپ اُن میں سے اکثر کو شکر گزار نہ پائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: یہاں سے تو نکل ذلیل وخوار ہو کر۔ ان میں سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا سو میں تم سب سے جہنم کو بھر کر رہوں گا۔''

اس یاددہانی کی خاطر ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ اپنے برگزیدہ بندوں کو نبی اور رسول بنا کر بھیجتا رہا جو انسانوں کو شیطان کے دھوکے سے بچنے اور خدا کی خوشنودی کے حصول کی از حد تلقین کرتے رہے۔ انسان فطری طور پر عجلت پسند اور جلد باز واقع ہوا

ہے۔ جہاں اس کو نقد مفاد نظر آتا ہے اُس کی طبیعت ادھر لپکتی ہے' لیکن خدا کے نیک بندے ہر وقت خدا کی رضا اور خوشنودی کی طرف نظر رکھتے ہیں۔ وہ ظاہری اور وقتی مفادات کے پیچھے نہیں پڑتے مگر ایسے لوگ ہمیشہ قلیل تعداد میں رہے ہیں۔ قَلِیْلٌ مِنْ عِبَادِیَ الشَّکُوْرُ۔

شیطان گمراہی کے شعبے کا سربراہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے کام میں حد درجہ ماہر ہے۔ وہ ہر وقت اپنے نامسعود مشن میں مشنری سپرٹ کے ساتھ مصروف ہے۔ اُس کا طریق واردات دھوکہ دے کر انسان کو برائی پر ورغلانہ ہے۔ ظاہر ہے کہ برائی کو برائی کی صورت میں پیش کیا جائے تو اُس کے قبول میں پس و پیش ہوگا' اس لیے وہ ہر برائی کو اچھائی کے روپ میں پیش کرتا ہے اور نقصان دہ کام کو مفید دکھلاتا ہے۔ برے اعمال کو دلکش اور مزین کر کے پیش کرتا ہے۔

شیطان نے پہلا حملہ سب سے پہلے انسان حضرت آدم علیہ السلام پر کیا۔ اللہ تعالیٰ نے آدم علیہ السلام کو جنت کے مخصوص درخت کا پھل کھانے سے روک دیا۔ لیکن شیطان نے آدمؑ کو یہ کہہ کر اُس درخت کا پھل کھانے پر آمادہ کر لیا کہ اُس کا پھل کھا کر وہ ہمیش ہمیش کے لیے جنت میں رہ جائیں گے۔ جنت میں قیام کے خوشنما تصور کو پیش کر کے شیطان آدمؑ کو دھوکہ دینے میں کامیاب ہو گیا۔

سوچنے کی بات ہے کہ اگر شیطان آدم علیہ السلام پر کامیاب حملہ کر سکتا ہے تو عام انسان کی کیا حیثیت ہے؟ لیکن جس طرح ہر دور میں خدائے رحمٰن و رحیم نے شیطان کے حملوں سے بچ نکلنے کی تلقین کی ہے اُسی طرح قرآن پاک میں بھی تفصیل کے ساتھ شیطانی وساوس سے بچنے اور عمدہ کردار اور اخلاق اپنا کر اُسوۂ حسنہ کے مطابق عمل کرنے کی نصیحت کی گئی ہے' نیز شیطان کے پیروکاروں کو ابدی عذاب اور پیغمبروں کے فرماں برداروں کو ابدی راحت کی خوشخبری دی گئی ہے۔

قرآن پاک میں شیطانی حملے اور دھوکہ دہی کے طریق کار کی بھی وضاحت کی گئی ہے' حتیٰ کہ شیطان کو الغرور یعنی بڑا دھوکے باز کہا گیا ہے۔ وہ بڑے سے بڑے آدمی کو

دھوکہ دینے سے نہیں چوکتا۔اسی لیے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں انسان کو شیطان کے شر سے رحمان کی پناہ میں آنے کی دعا سکھائی ہے۔شیطان انسان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتا ہے' لیکن دھوکہ دینے کی غرض سے کہتا ہے کہ اس طرح مال کم ہو جائے گا۔لالچ میں آ کر انسان انفاق فی سبیل اللہ سے باز رہتا ہے اور اپنی دولت کے انبار اور بینک کی پاس بک دیکھ کر پھولا نہیں سماتا۔اس طرح اُس کی نظر سے اللہ کی راہ میں خرچ کر کے خدا کی خوشنودی حاصل کرنا اوجھل ہو جاتا ہے۔شیطان کسی کو جھوٹ بولنے' شراب پینے' رشوت کھانے اور جوا کھیلنے کی براہِ راست ترغیب نہیں دیتا' بلکہ ان اعمال میں سے ہر عمل کی ایسی توجیہہ پیش کرتا ہے کہ انسان اس عملِ بد کو کرنے پر بآسانی آمادہ ہو جاتا ہے۔شیطان کا یہ طریق کار بنی اسرائیل کو گمراہ کرنے کے واقعہ سے اچھی طرح واضح ہے جب وہ ہفتہ کے دن شکار کرنے سے اپنے خیال میں تو باز ہی رہے لیکن جو حیلہ سازی شیطان کی پیروی میں انہوں نے اختیار کی وہ اُن پر عذابِ عظیم کا باعث بنی۔

قرآن پاک کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ بخشش کے لحاظ سے گناہوں کی دو قسمیں ہیں' ایک قابل بخشش دوسری ناقابل بخشش۔تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ شرک ناقابل بخشش اور باقی سب گناہ قابل بخشش ہیں۔ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ اَنْ يُّشْرَكَ بِهٖ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًاۢ بَعِيْدًا (١١٦) ﴾ (النساء)

''بے شک اللہ معاف نہیں کرتا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا جائے' اور اس کے دوسرے گناہ جس قدر ہوں معاف کر دیتا ہے جس کے لیے چاہے' اور جس نے اللہ کے ساتھ شرک کیا وہ دور کی گمراہی میں جا پڑا۔''

چونکہ شیطان انسان کا بدترین دشمن ہے اس لیے اس کا پورا زور لوگوں میں شرک پھیلانے پر رہا ہے تاکہ لوگ حتمی طور پر مغفرتِ خداوندی کے اہل نہ رہیں۔

دنیا میں مسلمانوں کے علاوہ کچھ لوگ لامذہب' کافر' بت پرست یا اہل کتاب یہود و نصاریٰ ہیں جن میں یہود و نصاریٰ اگرچہ توحید کی تعلیم کے علمبردار تھے مگر شیطان اُن

کے عقائد میں شرک کو داخل کر کے انہیں مشرکین کے زمرے میں شامل کر چکا ہے۔صرف مسلمان اب توحید کامل کے حامل ہیں جن کے سامنے قرآن پاک کی صورت میں خالق کائنات کی بھیجی ہوئی صحیح تعلیمات غیر متبدل موجود ہیں۔ مگر شیطان کو یہ کیونکر گوارا ہوسکتا ہے کہ دنیا میں توحید خالص کی ترویج ہو؟ چنانچہ اُس نے مسلمانوں میں بھی اس ناقابلِ بخشش گناہ کو مزین صورت میں پیش کیا۔آج آپ دیکھ رہے ہیں کہ بہت سے کلمہ گومسلمان بدترین شرک میں ملوث ہیں۔

جومسلمان نمازوں میں ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ﴾ بار بار پڑھتے ہیں وہ نبیوں اور ولیوں کی روحوں سے بھی استعانت کرتے ہیں اور پھر گرتے گرتے یہاں تک گر جاتے ہیں کہ گھوڑوں اور گائیوں سے استعانت سے بھی نہیں شرماتے۔

قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کے بارے میں ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهٖ شَيْءٌ﴾ لیکن آج مسلمان مخلوق میں خالق کی صفات بلاتامل تسلیم کرتے ہیں۔ اسلام کی تعلیم کے مطابق عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ کی ذات ہے جو آسمان اور زمین کی باریک سے باریک چیز کی حقیقت اور وجود کو جاننے والا ہے۔ ہر شخص کو جس قدر چاہے علم عطا کرتا ہے۔ ہر فرد کا علم اُس کے علم کے سامنے ہیچ ہے۔ارشادِ الٰہی ہے:

﴿قُلْ لَّا يَعْلَمُ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ الْغَيْبَ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَمَا يَشْعُرُوْنَ اَيَّانَ يُبْعَثُوْنَ ﴿٦٥﴾﴾ (النمل)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے اللہ کے سوا آسمانوں اور زمین میں کوئی غیب کا علم نہیں رکھتا' اور وہ تو یہ بھی نہیں جانتے کہ کب اٹھائے جائیں گے۔''

﴿وَيَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ اِنِّىْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿٢٠﴾﴾ (یونس)

''اور وہ کہتے ہیں کیوں نہ اتاری گئی اس پر کوئی نشانی اُس کے پروردگار کی طرف سے؟ پس کہہ دیجیے علم غیب تو سراسر خدا کے پاس ہے بس تم انتظار کرو' میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والا ہوں۔''

﴿قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِیْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَیْبَ وَلَآ اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّیْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوْحٰٓی اِلَیَّ ۭ﴾ (الانعام: ۵۰)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے میں تم سے نہیں کہتا کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور نہ ہی میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں' میں تو صرف اُسی وحی کی پیروی کرتا ہوں جو مجھ پر نازل کی جاتی ہے۔''

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۚ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾﴾ (الاعراف)

''کہہ دیجیے میں مالک نہیں ہوں اپنے واسطے برے کا اور بھلے کا مگر جو چاہے اللہ۔ اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں اپنے لیے بہت سے فائدے حاصل کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا۔ میں تو ایمان لانے والوں کے لیے تنبیہ کرنے اور خوشخبری دینے والا ہوں۔''

قرآن پاک کی ان تصریحات کے باوجود کہ تنہا اللہ تعالیٰ ہی عالم الغیب ہے اور اس کے رسول ﷺ عالم الغیب نہیں ہیں' آج مسلمان بڑے واضح الفاظ میں آنحضرت ﷺ کو عالم الغیب اور ماکان وما یکون کا علم رکھنے والا مانتے ہیں۔ کچھ دوسرے مسلمان صلحائے اُمت اور شہداء کو عالم الغیب سمجھتے ہیں حالانکہ قرآن کی مندرجہ بالا تصریحات کے علاوہ قرآن میں انبیاء اور نیک لوگوں کے واقعات بھی موجود ہیں جن سے یہ بات اظہر من الشمس ہے کہ خدا تعالیٰ کے سوا کوئی دوسرا عالم الغیب نہیں ہے۔

قرآن پاک کی رو سے تمام اختیارات کا مالک اللہ تعالیٰ ہے۔ وہی ہر قسم کے نفع اور نقصان کا مالک ہے' حفاظت کرنے والا' زندگی اور موت پر اختیار رکھنے والا ہے' دعائیں سننا' نگہبانی کرنا' قسمت کا بنانا' بگاڑنا اُس کے ہاتھ میں ہے۔ حرام وحلال' جائز وناجائز کی حدود متعین کرنا اور انسانی زندگی کے لیے شریعت تجویز کرنا اسی کے اختیار میں ہے۔ سورۂ آل عمران میں ارشاد ہے:

﴿یَقُوْلُوْنَ هَلْ لَّنَا مِنَ الْاَمْرِ مِنْ شَیْءٍ ۭ قُلْ اِنَّ الْاَمْرَ كُلَّهٗ لِلّٰهِ ۭ﴾ (آیت ۱۵۴)

''وہ پوچھتے ہیں کہ اختیارات میں ہمارا بھی کچھ حصہ ہے۔ کہہ دیجیے اختیارات تو سارے کے سارے اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔''

کیا پیغمبر یعنی خدا کے پیارے اور برگزیدہ بندے دوسروں کے نفع نقصان کے مختار ہیں یا وہ اپنے نفع نقصان کے مالک ہوتے ہیں؟ فیصلہ کلام الٰہی سے سنیے:

﴿قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ۭ﴾ (یونس:۴۹)

''(اے نبیؐ!) کہہ دیجیے میرے اختیار میں تو اپنا نفع اور ضرر بھی نہیں، مگر جو اللہ چاہے۔ (سب کچھ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے)۔''

﴿قُلْ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا ۝ قُلْ اِنِّيْ لَنْ يُّجِيْرَنِيْ مِنَ اللّٰهِ اَحَدٌ ڏ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِهٖ مُلْتَحَدًا ۝﴾ (الجن)

''کہہ دیجیے میں تم لوگوں کے لیے نہ کسی نقصان کا اختیار رکھتا ہوں اور نہ کسی بھلائی کا۔ کہہ دیجیے مجھے اللہ کی گرفت سے کوئی نہیں بچا سکتا اور نہ میں اس کے دامن کے سوا کوئی جائے پناہ پا سکتا ہوں۔''

﴿وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۚ وَاِنْ يُّرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَاۗدَّ لِفَضْلِهٖ ۭ يُصِيْبُ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَهُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ ۝﴾ (یونس)

''اور اگر اللہ تجھے کوئی نقصان دے تو اُس کو سوائے اس کے کوئی دور کرنے والا نہیں، اور اگر وہ تیرے ساتھ بھلائی کا ارادہ کرے تو اُس کے فضل کو کوئی پھیرنے والا نہیں۔ وہ اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اپنا فضل پہنچاتا ہے۔ اور وہ بڑا بخشنے والا مہربان ہے۔''

ان قرآنی تصریحات کے مطابق اللہ تعالیٰ ہی جملہ اختیارات کا مالک ہے۔ وہی مخلوقات کے نفع اور نقصان پر قادر ہے۔ اگر وہ کسی کو نفع پہنچانا چاہے تو کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ اور اگر وہ کسی کو نقصان پہنچانا چاہے تو کوئی دوسرا اسے نفع نہیں دے سکتا۔ لیکن آج مسلمان ہر کس و ناکس کو مشکل کشا، حاجت روا اور داتا کے نام دیتے اور اللہ کی کتاب کی کھلی خلاف ورزی کرتے ہوئے شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں اور بڑے دھوکہ باز سے دھوکا کھا رہے ہیں۔ اس ضمن میں مزید سنیے:

﴿...... ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ لَهُ الْمُلْكُ ؕ وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ ؕ اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ ۚ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ ؕ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ ؕ﴾ (فاطر:۱۳، ۱۴)

''...... یہی ہے اللہ پروردگار تمہارا' اُسی کے واسطے ہے بادشاہی۔ اور اُس (اللہ) کو چھوڑ کر جن دوسروں کو تم پکارتے ہو وہ کھجور کی گٹھلی کے چھلکے کے مالک بھی نہیں ہیں۔ اگر تم انہیں پکارو تو تمہاری دعائیں سن نہیں سکتے' اور اگر سن لیں تو اُن کا کوئی جواب نہیں دے سکتے۔ اور قیامت کے روز وہ تمہارے شرک کا انکار کریں گے۔''

﴿قُلِ ادْعُوا الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ فَلَا يَمْلِكُوْنَ كَشْفَ الضُّرِّ عَنْكُمْ وَلَا تَحْوِيْلًا ۞ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ يَبْتَغُوْنَ اِلٰى رَبِّهِمُ الْوَسِيْلَةَ اَيُّهُمْ اَقْرَبُ وَيَرْجُوْنَ رَحْمَتَهٗ وَيَخَافُوْنَ عَذَابَهٗ ؕ اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ كَانَ مَحْذُوْرًا ۞﴾ (بنی اسرائیل)

''ان سے کہیے پکار دیکھو اُن معبودوں کو جن کو تم خدا کے سوا اپنا کارساز سمجھتے ہو' وہ کسی تکلیف کو تم سے ہٹا سکتے ہیں نہ بدل سکتے ہیں۔ جن کو یہ لوگ پکارتے ہیں وہ تو خود اپنے ربّ کے حضور رسائی حاصل کرنے کا وسیلہ تلاش کر رہے ہیں کہ کون اس سے قریب تر ہو جائے' اور وہ اس کی رحمت کے امیدوار اور اس کے عذاب سے خائف ہیں۔ بے شک تیرے پروردگار کا عذاب ایسا ہی ہے کہ اُس سے خوف کھایا جائے۔''

صاف ظاہر ہے کہ یہ آیات بتوں کے متعلق نہیں ہیں' بلکہ صلحائے اُمت اور بزرگانِ دین کے متعلق ہیں۔ ہمیشہ سے شیطان کا یہ طریق کار رہا ہے کہ وہ عوام کو انبیاء اور صلحاء کی قبروں کی طرف متوجہ کرتا ہے' کیونکہ لوگ بزرگوں پر اعتقاد اور حسنِ ظن رکھتے ہیں۔ اس کمزوری کا فائدہ اٹھا کر وہ لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے کہ یہ قبروں کے اندر بھی تمہاری ہر طرح کی بات سنتے ہیں اور مدد کو پہنچتے ہیں' وہ خدا رسیدہ ہیں اس لیے تمہاری مشکلات خدا تعالیٰ سے سفارش کر کے حل کرا دیں گے۔ چنانچہ لوگوں نے بزرگوں کی قبروں کو بچا کر

رکھنے کے لیے پختہ' مضبوط اور خوبصورت بنایا اور ان پر عمارتیں کھڑی کیں۔ اُن کے مزار مرجع خلائق بن گئے۔ اُمت مرحومہ پر بھی شیطانی دھوکہ اثر انداز ہوا اور وہ یہود و نصاریٰ کی طرح قبروں کا طواف کرنے' وہاں دعائیں مانگنے اور حاجات طلب کرنے میں مشغول ہو گئے اور شرک کا ارتکاب کر کے ابلیس کے مشن کی تکمیل کا باعث ہوئے۔ حالانکہ نبی آخر الزمان ﷺ نے شرک کے ظہور کے اس قدیم ترین راستے کو یہ کہہ کر قطعی مسدود کر دیا تھا کہ میں تمہیں قبروں کو پختہ کرنے اور اُن پر عمارت بنانے سے منع کرتا ہوں۔ حضرت جابر ؓ سے مروی ہے کہ:

نَهٰى رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَنْ يُجَصَّصَ الْقَبْرُ وَاَنْ يُّقْعَدَ عَلَيْهِ وَاَنْ يُّبْنٰى عَلَيْهِ

(رواہ مسلم)

''رسول اللہ ﷺ نے منع فرمایا ہے کہ قبر کو پختہ کیا جائے' اُس پر بیٹھا جائے اور اُس پر عمارت بنائی جائے''۔

اور فرمایا:

نَهَى النَّبِيُّ ﷺ اَنْ تُجَصَّصَ الْقُبُوْرُ وَاَنْ يُّكْتَبَ عَلَيْهَا وَاَنْ تُوْطَاَ

(رواہ الترمذی)

''منع فرمایا ہے نبی اکرم ﷺ نے قبروں کو پختہ کرنے سے اور قبروں پر لکھنے سے اور قبروں کو روندنے سے۔''

چنانچہ آنحضرت ﷺ نے خود زندگی بھر نہ کسی کی قبر پختہ کی نہ اس پر عمارت بنوائی اور کوئی تحریر لکھوائی۔ خلفائے راشدین کے زمانے میں بھی اسی سنت پر عمل رہا۔ خود عم رسولؐ حضرت حمزہ ؓ ۳ھ میں میدانِ اُحد میں شہید ہوئے۔ آپؐ نے انہیں سید الشہداء کہا' خود ہی ان کی تجہیز و تکفین کی۔ اُن کی قبر عہد رسالت میں اسی طرح خاک کی بنی ہوئی رہی' عہد صحابہ میں بھی بحالہ قائم رہی اور آج تک میدانِ اُحد میں بغیر عمارت اور قبے کے موجود ہے۔ رسول پاکؐ کے واضح ارشادات' آپؐ کے اُسوۂ حسنہ اور خلفائے راشدین کے طریقے کی خلاف ورزی کرتے ہوئے آج مسلمان اپنے بزرگوں کی قبریں پختہ بنا رہے ہیں' ان پر عمارتیں اور قبے تعمیر کر رہے ہیں' ان کے اوپر تحریریں لکھ رہے ہیں۔ یہ

کیوں ہورہا ہے؟ یہ سب کچھ شیطانی دھوکے کے سوا کچھ نہیں۔ شیطان اچھے روپ میں برے کام پیش کرتا ہے۔ حالانکہ بزرگوں کے احترام کا طریقہ خود شریعت اسلامیہ، صحابہ کرامؓ اور تابعین کے عمل سے واضح ہے۔ قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں کو بزرگوں کے گستاخ سمجھنا خود پرلے درجے کی حماقت ہے۔ جس طریق سے وہ اپنے بزرگوں کا احترام کرتے تھے وہی صحیح طریقہ تھا۔ قبر پرستی کا اُس دور میں نشان تک نہیں ملتا۔

مختصر یہ کہ جس طرح شیطان کی ہمیشہ سے یہ سرتوڑ کوشش ہے کہ لوگوں کو نا قابل معافی گناہ (شرک) میں مبتلا کر کے اُن پر جنت کا دروازہ بند کرا دے اسی شدت کے ساتھ ہمیں اس بات کا احساس ہر وقت پیش نظر رہنا چاہیے کہ شرک ہم سے ہرگز سرزد نہ ہو۔ ہم بار بار قرآن وسنت کی روشنی میں اپنے اعمال کا جائزہ لیتے رہیں اور اطمینان کر لیں کہ ہم کسی شیطانی دھوکے میں آ کر وہ کام تو نہیں کر رہے جن سے ہادیٔ اعظم ﷺ نے ہمیں منع کیا ہے۔ کیونکہ یہ شیطانی دھوکہ انجامِ کار ابدی زندگی کی تباہی کا موجب بنے گا۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ارشاد ہے:

﴿مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰهُ النَّارُ ﴾

(المائدۃ: ۷۲)

''جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا پس اللہ نے اس پر جنت حرام کر دی اور اُس کا ٹھکانہ دوزخ ہے۔''

وَبِالْوَالِدَیْنِ اِحْسَانًا

اسلامی تعلیمات میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی خصوصی تاکید ملتی ہے۔قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنے حق یعنی توحید کے متصلاً بعد والدین کے حقوق بیان کیے ہیں اور ان کے ساتھ اچھے سلوک کی تلقین کی ہے۔ والدین کا ادب واحترام' ان کے ساتھ حسن وخوبی کا برتاؤ اخلاقیات کا اہم تقاضا ہے۔چونکہ اسلام میں اخلاقیات کی اہمیت ایک تسلیم شدہ حقیقت ہے اس لیے اولاد کے لیے اپنے والدین کی خدمت' فرماں برداری اور نیک سلوک کو اسلامی اخلاق میں اہم ضابطے کے طور پر شامل کیا گیا ہے۔

دین اسلام کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں فطری تقاضوں کی تسکین کے لیے احسن طرزِ عمل اور عمدہ طریقِ کار اختیار کیا گیا ہے۔ والدین کے دل میں اولاد کی محبت کا جذبہ فطری طور پر نہایت شدت کے ساتھ موجود ہوتا ہے۔ چنانچہ اس جذبے کا کرشمہ ہے کہ والدین اپنے بچوں کے آرام وآسائش کا خیال رکھتے اور ان کی تعلیم و تربیت کا بہتر سے بہتر انتظام کرتے اوران کی تکالیف رفع کرنے کی انتہائی کوشش کرتے ہیں۔ بلکہ اگر اولاد کو مصیبت میں دیکھیں تو اس قدر بے تاب ہو جاتے ہیں کہ خود اپنی تکلیف بھی بھول جاتے ہیں۔سردیوں کے موسم میں ماں کے پہلو میں لیٹا ہوا بچہ رات کو بستر پر پیشاب کر کے بچھونے کو گیلا کر دے تو ماں کے لیے یہ نا قابل برداشت ہوتا ہے کہ وہ خود تو خشک بچھونے پر سوئے اور اس کا بچہ گیلے حصے پر پڑا رہے۔ چنانچہ وہ خود گیلے حصے پر ہو جاتی ہے اور بچے کو خشک بچھونے پر لٹا دیتی ہے۔اسی طرح والد اپنے خون پسینے کی کمائی اولاد پر خرچ کرتا ہے۔بعض اوقات خود تکلیف اٹھا کر اولاد کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ والدین اولاد کی کوتاہیوں کو برداشت کرتے اور کمالِ فراخ دلی سے انہیں معاف

کر دیتے ہیں۔

مروّت کا تقاضا ہے کہ محسن کو یاد رکھا جائے۔اس کے حسن سلوک اور مصیبت میں کام آنے کو فراموش نہ کیا جائے۔حدیث میں آتا ہے کہ جس نے لوگوں کا شکر ادا نہ کیا اس نے اللہ کا شکر ادا نہ کیا۔ اولاد کے لیے والدین سے بڑھ کر کون محسن ہو سکتا ہے! چنانچہ اولاد پر یہ فرض خود بخود عائد ہو جاتا ہے کہ وہ بڑی ہو کر والدین کی خدمت اور اطاعت کرے اور اس بات کو کبھی فراموش نہ کرے کہ انہوں نے بڑی تکلیفیں اٹھا کر' دکھ سہہ کر اور مال خرچ کر کے ان کی پرورش کی ہے۔سورۂ بنی اسرائیل میں ارشادِ باری ہے:

﴿...... وَبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا ۭ اِمَّا يَبْلُغَنَّ عِنْدَكَ الْكِبَرَ اَحَدُهُمَآ اَوْ كِلٰهُمَا فَلَا تَقُلْ لَّهُمَآ اُفٍّ وَّلَا تَنْهَرْهُمَا وَقُلْ لَّهُمَا قَوْلًا كَرِيْمًا ۝ وَاخْفِضْ لَهُمَا جَنَاحَ الذُّلِّ مِنَ الرَّحْمَةِ وَقُلْ رَّبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا ۝﴾

''......اور والدین کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔اگر اُن میں سے ایک یا وہ دونوں تمہارے سامنے بڑھاپے کو پہنچ جائیں تو ان کو اُف تک نہ کہنا اور نہ ان کو جھڑکنا' بلکہ ان کے ساتھ بات کرنا احترام کے ساتھ۔ اور ان کے لیے عاجزی کا بازو جھکا دو مہربانی کے ساتھ۔ اور (خدا سے التجا کرتے ہوئے) کہو اے میرے پروردگار! ان دونوں پر رحم کر جیسا انہوں نے مجھے چھوٹے سے کو پالا''۔

والدین کے اپنی اولاد پر اس قدر احسان ہوتے ہیں کہ ان کو شمار نہیں کیا جا سکتا۔ عام ضابطۂ اخلاق کے تحت اولاد کے لیے لازم ہے کہ وہ ہوش مندی کی عمر کو پہنچ کر اپنے والدین کے احسانات کا بدلہ چکائے' خصوصاً جبکہ والدین بڑھاپے کی عمر کو پہنچ کر جسمانی کمزوری کی وجہ سے اولاد کی خدمت کی حاجت بھی رکھتے ہوں۔ چونکہ والدین نے اولاد کی پرورش کے دوران دکھ اور تکلیف برداشت کیے ہوتے ہیں اس لیے فطرتاً وہ اُمید رکھتے ہیں کہ جن کے لیے انہوں نے دکھ اور تکلیفیں اٹھائیں بلکہ جان تک نچھاور کرتے رہے اب احتیاج کے وقت وہ ان کی نگہداشت کریں اور سہولت پہنچانے کی کوشش کریں۔ لیکن جب ناخلف اولاد جوان ہو کر اپنے من پسند مشاغل میں منہمک ہو جائے اور بوڑھے والدین کو بے سہارا چھوڑ دے تو ماں باپ کا ان پر ناراض ہونا فطری امر

ہے۔ چونکہ والدین کی ناراضی بجا ہوتی ہے اس لیے ان کی ناراضی خدا کی ناراضی کا موجب بنتی ہے۔ اسی طرح جب سعادت مند اولاد جوان ہوکر اپنے ضعیف والدین کی خدمت کرتی ہے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھتی ہے تو والدین کا دل خوش ہوتا ہے اور ان کی یہ خوش دلی اللہ تعالیٰ کو بھی پسند آتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ اللہ کی رضا والدین کی رضا میں ہے اور اللہ کی ناراضی والدین کی ناراضی میں ہے۔ ایک اور حدیث کے الفاظ اس طرح ہیں کہ جب کوئی اپنے ماں باپ کے لیے دعا کرنا چھوڑ دیتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے رزق میں تنگی کر دیتا ہے۔ معلوم ہوا کہ والدین کے حق میں دعا مانگنا بھی ادائے حقوق کے لیے لازم ہے۔ نیز والدین کے حق میں دعا کے الفاظ بھی خود قرآن پاک میں بتائے گئے ہیں، یعنی: ﴿رَبِّ ارْحَمْهُمَا كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا﴾ ''اے میرے پروردگار! ان دونوں (میرے ماں باپ) پر رحم فرما جیسا کہ انہوں نے مجھے بچپن میں پالا''۔ گویا دعا مانگنے والا ''كَمَا رَبَّيٰنِيْ صَغِيْرًا'' کہہ کر خدا تعالیٰ سے اپنے والدین کے لیے غیر مشروط اور مطلق مہربانی کی تمنا کر رہا ہے، کیونکہ انہوں نے مطلق مہربانی کے جذبے کے تحت ہی اپنی اولاد کی تربیت کی ہے۔ اولاد سے ناپختگی کی عمر میں اکثر اوقات نامناسب رویے کا ظہور بھی ہو جاتا ہے لیکن والدین اپنے تیور نہیں بدلتے، بلکہ معاف کیے دیتے ہیں اور درگزر سے کام لیتے ہیں۔ تو اب جوان صاحبزادے کی اللہ کے حضور دعا کا مفہوم یہ ہے کہ جس طرح میرے والدین نے میری لغزشوں، کوتاہیوں، غلطیوں اور نالائقیوں کے باوجود مطلق مہربانی کے جذبے سے میری پرورش کی اسی طرح تو بھی ان کی خطاؤں اور گناہوں کو نظر انداز کر کے اُن پر مطلق مہربانی فرما۔ کتنی معنی خیز دعا ہے جو ہمیں ہمارے خالق نے اپنے والدین کے حق میں مانگنے کے لیے سکھائی ہے۔

بعض اوقات والدین خود اخلاقی یا عملی اعتبار سے قصوروار ہوتے ہیں، تو سوال پیدا ہوگا کہ والدین کے حق میں دعا مانگنا اس وقت کیسا رہے گا؟ تو اس صورتِ حال کے لیے قرآن پاک میں کوئی استثناء مذکور نہیں ہے، بلکہ اولاد کو والدین کے حق میں غفور اور رحیم

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بچے کے سر پر خون نہیں بلکہ اس کی جگہ خلوق (زرد رنگ کی خوشبو) لگایا کرو''۔

خلوق ایک خوشبو کا نام ہے جو زعفران وغیرہ سے تیار کی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ عقیقہ کا رواج جاہلیت میں بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی اصلاح کر دی۔ لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرے کی قربانی کرنے کو کہا۔ اگر وسعت نہ ہو تو لڑکے کی طرف سے بھی ایک ہی قربانی کافی ہے۔ اس گوشت کے ساتھ عزیز و اقارب کی دعوت کی جائے اور کچھ گوشت مساکین و فقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔ عقیقہ ملت ابراہیمی کے شعائر میں سے ہے۔ سنن الترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے روایت ہے کہ:

عَقَّ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ عَنِ الْحَسَنِ بِشَاۃٍ وَقَالَ : ((یَا فَاطِمَۃُ احْلِقِیْ رَاْسَہٗ وَتَصَدَّقِیْ بِزِنَۃِ شَعْرِہٖ فِضَّۃً)) قَالَ : فَوَزَنْتُہٗ فَکَانَ وَزْنُہٗ دِرْھَمًا اَوْ بَعْضَ دِرْھَمٍ)) (رواہ الترمذی)

''رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کے عقیقہ میں ایک بکری کی قربانی کی اور آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے فرمایا: ''اس کا سر صاف کر دو اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کر دو''۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ سے ان کا وزن کیا تو وہ ایک درہم کے برابر یا اس سے بھی کچھ کم تھے''۔

بچے کا نام رکھنا بھی ایک حق ہے' ایسا نام جو کسی اچھی شخصیت کے نام پر ہو یا اچھے معنی رکھتا ہو۔ نام بے تکا اور بے معنی نہ ہو کہ بڑا ہو کر بچہ اپنے نام کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرے۔ مثلاً محمد بوٹا' پیراں دتہ' اروڑہ' گھسیٹا' علی بخش' عباد علی' شقنو د وغیرہم۔ رسول اللہ ﷺ کے پسندیدہ نام عبدالرحمٰن اور عبداللہ ہیں' یعنی وہ نام جس میں اللہ کا بندہ ہونے کا مفہوم نکلتا ہو۔ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناموں پر نام رکھنا بھی پسندیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَوَّلُ مَا یَنْحَلُ الرَّجُلُ وَلَدَہٗ اسْمُہٗ فَلْیُحْسِنِ اسْمَہٗ))

(رواہ ابوالشیخ' بحوالہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)

''آدمی اپنے بچے کو سب سے پہلا تحفہ نام کا دیتا ہے' اس لیے چاہیے کہ اس کا اچھا

حقوقِ اولاد

عام طور پر حقوقِ والدین پر بڑا زور دیا جاتا ہے اور بچوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی جاتی ہے کہ وہ اپنے والدین کے فرماں بردار رہیں اور ہر وقت ان کا ادب واحترام ملحوظ رکھیں' کبھی گستاخی کا کلمہ ان کی زبان سے نہ نکلنے پائے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ بچوں کو سکھانے اور تعلیم دینے کی زیادہ ضرورت ہوتی ہے۔ دوسری یہ کہ ناسمجھی میں ان سے خلافِ ادب حرکات سرزد ہونے کے امکانات زیادہ ہوتے ہیں' لیکن اس کے علاوہ ایک وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ پند و نصائح کرنے والے لوگ بڑی عمر کے ہوتے ہیں۔ اکثر صاحبِ اولاد بھی ہوتے ہیں۔ وہ اپنی اولاد کو فرماں بردار دیکھنا چاہتے ہیں۔ وعظ و نصیحت کے ان کلمات میں ان کی اپنی غرض بھی شامل ہوتی ہے۔ جب وہ چھوٹوں کو نصیحت کر رہے ہوتے ہیں تو ان کی انا کو تسکین ہوتی ہے کیونکہ وہ اپنے آپ کو پارسا سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

تھوڑا سا غور کریں تو انسان آسانی سے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ بچوں کو ان کے فرائض یاد دلانے واقعتاً بہت ضروری ہیں' مگر اس سے بھی اہم تر یہ ہے کہ بڑے اپنے فرائض کی ادائیگی میں کما حقہٗ دلچسپی لیں اور بچوں کی تربیت اس نہج پر کریں کہ عمر کے ساتھ ساتھ بچے خود بخود اپنے فرائض سے آگاہ ہوتے جائیں اور اپنے والدین کی مثال سامنے رکھتے ہوئے فرائض کی ادائیگی میں چستی اور مستعدی کا مظاہرہ کریں۔ ویسے بھی حقوق و فرائض کا عمل دوطرفہ ہے۔ ایک فریق کا رویہ دوسرے فریق کو متاثر کرتا ہے۔ اگر والدین اپنے فرائض کی ادائیگی میں چوکس (vigilant) ہوں تو بڑی حد تک ان کی اولاد فرض شناس اور ذمہ دار ہوگی۔ اگر ایک باپ گھر میں سگریٹ نوشی کرتا ہے تو یہ بُری عادت ہے اور صحت کے لیے بھی نقصان دہ ہے' لیکن اس کا بھیانک پہلو یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کی تربیت میں بھی کوتاہی کا ارتکاب کر رہا ہے' کیونکہ خود تمباکو نوشی کرنے والا اپنے

بیٹے کو اس سے باز رہنے کی نصیحت کیسے کر سکتا ہے؟ اور اگر کرے بھی تو اُس کا اثر کیا ہوگا؟ اب اگر بچہ بڑا ہو کر سگریٹ نوشی کا عادی ہو جائے تو اس کا باپ بیٹے کی تربیت میں خامی سے کیسے بری ُالذمہ قرار دیا جا سکتا ہے؟ یہی حال بے نماز' رشوت خور' جھوٹ بولنے والے' وعدہ خلافی کرنے والے' گالی گلوچ اور بدزبانی کرنے والے' روزے نہ رکھنے والے اور زکوٰۃ نہ دینے والے والدین کا ہے۔ اگرچہ یہ گناہ ذاتی نوعیت کے ہیں لیکن اولاد کے معاملے میں ان کی تاَثیر متعدی ہو جاتی ہے۔

بچے اپنے والدین کو جس رویے اور جن مشاغل میں دیکھیں گے وہ ان سے کیسے متاثر نہ ہوں گے! لہٰذا ضرورت اس امر کی ہے کہ والدین بچوں کو زبانی وعظ و نصیحت بھی کریں مگر اہم تر بات یہ ہے کہ وہ انہیں اپنی شخصیت کا نمونہ پیش کر کے ان پر واضح کریں کہ کیا چیز پسندیدہ ہے اور کیا چیز ناپسندیدہ' کون سے کام کرنے کے ہیں اور کون سے اجتناب کرنے کے قابل ہیں۔ اس طرح بڑی حد تک توقع کی جا سکتی ہے کہ بچے ہمہ گیر تربیت پائیں اور اچھے شہری اور اچھے مسلمان ثابت ہوں۔ چنانچہ اس تحریر کا مدّعا یہ ہے کہ والدین اپنے فرائض سے واقف ہوں اور ان کی ادائیگی کے سلسلے میں چوکس ہوں۔ جبکہ اولاد کو فرائض کی ادائیگی کا احساس دلانا بھی ضروری ہے' مگر وہ اس کے بعد کی بات ہے۔

جیسا کہ اوپر ذکر ہوا' والدین کو حسنِ عمل اور حسنِ اخلاق کی عملی مثال پیش کرنا سب سے ضروری ہے۔ اس کے لیے اپنے فرائض کو ہر وقت ذہن میں مستحضر کرنا لازم ہے۔ یہاں یہ بات بھی پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ اولاد کی تربیت بہت بڑی ذمہ داری ہے۔ کیونکہ اچھی' صالح اور نیک اولاد صدقہ جاریہ کے درجے میں آتی ہے اور اُس کے نیک اعمال کا ثواب والدین کو بھی ملتا رہتا ہے چاہے وہ وفات بھی پا جائیں۔ اسی طرح اگر ماں باپ نے اپنی اولاد کی تربیت میں کوتاہی کی ہوگی تو اولاد کی برائیوں کا گناہ بھی والدین کو لگاتار ملتا رہے گا' اگرچہ وہ فوت بھی ہو جائیں۔ پس مسئلے کی اہمیت کو سامنے رکھتے ہوئے آیئے حقوقِ اولاد یعنی والدین کے فرائض کو سمجھنے کی کوشش کریں۔

میاں بیوی اللہ تعالیٰ سے نیک اور سعادت مند اولاد مانگیں۔ جیسا کہ حضرت زکریاعلیہ السلام کی دعا قرآن مجید میں منقول ہے:

﴿رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً طَيِّبَةً﴾ (آل عمران:۳۸)

''اے میرے پروردگار! مجھے اپنے پاس سے پاکیزہ اولاد عطا فرما۔''

پھر جب اللہ تعالیٰ اولاد مرحمت فرمائے تو اُس کی پیدائش پر اس کے داہنے کان میں اذان اور بائیں کان میں اقامت کہی جائے۔ اس عمل کی برکت اور تاثیر سے بچہ اُم الصبیان کے ضرر سے محفوظ رہے گا۔ نیز اللہ کی توحید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی پاکیزہ آواز اُس کے کانوں کے ذریعہ دل و دماغ تک پہنچ کر ضرور اپنا اثر دکھائے گی۔ بہتر ہے کہ پیدائش کے بعد بچے کو اللہ کے کسی مقبول اور صالح بندے کے پاس لے جائیں جو اُس کے لیے خیر و برکت کی دعا کرے۔ جب حضرت اسماء بنت ابی بکر رضی اللہ عنہما ہجرت کر کے مدینہ آئیں تو قبا کے مقام پر اُن کے ہاں عبداللہ بن زبیر رضی اللہ عنہما کی ولادت ہوئی۔ وہ بچے کو لے کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور بچے کو آپؐ کی گود میں ڈال دیا۔ آپؐ نے چھوہارہ منگوایا' اس کو چبایا' پھر اپنا لعابِ دہن اس کے مُنہ میں ڈالا اور تالو پر ملا' اس کے بعد اس کے لیے خیر و برکت کی دعا کی۔

بچے کی پیدائش اہل خاندان کے لیے خوشی اور مسرت کا موقع ہوتا ہے۔ ایامِ جاہلیت میں اس موقعے پر خوشی کے اظہار کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاتے تھے۔ اسلام نے اس فطری خوشی کے اظہار کو برقرار رکھتے ہوئے جاہلیت کے انداز ختم کر دیے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں:

كَانُوْا فِي الْجَاهِلِيَّةِ اِذَا عَقُّوْا عَنِ الصَّبِيِّ خَضَّبُوْا قُطْنَةً بِدَمِ الْعَقِيْقَةِ' فَاِذَا حَلَقُوْا رَاْسَ الصَّبِيِّ وَضَعُوْهَا عَلٰى رَاْسِهٖ ' فَقَالَ النَّبِيُّ ﷺ : ((اجْعَلُوْا مَكَانَ الدَّمِ خَلُوْقًا)) (رواہ ابن حبان فی صحیحہ)

''زمانۂ جاہلیت میں لوگوں کا یہ دستور تھا کہ جب وہ بچے کا عقیقہ کرتے تو روئی کے ایک پھوئے میں عقیقہ کے جانور کا خون بھر لیتے' پھر جب بچے کا سر منڈوا دیتے تو وہ خون بھرا ہوا پھویا اس کے سر پر رکھ دیتے۔ (یہ جاہلانہ رسم تھی) رسول

اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بچے کے سر پر خون نہیں بلکہ اس کی جگہ خلوق (زرد رنگ کی خوشبو) لگایا کرو''۔

خلوق ایک خوشبو کا نام ہے جو زعفران وغیرہ سے تیار کی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ عقیقہ کا رواج جاہلیت میں بھی تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے اس کی اصلاح کر دی۔ لڑکے کی طرف سے دو بکرے اور لڑکی کی طرف سے ایک بکرے کی قربانی کرنے کو کہا۔ اگر وسعت نہ ہو تو لڑکے کی طرف سے بھی ایک ہی قربانی کافی ہے۔ اس گوشت کے ساتھ عزیز واقارب کی دعوت کی جائے اور کچھ گوشت مساکین وفقراء میں تقسیم کر دیا جائے۔ عقیقہ ملت ابراہیمی کے شعائر میں سے ہے۔ سنن الترمذی میں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

عَقَّ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ عَنِ الْحَسَنِ بِشَاةٍ وَقَالَ :((يَا فَاطِمَةُ احْلِقِيْ رَاْسَهٗ وَتَصَدَّقِيْ بِزِنَةِ شَعْرِهٖ فِضَّةً)) قَالَ :فَوَزَنْتُهٗ فَكَانَ وَزْنُهٗ دِرْهَمًا اَوْ بَعْضَ دِرْهَمٍ)) (رواہ الترمذی)

''رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسنؓ کے عقیقہ میں ایک بکری کی قربانی کی اور آپؐ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ سے فرمایا: ''اس کا سر صاف کر دو اور بالوں کے وزن کے برابر چاندی صدقہ کر دو''۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ حضرت فاطمہؓ سے ان کا وزن کیا تو وہ ایک درہم کے برابر یا اس سے بھی کچھ کم تھے''۔

بچے کا نام رکھنا بھی ایک حق ہے' ایسا نام جو کسی اچھی شخصیت کے نام پر ہو یا اچھے معنی رکھتا ہو۔ نام بے تکا اور بے معنی نہ ہو کہ بڑا ہو کر بچہ اپنے نام کی وجہ سے شرمندگی محسوس کرے۔ مثلاً محمد بوٹا' پیراں دتہ' اروڑہ' گھسیٹا' علی بخش' عباد علی' شقنو د وغیرہم۔ رسول اللہ ﷺ کے پسندیدہ نام عبدالرحمن اور عبداللہ ہیں' یعنی وہ نام جس میں اللہ کا بندہ ہونے کا مفہوم نکلتا ہو۔ انبیاء علیہم السلام اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ناموں پر نام رکھنا بھی پسندیدہ ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَوَّلُ مَا يَنْحَلُ الرَّجُلُ وَلَدَهٗ اسْمُهٗ فَلْيُحْسِنِ اسْمَهٗ))

(رواہ ابوالشیخ' بحوالہ معارف الحدیث از مولانا محمد منظور نعمانی)

''آدمی اپنے بچے کو سب سے پہلا تحفہ نام کا دیتا ہے' اس لیے چاہیے کہ اس کا اچھا

نام رکھے۔''

اب بچے کی تربیت کا آغاز ہوتا ہے۔ جسمانی نشو ونما کے لیے بچے کو اپنے وسائل کے اندر رہتے ہوئے اچھی غذا اور خوراک جو حلال اور جائز طریقے سے کمائی گئی ہو' مہیا کرنے کا بندوبست کیا جائے۔ بچہ تو معصوم ہے' اس کو تو جو ملے گا کھا لے گا' مگر والدین خصوصاً والد کا یہ بڑا اہم فرض ہے کہ وہ روزی کمانے کے جائز ذرائع اختیار کرے۔ یہ تربیت اولاد کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ رزقِ حلال پر پرورش پانے والے بچے عموماً صاف ستھرے اخلاق و کردار کے مالک' والدین کے فرماں بردار' بزرگوں کا احترام کرنے والے اور راست رو ہوتے ہیں۔

جب بچہ بولنے کا آغاز کرے تو سب سے پہلے اسے کلمہ طیبہ سکھایا جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِفْتَحُوْا عَلٰی صِبْیَانِکُمْ اَوَّلَ کَلِمَةٍ بِلَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ وَلَقِّنُوْهُمْ عِنْدَ الْمَوْتِ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ)) (شعب الایمان)

''اپنے بچوں کی زبان سے سب سے پہلے لا الٰہ الا اللہ کہلواؤ اور موت کے وقت ان کو اسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ کی تلقین کرو۔''

جس طرح پیدائش کے بعد پہلی آواز بچے کے کان میں جو ڈالی جاتی ہے وہ اذان کے الفاظ ہیں' اسی طرح جب اس کی گفتگو کا آغاز بھی کلمۂ توحید سے ہوگا تو اس کا اس کے قلب و ذہن پر اثر ضرور ہوگا۔ آج کے مغرب زدہ دور میں مسلمان بچوں کو زیادہ سے زیادہ انگریزی الفاظ سکھانے کی کوشش کی جاتی ہے جس سے بچے کے ذہن پر اس زبان کی برتری غالب ہو کر اسے مغربی اقدار سے قریب اور اسلامی اقدار سے دور کرنے لگتی ہے۔

بچے کا سب سے پہلا مدرسہ اس کی ماں کی گود ہوتی ہے۔ اگر ماں پاکیزہ اخلاق و کردار کی مالک' سادگی پسند' مشرقی اقدار و روایات کی شائق اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے والی ہوگی تو بچہ یہی باتیں خود بخود سیکھ جائے گا۔ اس کے برخلاف اگر ماں فیشن کی دلدادہ' موسیقی کی شوقین' بے پردگی کی عادی اور اسلامی روایات سے نفور ہوگی تو بچہ بھی

انہی اقدار کو پسند کرے گا اور اپنائے گا۔ لہٰذا بچے کی تربیت میں ماں کا کردار باپ سے بھی زیادہ تاثیر رکھتا ہے۔ علامہ اقبال نے کیا خوب کہا ہے :

بتولے باش و پنہاں شو ازیں عصر
کہ در آغوش شبیرے بگیری

''اے مسلمان عورت! تو بتول (حضرت فاطمہؓ) کا کردار اپنا کر زمانے کی آنکھوں سے مستور زندگی گزار (یعنی باپردہ رہ)۔ پھر دیکھ تیری گود میں بھی حسینؓ پرورش پائے گا''۔

جو عورت حیا باختہ اور برے کردار و عمل کی مالک ہو اور ستر و حجاب کی پابندیوں کا مذاق اڑاتی ہوئی سر کے بال کھولے کلبوں' پارکوں' گلیوں اور بازاروں میں گھومے اس کی گود میں اسلامی اقدار سے محبت رکھنے والی اولاد کیسے پل سکتی ہے؟ آج ہم اس بات کی خواہش تو ضرور کرتے ہیں کہ ہمارے بچے سعادت منداور باکردار ہوں مگر اس سلسلہ میں عائد فرائض کی ادائیگی سے اعراض کرتے ہیں۔ اس کا نتیجہ سب کے سامنے ہے۔ یہ تو وہی بات ہے کہ نیم کا پودا لگا کر کوئی شخص آم کھانے کی تمنا کرے۔

رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق مسلمان اور کافر کے درمیان نماز کا فرق ہے۔ لہٰذا نماز کی اہمیت کو سمجھتے ہوئے بچوں کو نماز کا عادی بنانا بھی والدین کا فرض ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمروؓ بن العاص سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مُرُوْا اَوْلَادَكُمْ بِالصَّلَاةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعِ سِنِيْنَ وَاضْرِبُوْهُمْ عَلَيْهَا وَهُمْ اَبْنَاءُ عَشْرٍ وَفَرِّقُوْا بَيْنَهُمْ فِي الْمَضَاجِعِ)) (سنن ابی داوٗد)

''تمہارے بچے جب سات سال کے ہو جائیں تو ان کو نماز کی تاکید کرو اور جب دس سال کے ہو جائیں تو نماز میں کوتاہی کرنے پر ان کو سزا دو اور ان کے بستر بھی الگ کر دو''۔

یہاں یہ بات ملحوظِ خاطر رہے کہ اگر ماں باپ دونوں نماز کے پابند ہوں تو بچے خود ہی ان کو دیکھ کر نماز پڑھنے لگیں گے اور مار پیٹ کی نوبت نہیں آئے گی۔ اس کے برعکس اگر خود ماں باپ نماز کی اہمیت سے غافل ہوں تو وہ اولاد کو نماز کی ترغیب کیسے دیں گے!

اور بالفرض ایسے والدین اولاد کو نماز کی تاکید کریں تو اس کا اثر اولاد پر کیسے ہو سکتا ہے! اس لیے یہ ضروری ہے کہ والدین اچھی باتوں میں خود اپنا عملی نمونہ پیش کریں۔

والدین کے فرائض میں ایک اہم فرض یہ بھی ہے کہ وہ بیٹوں اور بیٹیوں کے ساتھ مساوی سلوک کریں۔ بیٹے کے ساتھ برتری کا سلوک اور بیٹی کو گھٹیا سمجھنا مناسب نہیں۔ برصغیر پاک و ہند کے مسلمانوں میں لڑکی کی پیدائش پر غمی اور افسردگی کا اظہار کیا جاتا ہے اور لڑکے کی پیدائش پر خوشیاں منائی جاتی ہیں۔ اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ یہاں غیر اسلامی اور غلط رسومات کے طومار کی وجہ سے لڑکی کی شادی کرنا بہت ہی مشکل بنا دیا گیا ہے۔ لمبے چوڑے جہیز کا انتظام لڑکی کے والدین کو کرنا ہوتا ہے' جبکہ لڑکے والوں کی طرف سے آنے والی بارات کے افراد کی خاطر تواضع بھی انہی کی ذمہ داری ہوتی ہے۔ لہٰذا جو شخص یہ اخراجات برداشت نہیں کر سکتا اسے بیٹی کی پیدائش پر یہ فکر دامن گیر ہو جاتی ہے کہ اس کی رخصتی کیسے ممکن ہو سکے گی۔ مگر یہ طوق و اغلال خود ساختہ بوجھ ہیں جو ہم لوگوں نے ہندو معاشرے سے اخذ کر رکھے ہیں۔ اگر آج ہم نکاح کا اسلامی طریق کار اپنالیں' یعنی جہیز اور بارات کو ختم کر دیں تو بیٹی کی پیدائش پر رنجیدہ ہونے کا کوئی سوال ہی نہ ہو۔ ہمیں یہ بات سمجھنی چاہیے کہ بیٹی کی پیدائش پر غم اور ناراضی کا اظہار تو کفار کا طریقہ ہے' جو بعض اوقات تو بیٹی کو پیدا ہوتے ہی زندہ دفن کر دیتے تھے۔ بالفاظِ قرآنی:

﴿وَاِذَا بُشِّرَ اَحَدُهُمْ بِالْاُنْثٰی ظَلَّ وَجْهُهٗ مُسْوَدًّا وَّهُوَ كَظِيْمٌ ﴿٥٨﴾ يَتَوَارٰی مِنَ الْقَوْمِ مِنْ سُوْٓءِ مَا بُشِّرَ بِهٖ ؕ اَيُمْسِكُهٗ عَلٰی هُوْنٍ اَمْ يَدُسُّهٗ فِی التُّرَابِ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَحْكُمُوْنَ ﴿٥٩﴾﴾

''اور جب ان میں سے کسی کو لڑکی کے پیدا ہونے کی خبر سنائی جاتی ہے تو وہ سیاہ رو ہو جاتا ہے اور جی میں گھٹتا رہتا ہے' لوگوں سے چھپتا پھرتا ہے اس بری خبر کی وجہ سے جو اسے ملی۔ سوچتا ہے کیا اس نومولود بچی کو ذلت کے ساتھ باقی رکھے یا اس کو کہیں لے جا کر مٹی میں دبا دے۔ سن رکھو! بہت برا ہے یہ فیصلہ جو یہ کرتے ہیں۔''

کفارِ مکہ کے اس ظالمانہ انداز کے برعکس اسلام میں بیٹی کی پیدائش کو مبارک سمجھا

جاتا ہے اور بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک اور اُن کے حقوق کی ادائیگی پر جنت کی خوشخبری دی گئی ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنِ ابْتُلِيَ مِنَ الْبَنَاتِ بِشَيْءٍ فَاَحْسَنَ اِلَيْهِنَّ كُنَّ لَهُ سِتْرًا مِنَ النَّارِ))

(رواه البخاری و مسلم)

''جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیٹیوں کی ذمہ داری ڈالی گئی اور اُس نے اُن کے ساتھ اچھا سلوک کیا تو یہ بیٹیاں اس کے لیے دوزخ سے بچاؤ کا سامان بن جائیں گی۔''

اسی طرح مسلم شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ عَالَ جَارِيَتَيْنِ حَتّٰى تَبْلُغَا جَاءَ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اَنَا وَهُوَ)) وَضَمَّ أَصَابِعَهٗ))

''جو شخص دولڑکیوں کی پرورش کرے یہاں تک کہ وہ بالغ ہو جائیں تو وہ شخص اور میں قیامت کے دن اس طرح ہوں گے۔ (یہ کہتے ہوئے) آپ ؐ نے ہاتھ کی انگلیوں کو ملا کر دکھایا''۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ان فرمودات سے معلوم ہوا کہ بیٹیوں کے ساتھ حسن سلوک اور ان کی پرورش اور پھر نکاح والدین کی بخشش کا باعث بن جائیں گے۔ اس طرح بیٹی قابلِ نفرت اور حقیر نہیں بلکہ باعث برکت و رحمت اور اللہ کی نعمت ہے۔ اسلامی معاشرے میں تو اس عورت کو مبارک سمجھا جاتا ہے جس کے ہاں پہلی پیدائش بیٹی کی ہو۔

موجودہ دور میں ایک برائی یہ پیدا ہوگئی ہے کہ والدین زیادہ اولاد سے گھبراتے ہیں۔ اگر اس گھبراہٹ کا سبب یہ ہے کہ اولاد کا معاشی بوجھ کیسے برداشت ہوگا' تو یہ ذہنیت سراسر اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے' کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں:

﴿وَلَا تَقْتُلُوْٓا اَوْلَادَكُمْ خَشْيَةَ اِمْلَاقٍ ۭ نَحْنُ نَرْزُقُهُمْ وَاِيَّاكُمْ ۭ اِنَّ قَتْلَهُمْ كَانَ خِطْاً كَبِيْرًا ۝۳۱﴾ (بنی اسراءیل)

''اور اپنی اولاد کو مفلسی کے ڈر سے قتل نہ کرو۔ ہم اُن کو رزق دیں گے اور تم کو بھی دے رہے ہیں۔ بے شک ان کا قتل بہت بڑا گناہ ہے۔''

پس افلاس و ناداری کے باعث کثرتِ اولاد سے نفرت تو کسی صورت جائز نہیں' کیونکہ یہ

تو اللہ تعالیٰ کی رزاقیت پر عدم اعتماد ہے' البتہ کوئی اور وجہ مثلاً عورت کی کمزور صحت یا موت کا خطرہ ہو تو اور بات ہے۔

والدین پر ایک ذمہ داری یہ بھی عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی اولاد کے ساتھ برابری کا سلوک کریں۔ نہ بیٹے کو بیٹی پر ترجیح دیں اور نہ ہی کسی ایک بیٹے کو یا بیٹی کو دوسری اولاد سے برتر جانیں۔ اسی طرح داد و دہش میں بھی سب کے ساتھ ایک جیسا سلوک کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں جب کوئی ایسا واقعہ پیش آیا کہ کسی ماں نے یا باپ نے اپنی اولاد میں سے کسی ایک کو کچھ ہبہ کرنا چاہا تو آپؐ نے اس کی اجازت نہیں دی اور فرمایا:

((اِعْدِلُوْا بَيْنَ اَوْلَادِكُمْ)) (رواہ البخاری)

''اپنی اولاد کے مابین مساوات اور برابری کو ملحوظ رکھو''۔

اس طرح کا سلوک ظلم و جور سمجھا گیا ہے۔ البتہ اولاد میں سے اگر کوئی بیٹا یا بیٹی کسی واقعی عذر کی بنا پر ترجیحی سلوک کے مستحق ہوں تو اُن کے ساتھ خصوصی معاملہ فقہائے کرام کے نزدیک جائز ہے۔ مثلاً ایک بیٹا جسمانی معذوری یا کسی اور وجہ سے روزی کے معاملے میں خود کفیل نہیں ہے تو اگر والدین اُس کی مالی امداد کرتے ہیں تو نہ یہ عدل و انصاف کے خلاف ہے نہ ہی ناجائز و مکروہ ہے' بلکہ یہ تو حسن سلوک کے درجہ میں اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔ اسی طرح اگر کسی خاص وجہ کی بنیاد پر دوسرے بھائی بہن کسی ایک بہن یا بھائی کے ساتھ خصوصی سلوک پر رضامند ہوں تو بھی والدین کے لیے یہ جائز ہے اور گناہ کی بات نہیں۔

والدین کی ایک یہ ذمہ داری بھی ہے کہ وہ اولاد میں سے کسی کو جائیداد سے محروم نہ کریں۔ یہ فطری بات ہے کہ ساری اولاد ایک جیسی نہیں ہوتی۔ کچھ کے معاملہ میں اُن کی فرمانبرداری' خدمت اور خوش اطواری کے سبب والدین کا جھکاؤ زیادہ ہوتا ہے' جبکہ کچھ ایسے بھی ہو سکتے ہیں جو ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی میں غفلت برتتے ہوں' بلکہ اس سے آگے بڑھ کر بداطوار اور بدعمل بھی ہوں۔ ظاہر ہے ایسی اولاد سے والدین ناخوش ہوں گے اور اس ناراضی کے سبب اُن کا دل چاہے گا کہ انہیں کسی طرح کا فائدہ نہ پہنچایا

جائے۔ مگر اسلامی تعلیمات کی رو سے کوئی باپ یا ماں اپنے بیٹے یا بیٹی کو بداطواری اور بدکرداری کی بنا پر جائیداد سے محروم نہیں کر سکتے۔ آئے دن اخبارات میں مسلمان ماں باپ کی طرف سے اپنی مسلمان اولاد کو وراثت سے محرومی کے اعلان یعنی عاق نامے شائع ہوتے رہتے ہیں جن کی کوئی شرعی حیثیت نہیں' بلکہ اولاد میں سے اچھے برے سب ہی افراد اپنے ماں باپ کی وراثت سے حصہ پائیں گے۔ کسی ماں یا باپ کو اپنی اولاد کو وراثت سے محروم کرنے کا حق نہیں۔ البتہ اگر کوئی نانہجار بیٹا یا بیٹی اپنے ماں یا باپ کو قتل کر دے تو وہ خود بخود اُن کی وراثت سے محروم ہو جائے گا۔

والدین کا فرض ہے کہ جب بیٹا یا بیٹی شادی کی عمر کو پہنچ جائیں تو اُن کے نکاح کا انتظام کریں۔ کیونکہ یہ انسان کی فطری ضرورت ہے اور فطری ضروریات کو پورا کرنے سے نہ اسلام روکتا ہے اور نہ بے جا پابندی لگاتا ہے۔ لہٰذا پسندیدہ یہ ہے کہ بالغ ہونے کے فوراً بعد شادی کر دی جائے۔ اس سلسلہ میں اگر والدین کی غفلت کے سبب اولاد غلط راستے پر چل نکلے تو ذمہ داری والدین پر عائد ہو گی اور وہ مجرم ٹھہریں گے۔ شعب الایمان میں حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ وُلِدَ لَهُ وَلَدٌ فَلْيُحْسِنِ اسْمَهُ وَاَدَّبَهُ فَاِذَا بَلَغَ فَلْيُزَوِّجْهُ فَاِنْ بَلَغَ وَلَمْ يُزَوِّجْهُ فَاَصَابَ اِثْمًا فَاِنَّمَا اِثْمُهُ عَلٰى اَبِيْهِ))

''جس کے ہاں اولاد ہو تو اسے چاہیے کہ اس کا اچھا نام رکھے' اور اُسے اچھی تربیت دے۔ پس جب وہ بالغ ہو جائے تو اُس کی شادی کرے' اگر شادی کی عمر کے پہنچ جانے کے باوجود اس کی شادی نہ کی گئی اور وہ گناہ میں مبتلا ہو گیا تو اُس کے گناہ کی ذمہ داری اس کے باپ پر ہو گی''۔

موجودہ دور میں دیر سے شادی کرنے کا رواج ہو گیا ہے اور یہ اس قدر معروف ہو گیا ہے کہ اگر کوئی باپ اپنے بیٹے یا بیٹی کا نکاح سولہ سترہ سال کی عمر میں کر دے تو اُس پر سخت نکتہ چینی کی جاتی ہے اور تعجب کا اظہار کیا جاتا ہے۔ یہ بات ہماری اسلامی اقدار سے عدم واقفیت اور لاعلمی کو ظاہر کرتی ہے۔ یا یہ کہ ہم خود اپنی اقدار کی بجائے دوسری اقوام کی

اُن روایات کے شیدائی ہوتے جارہے ہیں جوگھناؤنے جرائم کا باعث بن کر گندگی پھیلا رہی ہیں۔ابن ماجہ میں حضرت انسؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَکْرِمُوْا اَوْلَادَکُمْ وَاَحْسِنُوْا اَدَابَھُمْ))

''اپنی اولاد کا اکرام کرواوران کوحسن آداب سے آراستہ کرو''۔

یعنی اولاد کو عطیہ خداوندی اور انمول نعمت جان کر ان کی قدر کرنی چاہیے۔ اولاد کی تربیت کواہم ذمہ داری سمجھ کراس کی طرف بھرپورتوجہ دینی چاہیے۔دنیاوی مصروفیتوں' فضول مشغلوں اور معاشی دوڑ دھوپ میں گم ہوکرتربیت اولاد کے سلسلہ میں غفلت انتہائی غیرذمہ داری ہے۔اس حدیث میں اسی بات کومثبت انداز میں بیان فرماکراس کی اہمیت کواجاگرکیاگیا ہے۔

پس اگر والدین اپنے فرائض کی ادائیگی بطریق احسن کریں تو بڑی حدتک توقع کی جاسکتی ہے کہ اُن کی اولاد بھی ان کے حقوق پورے کرے گی اور خاندانی نظام میں بہتری پیدا ہوگی جس کے نتیجہ میں صحت مند مسلم معاشرہ قائم ہوکر خیر و برکت کا باعث ہوگا۔ اوراگر والدین اولاد کے حقوق پورے نہیں کرتے تو وہ کس طرح توقع کر سکتے ہیں کہ ان کی اولاد جوان ہوکران کی خدمت کرےاورحقوق ادا کرے۔

۞۞۞

نئ نسل کی بے راہ روی کا ذمہ دار کون؟

قائداعظم محمد علی جناح نے بجا طور پر نئ نسل کو معاشرے کے اہم ترین افراد گردانا ہے۔ نئ نسل ہی قومی اور ملی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے والی ہے۔ اگر نوجوانوں کی تربیت صحیح نہج پر ہو تو قوم کے روشن مستقبل کی پیشین گوئی کی جا سکتی ہے۔ لیکن اگر نوجوانوں کی اکثریت لہو ولعب میں محو اور لوٹ کھسوٹ میں مشغول ہو تو ظاہر ہے کہ قوم کی کشتی بس ڈوبنے ہی والی ہے۔ قوم کے باشعور اور ذمہ دار لوگوں پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ نوجوانوں کی تربیت پر نظرِ عقاب رکھیں اور انہیں صحیح اقدار اور اچھے اخلاق کی تعلیم سے آراستہ کریں۔ اس ذمہ داری کو وہ یہاں تک محسوس کریں کہ اپنے تجربات کی روشنی میں ان کوتاہیوں کی بھی پیش بندی کریں جنہیں وہ نوجوانی میں اختیار کر کے ان کے نتائج بد سے نہیں بچ سکے۔

آج جب ہم اپنے معاشرے کی نئ نسل کی طرف نگاہ کرتے ہیں تو ہم اسے تباہی کی طرف رواں دواں دیکھتے ہیں۔ ان حالات میں معاشرے کا ہر باشعور فرد یہ سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے کہ آخر نئ نسل کی بربادی کا ذمہ دار کون ہے؟ جب ہم اس مسئلے پر سنجیدگی سے غور کرتے ہیں تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ معاشرے کا کوئی ایک طبقہ یا گروہ ہی خاص طور سے نئ نسل کی تباہی کا ذمہ دار نہیں ہے' بلکہ بہت سے عوامل ہیں جو انحطاط کے اس عمل میں کل پرزوں کے طور پر کام کر رہے ہیں۔ بعض افراد تو شعوری طور پر اس عمل میں حصہ لے رہے ہیں جبکہ کچھ بے شعوری اور لاشعوری طور پر مصروفِ عمل ہیں۔ اس کی مثال یوں سمجھئے کہ بلاشبہ والدین سے بڑھ کر اپنی اولاد کا کوئی خیر خواہ نہیں ہوتا' والدین اپنی اولاد پر جان چھڑکتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اُن کے فرزند ارجمند معزز اور معاشرے کے ذی وقار افراد ہوں' لیکن مشاہدہ یہ بتاتا ہے کہ والدین اپنی عدم توجہی' معاشی مصروفیت یا

غفلت کی وجہ سے اپنی اولاد کی تربیت خود اپنی خواہش کے مطابق نہیں کر پاتے۔ چونکہ والدین اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کے اوّلین ذمہ دار ہوتے ہیں اس لیے نئی نسل کی بربادی کے ذمہ داروں میں سب سے پہلے والدین کا ذکر ہی مناسب ہے' اگرچہ بعد کے دلائل اس بات کی وضاحت کر دیں گے کہ والدین نئی نسل کی بربادی کے صرف جزوی ذمہ دار ہیں اور اس ضمن میں مؤثر ترین کردار چند دوسرے عوامل کا ہے۔

والدین پر اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کی ذمہ داری کا بوجھ قدرتی طور پر ڈالا گیا ہے۔ والدین کو اس ذمہ داری کا احساس بھی ہے' لیکن اکثر والدین معاشرے میں اپنی قابلِ ذکر حیثیت کو برقرار رکھنے کے لیے روزی کی تلاش میں سرگرداں ہیں اور اولاد کی تربیت کی طرف سے غفلت برتتے ہیں۔ وہ اولاد کی تربیت اور تعلیم کی ذمہ داری سکول کے اساتذہ پر ڈال دینا چاہتے ہیں اور ان حالات میں وہ اپنے طور پر مطمئن بھی ہو جاتے ہیں کہ ہم اپنی اولاد کی تربیت پر پیسے خرچ کر رہے ہیں۔ اگر انہیں کوئی اچھا استاد بطور ٹیوٹر مل جائے تو وہ اپنی ذمہ داری اُس پر ڈال کر خود کو بالکل فارغ البال محسوس کرتے ہیں' حالانکہ اپنی ذمہ داری کا بوجھ کسی غیر ذمہ دار کے کندھوں پر ڈالنا بالعموم اچھی اور نتیجہ خیز بات نہیں ہوتی۔ والدین کی یہ غفلت اُس وقت سب سے زیادہ شدید اور غالباً ناقابل تلافی ہو جاتی ہے جب والد کے ساتھ بچوں کی والدہ بھی معاشی حالت کی بہتری کے لیے کہیں ملازمت کر رہی ہو۔ اس طرح اگرچہ گھر کی معاشی حالت تو ضرور بہتر ہو جاتی ہے لیکن بچوں کی تربیت اکثر عجیب رنگ لاتی ہے۔ والدہ اور والد جب صبح سویرے اپنے اپنے کام پر نکل جاتے ہیں تو گھر میں نوکرانی بچوں کی نگرانی پر مامور ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ نوکرانی بچوں کی نگران تو ضرور ہوگی لیکن وہ فطری طور پر والدہ کی طرح شفیق اور مشفق ثابت نہیں ہوسکتی۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بچے اس ماحول میں پرورش پاتے ہیں جو سراسر شفقت سے محرومی کا مظہر ہوتا ہے۔ جس بچے نے شفقت سے محرومی میں پرورش پائی ہو وہ بڑا ہو کر شفیق اور رحم دل کیونکر ہوسکتا ہے! ایسے نوجوان لاشعوری طور پر معاشرے سے انتقام لینے کے لیے چل پڑتے ہیں۔ موجودہ دَور میں کھاتے پیتے خوشحال خاندانوں کے

نوجوانوں کا ڈاکہ زنی اختیار کرنا اسی قسم کی تربیت کا نتیجہ ہے‘ اگرچہ دوسرے عوامل نے بھی انہیں متاثر کیا ہے۔

انگریز نے سینکڑوں سال برعظیم پاک و ہند پر حکمرانی کی اور یہاں کے باشندوں کے قلوب و اذہان کو متاثر کیا۔ ہم انگریز کی جسمانی غلامی سے تو آزاد ہو گئے لیکن ذہنی غلامی کا اثر ہنوز تر و تازہ ہے۔ یہاں انگریز کی برتری کے احساس کا یہ حال ہے کہ جو لوگ شلوار قمیص پہننے کے عادی ہیں انہیں جب بھی دانشوروں کے کسی اجلاس میں جانا ہوتا ہے تو وہ کوٹ پتلون زیبِ تن کرتے ہیں اور اس مقصد کے لیے انہوں نے انگریزی لباس تیار رکھا ہوتا ہے۔ آپ نے کسی انگریز کو بمشکل ہی غیر انگریزی لباس میں دیکھا ہو گا۔ شلوار قمیص میں کیا قباحت ہے؟ انسان اس میں اپنے آپ کو ہلکا پھلکا محسوس کرتا ہے اور بدن بھی غیر ضروری طور پر کسا ہوا نہیں ہوتا۔ پھر ہمارا دین ڈھیلے ڈھالے کپڑے پہننے کی ترغیب دیتا ہے۔ اگرچہ ہمارے نوجوانوں نے انگریزی دَور کے ماہ و سال نہیں دیکھے لیکن جب وہ معاشرے میں ان دونوں لباسوں کو زیرِ استعمال دیکھتے ہیں تو اپنے طور پر انگریزی لباس کو بہتر سمجھ لیتے ہیں۔ نوجوانوں کے اس فیصلے کو ہم کسی حد تک حق بجانب کہہ سکتے ہیں‘ کیونکہ انگریزوں کے چلے جانے کے ۶۰ سال بعد بھی ہماری عدالتوں میں انگریزی قانون چل رہا ہے‘ انگریزی زبان کا تسلط ہے اور انگریزی سکولوں کی بالادستی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ معاشرے کے ذمہ دار افراد اپنی نوجوان نسل کو عملاً انگریزوں کی برتری کا سبق دے رہے ہیں۔ افسوس کہ اسلامی ملک میں جہاں مسلمان مدعی‘ مسلمان مدعیٰ علیہ اور مسلمان ہی جج ہیں‘ فیصلہ انگریز کے قانون کے تحت ہوتا ہے۔ کیا مسلمانوں کا اپنا کوئی قانون نہیں؟ کیا نئی نسل کو تباہی کے راستے پر ڈالنے والوں میں ہم قیامِ پاکستان سے لے کر اب تک کے تمام برسرِ اقتدار لوگوں کے نام نہیں لے سکتے؟ یہ ذمہ داری قوم کے بڑوں پر ہے کہ وہ اپنے تہذیبی ورثے کی قدر کریں اور نوجوان ان سے سیکھ کر اپنی روایات کو قابلِ افتخار سمجھیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ نئی نسل کو گمراہ رکھنے میں اُن تمام افراد کا حصہ ہے جو فکراً یا عملاً ابھی تک انگریز کی غلامی میں جکڑے ہوئے ہیں۔ اگر ہمیں شلوار

قمیص کوترک ہی کرنا ہےتو عربی لباس ہمارے لیے پسندیدہ ہونا چاہیے' کیونکہ یہ ہمارے اسلاف کا لباس رہا ہےاور موجود ہے۔

نئی نسل کی تباہی میں ہماری اخباری صحافت نے بھی نمایاں کردارادا کیا ہے۔گندی' مضراور مخربِ اخلاق چیزوں کی تشہیر پر کالم کے کالم لکھے جاتے ہیں لیکن اسلامی تعلیمات کا ذکر محض تبرک کے لیے کیا جاتا ہے۔ جرائم کی خبریں جلی سرخیوں میں شائع کی جاتی ہیں جنہیں چھوٹے بڑے سب لوگ پڑھتے ہیں۔چونکہ ملکی قوانین اورانتظامیہ کا طریق کار کچھ اس قسم کا ہے کہ بینک لوٹنے والوں' ڈاکہ ڈالنے والوں' قاتلوں اور بدمعاشوں کو شاذ ہی سزا ملتی ہے اس لیے نوجوان ذہن جس میں ذرا سی جرأت ہو' وہ ان برے طریقوں کواپنانے میں ایک قسم کی ترغیب پاتا ہےاوراسے اظہارِ جرأت' مہم جوئی اور بہادری کا کارنامہ سمجھ کر کرنے کاارادہ کر لیتا ہےاوراس طرح دولت مند بننے کا خواب بھی شرمندۂ تعبیر ہوتا دیکھتا ہے۔اگر ملکی قوانین اسلامی ہوں اوراسلامی ضابطۂ اخلاق کے ماتحت فساد مچانے والوں کو سرعام پھانسی' کوڑوں اور قید کی عبرت ناک سزائیں ملیں تو آئندہ کسی نوجوان کو جرائم پر دلیری کرنے کا حوصلہ نہ رہے۔اخبارات میں اخلاقی جرائم کی خبریں نمایاں کر کے شائع کی جاتی ہیں جو اخلاقی اقدار کی پامالی کی حوصلہ افزائی کا اشتہار ہوتی ہیں۔بعض رسالے ایسے شائع ہوتے ہیں جو محض بداخلاقی' گناہ کی زندگی اور جرائم کی ترغیب کی تشہیر کرتے ہیں۔ان میں قزاقوں' ڈاکوؤں اور دہشت گردوں کی حقیقی اور فرضی کہانیاں نہایت دلکش پیرائے اور مؤثر انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔گویا قومی تعمیر میں ان کا منفی کردار روزِ روشن کی طرح عیاں ہے' لیکن اس کے باوجوداُن کی اشاعت پر کوئی پابندی نہیں ہے۔

ابلاغِ عامہ کے دواداراے ریڈیواور ٹیلیویژن بھی منفی کردارادا کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھارہے ہیں۔محتاط اندازے کے مطابق ریڈیو کے پچاس فیصد پروگرام اور ٹیلی ویژن کا نوے فیصد وقت اس نسل کوتباہی کی راہ پر ڈالنے کے لیے بڑی کامیابی کے ساتھ صرف ہورہا ہے۔انگریزی اورانڈین فلمیں' کارٹون اور بےہودہ ڈرامے وغیرہ مغرب

اورعشاء کے درمیان دکھائے جاتے ہیں، مگر اسلامی تعلیمات کے چند پروگرام جومحض تبرکاً پیش کیے جاتے ہیں، اُن کا وقت رات ساڑھے دس یا اُس کے بعد شروع ہوتا ہے۔ امسال حج کا براہِ راست منظر تو دن کو دوپہر کے وقت دکھایا گیا لیکن رات کو اُس پروگرام کا وقت گیارہ بجے تھا۔ رمضان شریف میں ٹی وی پر ہر روز ایک پارے میں بیان شدہ تعلیمات کا خلاصہ پیش کرنے کا اہتمام کیا گیا لیکن مقرر کو اس کے لیے صرف پندرہ منٹ دیے جاتے۔ مقرر کی انتہائی کوشش کے باوجود پورے پارے کا خلاصہ ہمیشہ تشنہ رہتا۔

ٹیلی ویژن پر چونکہ متحرک تصاویر نظر آتی ہیں اس لیے نوجوان نسل کے لیے اُن کے اندر ایک کشش پائی جاتی ہے۔ اگر ٹیلیویژن پروگرام اسلامی تعلیمات اور اخلاقی اقدار کی اشاعت پر مشتمل ہوں تو اس پُرکشش ذریعے سے نئی نسل ضرور متاثر ہو اور اُن کے قلوب اور اذہان اسلامی رنگ میں رنگے جائیں۔ مگر صورتِ حال نہ صرف افسوس ناک بلکہ خطرناک حد تک بگڑی ہوئی ہے۔ جو ڈرامے دکھائے جاتے ہیں اُن میں بیشتر ایسے ہوتے ہیں جن میں نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کو چوری چھپے ملاقاتیں کرتے اور پیار ومحبت کے نغمے الاپتے ہوئے دکھایا جاتا ہے۔ کیا مسلمانوں کے ضابطۂ اخلاق میں اس چیز کی اجازت ہے؟ قرآن وسنت کی تعلیمات کی رو سے بالغ عورتوں کے لیے پردہ کرنا فرض ہے۔ حیا عورت اور مرد کی زینت ہے۔ مرد اور عورت کا اختلاط فساد کا موجب ہے۔ جس نبیٔ محترم ﷺ نے اُمہات المؤمنین کو نابینا سے بھی پردہ کرنے کا حکم دیا اُس کا کلمہ پڑھنے والے نوجوان لڑکے لڑکیاں انتہائی بے باکی سے ایک دوسرے سے ملتے ہیں اور اُن کی اس طرح کی عشقیہ ملاقاتیں ٹیلیویژن کے ذریعے ملک کے دُور دراز گوشوں میں بیٹھے ہوئے معصوم بچوں تک بھی پہنچائی جاتی ہیں۔ مختلف کاروباری اشتہار ٹیلیویژن پر دکھائے جاتے ہیں جہاں عورت کے حسن وجمال کی نمائش ہی اشتہار کی روحِ رواں ہوتی ہے۔ عورتیں ہی اناؤنسر ہیں اور عورتیں ہی خبریں سناتی ہیں۔ یوں معاشرے میں معصیت کی نشرواشاعت کے اس ادارے کی موجودگی میں

نوجوان نسل سے شرم وحیا اور اسلامی اقدار سے محبت کی توقع محض ایک دھوکا اور فریب ہے۔ بقول شاعر:

درمیانِ قعر دریا تختہ بندم کردۂ
باز می گوئی کہ دامن تر مکن ہشیار باش!

پاکستان ٹیلیویژن کے ارباب بست وکشاد نئی نسل کو تباہی کے راستے پر گامزن کرنے کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں' ابلاغ عامہ کے اس ذریعے سے نئی نسل کے اندر اخلاق کی عظمت' دین کی محبت اور بزرگانِ دین کے عظیم کارناموں کی اشاعت کی جاسکتی ہے' مگر اس کے منفی استعمال سے یہ تفریح جرائم کی ترغیب اور گناہ کا محرک بن کر رہ گئی ہے۔

سینما ایک مقبولِ عام تفریح ہے۔ کہنے کو تو یہ تفریح ہے لیکن اسے مخرب اخلاق ادارہ کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ فلمیں اس قدر گھٹیا معیار کی دکھائی جاتی ہیں جن میں نصیحت کا پہلو تو برائے نام ہوتا ہے لیکن عشق کی داستان اور شہوانی جذبات کا اظہار نمایاں ہوتا ہے۔ جب نوجوان ایسی فلمیں دیکھتے ہیں تو سکولوں اور کالجوں کی خشک اور پیشہ ورانہ تعلیم میں انہیں کوئی لذت محسوس نہیں ہوتی' بلکہ اُن کی دل پسند شخصیتیں فلمی اداکار اور اداکارائیں بن جاتے ہیں اور وہ سڑکوں پر گھومتے پھرتے مختلف موسیقاروں کے گانے گنگناتے نظر آتے ہیں۔ بزرگوں کا مقولہ ہے کہ بچے کی مثال گیلی مٹی کے برتن کی ہے کہ اُسے آپ خواہش کے مطابق شکل دے سکتے ہیں' لیکن جب اُس کچے برتن کو آگ میں پختہ کرلیا جائے تو اُس کی کجی دور کرنا ممکن نہیں رہتا۔ جب ہمارے بچے چڑھتی جوانی میں عشق کے رسیا ہو گئے اور اپنے جنسی جذبات پر قابو نہ رکھ سکے تو نتیجہ بے راہ روی کے سوا اور کیا ہوگا؟ آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں کہ ہمارے ہاں اغوا اور زنا کے واقعات کی کس قدر کثرت ہے۔ آئے دن گھر سے بھاگے ہوئے بچے جب پکڑے جاتے ہیں تو تفتیش کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے فلمی اداکار بننے کے شوق میں گھر کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ کیا یہ ہماری فلموں کا اثر نہیں ہے؟

سینما نوجوانوں کی کردار سازی میں قابل ذکر کردار ادا کرسکتا ہے۔ بزرگوں کے کارنامے اور بہادری کے واقعات پر مشتمل فلمیں بنائی جائیں تو یہ نوجوانوں کی صحیح سمت کی طرف راہ نمائی کرسکتی ہیں۔ لیکن صورت حال بالکل برعکس ہے۔ ہماری کون سی فلم ایسی ہے کہ جس میں گناہ کی دعوت دینے والا نسوانی کردار نہ ہو! اسی پر بس نہیں بلکہ یہاں تو فحاشی اور عریانی کے مناظر کی کثرت ہی کسی فلم کے معیاری ہونے کی علامت سمجھی جاتی ہے۔

علم روشنی ہے اور جہالت تاریکی۔ علم انبیاء کی وراثت ہے۔ علم کے بغیر انسان خدا کو بھی نہیں پہچان سکتا۔ اہل علم معاشرے کے روحِ رواں ہوتے ہیں۔ صاحب علم لوگ باشعور اور باخبر ہوتے ہیں۔ مگر آج کے ماحول میں علم کی کوئی قدر نہیں رہی۔ تعلیم محض ملازمت حاصل کرنے اور معاشی مسائل کے حل کے لیے حاصل کی جاتی ہے۔ اس لیے جب نوجوان نسل دیکھتی ہے کہ گریجوایٹ اور پوسٹ گریجوایٹ حضرات معمولی تنخواہ کی نوکریاں کر رہے ہیں' مگر اَن پڑھ لوگ جنہوں نے ناجائز ذرائع سے دولت اکٹھی کرنے کا مشغلہ اختیار کر رکھا ہے' دنیا کی نظروں میں معزز ہیں تو اُن کے لیے تعلیم حاصل کرنے میں کوئی کشش باقی نہیں رہتی۔ وہ بچے جو ذوق وشوق سے تعلیم حاصل کرتے ہیں' جب اُن کے انٹرویوز اخبارات میں چھپتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ڈاکٹر' انجینئر بن کر قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ اُن کا مدعا بھی بظاہر تو قوم کی خدمت ہوتا ہے لیکن اصل میں وہ دولت پیدا کرنے کے منصوبے پر عمل پیرا ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب کوئی واقعی ڈاکٹر بن جاتا ہے تو وہ ہر شخص سے' بلا امتیاز مفلس وتونگر' اپنی بھاری معائنہ فیس وصول کرتا ہے۔ جو شخص ڈاکٹر بن کر ہزاروں روپے یومیہ کماتا ہے اگر وہ بزعم خود قوم کی خدمت کا جذبہ ظاہر کرے تو کون اس کو باور کرے گا!

دولت دنیا میں عزت وسرفرازی کا باعث ہے۔ دولت کے ساتھ عیش وعشرت کی زندگی گزاری جاتی ہے۔ دولت سے ناجائز کام کروائے جاسکتے ہیں' اس لیے کہ ہمارا

معاشرہ اس کا رسیا ہو چکا ہے۔ آج یہ الفاظ ہر شخص کی زبان پر ہیں کہ پیسہ ہو تو کون سا کام نہیں ہو سکتا؟ ہماری نوجوان نسل یہ مشاہدہ کرتی ہے کہ تعلیم یافتہ شریف آدمی کی معاشرے میں کوئی قدر نہیں ہے' وہ کسی مقامی مسئلے میں بطور مشیر نہیں بلایا جاتا' مگر علاقے کے دولت مند اور با اثر لوگ ہر جگہ عزت کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔ مقامی مسائل کے حل کے وقت وہ مشیر خاص ہوتے ہیں۔ چونکہ وہ پولیس کی خاطر تواضع کر سکتے ہیں لہٰذا تھانے میں بھی اُنہیں کرسی پیش کی جاتی ہے۔ پولیس کسی کو ملزم کی حیثیت سے پکڑ لے تو یہ دولت مند افراد اسے تھانے سے چھڑا کر لے آتے ہیں۔ معاشرے کے کمزور' غریب اور شریف لوگ ناخواندہ اور جاہل مگر دولت مند لوگوں سے خائف رہتے ہیں۔ یہ منظر ہماری نوجوان نسل کو متاثر کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تعلیم حاصل کر کے پروفیسر یا ٹیچر یا خطیب بن گئے تو معاشرہ اُن کی کیا قدر کرے گا؟ لیکن اگر انہوں نے بے علم رہ کر ناجائز دولت کمانے کا دھندا اختیار کر لیا تو انہیں معاشرے میں برتری حاصل ہو گی' لہٰذا وہ برتری کے حصول کا یہی راستہ اختیار کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ ملازمین میں بھی دو طبقے ہو جاتے ہیں۔ جو جائز ذرائع سے کماتے ہیں وہ بمشکل گزارہ کرتے ہیں' لیکن جو ناجائز کماتے ہیں انہیں بہت ہوشیار اور زیرک سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح معاشرے میں منفی اقدار کی حوصلہ افزائی ہو رہی ہے اور شرافت اور تعلیم کو چنداں اہمیت نہیں دی جا رہی۔ ابھی کچھ عرصہ پہلے ملک میں انتخابات ہوئے۔ سرکاری ملازمین یعنی تعلیم یافتہ افراد کی اکثریت کو مختلف پولنگ اسٹیشنوں پر متعین کر دیا گیا۔ گھروں سے باہر ہونے کی وجہ سے یہ لوگ خود ووٹ نہ ڈال سکے۔ اس طرح ہزار ہا تعلیم یافتہ افراد کو حق رائے دہی سے محروم کر دیا گیا' جبکہ عوامی نمائندے چننے میں اکثریت غیر تعلیم یافتہ لوگوں ہی کی تھی۔ معلوم ہوا کہ پوری قومی مشینری میں تعلیم کی اہمیت کو سراسر ختم کیا جا رہا ہے۔ جب تعلیم اور تعلیم یافتہ افراد معاشرے میں اس درجے بے وقار ہیں تو نئی نسل تعلیم کے حصول میں اپنی توانائیاں کیوں ضائع کرے گی!

ضرورت اس بات کی تھی کہ صحیح اسلامی اقدار کی تشہیر و اشاعت کی جاتی اور اس

طرح نوجوان نسل اپنے دین کی طرف سے عائد کردہ فرائض سے روشناس ہونے کے علاوہ انسانیت کے تقاضوں سے بھی آگاہ ہوتی' کیونکہ اسلام دینِ فطرت ہے' کوئی اسلامی تقاضا ایسا نہیں ہے جو قوانینِ فطرت سے ٹکراتا ہو۔ لیکن ہوا یہ کہ جدید تہذیب نے جس قدر برائیاں چمکا دمکا کر پیش کیں اخلاقی قدروں کی اشاعت اُس سے کم تر رہی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نوجوان نسل ظاہری چمک دمک میں پڑ گئی اور آخرت کو فراموش کر بیٹھی۔ اس وقت پورا معاشرہ دولت کمانے کے چکر میں پڑ گیا ہے اور ہر شخص زیادہ سے زیادہ دنیاوی راحت کا سامان اکٹھا کرنے میں لگ گیا ہے۔ شادی بیاہ اور دوسری سماجی تقریبات پر بھاری اخراجات کے ساتھ نمود و نمائش کے لیے چمک دمک کا منظر پیش کیا جانے لگا ہے۔ ایک دوسرے کی دیکھا دیکھی ہر شخص دوسرے سے سبقت لے جانے کی کوشش میں ہے۔ قرآن کا حکم تو یہ ہے: ﴿فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ﴾ ''نیکیوں میں ایک دوسرے سے آگے بڑھ جانے کی کوشش کرو'' لیکن افسوس کہ یہاں نمود و نمائش' تصنع اور فضول خرچی کے کاموں میں سبقت لے جانے کا رجحان پیدا ہو گیا ہے۔ معاشرہ جب مجموعی طور پر چمک دمک پر فدا نظر آ رہا ہے تو نوجوان نسل تو پہلے ہی ناپختہ ذہن رکھتی ہے' لہٰذا اُن کا سحر زدہ ہونا یقینی ہے۔

یہاں علماء کی ذمہ داری تھی کہ وہ صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں قناعت کا درس دیتے اور خود اپنی زندگیوں سے قناعت پسندی کا ثبوت دیتے' مگر علماء اس کام میں ناکام رہے' اِلّا ماشاءَ اللہ۔ واعظین' مبلغین اور خطباء خود آسائش پسند ہو گئے۔ زبان سے قناعت پسندی کی تعلیم دینے والے بھی قناعت سے کوسوں دور چلے گئے۔ سچ پوچھیے تو علماء کا کام تھا دعوت الی الخیر' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر' مگر خود علماء فرقہ بندی کے چکر میں پڑ گئے اور سادہ لوح عوام کو ایک دوسرے سے متنفر کرنے کا فریضہ سنبھال لیا۔ جب نئی نسل نے واعظین اور علماء کو آپس میں ایک دوسرے کو بُرا بھلا کہتے سنا تو اس کے ذہن میں تحقیق و جستجو کی بجائے خود اسلام ہی سے نفرت پیدا ہو گئی۔ حالانکہ علماءِ دین کو اسلام کی کسوٹی سمجھنا بذاتِ خود غلطی ہے۔ ہاں علماء کی وہ جماعت ہمیشہ سے قابلِ قدر رہی ہے اور

اب بھی قابل قدر ہے جو ہر قسم کے حالات میں قرآن وسنت کی تعلیمات کی اشاعت وتبلیغ کے لیے کمر بستہ رہی اور نبی اکرم ﷺ کے اُسوۂ حسنہ پرعمل پیرا رہی۔ اب اگر کہیں اسلامی اقدار کی تھوڑی بہت ترویج نظر آتی ہے تو وہ انہی کی مساعی کا نتیجہ ہے۔ بہرحال نام نہاد علماء کے ناپسندیدہ طرزِ عمل نے بھی نئی نسل کو متاثر کیا اور یوں نئی نسل راہِ راست سے منحرف ہوئی۔

اگر علماء مسلک کے اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کا احترام کرتے' جیسا کہ خود جلیل القدر ائمہ وفقہاء آپس میں ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے' تو نفرت کے پیدا ہونے کا امکان نہ ہوتا۔ اسی طرح اگر علماء دیانت داری کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو اپنے لیے اسوۂ حسنہ سمجھ کر اپناتے اور اسے دوسروں کے سامنے پیش کرتے تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔ لہٰذا نئی نسل کی تباہی کی بہت بڑی ذمہ داری اُن علمائے کرام پر بھی عائد ہوتی ہے جنہوں نے اسلام کے عالم گیر اور سادہ طرزِ زندگی کی اشاعت کو چھوڑ کر اور فقہی اختلاف کو ہوا دے کر مسلمان کو مسلمان سے نفرت دلانے بلکہ نوجوانوں کو اسلام سے متنفر کرنے کا گھناؤنا کام اختیار کر رکھا ہے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ معاشرے کے تمام افرادِ قوم وملت کی خیر خواہی کے ساتھ اپنا محاسبہ کریں' طرزِ عمل بدلیں اور وہی کام کریں جو اسلامی اور اخلاقی تقاضوں کے مطابق ہوں' نیز نوجوانوں کے لیے مثبت کردار کا نمونہ بنیں۔ OO

کیا چھوٹے گناہ معمولی ہوتے ہیں؟

بعض اوقات ایک چھوٹی سی غلطی بڑی خوفناک ثابت ہوتی ہے۔ معمولی سی بے احتیاطی کا نتیجہ بڑی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ دو آدمیوں میں تلخ کلامی ہو جاتی ہے، دیکھتے ہی دیکھتے وہ تلخ کلامی مسلح لڑائی میں تبدیل ہو کر نوبت قتل و غارت تک پہنچ جاتی ہے۔ کسی شخص نے سگریٹ کا سلگتا ہوا ٹکڑا بے احتیاطی سے پھینک دیا، قریب کا غذ یا خشک پتے تھے، آگ بھڑک اٹھی اور آناً فاناً قابو سے باہر ہو گئی اور لاکھوں کا نقصان ہو گیا۔ کئی دفعہ ایسا ہوا کہ استری گرم تھی، بجلی چلی گئی، استری کا سوئچ آف کرنا یاد نہ رہا، رات گئے بجلی آ گئی، استری تیز گرم ہوئی، پاس پڑے ہوئے کپڑوں کو آگ لگ گئی اور جب تک اہل خانہ کو خبر ہوئی مکان کا ایک حصہ جل کر راکھ ہو چکا تھا۔ کسی نے گاڑی غلط جگہ پر پارک کر دی، ٹریفک کا مسئلہ پیدا ہو گیا، کئی لوگ بروقت اپنے اپنے کام پر نہ پہنچ سکے۔ اس طرح کئی قسم کا نقصان ہو گیا۔ ٹریفک سگنل کی خلاف ورزی معمولی بات ہے، مگر بعض اوقات اس کا نتیجہ اس قدر ہولناک ہوتا ہے کہ قیمتی جانیں چلی جاتی ہیں۔ کیلا کھاتے کھاتے اُس کا چھلکا بے احتیاطی سے راستے میں پھینک دیا، ایک آدمی کا پاؤں اُس پر پڑا، وہ بیچارہ پھسلا اور زندگی بھر کے لیے معذور ہو گیا۔

آپ نے دیکھا معمولی سی غلطی انجام کے اعتبار سے کس قدر بھیانک ثابت ہوئی۔ یہی حال گناہ کا ہے۔ ایسا گناہ جو بظاہر معمولی نظر آتا ہے، اکثر اوقات ہلاکت آفریں اور بڑی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ اگر ہم دورِ جاہلیت کی تاریخ کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ کئی کئی سال جاری رہنے والی لڑائیوں کی ابتدا بالکل معمولی معمولی باتوں سے ہوئی۔ اُس دور کی مشہور لڑائی جنگ بسوس قبیلہ شیبان اور قبیلہ تغلب کے درمیان شروع ہو کر چالیس سال سے زیادہ عرصے تک جاری رہی۔ اس میں فریقین کے

سینکڑوں آدمی قتل ہو گئے۔ یہ لڑائی اس طرح شروع ہوئی کہ ایک قبیلے کی اونٹنی نے دوسرے قبیلے کے باغ میں واقع ایک پرندے کا گھونسلہ خراب کر دیا تھا اور انڈے توڑ دیے تھے۔ اس پر باغ کے مالک نے اونٹنی کو مار ڈالا تھا۔ بس اسی سے ایک دوسرے پر حملے شروع ہو گئے اور قتل و غارت کا بازار گرم ہو گیا۔ پس کسی گناہ کو چھوٹا نہیں سمجھنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو مخاطب کر کے فرمایا:

((يَا عَائِشَةُ اِيَّاكِ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ ' فَاِنَّ لَهَا مِنَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ طَالِبًا)) (مسند احمد)

''اے عائشہ! چھوٹے گناہوں سے بھی بچا کرو' کیونکہ اللہ عزوجل کی طرف سے اِن کی بھی باز پُرس ہو گی۔''

قرآن مجید میں ہے کہ جب آدمی کو نامۂ اعمال ملے گا تو وہ اسے دیکھ کر کہے گا:

﴿مَالِ هٰذَا الْكِتٰبِ لَا يُغَادِرُ صَغِيْرَةً وَّلَا كَبِيْرَةً اِلَّآ اَحْصٰهَا ۚ﴾ (الکھف: ۴۹)

''یہ کیسا نوشتہ ہے کہ کوئی چھوٹی بڑی چیز نہیں چھوڑی جو اس میں درج نہ ہو!''

گویا نامۂ اعمال میں صرف بڑے بڑے گناہ ریکارڈ نہیں ہو رہے بلکہ چھوٹے گناہ بھی درج کیے جا رہے ہیں۔ محتاط طرزِ عمل ہمیشہ اچھا رہتا ہے۔ دریا میں معمولی پانی سمجھ کر اس میں قدم رکھنا خطرے سے خالی نہیں۔ ہو سکتا ہے کہ اگلے قدم پر کوئی گہرا گڑھا ہو اور وہ غرقابی کا باعث بن جائے۔ ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

لَا تُحْقِرَنَّ صَغِيْرَةً   اِنَّ الْجِبَالَ مِنَ الْحَصٰى

''کسی چھوٹی چیز کو حقیر نہ سمجھو' کیونکہ پہاڑ چھوٹے چھوٹے کنکروں سے مل کر بنتے ہیں''۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کا یہ قول بخاری شریف میں ہے کہ آج تم کئی گناہوں کو کرتے ہوئے اُن کو بال سے بھی کم سمجھتے ہو' حالانکہ ہم نبی اکرم ﷺ کے زمانۂ مبارک میں اُن کو مہلک گناہوں میں شمار کرتے تھے۔ گناہ کو معمولی سمجھنے سے انسان اُس کے ارتکاب پر دلیر ہو جاتا ہے' حالانکہ گناہ ایسی چیز ہے کہ اس سے دُور رہنا ہی بہتر ہے' خواہ کتنا ہی چھوٹا

کیوں نہ ہو' کیونکہ برائی تو بہرحال برائی ہے۔اور پھر معمولی سی تکرار معمولی کو بھی غیر معمولی بنا دیتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ کا ارشادِ گرامی ہے:

((اِیَّاکُمْ وَمُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ کَقَوْمٍ نَزَلُوْا فِیْ بَطْنِ وَادٍ فَجَاءَ ذَا بِعُوْدٍ وَجَاءَ ذَا بِعُوْدٍ حَتّٰی اَنْضَجُوْا خُبْزَتَھُمْ وَاِنَّ مُحَقَّرَاتِ الذُّنُوْبِ مَتٰی یُؤْخَذْ بِھَا صَاحِبُھَا تُھْلِکْہُ)) (مسند احمد)

''چھوٹے گناہوں سے بھی بچو! چھوٹے گناہوں کی مثال اُس قافلے جیسی ہے جو ایک مقام پر نازل ہوا ہو' اُن میں ہر شخص ایک ایک لکڑی لا کر جمع کرتا ہے' پھر وہ لکڑیاں اتنی ہو جاتی ہیں کہ وہ ان سے اپنا کھانا پکا لیتے ہیں۔ اور (یاد رکھو) چھوٹے گناہ گرفت کے وقت انجام دینے والے کے لیے تباہ کن ثابت ہوتے ہیں''۔

ظاہر ہے جس گناہ کو معمولی سمجھا جائے گا اُس کے متعلق احتیاط نہ ہوگی اور اس کا ارتکاب ہوتا رہے گا جو اُسے سنگین بنا دے گا' مگر جس گناہ کو آدمی بڑا سمجھے وہ اس کے قریب جانے سے باز رہے گا' اور اگر کبھی بڑا گناہ کر بیٹھا تو خوفِ خدا سے کانپ جائے گا' نادم ہوگا' استغفار کرے گا تو اُس کا وہی بڑا گناہ اللہ کے ہاں چھوٹا ہو جائے گا۔

فقیہہ ابو اللیث سمرقندیؒ نے ''تنبیہہ الغافلین'' میں لکھا ہے کہ گناہ بڑا ہو یا چھوٹا دس عیوب سے خالی نہیں ہوتا۔ پہلا یہ کہ اس نے اپنے پروردگار کو ناراض کیا۔ دوسرا یہ کہ اللہ کے مغضوب ابلیس کو خوش کیا۔ تیسرا یہ کہ جنت سے دُور ہوا۔ چوتھا یہ کہ جہنم کے قریب ہو گیا۔ پانچواں یہ کہ اس نے اپنے محبوب نفس پر ظلم کیا۔ چھٹا یہ کہ اس نے اپنے نفس کو گندا کر دیا جس کو اللہ نے پاک پیدا کیا تھا۔ ساتواں یہ کہ اس نے اپنے ہم نشین فرشتوں کو اذیت پہنچائی جو کہ اس کی حفاظت کرنے والے ہیں۔ آٹھواں یہ کہ اس نے رسول اللہ ﷺ کو قبر میں پریشان کیا۔ نواں یہ کہ اس نے رات اور دن کو اپنے اس برے عمل پر گواہ بنایا۔ دسواں یہ کہ اس نے تمام مخلوق سے خیانت کی (یعنی اس کے گناہ کی نحوست سے دوسری مخلوق متاثر ہوئی)۔

حضرت باقر رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ اللہ کا غضب و غصہ گناہوں میں پوشیدہ ہے۔ چنانچہ کسی معصیت کو چھوٹا مت سمجھو، ہو سکتا ہے اسی میں آتشِ غضب پنہاں ہو۔

بدنظری ایسا گناہ ہے کہ جسے عام طور پر گناہ سمجھا ہی نہیں جاتا' اور اگر کوئی سمجھتا ہے تو بہت معمولی گناہ۔ مگر اس کی سنگینی دیکھئے۔ ابو بکر کتانیؒ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے ایک دوست کو بعد از وفات خواب میں دیکھا۔ اُس سے پوچھا کیا معاملہ ہوا ہے؟ کہنے لگا ایک دفعہ ایک خوبصورت لڑکا میرے پاس سے گزرا' میں نے اس کی طرف دیکھ لیا' اس بدنظری کی پاداش میں شرم کے مارے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے ستر سال کھڑا رہا' پسینہ پسینہ ہو گیا تھا' پھر اللہ نے اپنے فضل سے معاف فرما دیا۔

حضرت بایزید بسطامی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں نے ایک عابد کی بزرگی کی تعریف و شہرت سنی تو میں اُس کی زیارت کے لیے گیا۔ میں نے دیکھا کہ اُس نے قبلہ کی جانب تھوک پھینکی۔ میں اُس کی زیارت کیے بغیر واپس ہو گیا' کیونکہ جس شخص نے شریعت کے ظاہری آداب کا خیال نہیں رکھا وہ روحانی اسرار سے کب واقف ہو گا!

نیک کام کرتے وقت قبلہ رو ہونا سعادت مندی اور موجب نجات ہے' اسی طرح سمتِ قبلہ کی بے ادبی گناہ اور نحوست کا باعث ہے۔ مگر عام طور پر اس کو معمولی کام سمجھ کر نظر انداز کر دیا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ: ''جو شخص قبلہ کی طرف تھوکتا ہے قیامت کے دن وہ ایسی حالت میں آئے گا کہ وہی تھوک اس کی آنکھوں کے درمیان چہرہ پر بُرے داغ کی صورت میں ہو گی۔'' (ابوداؤد)

کسی عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

خَلِّ الذُّنُوْبَ صَغِيْرَهَا وَكَبِيْرَهَا فَهُوَ التُّقٰى

''تو گناہ چھوڑ دے' خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے' بس یہی تقویٰ ہے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض بظاہر چھوٹے چھوٹے اعمال پر بڑے ثواب کی خوشخبری سنائی ہے یا چھوٹے سے عمل پر بہت زیادہ اجر و ثواب کی خبر دی ہے۔ بعض لوگ ایسی احادیث کو سنجیدگی سے نہیں لیتے اور تعجب کا اظہار کرتے ہیں۔ یہ بڑی خطرناک بات

ہے۔کسی معمولی عمل پر بہت زیادہ اجر وثواب عطا کرنا اللہ تعالیٰ کے لیے کچھ مشکل نہیں۔ اسی طرح وہ کسی بظاہر چھوٹے سے عمل پر گرفت کر لے تو اس کا ہاتھ کوئی روک نہیں سکتا۔ امام طبرانیؒ فرماتے ہیں کہ ''ہم طالب علمی کے دور میں شہر بصرہ کی ایک گلی میں سے گزر کر تیز تیز چلتے ہوئے اپنے استاد کے پاس جا رہے تھے۔ ہمارے ساتھ ایک غیر سنجیدہ طالب علم تھا' وہ اُس حدیث کا مذاق اڑاتے ہوئے جس میں کہا گیا ہے کہ طالب علم کے قدموں کے نیچے فرشتے پَر بچھاتے ہیں' کہنے لگا کہ اپنے قدموں کو اٹھالو کہیں تم فرشتوں کے پَر نہ توڑ دو۔اس نے مذاق کے انداز میں یہ بات کہی ہی تھی کہ اس کے پاؤں وہاں سے ہل نہ سکے' اس کی ٹانگیں سوکھ گئیں اور وہ زمین پر گر پڑا''۔ پس احکامِ شریعت یا قرآن وحدیث کی باتوں کی تحقیر اور اُن پر استہزاء کے انداز میں تبصرہ سے بچنا چاہیے۔

گناہ تو چھوٹا ہو یا بڑا آخر گناہ ہی ہے۔ پرہیز گار تو وہ ہیں جو مشکوک چیز سے بھی دُور رہتے ہیں کہ کہیں اُس کا تعلق گناہ سے نہ ہو۔ صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ الْحَلَالَ بَيِّنٌ وَاِنَّ الْحَرَامَ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشْتَبِهَاتٌ لَا يَعْلَمُهُنَّ كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ ، فَمَنِ اتَّقَى الشُّبُهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ وَمَنْ وَقَعَ فِي الشُّبُهَاتِ وَقَعَ فِي الْحَرَامِ)) (صحیح البخاری-وصحیح مسلم' کتاب المساقاۃ)

''یقیناً جو حلال ہے وہ واضح اور روشن ہے اور جو حرام ہے وہ بھی واضح ہے' اور ان دونوں کے درمیان کچھ ایسی چیزیں ہیں جو مشتبہ ہیں' بہت سے لوگ ان (کے شرعی حکم) کو نہیں جانتے۔ پس جو شخص شبہ والی چیزوں سے بھی (احتیاطاً) پرہیز کرے وہ اپنے دین اور اپنی آبرو کو بچا لے گا اور جو شخص شبہ والی چیزوں میں پڑے گا تو وہ حرام کی حدود میں جا گرے گا''۔

ترمذی شریف کی ایک مرفوع حدیث میں ہے کہ:

''بندہ متقی اس وقت ہوتا ہے جب ان جائز امور کو بھی ترک کر دے جن کے ذریعے آگے ناجائز امور میں پڑنے کا خطرہ ہو''۔

جب شبہ والی چیز سے بھی دُور رہنے کا حکم دیا گیا ہے تو گناہ کی بات کا تو کسی طور پر بھی

ارتکاب نہیں کرنا چاہیے۔ ایک عربی شاعر نے کیا خوب کہا ہے:

واصنع کماش فوق ار ض الشوك یحذر ما یری

یعنی ایسی زندگی گزار جس طرح کوئی شخص خاردار زمین پر چلتے ہوئے ہر چیز سے خطرہ محسوس کرتا ہے۔

مظہر جانِ جاناں رحمۃ اللہ علیہ کے متعلق مشہور ہے کہ ایک دفعہ انہوں نے بیت الخلاء سے نکلتے ہوئے غلطی سے بایاں قدم باہر رکھ دیا تو فوراً بے ہوش ہو گئے کہ حدیث کی مخالفت سرزد ہو گئی' کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم تو یہ ہے کہ بیت الخلاء میں داخل ہوتے وقت بایاں پاؤں پہلے اندر رکھو اور نکلتے وقت دایاں پاؤں پہلے باہر نکالو' جبکہ مسجد کا حکم اس کے برعکس ہے۔

صحیحین کی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((دَخَلَتِ امْرَأَةٌ النَّارَ فِيْ هِرَّةٍ رَبَطَتْهَا فَلَمْ تُطْعِمْهَا وَلَمْ تَدَعْهَا تَأْكُلُ مِنْ خَشَاشِ الْاَرْضِ)) (صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق)

''ایک عورت ایک بلی (نہایت ظالمانہ طریقے سے) مار ڈالنے کے جرم میں آگ میں داخل ہوئی۔ اس نے اس بلی کو باندھ لیا' پھر نہ تو خود اسے کھانے کو کچھ دیا اور نہ اسے چھوڑا کہ وہ حشرات الارض سے اپنا پیٹ بھر لیتی۔''

جب انسان پر غسل فرض ہو جائے تو جلد از جلد پاکیزگی اختیار کر لینی چاہیے' کیونکہ جُنبی آدمی نہ نماز پڑھ سکتا ہے' نہ مسجد میں داخل ہو سکتا ہے اور نہ قرآن مجید کو چھو سکتا ہے۔ اس لیے جنابت کی حالت میں رہنا گناہ کی حالت میں رہنا ہے۔ ایک شخص نے کسی کو خواب میں دیکھا۔ خواب میں نظر آنے والے نے کہا مجھے چھوڑ دیجیے' میں بری حالت میں ہوں' کیونکہ ایک دفعہ میں نے غسلِ جنابت نہیں کیا تھا جس کے بدلہ میں اللہ تعالیٰ نے مجھے آگ کا کپڑا پہنا دیا' اس آگ کے لباس میں دن رات سرگرداں ہوں۔

کسی آدمی نے ایک فوت شدہ نمازی کو خواب میں دیکھا اور پوچھا موت کے بعد تمہارے ساتھ کیسا سلوک ہوا؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے ایک دن وضو کے بغیر نماز

پڑھی تھی جس کی سزا مجھے یہ ملی کہ ایک بھیڑیا مجھ پر مسلط کر دیا گیا ہے جو مجھے ہر وقت قبر میں ڈراتا رہتا ہے۔ اِس خوفناک صورتِ حال کی وجہ سے میں بہت بری حالت میں ہوں۔

کھانے پینے کی چیزوں میں احتیاط کی اہمیت اور بھی زیادہ ہے' کیونکہ ناجائز لقمہ نری ہلاکت ہے۔ بزرگانِ دین اور صلحائے اُمت نے اس ضمن میں قابل تقلید مثالیں چھوڑی ہیں۔ مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ ایک بار کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں دودھ پیش کیا۔ آپؓ نے پی لیا۔ پھر اس آدمی سے پوچھا کہ یہ دودھ تم نے کہاں سے حاصل کیا تھا؟ اس نے کہا میں ایک چشمے پر گیا' وہاں صدقہ کی اونٹنیوں کو پانی پلایا جا رہا تھا۔ شتربانوں نے ان کا دودھ دوہا اور اس میں سے کچھ مجھے بھی دیا۔ وہی دودھ میں نے لا کر آپؓ کی خدمت میں پیش کیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً اُنگلی اپنے حلق میں ڈالی اور قے کر کے دودھ نکال دیا' کیونکہ وہ بیت المال کی اونٹنیوں کا اتنا سا دودھ بھی اپنے لیے جائز نہیں سمجھتے تھے۔

ایک صالح نوجوان نہر کے کنارے سفر کر رہا تھا۔ نہر میں ایک سیب تیرتا ہوا آ رہا تھا' اُس نے پکڑا اور کھا لیا۔ بعد ازاں خیال آیا کہ نمعلوم یہ سیب کس کا تھا' اور میں نے مالک کی مرضی کے بغیر کھا لیا! اسی فکر میں آگے جا رہے تھے کہ دیکھا کہ نہر کے کنارے ایک باغ ہے جس کے درختوں کی شاخیں پانی پر جھکی ہوئی ہیں۔ سمجھ گئے کہ وہ سیب اسی باغ کے درخت سے پانی میں گرا تھا۔ چنانچہ وہ صالح نوجوان اس باغ کے مالک کے پاس گیا اور کہا میں نے آپ کے باغ کا ایک سیب جو کہ نہر کے پانی میں بہا جا رہا تھا' آپ کی اجازت کے بغیر کھا لیا ہے' آپ مجھے یہ خطا معاف کر دیں۔ باغ کا مالک بھی صاحب ادراک تھا۔ کہنے لگا میں تو معاف نہیں کروں گا۔ جب نوجوان نے منت سماجت کی تو کہنے لگا کہ معافی کی ایک صورت ہے' اور وہ یہ کہ میری بیٹی سے نکاح کر لو جو آنکھوں سے اندھی' کانوں سے بہری اور ٹانگوں سے معذور ہے۔ نوجوان نے چار و ناچار یہ شرط منظور کر لی۔ نکاح ہو گیا۔ جب نوجوان نے اس لڑکی کو دیکھا تو اس کے اندر کوئی بھی جسمانی عیب نہ تھا' وہ حیران ہوا اور لڑکی کے والد سے پوچھا کہ لڑکی نہ تو اندھی

ہے' نہ بہری ہے اور نہ معذور ہے۔ اس نے جواب دیا کہ میری لڑکی اندھی اِس معنی میں ہے کہ اس نے کسی غیر محرم کو نہیں دیکھا۔ بہری اِس معنی میں ہے کہ اس کے کان ناجائز اور حرام آوازیں سننے سے پاک رہے۔ ٹانگوں سے معذور ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کسی معصیت کے کام کی طرف چل کر کبھی نہیں گئی۔ یہ صالح نوجوان اور اس کی خوش خصال اور پاک دامن بیوی ہی وہ جوڑا ہے جن کے ہاں حضرت عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ نے جنم لیا۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ کا ایک عقیدت مند انہیں ملنے کے لیے آیا۔ معلوم ہوا کہ وہ ٹرین میں سوار ہو کر عازمِ سفر ہو چکے ہیں۔ چنانچہ وہ بھی ٹرین میں سوار ہو گیا۔ جلدی سے ٹکٹ بھی نہ خرید سکا۔ جب ٹرین کے ڈبے میں ٹکٹ چیک کرنے والا آیا تو نوجوان نے کہا کہ میں جلدی میں سوار ہو گیا ہوں اور ٹکٹ نہیں لے سکا' آپ مجھے ٹکٹ دے دیں۔ ٹکٹ چیکر نے نوجوان کے چہرے پر نظر ڈالی تو اسے معصوم سا چہرہ جس پر خوبصورت داڑھی تھی' بھلا معلوم ہوا' کہنے لگا نوجوان! ٹکٹ کی ضرورت نہیں' جہاں آپ اترنا چاہیں اتر جائیں۔ نوجوان مطمئن ہو کر بیٹھ گیا اور سفر ختم کر کے سٹیشن پر اتر گیا۔ مولانا تھانویؒ سے ملاقات ہوئی تو ضمناً سفر کا ذکر بھی آ گیا تو نوجوان نے ساری روئیداد بتا دی۔ مولانا نے کہا کہ تم نے یہ اچھا نہیں کیا۔ اگرچہ ٹکٹ چیکر نے آپ کو کرایہ معاف کر دیا' مگر وہ تو کرایہ معاف کرنے کا مجاز نہ تھا۔ وہ ریل کا ملازم تھا۔ آپ نے کرایہ نہ دے کر محکمۂ ریلوے کو نقصان پہنچایا ہے۔ اب اتنی رقم کا ریل کا ٹکٹ خرید کر ضائع کر دو' متعلقہ محکمے کو کرایہ کی رقم پہنچ جائے گی۔

خلاصۂ مضمون یہ ہے کہ اگرچہ قرآن وحدیث میں کچھ گناہوں کو چھوٹا اور کچھ کو بڑا کہا گیا ہے' مگر ہمیں تفصیلی طور پر اِن گناہوں کی تاثیر کا علم نہیں۔ بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ ایک بڑے گناہ کا انجام اِس قدر خطرناک اور ہلاکت خیز نہیں ہوتا جتنا کسی چھوٹے گناہ کا' لہٰذا جو کام گناہ کا ہے' خواہ چھوٹا ہو یا بڑا' اُس سے بچنا انتہائی ضروری ہے۔

چھوٹی چھوٹی نیکیوں پر اجرِ عظیم

نیکی کے کچھ کام بظاہر معمولی نظر آتے ہیں مگر اُن کا اجر و ثواب بہت زیادہ ہوتا ہے' لوگ ایسے کاموں کو حقیر سمجھ کر اُن کی طرف متوجہ نہیں ہوتے اور اس طرح بہت بڑے اجر و ثواب سے محروم رہتے ہیں۔ حالانکہ معمولی اور آسان کام جو اجر کے اعتبار سے عظیم ہو اُس کی طرف تو دوڑ کر جانا چاہیے اور اُس کی انجام دہی کے لیے ہمہ وقت مستعد رہنا چاہیے۔ جیسا کہ ہم اُس کام کی طرف سب کام چھوڑ کر متوجہ ہو جاتے ہیں جس میں روپے پیسے کا غیر معمولی نفع نظر آ رہا ہو۔ یہاں تو یہ حال ہے کہ دُنیا کے معمولی نفع کی خاطر انسان لمبے لمبے سفر اختیار کر لیتا ہے' بلکہ بڑے بڑے خطرات کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہو جاتا ہے۔ حالانکہ دُنیا کا مال و متاع اور مفاد جس قدر بھی ہو وہ متاعِ قلیل' غیر حقیقی اور فانی ہے' جبکہ آخرت کا نفع حقیقی' دائمی اور ابدی ہے جس کے مقابلہ میں دُنیوی مفاد کی کوئی حیثیت نہیں۔ عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اُن آسان کاموں کی طرف دھیان دیں جن پر اسلامی تعلیمات کے اندر بڑے اجر و ثواب کے وعدے ہیں۔ کسی مسلمان بھائی کو خوش کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ ضروری نہیں کہ اس کے لیے بہت لمبی چوڑی جدوجہد کرنا پڑے' بلکہ بعض اوقات تو معمولی سی کاوش سے دوسرے کا دل خوش کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر کسی شخص کا اپنے کسی عزیز رشتہ دار کے ساتھ اختلاف ہو گیا ہے اور وہ اس صورت حال میں پریشان ہے' ایک آدمی آگے بڑھ کر دونوں کے درمیان غلط فہمیوں کا ازالہ کر کے اُن کے درمیان اُلفت و مودّت کا رشتہ دوبارہ قائم کر دیتا ہے تو یہ چھوٹا سا عمل بہت بڑی نیکی ہے' کچھ عجب نہیں کہ اُس کا یہ عمل اُسے جنت میں لے جائے۔ ذیل میں ہم ایسے چند اعمال کا ذکر کرتے ہیں جو بظاہر چھوٹے نظر آتے ہیں مگر قرآن و حدیث کی رو سے ان کا اجر بہت عظیم ہے۔

دوسروں کو فائدہ پہنچانا

حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ قَضٰى لِاَحَدٍ مِنْ اُمَّتِيْ حَاجَةً يُرِيْدُ اَنْ يَسُرَّهٗ بِهَا فَقَدْ سَرَّنِيْ، وَمَنْ سَرَّنِيْ فَقَدْ سَرَّ اللّٰهَ، وَمَنْ سَرَّ اللّٰهَ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ)) (۱)

''جس شخص نے میری اُمت میں سے کسی انسان کو خوش کرنے کے لیے اس کا کوئی کام کیا تو اُس نے مجھے خوش کیا، اور جس نے مجھے خوش کیا تو اس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا، اور جس نے اللہ تعالیٰ کو خوش کیا اللہ تعالیٰ اُسے جنت میں داخل فرمائیں گے۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ ہی سے مروی حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ:

((مَنْ اَغَاثَ مَلْهُوْفًا كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ ثَلَاثًا وَسَبْعِيْنَ مَغْفِرَةً، وَاحِدَةٌ فِيْهَا صَلَاحُ اَمْرِهٖ كُلِّهٖ وَثِنْتَانِ وَسَبْعُوْنَ لَهٗ دَرَجَاتٌ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (۲)

''جو شخص کسی مصیبت زدہ انسان کی مدد کرے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے ۷۳ مغفرتیں لکھ دیتے ہیں۔ ان میں سے صرف ایک مغفرت اس شخص کی اصلاحِ حال اور خوشحالی کے لیے کافی ہے اور باقی ۷۲ مغفرتیں اس کے لیے قیامت کے دن بلندیٔ درجات کا ذریعہ ہوں گی۔''

یتیم پر شفقت

یتیم بچہ شفقتِ پدری سے محروم ہے۔ وہ محزون اور مغموم ہے۔ اگر کوئی شخص اُس کی ضروریات اور خواہشات کی تکمیل میں مدد کرے تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔ لیکن جس شخص کو اُس کی مالی امداد کی استطاعت نہیں، مگر وہ پیار اور شفقت کے جذبات کے ساتھ اُس کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرتا اور محبت و رأفت کا ہاتھ اُس کے سر پر رکھتا ہے تو اُس کا یہ عمل بھی بے انتہا ثواب کا باعث بن جاتا ہے۔ حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ:

''جو شخص کسی یتیم بچے یا بچی کے سر پر صرف اللہ کی رضا کی خاطر شفقت سے ہاتھ پھیر دے تو جتنے بالوں پر اس کا ہاتھ پھرے گا اُن کی تعداد کے برابر اس شخص کو نیکیاں ملیں گی۔'' (۳)

پھر رسول اللہ ﷺ نے اپنی دو انگلیوں (انگشت شہادت اور اس کے ساتھ والی انگلی) کو ملایا اور فرمایا: ''جو شخص کسی یتیم بچے یا بچی کا نگران ہو اور اُس کے ساتھ اچھا سلوک کرے تو مَیں اور وہ شخص جنت میں اِن دو انگلیوں کی مانند قریب ہوں گے۔'' دیکھئے یتیم کے سر پر پیار' محبت' ہمدردی اور خیر خواہی کے ساتھ ہاتھ پھیرنا کتنا آسان کام ہے' مگر اس کا اجر و ثواب کتنا عظیم ہے۔ ہاتھ کے نیچے تو لاکھوں کی تعداد میں بال ہوں گے' چنانچہ یہ معمولی سا عمل لاکھوں نیکیوں کا سبب بن جائے گا۔ اور اگر کسی نے ایک بے سہارا یتیم کو اپنے ہاں رکھ لیا اور اُس کے کھانے پینے اور لباس وغیرہ کی ذمہ داری قبول کر لی تو یہ عمل اُس کی مغفرت کا باعث بن جائے گا۔ اور یہ کام بھی زیادہ مشکل نہیں' کیونکہ جہاں وہ اپنے بچوں کی ضروریات پوری کرتا ہے اس یتیم کی کفالت بھی کر لے گا' اور سچ تو یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی روزی میں برکت ڈال دے گا اور یتیم کا وجود اُس کے لیے بار نہیں ہو گا بلکہ سعادت کا باعث بن جائے گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ قَبَضَ يَتِيمًا مِنْ بَيْنِ الْمُسْلِمِينَ اِلٰى طَعَامِهٖ وَشَرَابِهٖ اَدْخَلَهُ اللّٰهُ الْجَنَّةَ اِلَّآ اَنْ يَّعْمَلَ ذَنْبًا لَا يُغْفَرُ لَهٗ)) (۴)

''جو شخص کسی یتیم کو بلا کر اپنے کھانے پینے میں شریک کر لے تو اللہ تعالیٰ اس شخص کو جنت میں داخل فرما دیتے ہیں' سوائے اس کے کہ اس نے ناقابلِ بخشش گناہ (یعنی شرک و کفر) کیا ہو۔''

اور یہ بات تو اصولاً طے ہے کہ جس کی موت کفر اور شرک پر واقع ہو اُس کے لیے بخشش نہیں۔ حصولِ جنت کا کتنا آسان ذریعہ ہے کہ کسی یتیم کی کفالت اپنے ذمہ لے لی جائے اور اپنے بچوں کی طرح اُس کی ضروریات کو بھی پورا کیا جائے۔

بیت اللہ کو تکنا

بیت اللہ مسلمانوں کا قبلہ ہے۔ روئے زمین پر بسنے والے مسلمان اُس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ ہر صاحب حیثیت پر بیت اللہ کا حج کرنا فرض ہے۔ جو شخص حج کی خاطر مکہ معظّمہ پہنچے گا وہ خوش نصیب خانہ کعبہ کا طواف کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے گھر کو خصوصی فضیلت سے نوازا ہے۔ حرم شریف میں ذکر واذکار، نماز اور طواف بلاشبہ بڑے اجر کے کام ہیں، مگر خانۂ کعبہ کے سامنے بیٹھ کر اُسے تکتے رہنا بھی ثواب کا موجب ہے۔ حضرت حسان بن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ:

ان الله خلق لهذا البيت عشرين ومائة رحمة ينزلها في كل يوم فستون منها للطائفين واربعون للمصلين وعشرون للناظرين. (٥)

''اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کے لیے ایک سو بیس رحمتیں پیدا فرمائی ہیں جو وہ ہر روز اُس پر نازل فرماتا ہے۔ پس ان میں سے ساٹھ رحمتیں طواف کرنے والوں کے لیے ہوتی ہیں، چالیس رحمتیں نماز پڑھنے والوں کے لیے اور بیس رحمتیں خانہ کعبہ کو دیکھنے والوں کے لیے ہیں''۔

یوں جو شخص بیت الحرام تک پہنچ گیا وہ محض اللہ کے گھر کی طرف عقیدت کے ساتھ تکتا رہے تو بھی ثواب حاصل کرتا ہے۔

احترامِ قبلہ

حدیث میں ہے کہ جو شخص غلطی سے کعبہ کی جانب مُنہ کر کے رفع حاجت کے لیے بیٹھ گیا، پھر بیٹھے بیٹھے اُسے خانۂ خدا کی عظمت کا خیال آیا تو اُس نے اُسی وقت اپنا رُخ دوسری طرف پھیر لیا تو اٹھنے سے پہلے اُس کے گناہ بخش دیے جاتے ہیں۔ دیکھیے یہ کتنا معمولی سا عمل ہے مگر احترامِ حرم کے احساس نے اُس کو کتنا عظیم بنا دیا! (٦)

ماں باپ کو محبت سے دیکھنا

اللہ کی رحمت کا اندازہ لگایئے کہ خانہ کعبہ تک تو بہرحال وہی پہنچ سکتے ہیں جو صاحبِ استطاعت ہوں، مگر جو وہاں تک نہیں پہنچ پاتے اُن کے لیے بھی ثواب کمانے کا

آسان طریقہ ہے کہ جو شخص اپنے ماں باپ کی طرف محبت اور پیار کی نظر سے دیکھتا ہے تو وہ بڑا اجر و ثواب پاتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا مِنْ وَلَدٍ بَارٍّ يَنْظُرُ اِلٰى وَالِدَيْهِ نَظْرَةَ رَحْمَةٍ اِلاَّ كَتَبَ اللّٰهُ لَهٗ بِكُلِّ نَظْرَةٍ حَجَّةً مَبْرُوْرَةً)) قَالُوْا : وَاِنْ نَظَرَ كُلَّ يَوْمٍ مِائَةَ مَرَّةٍ؟ قَالَ : ((نَعَمْ ، اَللّٰهُ اَكْبَرُ وَاَطْيَبُ)) (۷)

''جو نیک بیٹا اپنے والدین کو بنظرِ رحمت دیکھے تو اللہ تعالیٰ اُس کے لیے ہر نظر کے بدلے ایک مقبول حج کا ثواب لکھ لیتے ہیں''۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا کہ اگر کوئی آدمی ایک دن میں سو مرتبہ دیکھے (تو کیا اسے سو حج مبرور کا ثواب ملے گا)؟ آپ ؐ نے فرمایا: ''ہاں' اللہ تعالیٰ بہت بڑے ہیں اور بہت پاکیزہ ہیں''۔

یوں نیکوکار بیٹے یا بیٹیاں بڑی آسانی سے اپنے گھر کے اندر رہ کر صبح و شام اجرِ عظیم حاصل کرتے رہتے ہیں۔

سلام کرنا

مسلمان آپس میں ملتے ہیں تو ایک دوسرے کو سلام کہتے ہیں۔ یہ سلام کہنا بذاتِ خود بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے' حالانکہ بظاہر یہ عمل بالکل معمولی نظر آتا ہے۔ اکثر لوگ اس آسان سے عمل کی اہمیت سے بے خبر ہیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی وجہ سے سلام کرنے کا عام رواج تھا۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما بلا ضرورت بازار جاتے اور لوگوں کو سلام کرتے اور بعض اوقات خرید و فروخت کے بغیر گھر واپس آ جاتے۔ طفیل بن ابی بن کعبؒ فرماتے ہیں:

''میں ہر صبح حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی خدمت میں حاضر ہوتا تھا۔ پھر وہ مجھے صبح صبح بازار لے جاتے۔ بازار میں جس کے پاس سے گزرتے اُسے سلام کہتے' خواہ کوئی ردّی بیچنے والا ہوتا یا کوئی بڑا تاجر ہوتا' یا کوئی مسکین ہوتا یا کوئی اور ہوتا' ہر ایک کو السلام علیکم کہتے تھے۔ طفیل کہتے ہیں کہ ایک دن میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس گیا' وہ مجھے اپنے ساتھ لے کر بازار جانے لگے۔ میں نے اُن سے

پوچھا کہ آپ بازار میں کیا کریں گے؟ نہ تو آپ خرید وفروخت کے لیے کھڑے ہوتے ہیں اور نہ کسی سودے کے بارے میں پوچھتے ہیں' نہ کسی سے بھاؤ دریافت کرتے ہیں اور نہ بازار کی کسی محفل میں جا کر بیٹھتے ہیں۔ پس آج آپ ہمارے پاس یہیں بیٹھیں اور باتیں کریں۔ اس پر حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا: ''اے طفیل! ہم روزانہ صبح صرف اس غرض سے بازار جاتے ہیں کہ جو مسلمان بھی ملے اُسے السلام علیکم کہیں (اور ثواب پائیں)۔''(۸)

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے کہا ''السلام علیکم!'' آپؐ نے اس کے سلام کا جواب دیا' جب وہ مجلس میں بیٹھ گیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''دس''۔ یعنی اس شخص کو دس نیکیاں ملیں۔ پھر ایک اور آدمی آیا اور اُس نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ!'' آپؐ نے اُس کے سلام کا جواب دیا' جب وہ آدمی بیٹھ گیا تو آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''بیس''۔ یعنی اس شخص کو بیس نیکیاں مل گئیں۔ پھر ایک تیسرا آدمی آیا اور اُس نے کہا ''السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!'' آپؐ نے اس کے سلام کا جواب دیا' جب وہ مجلس میں بیٹھ گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''تیس''۔ یعنی اس کے لیے تیس نیکیاں لکھی گئیں۔(۹)

آپ نے دیکھا کہ اتنے آسان عمل کا کتنا بڑا ثواب ہے!

روزے دار کا اجر' جب اُس کے سامنے کھانا کھایا جائے

ایک شخص روزے سے ہے۔ اگر اُس کے پاس کوئی ایسا شخص کھانا کھاتا ہے جو کسی عذر کی بنا پر روزہ نہیں رکھ سکا تو اس روزہ دار کو بڑا ثواب ملتا ہے' اس لیے کہ پاس ایک شخص کھانے سے بھوک مٹا رہا ہے مگر اسے کھانے کی اجازت نہیں اور وہ اللہ کی رضا کے لیے بھوک پیاس برداشت کر رہا ہے۔ اس وقتی سے صبر پر بھی روزہ دار اجر پا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض بزرگوں کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ روزے کی حالت میں ہوتے تو کسی معذور غیر روزہ دار کو اپنے پاس بلا کر اسے کھانا کھلاتے اور پانی پلاتے تاکہ اجر عظیم حاصل کریں۔ حضرت اُمّ عمارہ رضی اللہ عنہا روایت کرتی ہیں کہ:

اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ دَخَلَ عَلَيْهَا فَقَدَّمَتْ اِلَيْهِ طَعَامًا فَقَالَ: ((كُلِيْ)) فَقَالَتْ: اِنِّیْ صَائِمَةٌ فَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ: ((اِنَّ الصَّائِمَ تُصَلِّیْ عَلَيْهِ الْمَلَائِكَةُ اِذَا اُكِلَ عِنْدَهٗ حَتّٰی يَفْرُغُوْا)) (۱۰)

''نبی اکرم ﷺ اُن کے پاس تشریف لائے تو انہوں نے آپؐ کو کھانا پیش کیا' پس آپؐ نے فرمایا: ''اُمِ عمارہ! تم بھی کھاؤ''۔ انہوں نے کہا: میں تو روزے سے ہوں۔ اس پر آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''جب روزہ دار کے پاس کچھ کھایا جائے تو کھانا کھانے والے کے فارغ ہونے تک فرشتے اس روزہ دار کے لیے رحمت اور بخشش کی دُعا کرتے رہتے ہیں''۔

اترا ہوا لباس صدقہ کرنا

صدقہ وخیرات تو بڑے اجر و ثواب کے کام ہیں۔ اسی طرح کسی ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کرنا بھی اعلیٰ درجے کی نیکی ہے۔ جب کوئی شخص نیا کپڑا پہنے اور اپنا پرانا کپڑا اتار کر کسی ضرورت مند کو دے دے تو اس معمولی سے عمل پر اللہ تعالیٰ اُسے اپنے سایۂ رحمت میں لے لیتا ہے۔ جب نیا کپڑا مل جائے تو پرانا کپڑا فالتو ہو جاتا ہے۔ یہ فالتو کپڑا صدقہ میں دے دینا کوئی بڑا عمل نہیں' مگر اس پر اجرِ عظیم اللہ تعالیٰ کی کمالِ رحمت کا مظہر ہے۔ حضرت ابو امامہ ؓ کہتے ہیں کہ حضرت عمر ؓ نے نیا لباس زیب تن کیا اور یہ الفاظ کہے:

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ كَسَانِیْ مَا اُوَارِیْ بِهٖ عَوْرَتِیْ وَاَتَجَمَّلُ بِهٖ فِیْ حَيَاتِیْ (۱۱)

''تمام تعریفیں اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے کپڑا پہنایا جس سے میں اپنا ستر ڈھانپتا ہوں اور زینت حاصل کرتا ہوں''۔

پھر اپنے اتارے ہوئے پرانے کپڑے کو صدقہ کر دیا اور کہنے لگے کہ میں نے رسول اللہ ﷺ کو یہ فرماتے ہوئے سنا کہ:

((مَنْ لَبِسَ ثَوْبًا جَدِيْدًا فَقَالَ اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ كَسَانِیْ مَا اُوَارِیْ بِهٖ عَوْرَتِیْ وَاَتَجَمَّلُ بِهٖ فِیْ حَيَاتِیْ ثُمَّ عَمَدَ اِلَى الثَّوْبِ الَّذِیْ اَخْلَقَ فَتَصَدَّقَ

بِهٖ كَانَ فِيْ كَنَفِ اللّٰهِ وَفِيْ حِفْظِ اللّٰهِ وَفِيْ سَتْرِ اللّٰهِ حَيًّا وَمَيِّتًا)) (۱۲)

''جوشخص کوئی نیا لباس پہنے' پھر مذکورہ بالا دعا پڑھے اور پرانا لباس اتار کر صدقہ کر دے تو وہ دنیا وآخرت میں اللہ تعالیٰ کے سایۂ رحمت اور اس کی حفاظت میں ہوگا۔''

کھانے کا برتن صاف کرنا

اسلام صفائی' ستھرائی' نظافت اور طہارت پر بڑا زور دیتا ہے۔ کھانا کھانے سے پہلے ہاتھ دھونے کی تاکید کی گئی ہے' تاکہ کھانا کھانے والا صاف ستھرے ہاتھوں کے ساتھ بلاتکلف کھانا کھا سکے۔ کھانا کھانے کے بعد ہاتھ کی انگلیوں کو چاٹ لینا بھی مستحسن عمل ہے۔ اس سے انگلیوں کے ساتھ لگی ہوئی غذا بھی ضائع نہیں ہوگی اور انگلیاں بھی صاف ہو جائیں گی۔ اسی طرح کھانے کے برتن کو بھی اچھی طرح صاف کر دینا چاہیے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھانا کھانے کے بعد انگلیاں اور برتن چاٹنے اور صاف کرنے کا حکم دیا اور فرمایا:

((اِنَّكُمْ لَا تَدْرُوْنَ فِي اَيَّةِ الْبَرَكَةُ)) (۱۳)

''تمہیں نہیں معلوم کہ کھانے کے کس حصے اور ذرے میں برکت ہے''۔

پس اس بُرے رواج کو چھوڑ دینا چاہیے کہ کھانے کے برتن میں کھانا چھوڑ دیا جائے یا اچھی طرح صاف نہ کیا جائے۔ اسی طرح کھانا کھا کر ہاتھ کی انگلیوں کو چاٹ لینا چاہیے۔ کئی دیگر حکمتوں کے علاوہ اس میں یہ حکمت بھی ہے کہ جسم وجان کا رشتہ برقرار رکھنے والی غذا کی قدر کی جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ اَكَلَ فِيْ قَصْعَةٍ ثُمَّ لَحِسَهَا اسْتَغْفَرَتْ لَهُ الْقَصْعَةُ)) (۱۴)

''جوشخص کسی برتن میں کھانا کھا کر اُسے اچھی طرح صاف کر لے اور چاٹ لے تو وہ برتن اس شخص کے لیے بخشش ومغفرت کی دعا مانگتا ہے۔''

گرا ہوا لقمہ اٹھا کر کھا لینا

اگر کھانا کھاتے وقت لقمہ ہاتھ سے گر جائے تو اٹھا کر صاف کر کے کھا لینا برکت کا باعث ہے۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا کہ:

((اِنَّ الشَّيْطَانَ يَحْضُرُ اَحَدَكُمْ عِنْدَ كُلِّ شَيْءٍ مِنْ شَاْنِهٖ حَتّٰى يَحْضُرَهٗ عِنْدَ طَعَامِهٖ فَاِذَا سَقَطَتْ مِنْ اَحَدِكُمُ اللُّقْمَةُ فَلْيُمِطْ مَا كَانَ بِهَا مِنْ اَذًى ثُمَّ لِيَاْكُلْهَا وَلَا يَدَعْهَا لِلشَّيْطَانِ فَاِذَا فَرَغَ فَلْيَلْعَقْ اَصَابِعَهٗ فَاِنَّهٗ لَا يَدْرِيْ فِيْ اَيِّ طَعَامِهٖ تَكُوْنُ الْبَرَكَةُ)) (۱۵)

''شیطان اپنے ہر مناسب موقع پر تمہارے پاس حاضر ہو جاتا ہے' یہاں تک کہ کھانے کے وقت بھی حاضر ہوتا ہے' لہٰذا جب تم میں سے کسی کے ہاتھ سے لقمہ گر جائے تو اُسے چاہیے کہ گرد وغیرہ صاف کر کے کھا لے اور شیطان کے لیے نہ چھوڑے' پھر کھانا کھانے سے فارغ ہو کر اپنی انگلیاں چاٹ لے' کیونکہ اسے یہ پتا نہیں کہ کھانے کے کس حصے میں برکت ہے''۔

کھانا کھانے کے بعد انگلیاں چاٹ لینا' برتن صاف کر دینا اور گرا ہوا لقمہ صاف کر کے کھا لینا چنداں مشکل نہیں' مگر اس پر مغفرت اور برکت کا حاصل ہونا کتنی بڑی بات ہے!

مریض کی عیادت

بیماری انسانی زندگی کا لازمہ ہے۔ مریض بیماری کی تکلیف میں ہمدردی اور حوصلہ افزائی کا طالب ہوتا ہے۔ چنانچہ مریض کی عیادت اگر پورے آداب کے ساتھ کی جائے تو بڑے اجر و ثواب کا کام ہے' جبکہ مریض کی عیادت ایک آسان سا کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے:

((مَنْ اَتٰى اَخَاهُ الْمُسْلِمَ عَائِدًا مَشٰى فِيْ خَرَافَةِ الْجَنَّةِ حَتّٰى يَجْلِسَ' فَاِذَا جَلَسَ غَمَرَتْهُ الرَّحْمَةُ' فَاِنْ كَانَ غُدْوَةً صَلّٰى عَلَيْهِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ حَتّٰى يُمْسِيَ' وَاِنْ كَانَ مَسَاءً صَلّٰى عَلَيْهِ سَبْعُوْنَ اَلْفَ مَلَكٍ حَتّٰى يُصْبِحَ)) (۱۶)

''جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی تیمارداری کے لیے آتا ہے گویا وہ ایک طرح سے جنت کی طرف آ رہا ہے یہاں تک کہ وہ مریض کے پاس بیٹھ جاتا ہے' پس جب وہ مریض کے پاس بیٹھتا ہے تو رحمت اس کو ڈھانپ لیتی ہے۔ اگر وہ صبح کے وقت مریض کی عیادت کے لیے آتا ہے تو شام تک ستر ہزار فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں اور اگر وہ شام کو آئے تو صبح تک ستر ہزار

فرشتے اس کے لیے رحمت کی دعائیں کرتے رہتے ہیں''۔

ایک اور حدیث میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ تَوَضَّأَ فَاَحْسَنَ الْوُضُوْءَ وَعَادَ اَخَاهُ الْمُسْلِمَ مُحْتَسِبًا بُوْعِدَ مِنْ جَهَنَّمَ مَسِيْرَةَ سَبْعِيْنَ خَرِيْفًا)) (۱۷)

''جو شخص اچھی طرح وضو کرے' پھر محض ثواب کی نیت سے اپنے مسلمان بھائی کی عیادت کے لیے جائے تو وہ دوزخ سے ستر سال کی مسافت کے برابر دور کر دیا جاتا ہے۔''

اتنی معمولی سی بات پر دوزخ سے دُوری اللہ تعالیٰ کی شانِ رحیمی کی ہی مظہر ہو سکتی ہے۔

نماز جنازہ میں شرکت

دوست احباب یا اعزہ واقارب میں سے جب کوئی فوت ہو جائے تو اُس پر نمازِ جنازہ پڑھی جاتی ہے۔ کسی کی نماز جنازہ میں شرکت کرنا ایک اخلاقی تقاضا' شرعی ذمہ داری اور میت کا حق ہے۔ چنانچہ اس فریضے کی ادائیگی بھی بڑے اجر وثواب کا باعث ہے' حالانکہ اس میں نہ زیادہ وقت لگتا ہے اور نہ ہی کوئی بڑی مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((مَنْ صَلّٰى عَلٰى جَنَازَةٍ فَلَهٗ قِيْرَاطٌ ' فَاِنْ شَهِدَ دَفْنَهَا فَلَهٗ قِيْرَاطَانِ' الْقِيْرَاطُ مِثْلُ اُحُدٍ)) (۱۸)

''جو آدمی کسی (مسلمان میت) کی نماز جنازہ میں شرکت کرے تو اسے ایک قیراط ثواب ملے گا' اور اگر میت کے دفن ہونے تک ساتھ رہے تو اسے دو قیراط ثواب ملے گا۔ (آپؐ نے فرمایا) ایک قیراط کی مقدار اُحد پہاڑ کے برابر ہے۔''

اس قدر معمولی عمل پر اتنے بڑے ثواب کا تقاضا تو یہ ہے کہ آدمی نماز جنازہ میں ضرور شرکت کرے اور اگر ہو سکے تو دفن تک وہاں موجود رہے۔

نمازِ جمعہ کی تیاری اور شرکت

جیسا کہ اوپر بیان ہوا' اسلام میں طہارت اور نظافت کی بڑی اہمیت ہے۔

اعضائے وضوتو ہر نماز کے وقت دھونے ہوتے ہیں۔ البتہ غسل کرنا جمعہ کے دن نمازِ جمعہ کی تیاری کا حصہ ہے۔ جمعہ کے دن صبح اٹھ کر غسل کرنا' صاف ستھرے کپڑے پہننا' خوشبو لگانا' مسواک کرنا وغیرہ سارے صفائی اور ستھرائی کے کام ہیں جس سے انسان کی طبیعت میں بشاشت اور تازگی پیدا ہوتی ہے۔ اس پر بھی کریم و رحیم پروردگار اپنی شان کے مطابق اجر و ثواب سے نوازتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنِ اغْتَسَلَ يَوْمَ الْجُمُعَةِ كُفِّرَتْ عَنْهُ ذُنُوْبُهُ وَخَطَايَاهُ' فَإِذَا اَخَذَ فِي الْمَشْيِ كُتِبَ لَهُ بِكُلِّ خُطْوَةٍ عِشْرُوْنَ حَسَنَةً' فَإِذَا انْصَرَفَ مِنَ الصَّلَاةِ اُجِيْزَ بِعَمَلِ مِائَتَيْ سَنَةٍ)) (١٩)

''جو شخص جمعہ کے دن غسل کر لے اس کے گناہ اور خطائیں معاف کر دی جاتی ہیں' پھر جب وہ چل کر (مسجد کی طرف) جاتا ہے تو اس کے ہر قدم کے بدلے بیس بیس نیکیاں لکھی جاتی ہیں' پھر جب نماز سے فارغ ہو کر واپس گھر جاتا ہے تو اس کو دو سو سال کے عمل کا بدلہ دیا جاتا ہے۔''

نمازِ جمعہ کی تیاری کے ضمن میں غسل کرنا کس قدر معمولی عمل ہے' مگر اجر و ثواب کے اعتبار سے یہ کام کتنی بڑی فضیلت کا حامل ہے کہ گناہوں اور خطاؤں کی بخشش کا ذریعہ بن جاتا ہے!

جمعہ کے دن جلدی مسجد جانا

ہفتے میں ایک دن یعنی یوم الجمعہ خصوصی عبادت اور فضیلت کا دن ہے۔ اس روز ظہر کی چار رکعتوں کے بجائے جمعہ کی نماز کی دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ نماز سے قبل خطیب وعظ کرتا ہے جس میں دین کی تعلیمات حاضرین کو سنائی جاتی ہیں۔ اگرچہ خود جمعہ بڑا بابرکت دن ہے مگر اس دن خطیب کے خطبہ شروع کرنے سے پہلے مسجد میں پہنچ جانا بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

''جب جمعہ کا دن ہوتا ہے تو فرشتے مسجد کے دروازے پر کھڑے ہو جاتے ہیں اور شروع میں آنے والوں کے نام یکے بعد دیگرے لکھتے ہیں۔ اوّل وقت

دوپہر میں آنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو اللہ کے حضور میں اونٹ کی قربانی پیش کرتا ہے' پھر اس کے بعد آنے والے کی مثال اس شخص کی سی ہے جو گائے پیش کرتا ہے' پھر اس کے بعد آنے والے کی مثال مینڈھا پیش کرنے والے کی ہے' اور اس کے بعد مرغی پیش کرنے والے کی اور اس کے بعد انڈا پیش کرنے والے کی۔ پھر جب امام خطبہ کے لیے منبر کی طرف جاتا ہے تو یہ فرشتے اپنے لکھنے کے دفتر لپیٹ لیتے ہیں اور خطبہ سننے میں شریک ہو جاتے ہیں۔''(۲۰)

راستے سے رکاوٹ دُور کرنا

دوسروں کی خیر خواہی اسلامی اخلاق کی ایک اہم شق ہے۔ اس خیر خواہی کے سلسلے میں ادنیٰ سے ادنیٰ عمل بھی ثواب سے خالی نہیں۔ راستے پر بعض اوقات کوئی روڑہ' پتھر کا ٹکڑا یا کانٹے دار درخت کی شاخ پڑی ہوتی ہے۔ اگر اس خیال سے وہ روڑہ' پتھر یا کانٹا راہ سے ہٹا دیا جائے کہ راہگیر پتھر سے ٹھوکر نہ کھائیں یا کسی کے پاؤں میں یا گاڑی کے ٹائر میں کانٹا نہ چبھ جائے' تو یہ معمولی سا عمل بڑے اجر کا باعث ہے۔ اور کیا عجب کہ یہی چھوٹا سا عمل کسی کی بخشش کا سبب بن جائے! حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((بَیْنَمَا رَجُلٌ یَمْشِیْ بِطَرِیْقٍ وَجَدَ غُصْنَ شَوْكٍ عَلَى الطَّرِیْقِ فَاَخَّرَهٗ فَشَکَرَ اللّٰهُ لَهٗ فَغَفَرَ لَهٗ)) (۲۱)

''ایک شخص نے راستے میں کانٹے دار شاخ دیکھی اور ہٹا دی تو اللہ تعالیٰ نے اس عمل کو قبول فرما کر اُسے بخش دیا۔''

تلاوتِ قرآن مجید

قرآن مجید کی تلاوت کس قدر آسان سا کام ہے! چند منٹوں میں درجنوں آیات بآسانی تلاوت کی جا سکتی ہیں۔ اس عمل کے اجر کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے:

((مَنْ قَرَاَ حَرْفًا مِنْ کِتَابِ اللّٰهِ فَلَهٗ بِهٖ حَسَنَةٌ وَالْحَسَنَةُ بِعَشْرِ اَمْثَالِهَا لَا

اَقُوْلُ "الم" حَرْفٌ، وَلٰكِنْ اَلِفٌ حَرْفٌ وَلَامٌ حَرْفٌ وَمِيْمٌ حَرْفٌ))(۲۲)

''جس نے کتاب اللہ کا ایک حرف پڑھا اس نے ایک نیکی کمائی اور ایک نیکی اللہ کے ہاں دس نیکیوں کے برابر ہے' اور میں یہ نہیں کہتا کہ ''الٓمٓ'' ایک حرف ہے' بلکہ ''الف'' ایک حرف ہے' ''لام'' ایک حرف ہے اور ''میم'' ایک حرف ہے''۔

یوں الٓمٓ پڑھنے سے تیس نیکیاں ملیں۔ پس جو شخص چند منٹ تلاوت کر لے وہ ڈھیروں نیکیاں کما سکتا ہے۔

روزہ افطار کرانے کا ثواب

رمضان ماہِ صیام ہے۔ مسلمان اس میں روزہ رکھتے ہیں۔ صبح صادق کے وقت سحری کھا کر سارا دن کچھ کھانا پینا نہیں ہوتا۔ غروبِ آفتاب کے ساتھ ہی افطاری کا وقت ہو جاتا ہے۔ ظاہر ہے اُس وقت بھوک زوروں پر ہوتی ہے' ایسی حالت میں کسی روزہ دار کو کھانے پینے کا سامان فراہم کرنا (اگر چہ وہ سامان قلیل ہی ہو) بہت بڑی نیکی ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ فَطَّرَ صَائِمًا كَانَ لَهٗ مِثْلُ اَجْرِهٖ غَيْرَ اَنَّهٗ لَا يَنْقُصُ مِنْ اَجْرِ الصَّائِمِ شَيْئًا))(۲۳)

''جس نے کسی روزہ دار کو افطار کرایا اس کو روزہ دار ہی کے مثل ثواب ملے گا' اس حال میں کہ روزہ دار کے ثواب میں بھی کچھ کمی نہیں ہوگی۔''

ظاہر ہے کہ روزہ رکھنا تو مشقت کا کام ہے مگر افطار کرانا تو معمولی سی بات ہے جس پر پورے روزے کا ثواب اللہ کی رحمت اور مہربانی ہی کا مظہر ہے۔ اور روزہ تو محض پانی یا لسی کے ایک گھونٹ یا ایک کھجور سے بھی افطار کرایا جا سکتا ہے۔

باوضو سونا

صاف ستھرا رہنا انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ اس سے انسان کی طبیعت تر و تازہ اور ہشاش بشاش رہتی ہے۔ اسلام میں نماز سے پہلے وضو کرنا ضروری ہے۔ وضو میں ہاتھ' پاؤں' چہرہ اور بازو دھوئے جاتے ہیں جس سے صفائی حاصل ہوتی ہے اور انسان

پاکیزگی اور تازگی محسوس کرتا ہے۔ وضو جہاں پاکیزگی کا باعث بنتا ہے وہاں اس سے اجر وثواب بھی ملتا ہے۔ صلحاء اور اتقیاء کا معمول ہے کہ وہ اکثر باوضو رہتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

''جو شخص باوضو ہو کر اللہ کا ذکر کرتے ہوئے بستر پر سو جائے اور رات کو کروٹ بدلتے ہوئے یا ویسے ہی بیداری کے وقت اللہ تعالیٰ سے دنیا و آخرت کے نیک امور میں سے کسی چیز کا سوال کرے تو اللہ تعالیٰ وہ چیز اسے عنایت فرما دیتے ہیں اور ایک فرشتہ ساری رات اس کے پاس رہتے ہوئے اس کے لیے دعا کرتا رہتا ہے کہ اے اللہ! اب اس بندے کو بخش دے' کیونکہ یہ باوضو سویا ہے۔''(۲٤)

مقروض کو مہلت دینا

مسلم شریف کی ایک حدیث میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کا ارشاد نقل کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

''اگلی اُمتوں میں سے ایک شخص سے اُس کی وفات کے بعد فرشتوں نے پوچھا: کیا تو نے کوئی نیک عمل کیا؟ اس نے جواب دیا: نہیں۔ فرشتوں نے کہا: یاد کر (شاید کوئی نیک عمل یاد آ جائے)۔ کہنے لگا: میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا' میں نے اپنے ملازموں کو تاکید کر رکھی تھی کہ تنگ دست کو مہلت دیا کرو اور آسودہ حال سے نرم برتاؤ کیا کرو۔ پھر آپؐ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کی طرف سے آواز آئی: (اے فرشتو!) تم بھی میرے بندے سے درگزر کرو''۔(۲۵)

دیکھیے قرض معاف تو نہیں کیا جا رہا' بلکہ تنگ دست سے سختی کے ساتھ تقاضا نہ کرنے اور کچھ مہلت دینے سے اللہ تعالیٰ نے بخشش کا فیصلہ فرما دیا۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس آدمی کا کسی دوسرے آدمی پر کوئی حق (قرضہ وغیرہ) واجب الادا ہو اور وہ اس مقروض کو ادا کرنے کے لیے مہلت دے تو اس کو ہر دن کے عوض صدقہ کا ثواب ملے گا۔''(۲٦)

چونکہ اللہ تعالیٰ کو اپنی مخلوق کے ساتھ بہت محبت ہے' لہٰذا جو شخص اُس کے بندوں کے

ساتھ اچھا سلوک کرتا ہے اُس پر وہ خوش ہوتا ہے۔ خدمت خلق کے ضمن میں چھوٹے چھوٹے کاموں پر اللہ تعالیٰ بڑے بڑے اجر عطا کرتا ہے۔ کسی بھوکے کو کھانا کھلانا' یا کسی تنگ دست کو لباس مہیا کرنا اللہ کی خوشنودی کے کام ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ نَفَّسَ عَنْ مُؤْمِنٍ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ الدُّنْيَا نَفَّسَ اللّٰهُ عَنْهُ كُرْبَةً مِنْ كُرَبِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ' وَمَنْ يَسَّرَ عَلٰى مُعْسِرٍ يَسَّرَ اللّٰهُ عَلَيْهِ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ' وَمَنْ سَتَرَ مُسْلِمًا سَتَرَهُ اللّٰهُ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ)) (۲۷)

''جس نے کسی شخص سے دنیا کے دکھوں میں سے ایک دُکھ دور کیا اللہ تعالیٰ قیامت کے دکھوں میں سے ایک دکھ اُس شخص سے دور کر دے گا' اور جس نے تنگ حال شخص پر آسانی کی تو اللہ تعالیٰ اس پر دنیا اور آخرت میں آسانی فرما دے گا' اور جس شخص نے کسی مسلمان (کے عیب) پر پردہ ڈالا تو اللہ تعالیٰ دنیا اور آخرت میں اس کی پردہ پوشی فرمائے گا''۔

مسواک کرنا

مسواک کرنا کوئی مشکل کام نہیں۔ نہ اس میں جسمانی مشقت ہے اور نہ کوئی پیسہ خرچ ہوتا ہے' بلکہ اس عمل سے دانت مضبوط ہوتے ہیں' منہ میں تعفن پیدا نہیں ہوتا اور انسان کئی بیماریوں سے محفوظ رہتا ہے۔ مگر اس معمولی سے کام کا اجر دیکھ کر انسان حیران رہ جاتا ہے۔ نماز کے لیے وضو شرط ہے اور وضو کے موقع پر مسواک کی تاکید کی گئی ہے۔ اگرچہ مسواک کے بغیر بھی وضو ہو جاتا ہے' مگر مسواک کر کے جو وضو کیا جائے گا اُس وضو کے ساتھ پڑھی جانے والی نماز کا مرتبہ بہت بڑھ جاتا ہے۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''وہ نماز جس کے لیے مسواک کی جائے اس نماز کے مقابلہ میں ستر گنا فضیلت رکھتی ہے جو بلا مسواک پڑھی جائے''۔(۲۸)

عربی محاورے میں ستر کا لفظ کثرت کے لیے بولا جاتا ہے۔ لیکن یہ بھی بعید نہیں کہ اس حدیث میں سبعین کا لفظ ستر ہی کے معنوں میں ہو۔ تو اگر بندہ ہر نماز کے ساتھ تازہ وضو کرے اور مسواک بھی کرے تو اس طرح ایک دن میں پڑھی جانے والی پانچ نمازیں اجر کے اعتبار سے ۳۵۰ نمازوں کے برابر شمار کی جائیں گی۔ اللہ کی رحمت تو بے حد وسیع

ہے وہ چاہے تو اس سے بھی زیادہ اجر وثواب عطا فرمادے۔ رسول اللہ ﷺ کثرت سے مسواک استعمال کرتے۔ دن یا رات میں جب بھی آپؐ سوتے تو اٹھنے کے بعد وضو کرنے سے پہلے مسواک ضرور فرماتے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ لَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ لَاَمَرْتُھُمْ بِالسِّوَاکِ عِنْدَ کُلِّ صَلَاۃٍ)) (۲۹)

''اگر مجھے یہ احساس نہ ہوتا کہ میری اُمت پر بہت مشقت پڑ جائے گی تو میں ہر نماز کے وقت انہیں مسواک کا حتمی حکم دے دیتا۔''

فوت شدگان کے لیے استغفار

موت ایک اٹل حقیقت ہے۔ ہر شخص کو دار العمل سے دار البقاء کی طرف کوچ کرنا ہے۔ وہاں اپنے اعزہ واقارب' دوست واحباب کچھ کام نہ آئیں گے' بلکہ صرف اعمال کی بابت پوچھا جائے گا۔ جو شخص وفات پا جاتا ہے اب اُس کا کوئی اختیار نہیں ہوتا کہ وہ کسی طور سے اپنے نامۂ اعمال میں نیکیوں کا اضافہ کر سکے۔ مگر زندہ لوگ مرنے والوں کے حق میں دعائے مغفرت کر کے انہیں نفع پہنچا سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے خود قرآن مجید میں والدین اور جملہ مسلمانوں کے لیے ان الفاظ میں دُعا سکھائی ہے: ﴿رَبَّنَا اغْفِرْلِیْ وَلِوَالِدَیَّ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ یَوْمَ یَقُوْمُ الْحِسَابُ﴾ (ابراھیم) ''اے ربّ ہمارے! بخش دیجیو گناہ میرے' میرے والدین کے اور تمام مؤمنوں کے جس دن حساب کتاب قائم ہوگا''۔ صاف ظاہر ہے جب یہ دعا خود پروردگار نے سکھائی ہے تو لازماً یہ نتیجہ خیز ہوگی اور فوت شدگان کے حق میں گناہوں کی معافی کا سبب بنے گی۔ مگر رحمت حق کا اندازہ لگائیے کہ دعائے مغفرت کرنے والا اس معمولی سے کام پر کتنا بڑا اجر پاتا ہے۔ معجم کبیر طبرانی میں حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جو بندہ عام ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگے گا اس کے لیے ہر مؤمن مرد اور عورت کے بدلے ایک ایک نیکی لکھی جائے گی''۔ (۳۰)

کلماتِ استغفار کی فضیلت دیکھئے کہ جس کے حق میں استغفار کیا جائے اُسے بھی

گراں قدر فائدہ پہنچتا ہے اور استغفار کرنے والا بھی بے شمار نیکیاں حاصل کر لیتا ہے۔

شہادت کا ثواب

شہید فی سبیل اللہ کے مقام و مرتبہ سے کون واقف نہیں! شہید فی سبیل اللہ وہ ہے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتا ہوا مارا جائے۔ مقتول فی سبیل اللہ کی فضیلت قرآن و حدیث میں واضح کی گئی ہے۔ شہید کے سارے گناہ بخش دیے جاتے ہیں سوائے قرض کے۔ اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت ہے کہ وہ اپنے فضل و کرم سے بہت سے چھوٹے چھوٹے اعمال پر شہادت کا اجر و ثواب عطا فرماتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ اپنے وطن سے دُور حالتِ سفر کی موت بھی شہادت ہے۔ (۳۱)

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (ایک روز صحابہؓ کو مخاطب کر کے) فرمایا:

> ''تم لوگ اپنے میں کس کو ''شہید'' شمار کرتے ہو؟'' انہوں نے عرض کیا کہ (ہمارے نزدیک تو) جو بندہ راہِ خدا میں قتل کیا گیا وہی شہید ہے...... آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اس صورت میں تو میری اُمت کے شہداء تھوڑے ہی ہوں گے...... (سنو!) جو بندہ راہِ خدا میں قتل کیا گیا وہ شہید ہے' اور جس بندے کا انتقال راہِ خدا میں ہوا (یعنی جہاد کے سفر میں جس کو موت آ گئی) وہ بھی شہید ہے' اور جس بندے کا طاعون میں انتقال ہوا وہ بھی شہید ہے' اور جس بندے کا پیٹ کے مرض میں مبتلا ہو کر انتقال ہوا (جیسے کہ ہیضہ' تخمہ' اسہال' استسقاء وغیرہ) وہ بھی شہید ہے''۔ (۳۲)

اگرچہ موت کی یہ کیفیات انسان کے اپنے بس میں نہیں مگر اس طرح کی حادثاتی اموات پر شہادت کا اجر و ثواب اللہ تعالیٰ کی بے پایاں رحمت کا مظہر ہے جس میں ذرا بھی تعجب نہیں۔

حواشی

(۱) استعظام الصغائر' از مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی۔

(۲) رواہ البیھقی فی شعب الایمان۔

(۳) مسند احمد و جامع الترمذی۔

(٤) سنن الترمذی' کتاب البر والصلة عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی رحمة الیتیم وکفالته۔
(٥) رواه ابن عباس رضی اللّٰہ تعالیٰ عنهما مرفوعاً' تاریخ مکة' ص ٥۔
(٦) استعظام الصغائر' ص۲۷' از مولانا محمد موسیٰ روحانی بازی۔
(٧) رواه البیهقی۔
(٨) رواه مالك والبیهقی فی شعب الایمان۔ ومشکوٰة' ج۲' باب السلام۔
(٩) جامع الترمذی و ابوداوٗد' بحواله معارف الحدیث' ج۳۔
(١٠) سنن الترمذی' کتاب الصوم عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی فضل الصائم اذا اکل عنده۔
(١١) سنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللهﷺ' باب فی دعاء النبی ﷺ۔
(١٢) سنن الترمذی' کتاب الدعوات عن رسول اللهﷺ' باب فی دعاء النبیﷺ۔
(١٣) صحیح مسلم' کتاب الاشربة' باب استحباب لقی الاصابع والقصعة واکل اللقمة الساقطة۔
(١٤) سنن الترمذی' کتاب الاطعمة عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی اللقمة تسقط۔ وسنن ابن ماجه' کتاب الاطعمة' باب تنقیة الصحفة۔ ومسند احمد۔
(١٥) صحیح مسلم' کتاب الاشربة' باب استحباب لعق الاصابع والقصعة واکل اللقمة والساقطة۔
(١٦) سنن ابن ماجه' کتاب ما جاء فی الجنائز' باب ما جاء فی ثواب من عاد مریضاً۔
(١٧) سنن ابی داوٗد' کتاب الجنائز' باب فی فضل العیادة علی وضوء۔
(١٨) صحیح مسلم' کتاب الجنائز' باب فضل الصلاة علی الجنازة واتباعها۔
(١٩) رواه الطبرانی فی الکبیر والاوسط کذا فی الترغیب والترهیب۔
(٢٠) معارف الحدیث' جلد۳' ص ۲۳۵۔
(٢١) صحیح البخاری' کتاب الاذان' باب فضل التهجیر الی الظهر۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارة' باب بیان الشهداء۔
(٢٢) سنن الترمذی' کتاب فضائل القرآن عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فیمن قرأ حرفا من القرآن ماله من الاجر۔
(٢٣) سنن الترمذی' کتاب الصوم عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی فضل من فطر صائما۔
(٢٤) طبرانی و ابن حبان۔ (٢٥) معارف الحدیث' ج۷' ص ٤٩٣۔
(٢٦) معارف الحدیث' ج۷' ص ٤٩٥۔
(٢٧) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبة والاستغفار' باب فضل الاجتماع علی تلاوة القرآن وعلی الذکر۔
(٢٨) شعب الایمان للبیهقی۔
(٢٩) صحیح البخاری' کتاب الجمعة' باب السواك یوم الجمعة۔ وسنن الترمذی' کتاب الطهارة عن رسول اللهﷺ' باب ما جاء فی السواك۔
(٣٠) معارف الحدیث' ج٥' ص ۲۰٦۔ (٣١) سنن ابن ماجه۔
(٣٢) صحیح مسلم' کتاب الامارة' باب بیان الشهداء۔

تلبیسِ ابلیس یعنی ابلیس کی چالیں

انسان فطرتاً کمزور پیدا کیا گیا ہے چنانچہ ہر انسان میں فطری کمزوریاں پائی جاتی ہیں۔ انسان کا امتحان یہ ہے کہ آیا وہ ان کمزوریوں کا شکار (victim) بن جاتا ہے یا اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی صلاحیتوں کو بروئے کار لاتے ہوئے ان فطری کمزوریوں پر قابو پانے کی کوشش کرتا ہے۔ مال اور اولاد کی محبت' حرص و ہوا' حبِ جاہ' غصہ' جلد بازی' سہل پسندی' برتری کی خواہش اور دوسروں پر حاکم بننے کی تمنا' یہ وہ کمزوریاں ہیں جو ہر انسان میں موجود ہیں۔ کامیاب انسان وہ ہے جو اِن کمزوریوں کو اپنے مزاج کا حصہ نہ بنالے بلکہ اسلامی تعلیمات کی حدود کے اندر اندر رہتے ہوئے ان پر کنٹرول کرے۔ شیطان جو انسان کا ازلی دشمن ہے' اُس کی ہر وقت یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ بندے کی ان کمزوریوں سے فائدہ اٹھائے' اسے گمراہ کرے اور ناکام بنادے۔ پس ہر شخص کے لیے لازم ہے کہ وہ چوکنا اور ہوشیار رہے' شیطان کے حملوں سے خبردار رہے۔ یاد رہے کہ کوئی چھوٹا' بڑا' نمازی' پرہیز گار' صالح' متقی' عام مسلمان' عابد' زاہد' عالم' فاضل' پیر' مرید' امام اور مقتدی وغیرہ کوئی بھی شیطان کے حملوں سے محفوظ نہیں۔ اُس نے صاحبِ کرامت اولیاء پر بھی حملے کیے جن میں سے بالآخر کچھ کو ہلاکت میں ڈالنے میں کامیاب بھی ہوگیا' جس کی ایک مثال بنی اسرائیل کا ایک مستجاب الدعوات صالح شخص بلعم بن باعوراء ہے جسے شیطان اغوا کرنے میں کامیاب ہوگیا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام جب اپنے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام کو اللہ کے حکم کے مطابق ذبح کرنے کے لیے لے کر چلے تو انہیں بھی شیطان نے بہکانے کی کوشش کی اور کہا: اس خیال پر عمل کرنے سے رک جاؤ! کیا کبھی کسی انسان نے اپنے بیٹے کو بھی ذبح کیا ہے؟ ایسے ہی ابوالبشر حضرت آدم علیہ السلام کو جنت سے نکالنے میں شیطان کی شیطنت کا قصہ تو

قرآن مجید میں متعدد مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ اُس نے آدمؑ کو سبز باغ دکھائے' جھوٹے وعدے کیے' قسمیں کھائیں اور انہیں شجرِ ممنوعہ کا پھل کھانے پر آمادہ کر لیا۔ حضرت یوسفؑ کا قول قرآن مجید میں نقل ہوا ہے کہ: ﴿وَمَا اُبَرِّئُ نَفۡسِیۡ ۚ اِنَّ النَّفۡسَ لَاَمَّارَۃٌۢ بِالسُّوۡٓءِ ......﴾ (یوسف:۵۳) ''اور میں اپنے نفس کو بری قرار نہیں دیتا' یقیناً نفس تو برائی پر بہت اُبھارنے والا ہے......''

اسی حقیقت کو بیان کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنۡکُمۡ مِنۡ اَحَدٍ اِلَّا وَقَدۡ وُکِّلَ بِہٖ قَرِیۡنُہٗ مِنَ الۡجِنِّ)) قَالُوۡا وَاِیَّاکَ یَارَسُوۡلَ اللّٰہِ؟ قَالَ :((وَاِیَّایَ اِلَّا اَنَّ اللّٰہَ اَعَانَنِیۡ عَلَیۡہِ فَاَسۡلَمَ فَلَا یَاۡمُرُنِیۡ اِلَّا بِخَیۡرٍ)) (۱)

''تم میں سے ہر ایک کے ساتھ ایک شیطان مقرر کیا گیا ہے''۔ صحابہؓ نے کہا: اور آپ کے ساتھ بھی یارسول اللہ ﷺ! آپؐ نے فرمایا: ''ہاں' مگر میں نے اللہ کی مدد سے اسے مسلمان کر لیا ہے' چنانچہ وہ مجھے بس نیکی ہی کا مشورہ دیتا ہے''۔

قرآن مجید میں شیطان کو اَلۡغَرُوۡر (بڑا دھوکے باز) کہا گیا ہے۔ اس کا ورغلانا اتنا سادہ نہیں کہ وہ کسی نمازی کو نماز چھوڑنے کا حکم دے یا بُت کو سجدہ کرنے کو کہے۔ اس کا حملہ عام طور پر بڑا باریک' لطیف اور خفیہ ہوتا ہے۔ نیکی کے کام کی مشقت اٹھانے والوں کو وہ یوں فریب دیتا ہے کہ اللہ بڑا غفور ورحیم ہے' اُس کی شانِ غفاریت پر پورا بھروسہ کرو' رات جاگ کر عبادت کرنے اور سردیوں میں صبح صبح ٹھنڈے پانی کے ساتھ وضو کرنے کی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں' اُس کو بھلا تمہاری عبادت کی کیا ضرورت ہے! چنانچہ انسان نفسانی خواہش کی اتباع میں شیطان کے وسوسے کا شکار ہو جاتا ہے۔ سورۂ فاطر میں ہے:

﴿یٰۤاَیُّہَا النَّاسُ اِنَّ وَعۡدَ اللّٰہِ حَقٌّ فَلَا تَغُرَّنَّکُمُ الۡحَیٰوۃُ الدُّنۡیَا ٝ وَلَا یَغُرَّنَّکُمۡ بِاللّٰہِ الۡغَرُوۡرُ ﴿۵﴾ اِنَّ الشَّیۡطٰنَ لَکُمۡ عَدُوٌّ فَاتَّخِذُوۡہُ عَدُوًّا ؕ﴾ (آیات ۵'۶)

''اے لوگو! یقیناً اللہ کا وعدہ سچا ہے' پس تمہیں دنیا کی زندگی دھوکے میں نہ ڈالے

اور نہ ہی اللہ تعالیٰ کے معاملے میں تمہیں بڑا دھوکے باز (شیطان) دھوکے میں ڈالے۔ بے شک شیطان تمہارا دشمن ہے' پس اس کو دشمن ہی سمجھو''۔

شیطان ماہر دھوکے باز ہے۔ وہ اس طرح دھوکہ دیتا ہے کہ آدمی کو بالکل احساس ہی نہیں ہوتا کہ وہ دھوکہ کھا رہا ہے۔ شیطان ہمدرد اور خیر خواہ بن کر دھوکہ دیتا ہے۔ وہ شر کے اندر خیر دکھاتا ہے۔ وہ دولت مند کو فی سبیل اللہ خرچ کرنے سے روکتا ہے اور سمجھاتا ہے کہ ابھی تمہاری مکان بنانے' اولاد کی شادیاں کرنے اور گاڑی خریدنے جیسی ضروریات ہیں۔ اگر یہ سب کچھ پہلے ہی سے میسر ہو تو بھی وہ دھوکہ دیتا ہے کہ یہ غریب لوگ خود محنت کیوں نہیں کرتے؟ خود محنت کریں اور کمائیں' جیسا کہ ہم نے محنت کی اور اتنی دولت اکٹھی کر لی' اگر یہ محنت نہیں کرتے تو ان کو بھوک پیاس برداشت کرنی چاہیے۔ شیطان کہتا ہے کہ یہ تمہارا محنت سے کمایا ہوا روپیہ ہے' زکوٰۃ دو گے تو ایک لاکھ میں سے اڑھائی ہزار چلے جائیں گے اور پھر لاکھ پورا نہیں رہے گا۔

نفس کے لالچ سے بچنا تو واقعی بڑی ہمت کا کام ہے۔ نوجوانوں کو شیطان موت کے لفظ سے وحشت دلاتا ہے۔ انہیں مطمئن کرتا ہے کہ یہ وقت تو عیش و عشرت کا ہے' ابھی سے تفکرات میں گھر جانا عقل مندی نہیں ہے' جیسے دل چاہے کرو' دوستوں میں بیٹھ کر دادِ عیش دو' اچھا کھاؤ' اچھا پہنو۔ رہا نماز روزہ تو یہ بزرگوں کے کرنے کے کام ہیں' جب بڑی عمر کے ہو جاؤ گے تو نماز روزہ کر لینا' ابھی تو بڑی زندگی پڑی ہے۔ شیطان موت کے تصور کو اُن سے دُور رکھتا ہے۔ یوں نوجوان بھولے سے بھی موت کو یاد نہیں کرتا۔ زبان سے تو سبھی کہتے ہیں کہ ایک دن موت کا ذائقہ چکھنا ہے' مگر اپنی موت کے وقت کو ہر کوئی دُور سمجھتا ہے۔

ایسے ہی درازیٔ عمر کی تمنا بوڑھوں کو نوجوانوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ شیطان اس انسانی کمزوری سے خوب فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ کہتا ہے اگرچہ تم بوڑھے ہو چکے ہو' اعضاء کمزور ہو گئے ہیں' مگر ابھی تو تم سے بڑی عمر کے لوگ بھی زندہ ہیں۔ تمہاری موت تو بہت دُور ہے۔ بوڑھے لوگ شیطان کے اس فریب میں آ کر توبہ کی طرف نہیں آتے۔ چہرے

پر داڑھی سجانا انبیاء کرام علیہم السلام کا طریقہ رہا ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور آپ ؐ کا حکم ہے' لیکن کتنے ہی بوڑھے ایسے ہیں کہ سفید بالوں والی داڑھی کو چہرے پر ظاہر نہیں ہونے دیتے' حالانکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ سفید بالوں کو سزا دیتے ہوئے اللہ تعالیٰ کو حیا آتی ہے' یعنی یہ سفید بال بھی نجات کا باعث بن سکتے ہیں' مگر دھوکے باز شیطان کا فریب ایسا ہے کہ نجات کا یہ راستہ بھی بند کرا دیتا ہے۔ عمر کے ساتھ ساتھ خواہشات کم ہونے کے بجائے زیادہ ہوتی جاتی ہیں۔ شیطان لمبی عمر کی اُمید دلا کر بوڑھوں کو معمول کی مصروفیات میں الجھائے رکھتا ہے۔ وہ صدقہ و خیرات اور نیکی کے دوسرے کاموں کو آنے والے وقت پر ٹالتے جاتے ہیں اور نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ انہیں نیکی کرنے کی توفیق میسر نہیں آتی اور عزرائیل اچانک آ دھمکتا ہے' اُس وقت حسرت و یاس کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا اور شیطان اپنی کارگزاری پر پھولا نہیں سماتا۔

جس طرح شیطان امیروں اور دولت مندوں کو دولت کی نمائش کے نت نئے طریقے سکھاتا ہے اسی طرح غریبوں کو بھی الٹی پٹیاں پڑھاتا ہے۔ انہیں کہتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کے پاس ڈھیروں دولت ہے جو انہوں نے غریبوں کا خون نچوڑ کر یا دیگر حرام ذرائع سے حاصل کی ہے۔ ان کی دولت کو ہر طرح سے لوٹنا جائز ہے۔ چنانچہ غریب اس فریب میں آ کر ڈاکے ڈالتے' چوریاں کرتے اور قتل و غارت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ شیطان امیروں کو اسراف و تبذیر کی ترغیب دیتا ہے اور اس کے بسبب غریبوں میں امیروں کے خلاف حسد کے جذبات پروان چڑھاتا اور نفرت پیدا کرتا ہے۔ اس طرح وہ دشمنی کے جذبات کے زیر اثر دولت مندوں کے نقصان پر خوش ہوتے ہیں' بلکہ انہیں نقصان پہنچا کر اطمینان محسوس کرتے ہیں' حالانکہ کسی دولت مند کی دولت چھیننا تو کسی طور بھی جائز نہیں۔

شیطان عالموں' واعظوں اور خطیبوں کو بھی راہِ راست سے ہٹانے سے نہیں چوکتا۔ وہ دوسروں کو وعظ و نصیحت کرنے کو کافی سمجھتے ہیں' اس طرح بزعمِ خویش وہ بہت زیادہ ثواب اکٹھا کرتے ہیں' مگر اپنے نفس کی اصلاح کی طرف سے انہیں شیطان دُور رکھتا

ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿اَتَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ اَنْفُسَكُمْ﴾ (البقرۃ:۴۴) ''کیا تم لوگوں کو نیکی کا حکم دیتے ہو اور اپنے آپ کو بھول جاتے ہو؟'' چنانچہ اکثر واعظ اور خطیب بے عملی بلکہ بدعملی کا شکار ہو جاتے ہیں۔ لوگ اُن کے علم و فضل اور خطبہ و وعظ اور حسنِ صوت سے متأثر ہو کر اُن کے عقیدت مند ہو جاتے ہیں اور ادب و احترام بجا لاتے ہیں' جس سے اُن کے اندر رعونت اور تکبر پیدا ہو جاتا ہے اور وہ اپنے آپ کو واقعی دوسروں سے برتر سمجھنے لگتے ہیں۔ اس طرح شیطان کا حملہ علماء' فضلاء اور مذہبی راہنماؤں پر بھی کارگر ثابت ہوتا ہے' جبکہ وہ اپنے آپ کو شیطان کے حملوں سے محفوظ سمجھ رہے ہوتے ہیں۔

عام مسلمانوں کو گمراہ کرنا تو شیطان کا بائیں ہاتھ کا کام ہے' وہ بڑی آسانی سے انہیں مشرکانہ کاموں اور بدعات میں ملوث کر لیتا ہے۔ نیک لوگ اور بزرگ فوت ہو جائیں تو اُن کی قبریں پختہ بنانے کو عقیدت اور احترام کی علامت بتاتا ہے۔ حالانکہ رسول اللہ ﷺ نے سختی کے ساتھ اس عمل سے روکا ہے اور خود آپ ﷺ کا اُسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے کہ آپؐ کی تین بیٹیاں آپؐ کے سامنے فوت ہوئیں' آپؐ نے اُن کا کفن دفن کیا مگر کسی کی قبر پختہ نہیں بنائی' بلکہ آپؐ نے حیاتِ دُنیوی کے آخری لمحات میں جو اہم باتیں تاکیداً ارشاد فرمائیں اُن میں ایک یہ بھی تھی کہ:

((لَعَنَ اللّٰهُ الْيَهُوْدَ وَالنَّصَارٰى اتَّخَذُوْا قُبُوْرَ اَنْبِيَائِهِمْ مَسْجِدًا)) (۲)

''اللہ کی لعنت ہو یہود و نصاریٰ پر کہ انہوں نے اپنے انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنالیا۔''

جب انبیاء کی قبروں کو سجدہ گاہ بنانے کی تاکیدی ممانعت ہے تو اولیاء اللہ اور صلحائے اُمت کی قبروں پر سجدے کی اجازت کیسے ہو سکتی ہے؟ مگر شیطان ہے کہ وہ کلمہ گو مسلمانوں کو فریب دینے میں کامیاب ہو جاتا ہے' اور وہ گروہ در گروہ مزاروں پر حاضری دیتے' دعائیں مانگتے' حاجتیں طلب کرتے' قبروں کو بوسہ دیتے' چادریں چڑھاتے' غسل دیتے اور سجدہ کرتے ہیں۔ واقعی شیطان کا فریب بڑا کاری ہے' اس لیے کہ وہ

سب سے بڑا دھوکے باز ہے۔

بدعات کو رواج دینا شیطان کا دل پسند اور مؤثر ترین ہتھیار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے بدعات سے سختی سے منع کرتے ہوئے فرمایا ہے: ((كُلُّ بِدْعَةٍ ضَلَالَةٌ)) ''ہر بدعت گمراہی ہے''۔ یہ ہدایت بڑی اہم ہے' کیونکہ دین تو مکمل ہو چکا ہے' اس میں کسی اضافے کی گنجائش پیدا کر لینا دین کو نامکمل سمجھنا ہے۔ ایک عید میلاد ہی کو لیجیے۔ اسلام میں تو صرف دو عیدیں ہیں' جن کے پروگرام ہمیں بتا دیے گئے ہیں۔ شیطان نے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ محبت کا آسان طریقہ ایجاد کر کے مسلمانوں میں رائج کر دیا ہے' حالانکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو رسول اللہ ﷺ سے سچی اور حقیقی محبت تھی۔ وہ آپؐ کی ہر سنت کو اپنانے والے تھے' مگر نہ تو رسول اللہ ﷺ نے اور نہ ہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے یہ عید منائی' مگر شیطان ہے کہ اس کو تیسری عید کے طور پر رائج کرنے میں کامیاب ہو گیا ہے۔ چونکہ اس عید کا پروگرام رسول اللہ ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول نہیں ہے لہٰذا ہر کوئی اپنے ہی طریقے سے اسے منا رہا ہے۔ کوئی مصنوعی پہاڑیاں بنا رہا ہے' کوئی جلوس نکال رہا ہے' کوئی موسیقی کی دھنوں پر نعتیں گا رہا ہے اور کوئی میلاد کا جلسہ منعقد کر کے اس عید کو قرآن سے ثابت کرنے کی بے سود کوشش کر رہا ہے۔ بے سود اِس لیے کہ اگر یہ عید قرآن سے ثابت ہو تو ماننا پڑے گا کہ خود رسول اللہ ﷺ نے اور پھر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے قرآن کی کچھ آیات پر عمل نہیں کیا' اور یہ محال ہے۔ اسی طرح دیگر بہت سی بدعات ہیں جن کو رواج دے کر شیطان نے اکثر مسلمانوں کو گمراہی کے تاریک غار میں دھکیل دیا ہے۔

شرک ایسا عمل ہے کہ آخرت میں اس کی بخشش نہیں۔ شرک کرنے والے کے تمام اعمال ضائع چلے جاتے ہیں' کیونکہ شرک بخشش کی راہ میں کافی رکاوٹ ہے۔ ارشاد ہے:

﴿إِنَّ اللّٰهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُّشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُوْنَ ذٰلِكَ لِمَنْ يَّشَآءُ ۚ﴾

(النّساء:٤٨و١١٦)

''یقیناً اللہ تعالیٰ معاف نہیں کرے گا کہ اُس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے' البتہ اس کے ماسوا (گناہ) جس کے لیے چاہے گا بخش دے گا''۔

اس بات کا شیطان کو بھی علم ہے۔ وہ جانتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مشرک کے لیے جہنم تیار کر رکھی ہے' لہٰذا شیطان کی یہ خواہش ہے کہ لوگوں سے شرک کا ارتکاب کرا کر انہیں اپنی پارٹی (حزب الشیطان) کا ایک فرد بنا لے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ کلمہ گو تو مشرک نہیں ہوسکتا' مگر ایسا نہیں ہے۔ کلمہ گو کو شرکیہ افعال کرنے کی کھلی چھٹی نہیں ہے۔ اللہ پر ایمان رکھنے والا بھی مشرک ہوسکتا ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے:

﴿وَمَا یُؤْمِنُ اَکْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ اِلَّا وَهُمْ مُّشْرِکُوْنَ﴾ (یوسف)

''اوران میں سے اکثر اللہ پر ایمان رکھنے کے باوجود مشرک ہیں''۔

مسلمانوں کو اس نا قابل بخشش گناہ سے دُور رہنے کی جتنی زیادہ ضرورت ہے اتنا ہی وہ شیطان کے فریب میں آ کر اس کا ارتکاب کر بیٹھتے ہیں۔ وہ اللہ کے سوا دوسروں سے استمداد کرتے' دعائیں مانگتے' ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے اور اُن کی رضا کے طالب ہوتے ہیں۔ اللہ کی صفات مخلوق میں تسلیم کرتے ہوئے کسی کو قادر' کسی کو عالم الغیب' کسی کو دستگیر' کسی کو داتا' کسی کو مشکل کشا اور کسی کو نفع و نقصان کا مالک مان لیتے ہیں' حالانکہ یہ ساری صفات خاص (exclusively) اللہ تعالیٰ کی ہیں۔ جب شیطان لوگوں سے شرکیہ اعمال کا ارتکاب کرا لیتا ہے تو اُس کی خوشی کی انتہا نہیں رہتی' کیونکہ وہ وعدۂ خداوندی کے مطابق ایسے شخص پر جنت کے دروازے بند کرانے میں کامیاب ہو جاتا ہے۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿اِنَّهٗ مَنْ یُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَیْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ النَّارُ﴾ (المائدۃ:۷۲) ''یقیناً جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا تو اللہ نے اُس پر جنت حرام کر دی ہے اور اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔

درود شریف پڑھنے کے بڑے فضائل ہیں۔ درود شریف کے الفاظ تھوڑے تھوڑے فرق کے ساتھ خود رسول اللہ ﷺ کی احادیث میں موجود ہیں۔ پھر ان میں سب سے زیادہ فضیلت والا درود دَرودِ ابراہیمی ہے جس کے الفاظ رسول اللہ ﷺ نے نماز میں شامل کر دیے ہیں۔ درود شریف کے وہ الفاظ جو رسول اللہ ﷺ نے اُمت کو سکھائے ہیں' بلاشبہ انتہائی خوبصورت اور افضل اور جامع ہیں' مگر شیطان نے یہاں بھی لوگوں کو

چلر دیا ہے۔ انہوں نے درود شریف کے نام سے خود بھی کچھ عبارتیں بنالی ہیں اور اُن کے خود ساختہ فضائل لوگوں کو بتائے ہیں۔ بھولے بھالے لوگ رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے الفاظ کو چھوڑ کر انسانوں کے بتائے ہوئے درود شریف پڑھ رہے ہیں' اُن بیچاروں کو یہ نہیں پتا کہ رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ کے مقابل کسی دوسرے کے الفاظ کی کوئی حیثیت نہیں۔ خود ساختہ درود شریف کو ہم نعت کہہ سکتے ہیں۔ اور اگر اس میں بھی مبالغہ آمیزی سے کام لیتے ہوئے شرکیہ الفاظ شامل ہو گئے تو وہ نعت بھی نہ رہی بلکہ ارتکابِ شرک کا موجب بن گئی۔ شیطان انسان کے ذہن سے یہ حقیقت آسانی سے مٹا دیتا ہے کہ جس طرح رسول اللہ ﷺ کا مقام تمام کائنات سے بلند ہے اسی طرح آپؐ کے بتائے ہوئے درود شریف کے الفاظ یا اَوراد و وظائف بھی انتہائی جامع اور افضل ہیں۔ اُن کے ہوتے ہوئے لوگوں کے خود ساختہ الفاظ اپنانا فریبِ نفس کے علاوہ کچھ نہیں۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ ہر انسان اپنا جائزہ لیتا رہے اور خیال رکھے کہ اس کا عمل اسوۂ رسول اور تعلیمِ رسول ﷺ کے مطابق ہو۔ کیونکہ اُمت کا ہر فرد بڑا ہو یا چھوٹا بالفاظِ قرآن اس بات کا پابند ہے کہ جو رسول اللہ ﷺ دیں وہ لے لے اور جس سے وہ روکیں اُس سے رک جائے۔ یہ حیثیت اُمت میں سے کسی اور کی نہیں۔

حواشی

(۱) صحیح مسلم' کتاب صفة القیامة والجنة والنار' باب تحریش الشیطان وبعثه سرایاه لفتنة الناس...... الخ۔

(۲) صحیح البخاری' کتاب الجنائز' باب ما یکره من اتخاذ المساجد علی القبور ۔ وصحیح مسلم' کتاب المساجد ومواضع الصلاة' باب النهی عن بناء المساجد علی القبور واتخاذ الصور۔

اسلامی اور غیر اسلامی تہوار

دنیا میں ہر مذہب و ملت کے اپنے اپنے تہوار ہیں جو مختلف یادگاروں کے طور پر منائے جاتے ہیں۔ اکثر و بیشتر یہ تہوار بہت زیادہ خوشی یا وفورِ غم کے واقعات کی یاد تازہ کرتے ہیں یا پھر عظیم شخصیتوں کی پیدائش و وفات کی یاد میں منائے جاتے ہیں۔

اسلام میں بھی چند تہوار منائے جاتے ہیں' مگر اسلامی اور غیر اسلامی تہواروں میں ایک اصولی فرق ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اس لیے تمام اسلامی احکام اور ضابطے حد درجہ اعتدال پر ہیں۔ خوشی اور غمی کے واقعات کی یاد منانا اسلامی تعلیمات کی روح کے منافی ہے' کیونکہ دنیا میں خوشی اور غمی' رنج و راحت دوش بدوش چلتے ہیں اور اس قدر عمومی چیز کی یاد منانا کوئی معنی نہیں رکھتا' کیونکہ اسلامی عقیدہ میں یہ بات بھی شامل ہے کہ تکلیف و آرام اللہ کی طرف سے ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں ہے:

﴿لِكَيْلَا تَأْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَا اٰتٰكُمْ﴾ (الحدید:۲۳)

''تا کہ تم رنجیدہ نہ ہو اُس چیز پر جو تم سے جاتی رہی اور نہ ہی اتراؤ اُس چیز پر جو تم کو عطا ہو۔''

یہی وجہ ہے کہ کسی کی وفات کی خبر سن کر جزع فزع یا گریہ و ماتم کرنے کی بجائے ''اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُوْنَ'' پڑھنے کی تلقین ہے جس میں اس بات کا اقرار ہے کہ آج اگر یہ شخص رخصت ہو رہا ہے تو کل ہمیں بھی اسی راہ سے گزرنا اور خدا کے حضور اپنے اعمال کی جواب دہی کرنا ہو گی۔

افراد خواہ کس قدر عظیم ہوں اسلام میں اُن کی پیدائش یا وفات کی یاد منانے کا حکم تو بڑی بات ہے جواز تک نہیں ہے۔ اسلام شخصیت پرستی کی جڑ کاٹتا ہے اور یہ بات عین فطری ہے۔ جو مذاہب و ملل اپنے اکابر کی یاد اُن کے ایامِ پیدائش و وفات منا کر تازہ

کرتے ہیں اُن کی تاریخ میں یقیناً چند لوگ ہی قابل ذکر ہوں گے اور اکثر و بیشتر اُن کا ماضی مشاہیر سے تہی ہوگا' مگر اسلام جیسے معتدل مزاج' عالمگیر اور فطری دین میں محال کاموں کے احکام کے لیے ہرگز گنجائش نہیں ہے۔

اسلام میں کم وبیش ایک لاکھ چوبیس ہزار تو انبیاء ورُسل ہی ہیں جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ یادمنانے کے قابل ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ طیبہ پر نگاہ ڈالیے۔ آپؐ کا اس دنیا میں ورودِ مسعود' نزول وحی کی ابتداء' ہجرت مدینہ' جنگ بدر میں کامیابی' جنگ اُحد' جنگ حنین' جنگ تبوک' فتح مکہ' دیگر بے شمار غزوات اور وفات' یہ واقعات ہیں کہ ان سے بڑھ کر اور کوئی واقعہ تاریخ عالم میں یادگار کے طور پر منانے کے قابل نہ ہوگا۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کے لاکھوں صحابہؓ اور کروڑوں کی تعداد میں شہداء' صالحین اور اولیاء اللہ اس قابل ہیں کہ ان کے دن منانے چاہئیں۔ اگر اسلام میں شخصی یادگاریں منانے کی اجازت ہوتو ایک مسلمان کی زندگی کا نہ صرف ہر دن بلکہ ہر دن میں ہر ساعت کسی نہ کسی عظیم شخصیت کی یادمنانے میں گزرے گی اور یہ بات انتہائی خلافِ عقل ہے کہ جس انسان کو دنیا میں حد درجہ مستعد زندگی گزارنے اور اسلام کا بول بالا کرنے کی جدوجہد کے لیے پیدا کیا گیا ہو اُس کے شب و روز دن منانے کی نذر کر دیے جائیں۔ اور اگر چند بزرگوں کے دن منائے جائیں تو دوسرے اکابرین سے بے انصافی ہوگی۔

قرونِ اولیٰ کی تاریخ شاہد ہے کہ اُس دور میں ایامِ پیدائش و وفات منانے کی کوئی نظیر نہیں ملتی۔ آج آنحضرت ﷺ کا یومِ پیدائش جو عید میلادالنبی کے نام سے رواج پا رہا ہے' آپ ﷺ کی ۲۳ سالہ نبوی زندگی اور خلافتِ راشدہ کے تیس سالوں میں کبھی اس طرح نہیں منایا گیا' بلکہ اس دور میں تو صرف دو عیدیں تھیں' عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ اور ان دونوں عیدوں کے احکام اور مسائل بھی اسلامی کتابوں میں ملتے ہیں مگر عید میلادالنبی کے نام سے کوئی تیسری عید اُس دور میں موجود نہ تھی۔ حالانکہ صحابہ کرامؓ' تابعین اور تبع تابعین کو جس قدر معرفت رسولؐ اور حبّ نبیؐ حاصل تھی آج کس کو حاصل ہے؟

اسلامی اور غیر اسلامی تہواروں میں ایک اور اصولی فرق ہے۔ غیر اسلامی تہوار

شخصیتوں کی یاد میں یا قومی اہمیت کے عظیم واقعات کی یاد میں منائے جاتے ہیں جبکہ اسلامی تہوار اصولوں کی فتح کی بنیاد پر منائے جاتے ہیں اور اُن کے تقرر کا اختیار بھی صرف مالکِ حقیقی کو ہے اور اس نے اپنے رسول ﷺ کی زبان سے وہ مسلمانوں کو بتا دیے ہیں۔ اسلامی تہوار عید الفطر' عید الاضحیٰ' رمضان شریف' اجتماع حج' شب قدر وغیرہم سب کی بنیاد اس نظریے پر ہے کہ اللہ تعالیٰ وحدہ لاشریک لہ ہی حاکم اعلیٰ ہے' اس کی رضا چاہنا ہی حقیقی خوشی ہے اور اُس کی اطاعت حقیقی فلاح ہے۔ رمضان شریف اللہ تعالیٰ کے حکم پر بھوک اور پیاس برداشت کرنے اور نفسانی خواہشات پر قابو پانے کی تربیت کا مہینہ ہے۔ جب مسلمان اس تربیت سے کامیاب و کامران گزر جاتے ہیں تو اگلے روز عید الفطر کا تہوار مناتے ہیں جس میں مزید دو رکعت نماز با جماعت ادا کر کے خدا کے سامنے سجدہ ریز ہوتے ہیں۔ حج اسلام کا رکن ہے۔ عرفہ کا دن بڑی فضیلت کا حامل ہے جب سرزمین بیت اللہ پر ہر طرف اللہ اکبر کی صدائیں گونجتی ہیں۔ سعادت مند لوگ حج کرتے ہیں اور اگلے دن عید الاضحیٰ کے موقع پر عالمِ اسلام میں کروڑوں جانور اللہ کے نام پر ذبح کیے جاتے ہیں اور دو رکعت نماز با جماعت ادا کر کے خالق دو جہاں کی کبریائی کا اظہار کیا جاتا ہے۔ باقی تمام اسلامی تہوار بھی اسی قبیل سے ہیں' کیونکہ ان ایام میں بھی رسول اللہ ﷺ نے کئی مخصوص دعائیں اور نمازیں اُمت کو سکھائیں۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے خلیل اللہ کے لقب سے نوازا۔ ان کے امتحانات اور کامیابیوں کا ذکر قرآن پاک میں جابجا موجود ہے جس سے ان کی فضیلت عیاں ہے۔ مگر ان کی' اُن کے فرزند ارجمند حضرت اسماعیل ذبیح اللہ کی یا ان کی زوجہ محترمہ کی پیدائش اور وفات کے دنوں کو کبھی نہ منایا گیا اور نہ منانے کا حکم دیا گیا۔ ہاں ان کے اعمال میں جو چیزیں مقاصد دین سے متعلق تھیں' ان کی یادگاروں کو نہ صرف محفوظ رکھا گیا بلکہ آنے والی نسلوں کے لیے فرض و واجب کا درجہ دے کر ان کو مذہب کا جزو قرار دے دیا گیا۔ قربانی' ختنہ' سعی' رمی' طواف انہی بزرگوں کے ایسے افعال کی یادگار ہیں جو انہوں نے اپنے نفسانی جذبات اور طبعی تقاضوں پر ضبط کر کے محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی

کے لیے کیے اور جن میں ہر دور کے لوگوں کے لیے عبرت ہے کہ انسانوں کو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اپنی محبوب ترین شے کی قربانی سے بھی دریغ نہیں کرنا چاہیے۔ آج مسلمانوں نے جہاں دوسرے بے شمار اصولِ دین سے بے توجہی اختیار کی ہے اسی طرح دوسری اقوام کی دیکھا دیکھی انہی کی طرز پر نئے تہوار ایجاد کر لیے ہیں۔ عیسائیوں نے حضرت مسیحؑ کے یوم پیدائش کو عید منائی تو ان کی تقلید میں کچھ مسلمانوں نے ختم المرسلین کی پیدائش کے دن کو عید میلاد النبی کا نام دے کر ایک نیا تہوار ایجاد کر لیا۔

آنحضرت ﷺ کے یومِ پیدائش کو عید میلاد النبی کا نام دینے اور خوشی منانے میں ایک اور امر بھی مانع ہے' اور وہ یہ کہ تاریخی طور پر ثابت ہے کہ آپؐ کی پیدائش کا دن اور مہینہ ہی آپؐ کی وفات کا دن اور مہینہ ہے۔ پیدائش پر خوشی کا اظہار بجا مگر رحمۃٌ للعالمینؐ کی وفات کا صدمہ کیا کچھ کم ہے کہ جہاں عمر فاروق رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی بھی جذباتِ غم پر قابو نہ رکھ سکے۔ معلوم ہوا کہ قدرت کی طرف سے بھی تاریخ پیدائش اور وفات کو جمع کر کے خوشی اور غمی کو متوازن کر دیا گیا ہے۔ اب اگر کوئی مسلمان اس دن خوشی منانے کا اہتمام کرتا ہے تو وہ آپؐ کی وفات کا سوگ کب منائے گا؟ اور اگر وفات کے دن سوگ منانے کا اہتمام کرتا ہے تو وہ پیدائش کی خوشی کب منائے گا؟ جبکہ آپؐ کی پیدائش کا دن ہی وفات کا دن ہے۔

مسلمانوں کو عبرت پکڑنی چاہیے کہ جس چیز کی کوئی اصل خیر القرون میں نہ ہو اسے بطور خود ایجاد کر کے شریعت میں داخل کرنا کتنی بڑی جسارت ہے' جبکہ اللہ تعالیٰ نے خود دین اسلام کو اتمام اور کمال کے درجہ پر پہنچا دیا۔ اَکْمَلْتُ اور اَتْمَمْتُ کے الفاظ ہی اس بات پر دلیل قاطع ہیں کہ اسلام اپنے جملہ اجزاء کے ساتھ مکمل ہو چکا ہے اور اب کوئی جزو ایسا نہیں ہے کہ جس میں خیر کا پہلو موجود ہو اور وہ پہلے سے اسلام میں داخل نہ ہو۔ بندے کو یہ بات ہرگز زیب نہیں دیتی کہ وہ آقا کا قلمدان لے کر بیٹھ جائے۔ وَمَا عَلَیْنَا اِلَّا الْبَلَاغُ!

تعزیت کا اسلامی طریقہ

ہندو اور مسلمان سینکڑوں سال تک برصغیر میں اکٹھے رہتے رہے۔ چنانچہ مذہبی اختلاف کے باوجود ایک دوسرے کے سماجی طور طریقوں سے متاثر ہوئے۔ آج ہم یہاں کے مسلمانوں کو دیکھتے ہیں تو اُن میں ایسے ایسے رسم و رواج ملتے ہیں جن کا اسلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں' بلکہ اسلامی لٹریچر میں جن چیزوں کا وجود نہیں وہ نہایت شدّ ومدّ کے ساتھ رائج ہیں۔ یہ رسم و رواج یہاں کے مسلمانوں کی روزمرہ زندگی کا جزو لاینفک بن چکے ہیں۔ خاص طور پر شادی بیاہ کے موقع پر اور موت ہو جانے کی صورت میں رسومات کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے جو طرح طرح کی دشواریوں کا باعث بنتا ہے' لیکن کون ہے جو صحیح اسلامی احکامات پر عمل کر کے دکھائے اور مسلمانوں کی گردنوں سے یہ مصنوعی طوق اُتارے۔

میثاق کے صفحات اور مقامی اخبارات شاہد ہیں کہ مدیر میثاق جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنے بچوں کی شادیاں نہایت سادگی کے ساتھ مسنون طریقے سے انجام دے کر عملاً عہد صحابہ کی یاد تازہ کر دی ہے۔ یہاں نہ کوئی بارات تھی نہ باجے گاجے' نہ کوئی جہیز تھا نہ سہرہ' نہ محفل نکاح کا غیر سنجیدہ ماحول تھا نہ لڑکی والوں کے ہاں کی دعوت۔ مسجد میں نکاح منعقد ہوا' حاضرین میں چھوہارے تقسیم کیے گئے اور قرآن پاک کی تلاوت کے روح پرور ریکارڈ سنائے گئے۔ لڑکے والوں نے سنت نبویؐ کے مطابق دعوت ولیمہ کا اہتمام کیا جس میں اعزہ اور دوست احباب کو مدعو کیا گیا اور بس۔

شادی کی رسومات کا تذکرہ بے سود ہو گا' کیونکہ ہم سب ان سے واقف ہیں۔ اسی طرح غمی کے موقع پر بھی تعزیت کی رسومات مہینوں تک پھیل جاتی ہیں۔ میت کے پسماندگان کے ہاں دوست احباب اور رشتہ داروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے۔

طرح طرح کے کھانوں سے اُن کی تواضع کی جاتی ہے۔ بعض اوقات عمر رسیدہ لوگوں کے جنازے پر باجے بجائے جاتے ہیں اور پیسے برسائے جاتے ہیں' رسومات کی ادائیگی کے لیے یومِ وفات سے اگلے دن' پھر ساتویں دن' پھر دسویں دن' چالیسویں دن اور پھر سال بعد اجتماعات منعقد کیے جاتے ہیں جن پر نمود و نمائش کی خاطر چارو ناچار بڑی بڑی رقوم خرچ کی جاتی ہیں اور اس پر طرہ یہ کہ ثواب کی امید بھی رکھی جاتی ہے' حالانکہ ثواب کا کام تو صرف وہی ہو سکتا ہے جو شارع علیہ السلام کے اُسوہَ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے طرزِ عمل کے مطابق ہو۔

ممتاز صحابیٔ رسول حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا بیٹا فوت ہو گیا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ملی تو آپؐ نے انہیں تعزیت نامہ لکھا جو معارف الحدیث جلد سوم از مولانا محمد منظور نعمانی میں حرف بحرف مذکور ہے۔ تعزیت نامے کی عربی عبارت کا ترجمہ مذکورہ کتاب سے درج ذیل ہے:

اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام

سلامٌ علیک!

میں پہلے تم سے اللہ کی حمد بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں' (بعد ازاں) دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ پر اجرِ عظیم دے اور تمہارے دل کو صبر عطا فرمائے اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں اور ہمارے مال اور ہمارے اہل و عیال یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے ہیں اور اس کی سپرد کی ہوئی امانتیں ہیں (اس اصول کے مطابق تمہارا لڑکا بھی تمہارے پاس اللہ کی امانت تھا) اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور جب اس کی مشیت ہوئی اپنی اس امانت کو تم سے واپس لے لیا۔ وہ تم کو اس کا بڑا اجر دینے والا ہے' اللہ کی خاص نوازش اور اس کی رحمت اور اس کی طرف سے

ہدایت (کی تم کو بشارت ہے) اگر تم نے ثواب اور رضاءِ الٰہی کی نیت سے صبر کیا۔ پس اے معاذ! صبر کرو اور ایسا نہ ہو کہ جزع وفزع تمہارے قیمتی اجر کو غارت کر دے اور پھر تمہیں ندامت ہو (کہ صدمہ بھی پہنچا اور اجر سے بھی محرومی رہی) اور یقین رکھو کہ جزع وفزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ اس سے رنج وغم دور ہوتا ہے اور اللہ کی طرف سے جو حکم اترتا ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے' بلکہ یقیناً ہو چکا ہے''۔ والسلام (بحوالہ معجم کبیر ومعجم اوسط للطبرانی)

تعزیت نامے کی عبارت سے صاف ظاہر ہے کہ آپ ﷺ نے میت کے پس ماندگان کے حق میں اجرِ عظیم کی دعا کی ہے اور صبر وشکر کی تلقین کے ساتھ ساتھ جزع وفزع سے روکا ہے۔ غم واندوہ میں آنکھوں سے آنسو نکلنا فطری بات۔ یہ فوت ہونے والے کے ساتھ محبت کے تعلق کی وجہ سے ہے۔ اسی لیے اس سے نہیں روکا گیا۔

پس اُسوۂ حسنہ کی روشنی میں میت کے پس ماندگان کے ساتھ اظہار ہمدردی اور تعزیت کے یہ موزوں ترین الفاظ ہیں جو ملاقات کی صورت میں زبانی اور بصورتِ دیگر بذریعہ خط کہے جاسکتے ہیں۔ ہر کسی کی وفات اللہ کے اِذن سے ہوتی ہے۔ اُس کو صبر کے ساتھ قبول نہ کرنا اور جذبات پر قابو نہ رکھ سکنا اللہ کی مشیت پر اعتراض ہے۔ اللہ تعالیٰ الحکیم ہے' اُس کا کوئی فیصلہ حکمت سے خالی نہیں' وہ جو بھی کرتا ہے درست کرتا ہے۔ وہ موت وحیات کا مالک ہے۔

اولاد کی تمنا میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرنا عین صواب ہے' مگر اولاد نہ ملنے کی صورت میں شکوہ وشکایت زبان پر لانا اور ہر وقت پریشان رہنا' غم واندوہ میں بے حال ہونا درست نہیں۔ بلکہ اولاد سے محرومی کو اللہ کا فیصلہ سمجھ کر صبر کرنا مناسب ہے۔ اور یہ سمجھنا چاہیے کہ اگر اولاد ہوتی اور وہ نافرمان اور نالائق ہوتی تو ایسے میں جو پریشانی آتی وہ کیسے برداشت ہوتی۔ پس اللہ تعالیٰ جس حال میں رکھے اُسی میں مصلحت سمجھنی چاہیے۔

اسی طرح کسی فرد کی موت کا فیصلہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔ اس صدمے سے پس ماندگان غمگین اور افسردہ ہوتے ہیں۔ یہ طبعی امر ہے۔ مگر اس صدمے کو اگر

صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے اور آہ وفغاں' جزع فزع اور شکوہ وشکایت زبان پر نہ لائی جائے تو یہ صبر بڑے اجر کا باعث ہے' جیسا کہ حضرت معاذ بن جبلؓ کے نام رسول اللہ ﷺ کے تعزیت نامے میں ذکر ہو چکا۔ قرآن مجید میں ہے کہ ﴿اِنَّ اللّٰہَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ﴾ (البقرۃ) ''بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔ حضرت صہیبؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''بندۂ مؤمن کا معاملہ بھی عجیب ہے۔ اس کے ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے۔ اگر اس کو خوشی اور آرام پہنچے تو وہ اپنے ربّ کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے' اور اگر اسے کوئی دکھ پہنچے تو وہ (اللہ کا فیصلہ سمجھتے ہوئے) اس پر صبر کرتا ہے تو یہ صبر بھی اس کے لیے سراسر خیر ہی کا موجب ہے''۔ (مسلم)

پس کسی عزیز کی وفات پر کسی طرح کی غم میں ڈوبی ہوئی اور اسراف وتبذیر کی موجب رسومات اپنانا اسلامی تعلیمات کے خلاف اور اجر کو ضائع کر دینے کا باعث ہے۔ جبکہ صبر کا اجر عاقبت کی حقیقی اور پائیدار زندگی میں فوز وفلاح کا سبب بنے گا۔ حضرت ابوامامہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ: اے ابن آدم! اگر تو نے شروعِ صدمہ میں صبر کیا اور میری رضا اور ثواب کی نیت کی تو میں تیرے لیے جنت سے کم کسی ثواب پر راضی نہ ہوں گا''۔ (ابن ماجہ)

کسی قریبی عزیز کی وفات کے صدمے پر فوری طور پر صبر کرنے سے اتنے بڑے ثواب کا وعدہ اہل ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی رحمت ہے۔ پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ صدمے کا یہ زخم خود بخود ہلکا ہو کر بالآخر مٹ جاتا ہے اور یہ اللہ تعالیٰ کا حکیمانہ نظام ہے۔

کسی کے ہاں موت ہو جائے تو عزیز واقارب کا فرض ہے کہ وہ مصیبت زدہ کو تسلی دیں' اظہار ہمدردی کریں' اُس کا غم ہلکا کرنے کی کوشش کریں کہ یہ بھی اجر کا باعث ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا یہی طریقہ ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے کسی مصیبت زدہ کی تعزیت کی تو اس کے لیے مصیبت زدہ

کا سا ہی اجر ہے''۔ (جامع الترمذی' سنن ابن ماجہ)

میت پر سوگ صرف تین دن تک ہے۔ اسی دوران عزیز و اقارب اور دوست احباب تعزیت کے لیے آئیں۔ لواحقین کو صبر کی تلقین کریں اور ہمدردی کا اظہار کریں۔ جو ایک بار تعزیت کر چکے اُسے دوبارہ تعزیت کے لیے نہیں آنا چاہیے۔ تین دن کے بعد اہل خانہ اپنے اپنے کام میں مصروف ہو جائیں۔ صرف عورت اپنے شوہر کی وفات پر چار ماہ دس دن تک سوگ کی حالت میں رہے گی۔ پس ماندگان کو چاہیے کہ وہ فوت شدہ کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت کی دعا کریں جس سے اسے بھی فائدہ ہو اور خود کو بھی۔

حضرت عبادہ بن صامتؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جو بندہ عام ایمان والوں اور ایمان والیوں کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت مانگے گا اُس کے لیے ہر مؤمن مرد و عورت کے حساب سے ایک ایک نیکی لکھی جائے گی''۔ (معجم کبیر للطبرانی)

پس ہمارے لیے ہر معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی زندگی میں بہترین نمونہ ہے۔ جس کام کو جس انداز سے آپؐ نے انجام دیا یا حکم دیا وہی اچھا اور موجب ثواب ہے۔ فضول قسم کے اضافے اور تکلفات بدعات کے ضمن میں آتے ہیں اور بدعات تو نری گمراہی ہیں۔

❁❁❁

فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ

انسان کی زندگی میں جہاں خوشی اور مسرت کے لمحات آتے ہیں وہاں اسے رنج وغم اور مصیبت کے لمحات سے بھی گزرنا پڑتا ہے۔ خوشی کے مواقع فرح اور انبساط پیدا کرتے ہیں جبکہ رنج وغم سے انسان افسردہ اور پریشان ہو جاتا ہے۔ مکمل ضابطۂ حیات ہونے کے ناطے اسلام خوشی ومسرت اور رنج وغم کے مواقع پر متوازن اور معتدل رویہ اختیار کرنے کی تعلیم دیتا ہے۔ قرآن کریم میں ہے:

﴿ لِكَيْلَا تَاْسَوْا عَلٰى مَا فَاتَكُمْ وَلَا تَفْرَحُوْا بِمَآ اٰتٰىكُمْ ۭ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُوْرِ ﴾ (الحدید)

''تاکہ جوتم سے فوت ہو گیا ہو اُس کا غم نہ کھایا کرو اور جوتم کو اس نے دیا اس پر اترایا نہ کرو۔ اور اللہ تعالیٰ کسی اترانے والے شیخی بھگارنے والے کو محبوب نہیں رکھتا۔''

یہ اس لیے کہ خوشی اور غمی سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے' اس کے فیصلہ کے مطابق ہی ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھنے والے بندوں کا یہ حال رہنا چاہیے کہ جب کوئی دکھ اور مصیبت پیش آ جائے تو وہ مایوسی اور پریشانی کا شکار نہ ہوں بلکہ صبر وثبات کے ساتھ اس کو برداشت کریں اور دل میں اس یقین کو تازہ کریں کہ یہ سب کچھ اللہ کی طرف سے ہے' جو ہمارا رحیم وکریم اور مہربان ربّ ہے' اور وہی ہمیں اس مصیبت سے نجات دینے والا ہے۔ اسی طرح جب ہر طرح کی نعمتیں میسر ہوں اور راحت وآرام کے ساتھ حالات سازگار رہوں تو بھی اس کو اپنے زورِ بازو اور عقل ودانش کا نتیجہ نہ سمجھیں' بلکہ اُس وقت بھی اپنے دل میں یہ یقین تازہ کریں کہ خوشی اور مسرت کے یہ سارے سامان محض اللہ تعالیٰ کی مہربانی اور اس کی عطا ہے اور وہ جب چاہے یہ نعمت واپس لے سکتا ہے۔ یہ طرزِ عمل اختیار کر کے بندہ اپنے ربّ کے دامن سے وابستہ رہتا ہے اور اس پر

خدافراموشی اور آزادخیالی طاری نہیں ہوتی۔ نیز وہ مصائب و آلام کو حکیم وعلیم خدا کی جانب سے سمجھ کر اُن کو برداشت کرتا اور مایوسی اور دل شکستگی سے بچا رہتا ہے۔

صبر اور شکر اسلامی اخلاق کے دو اہم عنوان ہیں۔شکر مؤمن کے اس رویے کا نام ہے جب وہ خوشی اور مسرت کے لمحات سے لطف اندوز ہوتا ہے اور اس کو خدا کا عطیہ جان کر اس کی حمد کے ترانے گاتا ہے۔اور صبر اس کیفیت سے عبارت ہے جب مؤمن کو دکھ' رنج یا مصیبت کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور وہ اس صدمے کو اللہ حکیم وعلیم کی مشیت اور رضا سمجھ کر قبول کرتا ہے اور شکوہ وشکایت یا جزع وفزع نہیں کرتا۔آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

((عَجَبًا لِأَمْرِ الْمُؤْمِنِ اِنَّ اَمْرَهٗ كُلَّهٗ خَيْرٌ ' وَلَيْسَ ذَاكَ لِأَحَدٍ اِلَّا لِلْمُؤْمِنِ ' اِنْ اَصَابَتْهُ سَرَّاءُ شَكَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهٗ ' وَاِنْ اَصَابَتْهُ ضَرَّاءُ صَبَرَ فَكَانَ خَيْرًا لَهٗ)) (رواہ مسلم)

''بندۂ مؤمن کا معاملہ بھی عجیب ہے' اس کے ہر معاملہ اور ہر حال میں اس کے لیے خیر ہی خیر ہے اور یہ نعمت صرف مؤمن کو ہی نصیب ہے۔اگر اس کو خوشی اور راحت وآرام پہنچے تو وہ اپنے ربّ کا شکر ادا کرتا ہے اور یہ اس کے لیے خیر ہی خیر ہے' اور اگر اسے کوئی دکھ اور رنج پہنچتا ہے تو وہ اس پر صبر کرتا ہے اور یہ صبر بھی اس کے لیے سراسر خیر اور برکت کا موجب ہوتا ہے۔''

ابن ماجہ میں وارد ایک حدیث قدسی میں رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((يَقُوْلُ اللّٰهُ سُبْحَانَهٗ ابْنَ اٰدَمَ اِنْ صَبَرْتَ وَاحْتَسَبْتَ عِنْدَ الصَّدْمَةِ الْاُوْلٰى لَمْ اَرْضَ لَكَ ثَوَابًا دُوْنَ الْجَنَّةِ))

''اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ فرماتا ہے: اے فرزند آدم! اگر تو نے شروعِ صدمہ میں صبر کیا اور میری رضا اور ثواب کی نیت کی تو میں نہیں راضی ہوں گا کہ جنت سے کم کوئی اور ثواب تجھے دیا جائے۔''

صدمہ کے وقت اس کا اثر بہت زیادہ ہوتا ہے۔اس وقت صبر کرنا مشکل ہوتا ہے۔بعد میں وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خود ہی صبر آ جاتا ہے۔چنانچہ صدمہ پہنچنے کے وقت اللہ کی رضا کے لیے صبر کرنا اللہ تعالیٰ کو بہت محبوب ہے۔اسی لیے اس کا بھرپور اجر دینے کا

وعدہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں فرمایا ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ﴾ (البقرۃ)

''بے شک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے''۔

صحیحین کی ایک حدیث میں حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی (حضرت زینبؓ) نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کہلا بھیجا کہ میرے بچے کا آخری دم ہے اور چل چلاؤ کا وقت ہے' لہٰذا آپؐ اِس وقت تشریف لے آیئے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے جواب میں سلام کہلا بھیجا اور پیام دیا کہ بیٹی! اللہ تعالیٰ کسی سے جو کچھ لے وہ بھی اسی کا ہے اور کسی کو جو کچھ دے وہ بھی اسی کا ہے۔ الغرض ہر چیز ہر حال میں اسی کی ہے اور ہر چیز کے لیے اس کی طرف سے ایک مدت اور وقت مقرر ہے' پس چاہیے کہ تم صبر کرو اور اللہ تعالیٰ سے اس صدمہ کے اجر و ثواب کی طالب بنو۔ صاحبزادی زینبؓ نے پھر آپؐ کے پاس پیام بھیجا اور قسم دی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم! اس وقت ضرور تشریف لائیں۔ پس آپؐ اٹھ کر چل دیے اور آپؐ کے اصحابؓ میں سے سعد بن عبادہ' معاذ بن جبل' اُبی بن کعب' زید بن ثابت رضی اللہ عنہم اور کچھ اور لوگ بھی آپؐ کے ساتھ ہو لیے۔ پس وہ بچہ اٹھا کر آپؐ کی گود میں دیا گیا اور اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ اس کے اس حال کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس پر سعد بن عبادہؓ نے عرض کیا: حضرت یہ کیا؟ آپؐ نے فرمایا: ''یہ رحمت کے اس جذبے کا اثر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے دلوں میں رکھ دیا ہے اور اللہ کی رحمت ان ہی بندوں پر ہوگی جن کے دلوں میں رحمت کا یہ جذبہ موجود ہو''۔

معلوم ہوا کہ صدمے کے اثر سے آنکھوں سے آنسو جاری ہونا رقتِ قلب کی علامت اور جذبۂ رحمت کا لازمی نتیجہ ہے جو کہ صبر کے منافی نہیں' البتہ جزع فزع اور شکوہ و شکایت کے الفاظ زبان پر لانا بے صبری ہے۔

مؤمن کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے آپ کو ہمہ وقت آزمائش میں سمجھے۔ خوشی اور مسرت کی حالت بھی آزمائش ہے اور جذبۂ شکر کے ساتھ ساتھ خدا کی نعمتوں کا خدا

کے حکم کے مطابق استعمال اور خدا کی حمد وثنا اس کی کامیابی ہے۔ رنج والم اور دکھ تکلیف کی حالت بھی آزمائش ہے جبکہ اسے خدا کی مشیت اور فیصلہ جان کر قبول کرنا اور اپنے اوپر صبر کی کیفیت طاری کرنا اس کی کامیابی ہے۔

سب سے بڑا صدمہ کسی عزیز کی وفات ہوتا ہے۔ ایسے موقع پر صدمہ سے دوچار خاندان کے ساتھ اظہارِ تعزیت مسنون ہے' مگر تعزیت کے خود ساختہ طریقے چنداں سودمند نہیں۔ صاحب خانہ کو صبر کی تلقین اور رجوع الی اللہ کی یاد دہانی ہی اصل تعزیت ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کا بیٹا فوت ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تعزیتی خط لکھوا کر بھیجا۔ اس خط کا متن مع ترجمہ اس طرح ہے:

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ ۔ مِنْ مُحَمَّدٍ رَسُوْلِ اللّٰهِ اِلٰى معاذ بن جبل۔ سَلَامٌ عَلَيْكَ ' فانى احمد اليك الله الذى لا اله الا هو ۔ اما بَعد فاعظم الله لكَ الاجر واَلْهَمَك الصَّبر۔ ورزقنا واياك الشكر۔ فان انفسنا واموالنا واهلنا مِنْ مواهب الله الهنيئة وعوارية المستودعة۔ متعك الله الذى به فى غبطة وسرور وقبضه منك باجر كبير۔ الصلوٰة والرحمة والهدى ان احتسبته ' فَاصْبِرْ ولا يُحْبِطُ جَزَعُك اَجْرَكَ فَتَندَم۔ وَاعلم ان الجزع لا يردّ ميتاً ولا يدفع حَزَناً وَمَا هو نازلٌ فكان قَدْ۔ والسلام ۔ (رواه الطبرانى فى الكبير الاوسط)

''بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۔ اللہ کے رسول محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی طرف سے معاذ بن جبل کے نام۔ پہلے میں اس اللہ کی حمد تم سے بیان کرتا ہوں جس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ بعد ازاں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تم کو اس صدمہ کا اجرِ عظیم دے اور تمہارے دل کو صبر عطا فرمائے اور ہم کو اور تم کو نعمتوں پر شکر کی توفیق دے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہماری جانیں' ہمارے مال اور ہمارے اہل وعیال یہ سب اللہ تعالیٰ کے مبارک عطیے اور اس کی سونپی ہوئی امانتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جب تک چاہا خوشی اور عیش کے ساتھ تم کو اس سے نفع اٹھانے اور جی بہلانے کا موقع دیا اور جب اس کی مشیت ہوئی اپنی اس امانت کو تم سے واپس لے لیا اور وہ تم کو اس کا بڑا اجر دینے والا ہے' اللہ کی خاص نوازشیں' اس کی رحمت اور اس کی طرف

سے ہدایت (کی تم کو بشارت ہے)'اگر تم نے ثواب اور رضاءِ الٰہی کی نیت سے صبر کیا۔ (پس اے معاذ!) صبر کرو اور ایسا نہ ہو کہ جزع وفزع تمہارے اجر کو غارت کر دے اور پھر تمہیں ندامت ہو۔ اور یقین رکھو کہ جزع اور فزع سے کوئی مرنے والا واپس نہیں آتا اور نہ اس سے دل کا رنج وغم دور ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے جو حکم آتا ہے وہ ہو کر رہنے والا ہے' بلکہ یقیناً ہو چکا ہے۔ والسلام''

اس تعزیت نامے میں جناب رسول اللہ ﷺ نے انتہائی حقیقت پسندانہ انداز میں حضرت معاذ بن جبلؓ کے بیٹے کی وفات پر تعزیت بھی کی ہے' صبر جمیل کی تلقین بھی کی ہے اور جزع وفزع سے روک کر صحیح طرزِ عمل کی طرف راہنمائی بھی کی ہے۔ گویا اس تعزیت نامے میں ہر اُس شخص کے لیے تعزیت' خیر خواہی' تسلی اور تشفی کا پورا سامان ہے جس کو کوئی صدمہ پہنچے۔ ہمیں چاہیے کہ اپنی مصیبتوں میں اپنے ہادی ورہبر ؐ کی ایمان افروز نصیحت سے صبر وسکون حاصل کریں۔

یہاں اس بات کا تذکرہ بے محل نہ ہو گا کہ چند دن قبل امیر تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کے چھوٹے بھائی جناب اقتدار احمد کا انتقال ہو گیا۔ مرحوم بہت خوبیوں کے مالک اور ڈاکٹر صاحب کی تنظیمی اور دعوتی سرگرمیوں میں ہمہ تن ان کے معین ومؤید تھے۔ وہ ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ پر بیعت بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی فکر کی نشر واشاعت کے لیے زرِ کثیر صرف کر کے انہوں نے ''ندا'' جاری کیا' جسے بعد ازاں ''ندائے خلافت'' کی صورت دی اور بڑی جدوجہد اور کاوش کے ساتھ اس کو چلایا۔ گہرے خاندانی روابط کے علاوہ وہ صحیح معنوں میں ڈاکٹر صاحب کے دست راست' اچھے مشیر' غمگسار اور خیر خواہ تھے۔ ایسے بھائی کی جدائی ڈاکٹر صاحب کے لیے یقیناً بہت بڑا صدمہ تھا۔ مگر ہم نے دیکھا کہ ڈاکٹر صاحب اس موقع پر بھی صبر وثبات کے پہاڑ اور سراپا تسلیم ورضا تھے۔ انہوں نے وہ دعوتی وتنظیمی پروگرام جو پہلے سے طے شدہ تھے' بڑے عزم اور حوصلے کے ساتھ بروقت انجام دیے۔ سچ تو یہ ہے کہ ایسے موقعوں پر یہ طرزِ عمل ڈاکٹر صاحب کے علاوہ کسی دوسرے میں کم ہی نظر آیا ہے۔

[یہ تحریر ماہنامہ میثاق لاہور بابت ماہِ جولائی 1995ء میں شائع ہوئی تھی]

مقامِ صحابہؓ

صاحب کے لغوی معنی دوست، ساتھی اور پیرو کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں ''صحابی'' اُن افراد کو کہا جاتا ہے جنہوں نے ایمان کی حالت میں رسول کریم ﷺ کو دیکھا اور زندگی بھر اسلام پر قائم رہے۔ اس طرح عہدِ رسالت کے کافر، مشرک اور منافق لوگوں کو اصحابِ رسولؐ نہیں کہا جاتا۔

اصحابِ رسولؐ کا مقام انبیاء علیہم السلام کے بعد سب سے بلند ہے، کیونکہ انہوں نے محبوبِ خداؐ کے ساتھ وفاداری کا حق ادا کر دیا۔ انہوں نے رسول پاکؐ کے اشاروں پر اپنی جانیں نچھاور کیں، دکھ برداشت کیے، تکلیفیں جھیلیں اور اسلام کے پودے کو اپنے خونِ جگر کے ساتھ سینچا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جاں نثاری کے واقعات تاریخِ اسلام کے اوراق پر پھیلے ہوئے ہیں جن کو پڑھ کر غیر مسلم بھی یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ محمد (ﷺ) کے ساتھی غیر معمولی انسان تھے۔ کیونکہ انہوں نے اپنے آقا کی اطاعت میں ایسے نقوش چھوڑے ہیں کہ کوئی دوسرا ان کی گردِ راہ کو بھی نہیں پا سکتا۔ رسول پاکؐ وضو کرتے تھے تو وہ پانی نیچے نہ گرنے دیتے۔ وہ آپؐ کے اشارے پر کٹ مرنے کو فخر سمجھتے تھے۔ یہاں صرف دو حضرات کے واقعات سنتے جائیے۔

حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ آنحضرت ﷺ کے ایک صحابی ہیں۔ ان کی شادی ہوئی، رات گزاری تو صبح غسل کی تیاری کر رہے تھے۔ کان میں خبر پڑی کہ مسلمانوں کو میدانِ اُحد میں شکست ہو رہی ہے۔ غسل کو چھوڑا اور اُسی وقت میدانِ کارزار کی طرف لپکے، خوب دادِ شجاعت دی۔ دشمن کی صفوں میں کھلبلی مچا دی۔ بالآخر جامِ شہادت نوش کیا۔ جب اُن کو دفن کرنے لگے تو آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''مَیں دیکھتا ہوں کہ فرشتے حنظلہ رضی اللہ عنہ کو غسل دے رہے ہیں''۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت حنظلہؓ کو تاریخ میں ''غسیلِ ملائکہ'' کہتے

ہیں۔ حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ اسلام لانے سے قبل ناز و نعمت کی زندگی گزارتے تھے۔ نوجوان ہی تھے کہ گھر والوں سے چھپ کر مسلمان ہو گئے۔ گھر والوں کو معلوم ہوا تو انہوں نے باندھ دیا۔ ایک دن موقع پا کر بھاگ گئے۔ پہلے حبشہ کی طرف ہجرت کی' بعد ازاں ہجرتِ مدینہ سے بھی مشرف ہوئے اور زہد و فقر کی زندگی میں ناز و نعم والی زندگی سے زیادہ مسرور نظر آتے۔ ایک مرتبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ اُن کی چادر میں کپڑے کی بجائے چمڑے کا پیوند لگا ہوا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی پہلی اور اس حالت کا تذکرہ فرماتے ہوئے آبدیدہ ہو گئے۔ جنگ اُحد میں مہاجرین کا جھنڈا اُن کے ہاتھ میں تھا۔ ایک کافر نے تلوار کا وار کیا اور اُن کا ہاتھ کٹ گیا' فوراً جھنڈے کو دوسرے ہاتھ میں پکڑ لیا۔ اس نے پھر تلوار ماری اور دوسرا ہاتھ بھی کاٹ ڈالا۔ انہوں نے دونوں بازوؤں کو جوڑ کر سینہ سے جھنڈے کو چمٹا لیا تا کہ گر نہ جائے' بالآخر ایک تیر لگا اور آپؓ شہید ہو گئے۔ جھنڈا پھر ایک دوسرے شخص نے اٹھا لیا۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جب خدا کے حکم سے تبلیغ کا آغاز کیا تو گویا آپؐ نے بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈال دیا۔ مکہ کے لوگ آپؐ کے مخالف ہو گئے اور طرح طرح سے اذیتیں دینے لگے۔ اس حالت میں کوئی کمزور کردار کا انسان آپؐ کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا۔ کیونکہ ہر شخص کو معلوم تھا کہ اسلام میں داخل ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینا دنیا بھر کو دشمن بنا لینے کے مترادف ہے۔ چنانچہ اُس وقت جو لوگ ایمان لائے انہوں نے پیغمبر اسلام کے ساتھ ہو کر مصیبت کے دن گزارے' وہ کسی بھی وقت پھسلنے والے نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ شکور ہے' وہ کسی کے صلے کو نہیں روکتا۔ اُس نے اپنی بے نیازی کے باوجود قرآن پاک میں اصحابِ رسولؐ کا تذکرہ اچھے الفاظ میں کیا تا کہ قیامت تک نسل انسانی ان کو خراجِ تحسین پیش کرتی رہے۔ نہ صرف یہ بلکہ اصحابِ رسولؐ کے ایمان کو سند کی حیثیت سے پیش کیا اور فرمایا کہ اس طرح ایمان لاؤ جس طرح لوگ یعنی ''اصحابِ رسولؐ'' ایمان لائے ہیں۔ گویا اصحابِ رسول کا ایمان بارگاہِ ربّ العزت میں مقبول تھا۔

قرآن کے اوّلین مخاطب اہل مکہ تھے۔ ان میں جو ایمان لاتے گئے پیغمبر اسلامؐ

کے ساتھی بنتے گئے۔ جب یہ ایک جماعت بن گئی تو اللہ تعالیٰ نے یوں خطاب فرمایا: ''تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لیے برپا کی گئی۔ تم بھلائی کی تلقین کرتے ہو اور برائی سے روکتے ہو!'' (آل عمران: ۱۱۰) اگرچہ خیر اُمت کے مصداق تمام صالح مسلمان ہیں تاہم اس اعزاز کے اوّلین مخاطب تو اصحابِ رسولؐ ہی ہیں۔

رسولِ پاکؐ کے ساتھیوں کی جماعت نے دین کی تعلیم براہِ راست پیغمبر علیہ السلام سے حاصل کی۔ اُس پر خود دیانت داری کے ساتھ عمل پیرا رہے اور وہی تعلیم بعد میں آنے والوں تک پہنچا دی۔ دوسرے لفظوں میں یوں سمجھئے کہ یہ صحابہ کرامؓ ہی ہیں جن کی بدولت قرآن ہم تک پہنچا اور ہم خدا اور اُس کے رسولؐ سے متعارف ہوئے۔ اس لحاظ سے ہر مسلمان جماعتِ صحابہؓ کا زیر بارِ احسان ہے کہ انہوں نے اسلام ہم تک پہنچایا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

((اَصْحَابِیْ کَالنُّجُوْمِ فَبِاَیِّهِمُ اقْتَدَیْتُمْ اِهْتَدَیْتُمْ))

''میرے صحابی ستاروں کی مانند ہیں، پس جس کی پیروی تم کرو گے ہدایت پاؤ گے۔''

یعنی صحابہ کا عمل اُمت مسلمہ کے لیے سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے سامنے رسولِ پاکؐ کی پاکیزہ زندگی کا نمونہ موجود تھا۔ اور وہ خدا کے اس حکم کے مطابق کہ تمہارے لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں بہترین نمونہ موجود ہے، ہر کام میں پیغمبر اسلامؐ کی اتباع کرتے تھے۔ اُن کے تمام کام نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے نقشِ قدم کے مطابق تھے۔ مثال کے طور پر نماز ہی کو لیجیے۔ نماز کی نیت باندھ کر کھڑے ہونے، رکوع و سجود کی کیفیت، قعدہ اور جلسہ کی حالت اور سلام پھیرنے کا طریقہ ہم پر بالکل واضح ہے، ہم نے صحابہؓ کی تعلیمات سے سیکھا ہے اور صحابہؓ کو یہ حکم تھا کہ ''نماز پڑھو جس طرح تم مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو!'' آج ہماری نمازوں کے طریقہ ادائیگی کے صحیح ہونے کی دلیل یہی ہے کہ وہ صحابہؓ کی تعلیم اور نمونے کے مطابق ہوں۔ کیونکہ ان کا طریق بلاشبہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نمونہ کے مطابق تھا۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اپنے رسول مقبولؐ کو ارشاد فرمایا کہ ''اُن سے مشورہ کیجیے!'' دستور یہ تھا کہ احکام و فرائض کا ذکر قرآن پاک میں آ جاتا تھا۔ اگر کوئی ایسا معاملہ پیش آ جاتا جس کی صورت قرآن پاک میں واضح نہ ہوتی تو حضورؐ اپنے صحابہؓ سے اُس کام کے بارے میں مشورہ لیتے اور قبول کرتے۔ نبی اکرم ﷺ کا اپنا فیصلہ حددرجہ صائب اور صحیح ہوتا تھا۔ ﴿شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ﴾ سے تو اصحابِ رسولؐ کی فضیلت مقصود ہے۔

اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا:

﴿رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ ؕ﴾ (البیّنۃ:۸)

''اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے!''

یہ خطاب اصحابِ رسولؐ کو ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی جماعت نے اطاعتِ رسولؐ اور احکامِ خداوندی پر چلنے کا حق ادا کر دیا۔ خدا تعالیٰ بھی اپنے بندوں سے یہی تقاضا کرتا ہے کہ وہ اُس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کریں۔ صحابہؓ نے اپنی زندگیاں محض رضائے خدا کے لیے وقف کی ہوئی تھیں۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان پر اپنی خوشنودی کا اظہار کیا اور فرمایا کہ وہ اُس سے راضی ہو گئے۔ دراصل صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خدا کی خوشنودی دلانے والا عمل یہ تھا کہ وہ ربّ سے راضی تھے۔ ہر مشکل اور تکلیف کو جو وہ پیغمبر اسلام کے شانہ بشانہ برداشت کرتے تھے' اُسے اللہ تعالیٰ کے علم و رضا کے مطابق جانتے تھے۔ تبھی تو کسی وقت نہ گھبراتے اور خوف نہ کھاتے تھے۔ ان کا اس بات پر گہرا یقین تھا کہ: ''کوئی مصیبت وارد نہیں ہوتی بجز اللہ تعالیٰ کے حکم سے!'' یہی صبر کا مقام ہے کہ انسان مصیبت میں اپنے جذبات کو بے قابو نہ ہونے دے۔ بڑے سے بڑے دنیاوی نقصان پر بھی حرفِ شکایت زبان پر نہ لائے' بلکہ رضائے الٰہی سمجھ کر اسے اپنے حق میں نہ صرف خدائی فیصلہ سمجھے بلکہ بہترین فیصلہ جانے اور یہ کہے کہ: ''ہم اللہ ہی کے لیے ہیں اور اُسی کی طرف رجوع کرنے والے ہیں!'' صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی پوری زندگی میں خدا کے فیصلوں پر گہری رضامندی کا ظہور ملتا ہے۔ اور اُسی کے صلے میں انہیں بارگاہِ صمدیت

سے خوشنودی کا اعزاز ملا ہے۔ یہ اعزاز اُن ہی کا حصہ ہے۔ کیونکہ آج تو بڑے سے بڑا عابد و زاہد بھی اس بات کا دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اسے خدا کی خوشنودی حاصل ہے۔ اگر دعویٰ کرے گا تو دلیل کہاں سے لائے گا؟ کیونکہ اعمال کی قبولیت اللہ تعالیٰ پر واجب نہیں۔ مگر جس جگہ وہ اپنی رضا دے چکا وہاں خلاف کے وقوع کا کیا سوال؟ ﴿اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ﴾ (آل عمران)

اللہ تعالیٰ نے قرآن میں وعدہ فرمایا ہے کہ وہ نبیوں کو رسوا نہیں کرے گا۔ نبی تو خدا کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں' اُن کی رسوائی تو منطقی طور پر خارج از امکان ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی کے ساتھ اُس کے ساتھیوں کی رسوائی کی نفی کر کے اصحابِ رسولؐ کو عدم اہانت کی بشارت میں نبی کے ساتھ شریک ٹھہرا دیا ہے۔ بالفاظِ قرآنی:

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ﴾ (الحدید:۸)

''جس دن اللہ رسوا نہیں کرے گا نبی کو اور نہ ہی ان ایمان والوں کو جو اُس کے ساتھ ہیں!''

ظاہر ہے کہ جو شخص فیصلہ کے دن رسوائی سے بچ گیا وہ کامیاب ہوا اور اُس نے بڑی ہی فلاح پائی۔ صحابہؓ کے علاوہ بارگاہِ الٰہی سے اس قسم کی بشارت بجز انبیاء علیہم السلام کے کسی دوسرے کو نہیں ملی۔

یکم ذی قعدہ ۶ ہجری کو رسول اللہ ﷺ نے مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ کی طرف بقصدِ عمرہ سفر اختیار کیا۔ تقریباً ۱۵۰۰ مہاجرین اور انصار آپؐ کے ساتھ تھے' چونکہ ارادہ جنگ کا نہ تھا اس لیے کسی قسم کا سامانِ حرب ساتھ نہ لیا۔ صرف وہ ہتھیار لیے جو ایک مسافر کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ ذوالحلیفہ کے مقام پر پہنچ کر سب نے احرام باندھا اور ایک شخص کو جاسوس بنا کر قریش کی خبر معلوم کرنے کے لیے آگے روانہ فرمایا۔ جاسوس نے آ کر اطلاع دی کہ قریش مکہ کو مسلمانوں کی آمد کی خبر ہو چکی ہے اور انہوں نے مقابلہ کے لیے لشکر تیار کر لیا ہے۔ نیز ان کا ارادہ ہے کہ مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہ ہونے دیں گے۔ رسول اللہ ﷺ نے سنا تو وہ راستہ چھوڑ کر ایک دوسرا راستہ اختیار کیا اور حدیبیہ کے

مقام پر پہنچ گئے۔ یہاں آپؐ نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو سفیر بنا کر رؤساءِ مکہ کے پاس بھیجا تاکہ وہ انہیں بتائیں کہ مسلمانوں کا ارادہ جنگ کا ہرگز نہیں۔ اُن کے پاس جنگی ہتھیار بھی نہیں، وہ تو صرف عمرہ کی غرض سے آ رہے ہیں۔ حضرت عثمانؓ نے مکہ پہنچ کر قریش کو پیغام دیا۔ سب نے جواب دیا کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا' تم تنہا طواف کرنا چاہو تو کرلو۔ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا کہ مَیں رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم کے بغیر کبھی طواف نہ کروں گا۔ اس پر قریش خاموش ہو گئے اور انہوں نے حضرت عثمانؓ کو اپنے پاس روک لیا۔ ادھر مسلمانوں میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا گیا ہے۔ جب رسول پاکؐ کو یہ خبر پہنچی تو آپؐ کو سخت صدمہ ہوا اور فرمایا: ''جب تک مَیں اُن سے بدلہ نہ لے لوں گا یہاں سے حرکت نہ کروں گا!'' اور وہیں ایک کیکر کے درخت کے نیچے اپنے ساتھیوں سے بیعت لینا شروع کر دی کہ جب تک جان میں جان ہے کافروں سے جہاد و قتال کریں گے۔ مر جائیں گے مگر بھاگیں گے نہیں۔ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پیغمبر اسلامؐ کے فرمان پر اپنی اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کا عہد کر رہے تھے تو ربّ العزت نے اُن کے حق میں رضامندی کی سند ان الفاظ میں عطا فرمائی:

﴿لَقَدْ رَضِیَ اللّٰہُ عَنِ الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ یُبَایِعُوْنَکَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ فَعَلِمَ مَا فِیْ قُلُوْبِھِمْ فَاَنْزَلَ السَّکِیْنَةَ عَلَیْھِمْ وَاَثَابَھُمْ فَتْحًا قَرِیْبًا﴿۱۸﴾﴾ (الفتح)

''تحقیق اللہ راضی ہوا ایمان والوں سے جس وقت وہ آپ کے ہاتھ پر درخت کے نیچے بیعت کر رہے تھے۔ اُن کے دلوں میں (اللہ' اور اس کے رسولؐ کی محبت اور اخلاص) جو کچھ بھرا ہوا ہے' وہ اللہ کو خوب معلوم ہے۔ پس اللہ نے اُن پر اپنی خاص سکینت (طمانیت) کو اتار دیا اور انعام میں اُن کو قریبی فتح عطا فرمائی''۔

تاریخ اسلام میں اس بیعت کو ''بیعتِ رضوان'' کہتے ہیں' کیونکہ اس بیعت میں حصہ لینے والے مسلمانوں کے حق میں اللہ تعالیٰ نے اپنی رضا کی سند کا اعلان کیا ہے۔ حدیث میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّم نے فرمایا: ''جن لوگوں نے درخت کے نیچے بیعت کی ہے ان میں سے کوئی جہنم میں داخل نہیں ہوگا!''

علامہ ابن عبدالبر مقدمہ استیعاب میں مذکورہ آیت کے تحت لکھتے ہیں: ''اللہ جس سے راضی ہو گیا پھر اُس سے کبھی ناراض نہیں ہو گا' اِن شاء اللہ تعالیٰ!'' یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہمیشہ صحیح ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ گزشتہ' موجودہ اور آئندہ کے حالات سے پوری طرح واقف ہے۔ وہ صرف اُسی شخص کے حق میں اپنی رضا کا فیصلہ کرے گا جو آئندہ زمانے میں بھی کبھی رضاءِ الٰہی کے خلاف کوئی کام کرنے والا نہ ہو گا۔ یوں سمجھئے کہ کسی شخص کے لیے رضاءِ الٰہی کا اعلان اس بات کی ضمانت ہے کہ اس کا خاتمہ اور انجام بھی اسی حالتِ صالحہ پر ہو گا اور اس سے رضاءِ الٰہی کے خلاف کوئی کام آئندہ سرزد نہ ہو گا۔ اگر کوئی شخص یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا کا یہ فیصلہ ان لوگوں کے وقتی حالات کے لیے تھا' بعد میں اُن کے حالات خراب ہو گئے اس لیے وہ اس انعام واکرام کے مستحق نہیں رہے' تو یہ بات حد درجہ نامعقول اور بے وزن ہے' کیونکہ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شروع میں انجام سے بے خبری کی وجہ سے رضا کا اعلان کر دیا اور بعد میں یہ حکم بدل گیا۔ نعوذ باللّٰہ من ذٰلک!

بیعتِ رضوان سے تقریباً چار سال پہلے غزوۂ بدر پیش آیا جو کفر اور اسلام کے درمیان پہلا معرکہ تھا۔ اور اس لحاظ سے بڑی اہمیت کا حامل تھا کہ اس میں مسلمانوں کی ناکامی اسلام کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتی۔ اسلام اپنے ابتدائی مراحل میں تھا' مسلمان لٹ پٹ کر ابھی ایک سال قبل مکہ سے ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے اور مدینہ کے مٹھی بھر مسلمانوں نے مہاجر بھائیوں کی اعانت میں اُن کو اپنے گھروں اور کاروباروں میں شریک کر لیا تھا۔ کیونکہ معاشی اعتبار سے بھی مسلمانوں کی حیثیت بہت کمزور تھی۔ تعداد کے لحاظ سے شریکِ جنگ مسلمان صرف تین سو تیرہ تھے اور ان کے پاس بھی صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے اور اسلحہ بھی برائے نام تھا۔ ادھر کفار کے لشکر میں ایک ہزار افراد' وافر سواریاں اور بہت زیادہ سامانِ اسلحہ تھا۔ ہر عقل مند آدمی سمجھ سکتا ہے کہ کردار اور عمل کے اعتبار سے تین سو تیرہ مجاہد کس درجہ عظیم تھے۔ خدا اور رسولؐ کے فرمان کو وہ کس قدر اہم سمجھتے تھے۔ ان مجاہدین کو معلوم تھا کہ مدِ مقابل کی تعداد اور قوت ان سے کئی گنا

زیادہ ہے۔ یہ مجاہدین میدانِ جنگ سے جانیں سلامت واپس لانے کے لیے نہیں گئے تھے' بلکہ وہ اپنی جانوں کے عوض خدا کی رضا خرید چکے تھے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ﴾ (التوبة:۱۱۱)

''بے شک اللہ نے مسلمانوں سے اُن کے مال اور جان خرید لیے ہیں اس بدلے پر کہ اُن کے لیے جنت ہے۔ وہ اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں' پس مارتے ہیں اور مرتے ہیں''۔

بدر کے دن میدانِ جنگ میں اترنے والے یہ صحابیؓ خدا کے حکم اور اس کے نبیؐ کی اطاعت میں مال اور جان فدا کرنے کے لیے آئے تھے' کسی قسم کی دنیاوی غرض پیش نظر نہ تھی۔ رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

((لَعَلَّ اللّٰهَ اطَّلَعَ اِلٰى اَهْلِ بَدْرٍ فَقَالَ : اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ فَقَدْ وَجَبَتْ لَكُمُ الْجَنَّةُ)) (صحیح البخاری)

''تحقیق اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی طرف نظر فرمائی اور فرمایا: جو چاہو کرو' جنت تمہارے لیے واجب ہو چکی ہے۔''

اِعْمَلُوْا مَا شِئْتُمْ سے اہل بدر کو گناہوں کی اجازت دینا مقصود نہیں بلکہ ان کے صدق و اخلاص کو ظاہر کرنا ہے کہ ربّ العزت کی بارگاہ میں اہل بدر کی مخلصانہ جانبازی اور محبانہ اور والہانہ سرفروشی مسلّم ہو چکی ہے۔ مرتے دم تک یہ لوگ اسلام کے ساتھ وفادار رہیں گے اور بڑی سے بڑی آزمائش اُن کے پائے ثبات میں لغزش پیدا نہ کر سکے گی۔ اُن کے دل خدا اور رسولؐ کی محبت اور اطاعت سے لبریز ہیں۔ معصیت اور نافرمانی اُن کے قلوب اور اذہان میں کوئی جگہ نہ پائے گی' ہاں اگر بشری تقاضوں کے تحت اُن سے کسی وقت کوئی لغزش ہو جائے تو فوراً توبہ واستغفار کی طرف رجوع کریں گے اور ربّ العزت کے حضور اس قدر تضرع اور ابتہال کریں گے کہ ان کی معصیت اجر عظیم میں بدل جائے گی۔ کما وعد الله تعالىٰ فى القرآن الكريم۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ان جملہ فضائل کے باوجود تاریخ کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے درمیان اختلافات اور رنجشیں موجود تھیں' بلکہ ان کے درمیان خونریز جنگیں بھی لڑی گئیں۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ صحابہؓ کے یہ مشاجرات اُن کے فضائل کا ساتھ کیسے دے سکتے ہیں؟ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو تاریخی روایات لاریب نہیں ہیں جبکہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے فضائل اُس کتاب میں درج ہیں جو لا ریب فیہ ہے۔ اگر متعصّبانہ فیصلہ کرنا ہو تو تاریخی روایات پر اعتماد کر کے قرآنی آیات سے روگردانی کرنا ہوگی۔ لیکن صحیح فیصلہ یہ ہوگا کہ قرآنی آیات دربارۂ فضائل صحابہؓ بھی پیش نظر رہیں اور تاریخی حوالے بھی سامنے رہیں اور حالات کی ایسی تأویل کی جائے کہ مستند تاریخی حقائق سے بھی غض بصر نہ کیا جائے اور کتابِ حکمت کے فیصلوں کا بھی ابطال نہ ہو۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم انسان تھے اور انسانوں میں انبیاءِ کرام کے علاوہ کوئی بھی معصوم نہیں ہے۔ تاہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور عام انسانوں میں فرق یہ ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہر عمل نیک نیتی' حسن اخلاص اور حصولِ رضائے الٰہی کے جذبے سے تھا۔ کیونکہ انہوں نے انسان کامل علیہ السلام سے رُودررُو تعلیم پائی تھی اور جذبات پر قابو پانے کا ڈھنگ سیکھا تھا اور تربیت حاصل کی تھی۔ جبکہ عام انسان خلوص کے اس اعلیٰ مقام تک کبھی نہیں پہنچ سکتا اور نہ ہی اس قدر بےغرض ہو سکتا ہے جس قدر اصحابِ رسولؐ اپنی ذات کے لیے تھے۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو نے کسی معاملہ میں ایک دوسرے کی مخالفت کی ہے تو ان میں سے ہر ایک کی غرض رضائے الٰہی تھی۔ کیونکہ ایسا بھی ممکن ہے کہ دو آدمی ایک دوسرے کے برعکس کام کریں' لیکن دونوں خلوصِ نیت کی بنا پر اجر کے مستحق ٹھہریں۔ اس کی بہترین مثال ان دو صحابیوں کی ہے جن میں سے ایک نے مسجد نبویؐ کے باہر ایک لکڑی گاڑ دی تاکہ اگر کوئی شخص گھوڑے پر سوار ہو کر آئے تو اپنا گھوڑا اس کے ساتھ باندھ کر اطمینان کے ساتھ مسجد کے اندر نماز ادا کر سکے۔ دوسرے صحابیؓ نے جب مسجد کے دروازہ کے باہر لکڑی گاڑی ہوئی دیکھی تو اکھاڑ کر پھینک دی کہ جو لوگ مسجد میں نماز

ادا کرنے کے لیے آئیں گے وہ اس سے ٹھوکر کھا جائیں گے۔ معاملہ رسالت مآب ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ نے دونوں کو اس بنیاد پر اجر وثواب کا مستحق قرار دیا کہ دونوں کی نیت اچھی تھی۔ آج جو مسلمان صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ اس قدر عقیدت رکھتے ہیں تو اس کی بنیاد بھی اسی بات پر ہے کہ قرآن وحدیث میں جابجا اللہ اور اس کے رسولؐ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی مجموعی طور پر تعریف وتوصیف کی ہے اور انہیں پسندیدہ افراد قرار دیا ہے۔ اب کون مسلمان ہے جو خدا اور اس کے صادق وامین رسولؐ کے فیصلے پر تنقید کی جرأت کر سکتا ہے؟ تنقید تو بڑی بات ہے' کوئی شخص اُس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ رسولِ خدا کے کیے ہوئے فیصلے کو بطیبِ خاطر قبول نہ کرے۔ اگر رسولِ خدا کے فیصلے پر اُس کے دل میں ذرا بھی بے اطمینانی یا تردّد رہا تو وہ مسلمان ہی نہ رہا۔

اب ہم دیکھتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جو غلطیاں' خطائیں یا گناہ سرزد ہوئے ان کی کیا نوعیت تھی اور ان غلطیوں نے ان کی شخصیت کو کس قدر متاثر کیا ہے۔ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ صحابہ کرامؓ انسان تھے اور ان سے غلطی کا صدور ممکن ہے۔ لیکن جب بھی غلطی ہونے کے بعد انہیں اس کا احساس ہوا انہوں نے خدا کے حضور گڑگڑا کر معافی مانگ لی اور قرآن پاک گواہ ہے کہ انہیں معافی مل گئی۔ آج بھی ہر شخص کے لیے بارگاہِ ربّ العزت میں توبہ کی پوری گنجائش موجود ہے۔ گناہگار گناہ کے بعد توبہ بھی کر رہے ہیں لیکن کون کہہ سکتا ہے کہ اس کی توبہ نے شرفِ قبولیت پایا ہے۔ یہ برتری اور سعادت صرف صحابہ کرامؓ کو ہی حاصل ہے کہ انہوں نے اپنے قصور کا اعتراف کیا' سرکار دو عالمؐ کے ساتھ مل کر اللہ تعالیٰ سے معافی چاہی اور زندۂ جاوید کتاب میں ان کی توبہ کی قبولیت کا اعلان کر دیا گیا: ﴿لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَالْمُهَاجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ......﴾(التوبة:۱۱۷)۔

ابولبابہؓ بن عبدالمنذر بیعتِ عقبہ کے موقع پر ہجرتِ مدینہ سے قبل اسلام لائے تھے۔ انہوں نے جنگ بدر اور جنگِ احد میں شرکت کی۔ دوسرے غزوات میں بھی آنحضرت ﷺ کے ساتھ شریکِ جہاد رہے' مگر غزوۂ تبوک کے موقع پر نفس کی کمزوری نے غلبہ کیا اور یہ کسی شرعی عذر کے بغیر بیٹھے رہ گئے۔ ان کے ساتھ چھ دوسرے مخلص افراد

بھی انہی کی طرح رہ گئے۔ جب آنحضرت ﷺ غزوۂ تبوک سے واپس تشریف لائے تو ابولبابہؓ اور اُن کے دوسرے چھ ساتھیوں کو آنحضرت ﷺ کی ناراضگی برداشت کرنے کا چارہ نہ تھا۔ انہوں نے پیغمبر اسلام کی طرف سے کسی قسم کی باز پرس سے پہلے ہی خود کو ایک ستون کے ساتھ باندھ کر عہد کر لیا کہ ہم اس وقت تک نہ کھائیں گے، نہ پئیں گے اور نہ ہی آرام کریں گے جب تک ہمیں ہماری کوتاہی پر معافی نہ مل جائے یا پھر ہم اسی حال میں مر جائیں گے۔ چنانچہ کئی روز وہ اسی طرح بے خواب اور بھوکے پیاسے بندھے رہے حتیٰ کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ آنحضرت ﷺ کو اُن کی توبہ کی کیفیت معلوم ہو گئی، اور خالق دو جہاں نے اُن کی معافی کی خبر بذریعہ وحی رسول پاک ﷺ کو بتادی۔ آخر کار انہیں بتایا گیا کہ تمہاری توبہ قبول ہو گئی ہے اور خدا اور رسولؐ نے تمہیں معاف کر دیا ہے تو انہوں نے اپنے بندھن کھول کر چین کا سانس لیا اور بارگاہِ رسالت میں حاضر ہو کر عرض کی کہ ہماری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ ہم اپنے سارے مال خدا کی راہ میں صدقہ کر دیں جن کی محبت نے ہمیں فرض سے غافل کیا۔ آنحضرت ﷺ نے فرمایا کہ سارا مال دینے کی ضرورت نہیں، صرف ایک تہائی کافی ہے۔ چنانچہ وہ انہوں نے اسی وقت فی سبیل اللہ وقف کر دیا۔

حضرت کعبؓ بن مالک، بلالؓ بن اُمیہ اور مُرارہؓ بن رُبیع کا واقعہ بھی بالا جمال سورۃ التوبۃ میں مذکور ہے اور اس کی تفصیل مفسرین کرام نے احادیث کی روشنی میں لکھی ہے۔ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانی نے اس واقعہ کو بحوالہ بخاری شریف حضرت کعبؓ بن مالک کی زبانی اس طرح لکھا ہے:

''حضرت کعبؓ بن مالک فرماتے ہیں کہ تبوک کی مہم چونکہ بہت سخت اور دشوار گزار تھی، حضور ﷺ نے صحابہؓ کو تیاری کا عام حکم دیا۔ لوگ مقدور و استطاعت کے موافق سامانِ سفر درست کرنے میں مشغول تھے، مگر میں بے فکر تھا کہ جب چاہوں گا فوراً تیار ہو کر ساتھ چلا جاؤں گا۔ کیونکہ بفضلِ ایزدی اُس وقت ہر طرح کا سامان مجھ کو میسر تھا۔ ایک چھوڑ دو سواریاں میرے پاس موجود تھیں، میں اسی غفلت کے نشہ میں رہا۔ ادھر

نبی کریم ﷺ نے تمیں ہزار مجاہدین اسلام کو کوچ کا حکم دے دیا۔ مجھے اب بھی یہ خیال تھا کہ حضور ﷺ روانہ ہو گئے تو کیا ہے' اگلی منزل پر آپ ؐ سے جا ملوں گا۔ آج چلوں' کل چلوں' اسی امروز و فردا میں وقت نکل گیا۔ حضور ﷺ نے تبوک پہنچ کر فرمایا: ((مَا فَعَلَ كَعْبُ بْنُ مَالِكٍ؟)) ''کعب بن مالک کو کیا ہوا؟'' بنی سلمہ کا ایک شخص بولا یارسول اللہ! اُس کو عیش پسندی اور اعجاب وغرور نے نکلنے کی اجازت نہ دی۔ معاذ بن جبلؓ نے کہا کہ تو نے بری بات کہی۔ خدا کی قسم ہم نے اس میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ حضور ﷺ یہ گفتگو سن کر خاموش رہے۔ کعبؓ کہتے ہیں کہ آپ ؐ کی واپس تشریف آوری کے بعد بہت زیادہ وحشت اس سے ہوتی تھی کہ سارے مدینہ میں پکے منافق یا معذور مسلمان کے سوا مجھے کوئی مرد نظر نہ آتا تھا۔ بہرحال اب دل میں طرح طرح کے جھوٹے منصوبے گانٹھنے شروع کیے کہ آپ ؐ کی واپسی پر فلاں عذر کر کے جان بچا لوں گا۔ مگر جس وقت معلوم ہوا کہ حضور ﷺ خیر و عافیت سے واپس تشریف لے آئے ہیں تو دل سے سارے جھوٹ' فریب محو ہو گئے اور طے کر لیا کہ سچ کے سوا کوئی چیز اس بارگاہ میں نجات دلانے والی نہیں۔ حضور ﷺ مسجد میں رونق افروز تھے' اصحابؓ کا مجمع تھا۔ منافقین جھوٹے حیلے بہانے بنا کر ظاہری گرفت سے چھوٹ رہے تھے کہ مَیں حضور ﷺ کے سامنے آیا۔ میرے سلام کرنے پر آپ ؐ نے غضب آمیز تبسم فرمایا اور غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔ مَیں نے عرض کیا یارسول اللہ! اگر اس وقت میں دنیا والوں میں سے کسی دوسرے کے سامنے ہوتا تو آپ ؐ دیکھتے کہ کس طرح زبان زوری اور چرب لسانی سے جھوٹے حیلے حوالے کر کے اپنے کو صاف بچا لیتا۔ مگر یہاں تو معاملہ ایک ایسی ذاتِ مقدس سے ہے جسے جھوٹ بول کر اگر میں راضی بھی کر لوں تو تھوڑی دیر کے بعد خدا اس کو سچی بات پر مطلع کر کے مجھ سے ناراض کر دے گا۔ برخلاف اس کے سچ بولنے میں گو تھوڑی دیر کے لیے آپ ؐ کی خفگی برداشت کرنی پڑے گی' لیکن اُمید کرتا ہوں کہ خدا کی طرف سے اس کا انجام بہتر ہوگا اور آخر کار سچ بولنا ہی مجھے خدا اور رسول ؐ کے غصے سے نجات دلائے گا۔ یارسول اللہ! واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس غیر حاضری کا کوئی عذر نہیں۔ جس وقت

حضورﷺ کی ہم کابی کے شرف سے محروم ہوا اُس وقت سے زیادہ فراخی اور مقدرت کبھی مجھ کو حاصل نہ ہوئی تھی۔ میں مجرم ہوں' آپؐ کو اختیار ہے جو فیصلہ چاہیں میرے حق میں دیں۔ آپؐ نے فرمایا کہ یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی۔ اچھا جاؤ اور خدائی فیصلہ کا انتظار کرو۔ میں اٹھا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ (بلالؓ بن اُمیہ اور مرارہؓ بن ربیع) یہ دو شخص بھی میرے جیسے ہیں۔ ہم تینوں کے متعلق آپؐ نے حکم دے دیا کہ کوئی ہم سے بات نہ کرے' سب علیحدہ رہیں۔ چنانچہ کوئی مسلمان ہم سے بات نہ کرتا تھا نہ سلام کا جواب دیتا تھا۔ وہ دونوں تو خانہ نشیں ہو گئے۔ شب و روز گھر میں وقفِ گریہ و بکا رہتے تھے۔ میں ذرا سخت اور قوی تھا' مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتا۔ حضورﷺ کو سلام کر کے دیکھتا تھا کہ جواب میں لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں۔ جب میں حضورﷺ کی طرف دیکھتا تو آپؐ میری طرف سے منہ پھیر لیتے تھے۔ مخصوص اقارب اور محبوب ترین اعزہ بھی مجھ سے بیگانہ ہو گئے تھے۔ اسی اثنا میں ایک روز ایک شخص نے شاہ ''غسان'' کا خط مجھے دیا جس میں میری مصیبت پر اظہارِ ہمدردی کرنے کے بعد دعوت دی تھی کہ میں اس کے ملک میں آ جاؤں' وہاں میری بہت آؤ بھگت ہو گی۔ میں نے پڑھ کر کہا یہ بھی ایک مستقل امتحان ہے۔ آخر وہ خط میں نے نذرِ آتش کر دیا۔ چالیس دن گزرنے کے بعد بارگاہِ رسالتؐ سے جدید حکم پہنچا کہ میں اپنی عورت سے بھی علیحدہ رہوں۔ چنانچہ اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ اپنے میکے چلی جائے اور جب تک خدا کے یہاں سے میرا کوئی فیصلہ نہ ہو وہیں ٹھہری رہے۔ سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر اسی حالت میں موت آ گئی تو حضورﷺ میرا جنازہ نہ پڑھائیں گے اور فرض کیجیے ان دنوں میں آپﷺ کی وفات ہو گئی تو مسلمان ہمیشہ یہی معاملہ مجھ سے رکھیں گے' میری میت کے قریب بھی کوئی نہ آئے گا۔ غرض پچاس دن اسی حالت میں گزرے کہ خدا کی زمین مجھ پر باوجود فراخی کے تنگ تھی' بلکہ عرصۂ حیات تنگ ہو گیا تھا۔ زندگی موت سے زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی کہ یکا یک جبل سلع سے آواز آئی ''یا کعب بن مالك! اَبْشِرْ'' (اے کعبؓ بن مالک خوش ہو جا) میں سنتے ہی سجدے میں گر پڑا۔ معلوم ہوا کہ اخیر شب میں حق تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر

علیہ السلام کو خبر دی گئی کہ ہماری توبہ مقبول ہے۔آپؐ نے بعد نمازِ فجر صحابہؓ کو مطلع فرمایا۔ایک سوار میری طرف دوڑا کہ بشارت سنائے۔مگر دوسرے شخص نے پہاڑ پر زور سے للکارا۔ اُس کی آواز سوار سے پہلے پہنچی اور مَیں نے اپنے بدن کے کپڑے اتار کر آواز لگانے والے کو دیے۔پھر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔لوگ جوق در جوق آتے اور مجھے مبارک باد دیتے تھے۔مہاجرینؓ میں سے حضرت طلحہؓ نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خوشی سے چاند کی طرح چمک رہا تھا۔آپؐ نے فرمایا: ''خدا نے تیری توبہ قبول فرمائی''۔میں نے عرض کیا اس توبہ کا تتمہ یہ ہے کہ اپنا کل مال و جائیداد خدا کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔آپؐ نے فرمایا کہ سب نہیں کچھ اپنے لیے روکنا چاہیے۔چنانچہ میں نے خیبر کا حصہ الگ کر کے باقی مال صدقہ کر دیا۔چونکہ محض سچ بولنے سے مجھ کو نجات ملی تھی اس لیے عہد کیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا۔اس عہد کے بعد بڑے سخت امتحانات پیش آئے مگر الحمد للہ میں سچ کہنے سے کبھی نہ ہٹا اور نہ اِن شاء اللہ تازیست ہٹوں گا''۔

ابولبابہؓ بن عبد المنذرؓ اُن کے چھ ساتھیوں اور کعبؓ بن مالک اور اُن کے دو ساتھیوں کے مذکورہ بالا دونوں واقعات سے جہاں یہ معلوم ہوتا ہے کہ اصحابِ رسولؐ منزہ عن الخطا نہ تھے‘ وہاں یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جب خطا کے بعد خدا کے حضور سچے دل کے ساتھ توبہ کی تو بارگاہِ صمدیت سے اُن کی توبہ قبول ہوئی اور اُن کی خطا کی معافی کا اعلان قرآن پاک میں کر دیا گیا۔جب خدا نے ان کے خلوص اور اخلاص کے پیشِ نظر اُن کو معاف کر دیا تو اب کون ہے جو خدائی فیصلے کے موجود ہوتے ہوئے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو خطا کار کہے۔

ابولبابہؓ اور کعبؓ بن مالک کے واقعات سے ملتا جلتا ایک اور واقعہ قرآن پاک میں سورۃ الممتحنۃ میں ایک بدری صحابی حاطبؓ بن ابی بلتعہ کا ہے۔صلح حدیبیہ دو سال قائم رہی‘ بعد ازاں کفارِ مکہ کی طرف سے ٹوٹ گئی۔تب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی کے ساتھ مکہ فتح کرنے کا ارادہ کر لیا اور تیاری میں لگ گئے اور اس بات کو خفیہ رکھا تاکہ کفارِ مکہ اطلاع

پا کر لڑائی کا سامان نہ شروع کر دیں اور اس طرح حرم شریف میں لڑنا ناگزیر ہو جائے۔ حضرت حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے مکہ والوں کو خط لکھ بھیجا کہ محمد ﷺ کا لشکر اندھیری رات اور سیل بے پناہ کی مانند تم پر ٹوٹنے والا ہے۔ حضور ﷺ کو بذریعہ وحی اس بات کا علم ہو گیا' آپؐ نے حضرت علیؓ اور چند دوسرے صحابہؓ کو حکم دیا کہ فلاں مقام پر ایک عورت مکہ کی طرف سفر کرتی ہوئی جا رہی ہے اور اُس کے پاس ایک خط ہے' وہ اس سے لے کر آؤ۔ صحابہ کرامؓ تیزی کے ساتھ روانہ ہو گئے اور اس عورت کو پا لیا اور اُس سے خط کا مطالبہ کیا۔ اس نے بہت لیت و لعل کی مگر ڈرانے دھمکانے پر خط اُن کو نکال کر دے دیا۔ خط حضور ﷺ کے پاس پہنچ گیا۔ پڑھنے پر معلوم ہوا کہ حاطبؓ بن ابی بلتعہ نے یہ رقعہ کفارِ مکہ کے نام بھیجا تھا جس میں انہیں حضور ﷺ کی جنگی تیاریوں کی اطلاع دی تھی۔ آپؐ نے حاطبؓ کو بلا کر پوچھا تو انہوں نے جواب دیا: ''یا رسول اللہ! نہ مَیں نے کفر کیا ہے اور نہ اسلام سے پھرا ہوں' سچی بات یہ ہے کہ میرے اہل و عیال مکہ میں ہیں' وہاں اُن کی حمایت کرنے والا کوئی نہیں۔ میں نے کافروں پر ایک احسان کر کے یہ چاہا کہ وہ لوگ اس کے معاوضہ میں میرے اہل و عیال کی خبر لیتے رہیں اور اُن سے اچھا سلوک کریں۔ فتح و نصرت کے جو وعدے اللہ نے آپؐ سے کیے ہیں وہ یقیناً پورے ہو کر رہیں گے' کسی کے روکے رک نہیں سکتے''۔ آنحضرت ﷺ نے سن کر حاضرین سے فرمایا: ''حاطبؓ نے تم سے سچی بات کہی ہے!'' حضرت عمرؓ نے اٹھ کر کہا: ''یا رسول اللہ! مجھے اجازت دیجیے کہ اس منافق کی گردن مار دوں' اس نے اللہ اور اس کے رسولؐ اور مسلمانوں سے خیانت کی ہے!'' حضور ﷺ نے فرمایا: ''اس شخص نے جنگ بدر میں حصہ لیا ہے' تمہیں کیا خبر! ہو سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کو ملاحظہ فرما کر کہہ دیا ہو کہ تم خواہ کچھ کرو مَیں نے تم کو معاف کیا''۔ یہ بات سن کر حضرت عمرؓ رونے لگے اور انہوں نے کہا اللہ اور اس کے رسول ہی سب سے بہتر جانتے ہیں۔

قرآن پاک سے ماخوذ ان مثالوں سے یہ بات ثابت ہوئی ہے کہ اصحابِ رسولؐ تقرب الی اللہ کے اس مقام پر فائز تھے کہ اُن سے خطائیں اور گناہ بشری تقاضوں کے

تحت صادر تو ضرور ہوئے، لیکن بارگاہِ خداوندی میں اُن کے بلند مقام میں فرق نہ آیا اور وہ برابر خدا اور اس کے رسولؐ کے نزدیک پسندیدہ افراد رہے۔ اللہ تعالیٰ شکور ہے، اُس نے اصحابِ رسولؐ کو یہ فضیلت اُن کے خلوص اور اخلاص کے پیشِ نظر دی کہ انہوں نے دنیا و مافیہا کو رضائے الٰہی کے مقابلہ میں ہر وقت ہیچ سمجھا اور اپنی پوری زندگی اسلام کی خاطر سر پر کفن باندھے رکھا۔

آنحضرت ﷺ کے منظورِ نظر صحابہؓ کی غلطی بعض اوقات پوری اُمت کے لیے رحمت ثابت ہوئی۔ اوّل اوّل رمضان کے روزے کا حکم اس طرح تھا کہ رات کو ایک دفعہ آنکھ لگ جائے تو پھر پوری رات مباشرت کی اجازت نہ تھی۔ چند صحابہ کرامؓ کی طرف سے اس حکم کی پابندی نہ کی جاسکی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے پوری اُمت کے لیے اس شرط کو نرم کر دیا اور قرآن پاک میں حکم آ گیا کہ ''(رمضان شریف کی) راتوں میں تم اپنی عورتوں کے ساتھ بےحجاب ہو سکتے ہو!''

کیا اس حقیقت سے انکار کیا جا سکتا ہے کہ پوری اُمت کو یہ سہولت صحابہ کرامؓ کی غلطی ہی کے پیشِ نظر ملی ہے؟ سچ تو یہ ہے کہ غفور اور رحیم ربّ کا رسول رحمۃ للعالمینؐ ہے اور آپؐ کے ساتھی اُمت کے جملہ افراد کے لیے رحمت ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے عرفات کے میدان میں حجۃ الوداع کے موقع پر ایک عظیم اجتماع کو خطاب کر کے فرمایا: ''حاضرین میری یہ باتیں غائبین تک پہنچا دیں!'' صحابہ کرامؓ نے آنحضرت ﷺ کے فرمودات کمال احتیاط سے آگے پہنچائے۔ قرآن و حدیث اور سنتِ رسولؐ صحابہ کرامؓ ہی کی بدولت ہم تک پہنچے ہیں۔ انصاف سے دیکھا جائے تو ہر زمانے کے مسلمان جہاں خدا اور اس کے رسولؐ کے احسان مند ہیں وہاں صحابہ کرامؓ کے زیرِ بار احسان ہیں کہ انہوں نے کمال دیانت کے ساتھ دین کی یہ امانت اپنے سے بعد والوں تک پہنچائی۔ صحابہ کرامؓ کو اپنے آقا و مولیٰ سے اس قدر محبت تھی کہ وہ آپؐ کے وضو کا مستعمل پانی بھی زمین پر گرنے نہیں دیتے تھے بلکہ اپنے چہروں اور سینوں پر مل لیتے تھے۔ اُن کے نزدیک نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مقدس دین اور دنیا کی ہر نعمت سے بڑھ کر

تھی۔ اس کی تائید میں کتبِ سیر و احادیث کا مطالعہ اطمینان کا باعث ہوگا۔ یہاں چند احادیث لکھی جاتی ہیں، جن سے معلوم ہوگا کہ خود آنحضرت ﷺ کے نزدیک صحابہ کرامؓ کا کیا مقام تھا۔

حضرت عبداللہؓ بن مسعود سے روایت ہے کہ آنحضرت ﷺ نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ نے اپنے سب بندوں کے دلوں پر نظر ڈالی تو محمد ﷺ کو ان سب قلوب میں بہتر پایا، اُن کو اپنی رسالت کے لیے مقرر کر دیا۔ پھر قلبِ محمد ﷺ کے بعد دوسرے قلوب پر نظر فرمائی تو اصحابِ محمدؐ کے قلوب کو دوسرے سب بندوں کے قلوب سے بہتر پایا اور اُن کو اپنے نبیؐ کی صحبت اور دین کی نصرت کے لیے پسند کر لیا''۔ (مشکوٰۃ)

حضرت جابرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسولِ پاکؐ نے فرمایا: ''اُس مسلمان کو آگ نہ چھوئے گی جس نے مجھ کو دیکھا ہو یا اُس شخص کو دیکھا ہو جس نے مجھ کو دیکھا ہو''۔ (مشکوٰۃ، باب مناقب صحابہؓ)

حضرت عمران بن حصین کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''میری اُمت کے بہترین لوگ میرے قرن کے لوگ ہیں، پھر وہ لوگ بہتر ہیں جو اُن سے متصل و پیوستہ ہیں، پھر وہ لوگ بہتر ہیں جو اُن سے متصل ہیں...... الخ''۔ (بخاری و مسلم)

حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میرے اصحاب کو برا نہ کہو، اس لیے کہ اگر تم میں سے کوئی اُحد پہاڑ کے برابر (خدا کی راہ میں) خرچ کرے تو صحابی کے ایک مُد یا آدھے مُد کے ثواب کے برابر بھی اس کا ثواب نہ ہو گا''۔ (بخاری و مسلم)

آنحضرت ﷺ نے اپنے ساتھیوں کے فضائل جس قدر بیان کیے ہیں، اُن کا اس مضمون میں احاطہ ممکن نہیں۔ جن افراد کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی معیت کے لیے منتخب فرمایا وہ اپنی قسمت پر جس قدر بھی ناز کریں کم ہے۔ دس صحابیوں کے نام لے کر آپؐ نے انہیں جنت کی بشارت دی، اُن کے نام یہ ہیں: حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر فاروق، حضرت عثمان غنی، حضرت علی، حضرت طلحہ، حضرت زبیر، حضرت سعد، حضرت عبدالرحمٰن بن

عوف' حضرت ابوعبیدہ بن الجراح اور حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہم۔ ان حضرات کو عشرۂ مبشرہ کہتے ہیں۔ حضرت سعید بن زید رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں خدا کی قسم! صحابہ کرامؓ میں سے کسی شخص کا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ کسی جہاد میں شریک ہونا جس میں اس کا چہرہ غبار آلود ہو جائے' غیر صحابہ سے ہر شخص کی عمر بھر کی عبادت و عمل سے بہتر ہے اگر چہ اس کو عمرِ نوح علیہ السلام عطا ہو جائے۔ (جمع الفوائد' ص۴۹۲' ج ۲' طبع مصر)

جماعتِ صحابہؓ میں فضیلت کے اعتبار سے خلفائے راشدینؓ کا مقام سب سے بلند ہے اور وہ بلاشبہ انبیاء کے بعد مخلوقات میں سب سے افضل ہیں۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''(ایک روز) جبریل علیہ السلام میرے پاس آئے اور میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور مجھ کو جنت کا وہ دروازہ دکھایا جس سے میری اُمت جنت میں داخل ہوگی''۔ ابوبکرؓ نے کہا یا رسول اللہ! کاش مَیں بھی آپؐ کے ساتھ ہوتا کہ اُس دروازہ کو دیکھ لیتا۔ آپؐ نے فرمایا: ''ابوبکرؓ! آگاہ ہو کہ میری اُمت میں سے سب سے پہلا شخص تو ہوگا جو جنت میں داخل ہوگا''۔ (مشکوٰۃ)

ایک روز حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے' آپؐ نے دیکھا تو فرمایا: ((اَنْتَ عَتِيْقُ اللّٰهِ مِنَ النَّارِ)) (رواہ الترمذی) ''تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے دوزخ کی آگ سے آزاد کیا ہوا ہے!'' اس روز سے ابوبکرؓ کا نام عتیق ہو گیا۔ ایک دفعہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا: ''میں نہیں جانتا کہ کب تک تمہارے درمیان رہوں' پس تم میرے بعد ابوبکرؓ و عمرؓ کا اتباع کرنا!''

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ایک چاندنی رات میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا سرمبارک میری گود میں تھا۔ میں نے عرض کیا: ''یا رسول اللہ! کیا کسی شخص کی اتنی نیکیاں بھی ہیں جتنے آسمان پر ستارے ہیں؟'' آپؐ نے فرمایا: ''ہاں' عمرؓ کی اتنی نیکیاں ہیں!'' پھر میں نے پوچھا ''اور ابوبکر کی نیکیوں کا کیا حال ہے؟'' آپؐ نے فرمایا: ''عمرؓ کی نیکیاں ابوبکرؓ کی ایک نیکی (غارِ ثور میں معیت) کے برابر ہیں''۔

حضرت ابوذرؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول پاکؐ نے فرمایا: ''خداوند تعالیٰ نے حق

کو عمرؓ کی زبان پر رکھا ہے اور وہ حق بات کہتا ہے''۔ (مشکوٰۃ بحوالہ ترمذی)

حضرت عقبہ بن عامرؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر ہوتا''۔

حضرت ابن عمرؓ روایت کرتے ہیں کہ ایک دن نبی پاک ﷺ گھر سے نکل کر مسجد میں اس طرح تشریف لائے کہ ابوبکرؓ و عمرؓ آپؐ کے دائیں بائیں تھے' اور نبی پاکؐ دونوں کے ہاتھ اپنے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے تھے اور فرمایا: ((هٰكَذَا نُبْعَثُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ)) (رواہ الترمذی) ''قیامت کے روز ہم اسی طرح اٹھائے جائیں گے''۔

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ ایک روز نبی ﷺ اور آپؐ کے ہمراہ ابوبکرؓ' عمرؓ اور عثمانؓ کوہِ احد پر چڑھے۔ اُحد پہاڑ حرکت کرنے لگا۔ آپؐ نے پاؤں سے ٹھوکر لگائی اور کہا: ''اُحد ٹھہر جا' تیرے اوپر ایک نبی ہے' ایک صدیق ہے اور دو شہید ہیں''۔ (بخاری)

حضرت سعدؓ بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علیؓ کی نسبت فرمایا: ''تو میرے لیے ایسا ہی ہے جیسے کہ موسیٰؑ کے لیے ہارونؑ۔ ہاں البتہ میرے بعد کوئی نبی نہیں ہے''۔ (بخاری و مسلم)

حضرت زیدؓ بن ارقم کہتے ہیں کہ نبی پاک ﷺ نے فرمایا: ''جس شخص کا میں دوست ہوں علیؓ اس کا دوست ہے''۔ (ترمذی' احمد)

حضرت عمران بن حصینؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہے: ''علیؓ مجھ سے ہے اور مَیں علی سے ہوں اور علیؓ ہر ایماندار کا ساتھی ہے''۔ (ترمذی)

ان احادیث سے ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت ﷺ کو اپنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے جنہوں نے ہر مشکل وقت میں آپؐ کا ساتھ دیا اور دین اسلام کی خاطر اور اللہ کی رضا کے لیے محبوب ترین چیزوں کو قربان کرنے سے دریغ نہ کیا' کس قدر محبت تھی۔ یہ چند ارشاداتِ نبوی بطور نمونہ پیش کیے گئے ہیں' ورنہ مستند اسلامی لٹریچر صحابہؓ کے فضائل سے مملو ہے۔ دراصل یہ ساری احادیث قرآنی الفاظ ''رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ'' کی قسم کی آیات اور سورۃ الفتح کے آخری رکوع کی تفسیر ہیں۔

ان سب تفصیلات کے باوجود مسلمانوں ہی کے ایک گروہ نے اصحابِ رسولؐ کو بایں ہمہ فضیلت اپنی نفرت، بغض، حسد اور غضب کا نشانہ بنایا ہے۔ حالانکہ مسلمان تو ایک طرف غیر مسلم مؤرخین اور مصنفین بھی اصحابِ رسولؐ کی تعریف کرتے ہیں اور انہیں ہر قسم کے حسن اخلاق کا مظہر خیال کرتے ہیں۔ طوالت کے خوف سے غیر مسلم مؤرخین و مصنفین کی آراء کے اقتباس درج نہیں کیے جا رہے۔ البتہ ایک ضروری بات وضاحت طلب ہے کہ اس بات کی رسول اکرم ﷺ نے نہ صرف نشاندہی کی بلکہ بڑے زور سے یہ بیان فرمایا کہ اصحابِ رسولؐ کو سب وشتم اور طعن وتشنیع کا نشانہ بنایا جائے گا۔ آپ کی دُوررَس نگاہ اور کمالِ فراست سے یہ پیشین گوئی عین ممکن ہے۔ ذرا غور کرنے سے بات سمجھ میں آ سکتی ہے کہ جب انبیاء و رسل جن کی فضیلت وعظمت حد درجہ مسلّم ہے، اپنے اپنے دور میں مظالم کا تختۂ مشق بنائے گئے، ہر ممکن طریقہ سے ستائے گئے اور اُن میں سے بعض کو قتل بھی کر دیا گیا تو اصحابِ رسولؐ کے ساتھ بھی ایسا ہی کیا جانا ضروری اور لابدی ہے۔ کیونکہ انبیاء ورُسل کے قریب ترین یہی پاک باز لوگ ہیں۔ خود آنحضرت ﷺ کا فرمان ہے کہ علماء تو انبیاء کے وارث ہوتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ اُمت کے علماء کے سرخیل بلکہ علماء ساز تو یہی صحابہ کرامؓ تھے۔ پس بادنیٰ تأمل یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اصولاً جو لوگ بھی پورے طور پر انبیائے کرام علیہم السلام کے نقشِ قدم پر چلیں گے بدفطرت لوگ ہر دور میں اُن کی مخالفت پر کمربستہ رہیں گے اور اُن کی استقامت کے مطابق ہی اُن کی مزاحمت کی جائے گی۔ آنحضرت ﷺ انبیاء کرام کے سردار تھے۔ چنانچہ آپؐ کے فرمان کے مطابق آپ کو تمام نبیوں سے بڑھ کر تکالیف پہنچائی گئیں۔ چونکہ صحابہ کرامؓ کا گروہ اُسوۂ حسنہ میں انبیائے کرام کے قریب ترین ہے لہٰذا وہ سنت یہاں بھی پوری ہو کر رہے گی جو انبیاء کے ساتھ ہوئی، یعنی وہ ستائے گئے۔

حضرت عبداللہ بن مغفلؓ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا: ''اللہ سے ڈرو، اللہ سے ڈرو میرے صحابہؓ کے معاملے میں، میرے بعد اُن کو (طعن وتشنیع کا) نشانہ نہ بنانا، کیونکہ جس شخص نے اُن سے محبت کی تو میری محبت کے ساتھ اُن سے محبت کی

اور جس نے اُن سے بغض رکھا تو میرے بغض کے ساتھ ان سے بغض رکھا' اور جس نے ان کو ایذا پہنچائی اُس نے مجھے ایذا پہنچائی' اور جس نے مجھے ایذا دی اس نے اللہ تعالیٰ کو ایذا پہنچائی' اور جو اللہ کو ایذا پہنچانا چاہے تو قریب ہے کہ اللہ اس کو عذاب میں پکڑے گا''۔(ترمذی)

حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب تم ایسے لوگوں کو دیکھو جو میرے صحابہؓ کو برا کہتے ہیں تو تم ان سے کہو خدا کی لعنت ہو تمہارے اس برے فعل پر''۔ (ترمذی)

صحابہ کرامؓ میں سے بھی ابوبکر صدیق' عمر فاروق' عثمان غنی اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم کا مقام سب سے بلند ہے۔ ان کے فضائل اور مناقب کا کسی قدر تذکرہ ہو چکا۔ اس کے علاوہ یہ کہ نبی اکرم ﷺ نے ان کو نہ صرف اپنے خصوصی مشیروں کے طور پر اختیار کیا ہوا تھا بلکہ اُن کے ساتھ قریبی رشتہ داریاں قائم کر لی تھیں اور اس طرح انہیں سرور انبیاء کا وہ قرب نصیب ہو گیا جس سے وہ باقی صحابہؓ سے ممتاز ہو گئے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کو آپ ﷺ نے ان کی صغر سنی کے باوجود اپنے نکاح میں لے لیا۔ اسی طرح حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو اُمّ المؤمنین بننے کا شرف حاصل ہوا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ وہ صحابی رسولؐ ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنی دو بیٹیاں یکے بعد دیگرے اُن کے نکاح میں دیں اور اس طرح انہیں ''ذوالنورین'' کا لقب ملا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے چچا زاد بھائی تھے۔ انہوں نے تو پرورش ہی آپؐ کے ہاں پائی تھی۔ اس لیے وہ تو پہلے ہی رسول پاک ﷺ کے قریبی تھے۔ بعد ازاں آپؐ نے اپنی سب سے چھوٹی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح ان سے کر دیا اور انہیں دوسرے تعلقات کے علاوہ دامادئ رسول کا شرف بھی حاصل ہو گیا۔

ان چاروں حضرات کو جو خصوصی تعلق اور قرب رسول پاک ﷺ کے ساتھ تھا وہ دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے پوشیدہ نہ تھا۔ چنانچہ سب حضرات ان چاروں کو عزت اور تکریم کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان ہی چاروں کو یکے بعد دیگرے رسول پاکؐ کی وفات کے

بعد خلافت کی ذمہ داری سونپی گئی اور امیر المؤمنین بنائے گئے۔ اللہ ان سے راضی ہو۔

حضرت عرباض بن ساریہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''تم میں جو شخص میرے بعد رہے گا تو وہ بہت اختلافات دیکھے گا' تو تم لوگوں پر لازم ہے کہ میری سنت اور خلفائے راشدین المہدیین کی سنت کو اختیار کرو۔ اس کے ساتھ چمٹ جاؤ اور اس کو دانتوں سے مضبوط تھامو' اور نو ایجاد شدہ اعمال سے پرہیز کرو' کیونکہ دین میں ہر نیا عمل بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے''۔ (ابوداؤد و ترمذی)

رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

﴿يَوْمَ لَا يُخْزِي اللّٰهُ النَّبِيَّ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ ۚ﴾ (التحریم:۸)

''اس دن اللہ ذلیل نہیں کرے گا نبیؐ کو اور ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور اُس کے ساتھ ہیں''۔

یہ فیصلہ کن آیت بتاتی ہے کہ جس طرح قیامت کے دن نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسوائی محال ہے اسی طرح نبیؐ کے ساتھیوں کی رسوائی بھی محال ہے' اور جو شخص اللہ تعالیٰ کے ہاں مکرم ہوا حقیقی معنوں میں وہی صاحب تکریم ہوا خواہ دنیا والے اس کے متعلق کیسے ہی خیالات رکھیں۔ حضرت مسیح عیسیٰ بن مریم علیہ السلام خدا کے برگزیدہ بندے اور اولوالعزم رسول ہیں' لیکن کچھ لوگ انہیں لعنتی سمجھتے ہیں (نعوذ باللہ' نقل کفر کفر نباشد)۔ خدائی فیصلے کے سامنے ان لوگوں کی زبان درازی کی کوئی وقعت نہیں' سوائے اس کے کہ اللہ کے رسول کے خلاف زبان کھول کر وہ خود اپنے آپ پر ابدی لعنت مسلط کرلیں۔ اسی طرح رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری اور روحانی رشتہ داروں یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سب و شتم اور مطعون کرنے سے ان پاک بازوں کا تو کچھ نہیں بگڑتا' البتہ ایسا کرنے والے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ناراضی اور خدا کے غضب سے کبھی نہیں بچ سکیں گے۔

اللہ تعالیٰ سب مسلمانوں کو اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی محبت اور تکریم نصیب فرمائے' آمین!

علامہ اقبال اور پاکستانی قوم

سوانحی خاکہ

علامہ اقبال کے اَجداد کشمیری پنڈت تھے جو ایک ولیٔ کامل کے ہاتھ پر اسلام لائے۔ آپ کے والدین نے سیالکوٹ میں رہائش اختیار کی جہاں ۱۸۷۶ء یا ۱۸۷۷ء میں آپ کی پیدائش ہوئی اور اقبال نام رکھا۔ مشن ہائی سکول سیالکوٹ سے میٹرک پاس کیا اور مرے کالج میں داخلہ لیا۔ یہاں آپ کو شمس العلماء مولانا سید میر حسنؒ جیسا استاد مل گیا۔ انہوں نے آپ کے اندر جوہر قابل دیکھا تو بھرپور توجہ دی۔ یہاں سے اقبال کی صلاحیتوں کو نمایاں ہونے کا موقع ملا جس کا اعتراف ان کے اساتذہ نے بھی کیا۔

ایف اے پاس کرنے کے بعد آپ وقت کے معروف ترین تعلیمی ادارے گورنمنٹ کالج لاہور میں داخل ہوئے اور فلسفہ اور عربی کے مضامین کے ساتھ بی۔اے پاس کیا۔ پھر وہیں سے فلسفہ میں ایم۔اے کیا اور جلد ہی اورینٹل کالج لاہور میں فلسفہ اور اقتصادیات کے لیکچرر مقرر ہوئے۔ اگلے ہی سال گورنمنٹ کالج لاہور میں فلسفہ اور انگریزی کے اسسٹنٹ پروفیسر مقرر ہوئے۔ کالج کے زمانۂ طالب علمی میں انہیں ڈاکٹر آرنلڈ کی صحبت نصیب ہوئی جو خود انتہائی علم دوست انسان تھے۔ انہیں عربی اور اسلامیات سے بہت دلچسپی تھی۔ عیسائیت پر پختہ یقین کے باوجود تعصب سے پاک تھے۔ ''دعوتِ اسلام'' ان کی مشہور کتاب ہے۔

۱۹۰۵ء میں آپ برطانیہ گئے۔ کیمبرج میں داخلہ لیا اور فلسفۂ اخلاق کی ڈگری حاصل کی۔ بعدازاں میونخ یونیورسٹی سے پی۔ایچ۔ڈی کی ڈگری حاصل کی۔ آپ کے مقالہ کا عنوان تھا: ''Development of Metaphysics in Persia''
اب آپ لندن واپس آئے تو بیرسٹری پاس کی۔ یہاں ڈاکٹر آرنلڈ کی غیر حاضری میں

چھ ماہ تک ان کے قائم مقام کی حیثیت سے لندن یونیورسٹی میں عربی کے پروفیسر رہے۔ انگلستان میں قیام کے دوران وقت کے چوٹی کے علماء وفضلاء کے ساتھ رابطہ رہا۔

ولایت سے واپسی پر آپ لاہور آ گئے اور یہاں سکونت اختیار کی۔ ۱۹۲۶ء میں دوستوں کے اصرار پر پنجاب کونسل میں مسلمانوں کی نمائندگی کے لیے کھڑے ہوئے اور کامیاب ہوئے۔ تین سال تک اس منصب پر رہے اور ملک وقوم کی بیش بہا خدمات انجام دیں۔ آپ کی عظمت کے اعتراف میں برطانوی سرکار نے ''سر'' کا خطاب دیا' مگر اُن کی نگاہ میں ان خطابات کی کوئی اہمیت نہ تھی' کیونکہ وہ کسی اور ہی جہاں میں رہتے تھے۔ شعر کہنے کی صلاحیت ان کے اندر کمال کی تھی۔ ابتدا میں جب وقت کے معروف ترین شاعر داغ دہلوی کو اصلاح کے لیے نظمیں بھیجیں تو وہ آپ کے ملکۂ شعر گوئی سے متأثر ہوئے اور بعد ازاں اقبال کا استاد ہونے پر فخر کرتے رہے۔ اقبال کی شاعری اگرچہ فنی خوبیوں سے بھی مالا مال تھی تاہم ان کا مقصد صرف شعر گوئی یا شعر برائے شعر نہ تھا' بلکہ وہ مسلمان قوم کا درد اپنے دل میں محسوس کرتے تھے اور انہوں نے اسی جذبے کو خوبصورت اشعار میں ظاہر کر کے ملت اسلامیہ کو بیدار کرنے کی کوشش کی ہے۔

علامہ اقبال نے قانون کی پریکٹس بھی کی' لیکن شاعرانہ دل' فلسفیانہ مزاج' صوفیانہ طبیعت اور جستجوئے علم کا ذوق رکھنے والے شخص کو وکالت سے کیا دلچسپی ہوسکتی ہے! چنانچہ وکالت کو چھوڑا اور پوری توجہ کے ساتھ ملت اسلامیہ کی فلاح و بہبود کے کام میں لگ گئے۔ ۱۹۲۸ء میں آپ کو انجمن اسلامیہ مدراس نے اسلام پر لیکچر دینے کی دعوت دی۔ چنانچہ آپ نے چھ لیکچر دیے۔ ان لیکچرز کو قبولِ عام حاصل ہوا۔ اب یہ کتابی صورت میں بھی دستیاب ہیں۔ دسمبر ۱۹۳۰ء میں سرکار برطانیہ نے آپ کو گول میز کانفرنس میں نمائندہ مقرر کر کے لندن بھیجا۔

جدوجہد آزادی

مسلم لیگ کے سالانہ اجلاس منعقدہ ۱۹۳۰ء میں آپ نے صدارتی خطبہ میں مسلمانانِ ہند کے لیے ایک آزاد اور خود مختار ریاست کے قیام کا مطالبہ پیش کیا جو برصغیر

کے شمال مغربی علاقوں پر مشتمل ہو جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ یہ وہ سرزمین ہوگی جہاں مسلمان آئیڈیل اسلامی ریاست قائم کریں گے۔ علامہ اقبال کے یہ الفاظ الہامی ثابت ہوئے اور محمد علی جناح کی آواز پر مسلم قوم نے لبیک کہا۔ چنانچہ نہ صرف انگریز کو برصغیر سے نکل جانا پڑا بلکہ مسلمانوں کو پاکستان کی صورت میں ایک خطۂ ارض مل گیا۔ علامہ اقبال کی وفات کو ابھی پورے دس سال نہ گزرے تھے کہ مصورِ پاکستان کے خواب کی تعبیر نے حقیقت کا روپ دھار لیا۔

علامہ اقبال کا سادہ اندازِ زندگی ہر شخص کو متاثر کرتا تھا۔ ان کا لباس سادہ، رہائش سادہ اور گفتگو بھی سادہ ہوتی تھی۔ ان کی زندگی کا ہر پہلو سادگی کا نمونہ تھا۔ تکلفات کو آپ ناپسند کرتے تھے۔ آپ کا دروازہ ہر چھوٹے بڑے کے لیے کھلا رہتا۔ جو شخص بھی ملاقات کا خواہش مند ہوتا بلا کسی رکاوٹ کے آپ کو مل سکتا تھا۔

علامہ اقبال نے کبھی نمایاں ہونے کی کوشش نہیں کی۔ لیکن ان کا بامقصد زندگی گزارنے کا انداز اس قدر پُرکشش تھا کہ جلد ہی شہرت کے آسمان کے تارے بن گئے اور دیکھتے ہی دیکھتے بین الاقوامی شخصیت بن گئے۔ جوں جوں وقت گزر رہا ہے آپ کے مقام و مرتبہ کے کئی دوسرے پہلو ظاہر ہو رہے ہیں اور ان کی مقبولیت میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔

علامہ اقبال کا دل سوز و گداز کا خزینہ تھا۔ اُمت کے درد کو اِس قدر محسوس کرتے کہ ملت کی بے حسی کا تذکرہ کرتے کرتے اکثر رونے لگتے۔ رسول اللہ ﷺ کی محبت میں فنا تھے۔ آپ ﷺ کا نام زبان پر آتے ہی جلتی ہوئی شمع کی طرح پگھلنے لگتے۔ درود شریف کثرت سے پڑھتے۔ ان کے نزدیک محبوبِ خداؐ کے ساتھ محبت ہی انسان کو اشرف المخلوقات بناتی ہے۔ آپ کے کلام میں سوزِ عشقِ مصطفیٰ ﷺ نمایاں ہے۔ آپ تنہائی پسند تھے اور یہ کوئی عجیب بات نہیں، کیونکہ مفکر غور و فکر میں ڈوب کر ہی گوہرِ مقصود حاصل کرتا ہے۔ علامہ اقبال ماں باپ کی قدر و منزلت سے آگاہ تھے۔ والدہ سے حد درجہ محبت اور اُلفت رکھتے تھے۔ جب وہ فوت ہوئیں تو آپ برطانیہ میں تھے۔ اس صدمے پر آپ

نے ایک طویل نظم ''والدہ مرحومہ کی یاد میں'' لکھی جو والہانہ جذباتِ محبت سے بھری پڑی ہے۔

آج پاکستان کے قیام کو نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے مگر اس مملکتِ خداداد پاکستان میں اسلامی نظام کے نفاذ کی آرزو پوری نہیں ہوسکی۔ مصور پاکستان اور بانئ پاکستان تو اللہ کو پیارے ہو گئے۔ ان کے بعد ملک کی باگ ڈور ایسے لوگوں کے ہاتھ میں آئی جن کے دل میں نہ قومی جذبہ تھا اور نہ ہی انہیں مسلمانوں کا مفاد عزیز تھا۔ اگر عزیز تھا تو صرف ذاتی مفاد کہ اس ملک کا اقتدار تادیر سنبھالے رکھیں اور اتنی دولت اکٹھی کرلیں کہ پشتہا پشت تک کے لیے کافی ہو۔ چنانچہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں ملک کا یہی انجام ہونا تھا کہ باشندگانِ پاکستان کا بچہ بچہ بین الاقوامی قرضوں کے نیچے دبا ہوا ہے اور امن وامان کی حالت ناگفتہ بہ ہوچکی ہے۔ پورا معاشرہ جرائم کی زد میں ہے۔ اقوامِ عالم کی نگاہ میں اس سرزمین کا وقار ختم ہو چکا ہے۔

آج بھی ملک کو اگر صالح قیادت میسر آجائے' قرآن وسنت کا نظام نافذ کر دیا جائے اور اقبال کے افکار سے راہنمائی حاصل کی جائے تو مسلمانانِ پاکستان اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کر سکتے ہیں اور یہی خطہ اقوامِ عالم کے لیے امن وامان اور سطوت وعظمت کے لحاظ سے مثالی سرزمین بن سکتا ہے:۔

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

علامہ اقبال بنیادی طور پر سیاست دان نہ تھے اور نہ ہی انہیں عملی سیاست سے کوئی دلچسپی تھی۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کوئی نہیں تھی کہ انہیں نمایاں ہونے کا کسی درجہ میں بھی شوق نہ تھا اور نہ ہی وہ شہرت کے خواہاں تھے۔ البتہ مسلمانوں کی حالتِ زار انہیں خون کے آنسو رلاتی تھی۔ ان کی نگاہِ دُور بین مستقبل میں مسلمانوں کے حالات دیکھ رہی تھی۔ یہ صورت حال ان کے حساس دل کے لیے قابل برداشت نہ تھی لٰہذا وہ مسلم اُمہ کو درپیش مسائل کا حل ڈھونڈنے میں غور وفکر کرتے تھے جس کے نتیجہ میں انہوں نے محسوس

کرلیا کہ برصغیر کے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ اوّل وہ انگریزوں کو برصغیر سے نکالیں اور بعدہٗ مسلمان ایک آزادوخودمختار ریاست قائم کر کے ہندوؤں کے تسلط سے بھی آزاد ہوں۔ یہ تجویز آپ نے اُس وقت پیش کی جب دُور دُور تک انگریز کی غلامی سے نکلنے کے بھی آثار نہ تھے' چہ جائیکہ مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ سرزمین کے حصول کے امکان کے متعلق سوچا جائے۔ چنانچہ یہ آپ کے سیاسی تدبر کا شاہکار ہے کہ آپ نے برصغیر کے شمال مغربی علاقہ جات پر مشتمل' جہاں مسلمانوں کی اکثریت تھی' ایک آزاد مسلم ریاست کی تشکیل کا اشارہ دیا اور اس منصوبے پر عمل درآمد میں ہی برعظیم کی نجات تھی۔ حصولِ آزادی کے اس پروگرام کا نقشہ تیار کر کے اس کے لیے قائد کی تلاش ہوئی تو مضبوط اعصاب کے مالک اور پُرخلوص شخصیت محمد علی جناح کی صورت میں مل گئی۔ علامہ اقبال نے خود جناح صاحب کو اُن کے اندر موجود صلاحیتوں اور مقام سے آگاہ کیا۔ یقیناً یہ بات بھی ان کی سیاسی بصیرت کا شاہکار ہے۔

علامہ اقبال ایک متواضع اور منکسر المزاج شخصیت تھے۔ انہوں نے جناح صاحب کو مسلمانوں کی قیادت پر آمادہ کیا۔ اس طرح حصولِ آزادی کا یہ سفر شروع ہو گیا۔ ابتداءً آپ نے سیاسی مزاج نہ ہونے کے باوجود جناح صاحب کے ساتھ کام کرتے ہوئے مسلم لیگ کی ایک صوبائی شاخ کے صدر کے طور پر کام کرنا بھی منظور کرلیا۔ جدوجہد آزادی کا آغاز ہوا۔ پاکستان کے تصوراتی نقشے میں رنگ بھرنے کا وقت آ گیا۔ پُرخلوص قائدین کی دن رات کی کوششوں کے نتیجہ میں اور لاکھوں جانوں کی قربانیاں دے کر آزاد وطن حاصل ہوگیا' مگر افسوس کہ مسلمانوں نے لاکھوں جانوں کی آزادی کی اس نعمت کی کسی درجے میں بھی قدر نہ کی۔ اس آزاد سرزمین پر نظامِ اسلام تو کیا نافذ کرتے اس کو سنبھال بھی نہ سکے' یہاں تک کہ ۱۹۷۱ء میں پاکستان کا ایک بازو اس سے علیحدہ ہوگیا۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا مگر افسوس کہ اس سے بھی نہ کوئی عبرت پکڑی گئی اور نہ ہی سبق سیکھا گیا' بلکہ بد سے بدتر کی طرف چلتے گئے۔ آج حالت یہ ہے کہ جس سرزمین کو اتنی لمبی جدوجہد کے بعد اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا وہاں اسلام تو کیا نافذ ہوتا

اسلام سے دوری میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور اب اسے سیکولر رسوشلسٹ اسٹیٹ بنانے کے پروگرام بن رہے ہیں۔

قیامِ پاکستان پر ہمیں قائدین تحریک خاص طور پر علامہ اقبال کے احسان کو ماننا چاہیے تھا۔ مگر ہم نے نہ صرف ان کے احسان کو فراموش کیا بلکہ آزادوطن کی بھی قدر نہ کی۔ حالات کا بغور جائزہ لیا جائے تو یہ بات آسانی سے سمجھ میں آ جاتی ہے کہ اگر خدانخواستہ پاکستان قائم نہ ہو چکا ہوتا تو ہندوؤں کی عیاری اور مکاری کے نتیجہ میں ہندوستان سے اسلام کا خاتمہ ہو چکا ہوتا' بلکہ پورا مشرقِ وسطیٰ ہندوؤں کے تسلط میں چلا جاتا۔

اگر مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ کی جدوجہد جو انہوں نے اکبر اعظم کے ''دین الٰہی'' کے خلاف کی تھی' انتہائی بروقت اور نتیجہ خیز ثابت ہوئی تو علامہ اقبال کی مسلمانانِ ہند کے لیے ایک علیحدہ آزاد وخود مختار مملکت کے حصول کی کوششیں اس سے بھی زیادہ کامیاب ہوئیں' کیونکہ علامہ اقبال کی وفات پر ابھی دس سال ہی گزر رہے تھے کہ برصغیر کے مسلمانوں کو پاکستان کی صورت میں آزاد اور خود مختار مملکت میں آزادی کا سانس لینا نصیب ہوا۔

حیرت ہوتی ہے کہ ہندی مسلمانوں کے قومی مسائل کا ذکر علامہ کی شاعری میں نظر نہیں آتا۔ مگر تھوڑے سے غور وفکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ علامہ کی شخصیت محدودیت کی قائل نہیں تھی۔ ان کی شاعری کے ابتدائی دور میں وطن کی محبت کے ترانے ہیں' مگر جب وہ مسلمانوں کی زبوں حالی کو دیکھتے ہیں تو ان کی شاعری کا رُخ دفعتاً بدل جاتا ہے اور وہ عالمی ملتِ اسلامیہ کا درد محسوس کرنے لگتے ہیں اور وہ ''ہندی ہیں ہم وطن ہے ہندوستاں ہمارا'' اور ''میرا وطن وہی ہے' میرا وطن وہی ہے'' کا انداز چھوڑ کر ''مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا'' کہنے لگتے ہیں۔ یعنی اوّل اوّل تو وہ ہندی قوم پرست شاعر اور بعد ازاں ملت اسلامیہ کے نقیب کی حیثیت سے نمایاں ہوتے ہیں۔ یہ بات واقعی درست ہے کہ جداگانہ قومی تشخص کے مسئلے کو سیاسی اعتبار سے آپ نے بہت اہمیت دی اور برصغیر کے مسلمانوں میں دوقومی نظریے کو اجاگر کیا' مگر اس ضمن میں انہوں نے شعر کا

ذریعہ اختیار نہیں کیا بلکہ عملی جدوجہد کو اپنایا۔

علامہ نے اُمت مسلمہ کی کج روی کے نتیجہ میں اس کی بربادی کا تذکرہ مرثیہ کے انداز میں کیا ہے، مگر صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ انہوں نے مسلمانوں کو اُن کا شاندار ماضی بھی یاد دلایا ہے۔ اس طرح انہوں نے شبلی و حالی کے خیالات کی ترجمانی کی۔ مولانا حالی نے اُمت کی حالت زار کو دیکھتے ہوئے کہا تھا: ؎

اے خاصۂ خاصانِ رُسل وقتِ دعا ہے
اُمت پہ تری آ کے عجب وقت پڑا ہے
جو دین بڑی شان سے نکلا تھا وطن سے
پردیس میں وہ آج غریب الغربا ہے

اور: ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اب دیکھئے وہ نظم جو صقلیہ (جزیرۂ سسلی) پر علامہ نے کہی: ؎

رو لے اب دل کھول کر اے دیدۂ خونابہ بار! وہ نظر آتا ہے تہذیب حجازی کا مزار
تھا یہاں ہنگامہ ان صحرا نشینوں کا کبھی بحر بازی گاہ تھا جن کے سفینوں کا کبھی
زلزلے جن سے شہنشاہوں کے درباروں میں تھے بجلیوں کے آشیانے جن کی تلواروں میں تھے
اک جہانِ تازہ کا پیغام تھا جن کا ظہور کھا گئی عصرِ کہن کو جن کی تیغِ ناصبور
مردہ عالم زندہ جن کی شورشِ قُم سے ہوا آدمی آزاد زنجیر توہم سے ہوا
غلغلوں سے جس کے لذت گیر اب تک گوش ہے
کیا وہ تکبیر اب ہمیشہ کے لیے خاموش ہے؟

اسی طرح بانگ درا میں ''بلادِ اسلامیہ'' کی یاد میں لکھی گئی نظم دیکھئے جس میں دلی،

بغداد، قرطبہ اور قسطنطنیہ جیسے عالی شان اسلامی شہروں کی عظمت و رفعت کا مرثیہ انتہائی دل سوزی کے ساتھ کہا ہے۔ اسی طرح ''بالِ جبریل'' کی طویل نظم جو ''مسجدِ قرطبہ'' کے عنوان سے موجود ہے، پڑھیں تو اندازہ ہوتا ہے کہ اقبال کے دل میں ملت اسلامیہ کے لیے کس قدر درد موجود تھا!

چونکہ اقبال کی شاعری مقصدیت سے بھرپور ہے اس لیے وہ اُمت مسلمہ کی خستہ حالی کا ذکر تو کرتا ہے مگر اسی پر بس نہیں کرتا، بلکہ وہ مسلمانوں کو اُن کا تابناک ماضی اور اُن کے اسلاف کے شاندار کارنامے یاد کراتا اور جرأت و شجاعت کا درس دیتا ہے اور بتاتا ہے کہ مسلمانوں کو اپنی گزشتہ عظیم روایات کو بحال کرنے کا پختہ عزم کر کے بھرپور جدوجہد کا آغاز کر دینا چاہیے۔ نہ صرف یہ بلکہ وہ ان کو بتاتا ہے کہ یہ بات لوہے پر لکیر ہے کہ اُمت مسلمہ اپنا کھویا ہوا وقار حاصل کرنے میں ضرور کامیاب ہو جائے گی: ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبر بھی کیا تو نے؟
وہ کیا گردوں تھا، تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا؟

یہ کہہ کر وہ مسلمانوں کو ماضی یاد دلاتا ہے اور پھر یہ کہہ کر اُمتِ مسلمہ کی ہمت بندھاتا اور عزمِ نو کا جذبہ اجاگر کرتا ہے: ع

''ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!''

اور : ؎

نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہو گا!

اور: ؎

سرشکِ چشمِ مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا — خلیل اللہ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے — یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا
اگر عثمانیوں پر کوہِ غم ٹوٹا تو کیا غم ہے — کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا

نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا!

اور: ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا' عدالت کا' شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا

اور: ؎

اقبال کا ترانہ بانگِ درا ہے گویا
ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا!

بحیثیتِ مجموعی علامہ اقبال پوری ملت اسلامیہ کا درد پورے خلوص کے ساتھ محسوس کرتے تھے۔ انہیں اُمت مرحومہ کی بیداری کے ساتھ گہری دلچسپی تھی۔ انہیں کسی ایک خطۂ ارض تک محدود کرنا زیادتی ہو گی۔ ان کی خواہش تھی کہ کرۂ ارضی پر بسنے والے مسلمان ایک مرکز پر اکٹھے ہو جائیں' پھر اس اتحاد کے نتیجے میں وہ ہر لحاظ سے فاتحِ عالم اور قائدِ جہاں بن جائیں۔ مگر جب انہیں اپنی یہ خواہش پوری ہوتی نظر نہ آتی تو کسی قدر اداسی کا اظہار کرتے: ؎

تیرے محیط میں کہیں گوہرِ زندگی نہیں
ڈھونڈ چکا میں موج موج' دیکھ چکا صدف صدف

علامہ اقبال یگانہ روزگار (genius) تھے۔ ایسے لوگ وقت سے پہلے پیدا ہو جاتے ہیں اور پھر پوری بیداری میں مستقبل کے خواب دیکھتے ہیں۔ ان کی بصیرت اس شعر میں ملاحظہ ہو: ؎

نہیں ہے نا امید اقبال اپنی کشتِ ویراں سے
ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی

چنانچہ دنیا نے دیکھ لیا کہ اکتوبر ۷۳ء کی عرب اسرائیل جنگ میں بزدل اور بھگوڑے عربوں نے کس جرأت اور جانبازی کا مظاہرہ کیا اور عالمِ اسلام میں اتحاد کی ایک لہر دوڑ گئی اور عربوں کو کس قدر وقار حاصل ہو گیا! پھر اگلے ہی سال عالمی اسلامی سربراہی کانفرنس لاہور میں منعقد ہوئی جس میں عالمِ اسلام کے اتحاد کا مظاہرہ پورے عالم نے

دیکھا۔اس اجتماع نے کفر کی قوتوں کو چونکا دیا۔انہوں نے اس کے ردّعمل میں مسلمانوں کے اندر افتراق و انتشار پیدا کرنے کی کوششیں بڑی سرگرمی سے شروع کر دیں۔ مسلمانوں کو پہلے بنیاد پرست اور پھر دہشت گرد قرار دیا۔عالم اسلام کے خلاف عالمِ کفر کی یہ لہر نتیجہ خیز ثابت ہوئی اور اسلام دشمن طاقتیں مشینی برتری کے ذریعے مسلمانوں کو نیچا دکھانے میں کامیاب ہوگئیں اور احیائے اسلام کی عالمی تحریک نہ صرف ٹھنڈی پڑ گئی بلکہ پوری دنیا میں مسلمان مجرم اور گردن زدنی ٹھہرے۔ یہ ساری صورت حال بھی علامہ کی بصیرت سے اوجھل نہ تھی' اس کے باوجود وہ ٹھنڈی سانس لینے اور کنجِ عافیت اختیار کرنے سے گریزاں تھے' بلکہ جدوجہد کے ذریعے حالات کو تبدیل کر دینے کے قائل تھے۔ وہ ملت اسلامیہ کو پکار کر کہتے ہیں:

''بتا رہی ہے یہ ظلمتِ شب کہ صبح نزدیک آ رہی ہے!''

چنانچہ آج کے حالات جو بظاہر نہایت حوصلہ شکن ہیں' ملتِ اسلامیہ کے لیے کامیابی کی نوید جانفزا لیے ہوئے ہیں' واقعاتِ عالم سے جو تیزی سے رونما ہو رہے ہیں ہر صاحبِ نظر یہ اندازہ لگا رہا ہے کہ پورے عالم میں رسول اللہ ﷺ کے طریق پر نظام خلافت قائم ہونے میں اب صدیاں نہیں لگیں گی' کیونکہ کفر خود اپنے آپ کو مٹانے کی جانب پیش رفت کر رہا ہے۔

اقبال کی رموزِ دین سے آگاہی

اقبال سیدھے سادے مسلمان تھے' مگر دین اسلام کے تقاضوں سے پوری طرح واقف تھے۔قرآنِ مجید کے ساتھ انہیں والہانہ محبت اور عقیدت تھی' کیونکہ انہوں نے رائج الوقت جدید علومِ فلسفہ اور عمرانیات کا گہری نظر سے مطالعہ کر رکھا تھا اور وہ یہ سمجھ رہے تھے کہ قرآن مجید کے بیان کردہ حقائق ہر زمانہ میں ناقابلِ تردید رہے ہیں۔ وہ سمجھتے تھے کہ انسانیت کی راہنمائی کے لیے اللہ کے کلام میں پوری صلاحیت موجود ہے۔ وہ عربی زبان ولغت میں مہارت رکھتے تھے' چنانچہ قرآن فہمی کے راستے میں اُن کے لیے کوئی رکاوٹ نہ تھی۔اس کے باوجود اُن کا اس بات پر پختہ یقین تھا کہ قرآن مجید کے فہم

پر عبور حاصل کرنا کسی فردِ بشر کے بس کا کام نہیں۔

علامہ اقبال نے شعوری طور پر سمجھ لیا تھا کہ قرآن ہی عالمِ انسانیت کی قیادت کر کے دنیا کو جنت نظیر خطہ بنا سکتا ہے۔ قرآن فہمی کے اعتبار سے اگر علامہ اقبال کو ترجمان القرآن کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا۔ آپ خود اس بات کے مدعی ہیں کہ انہوں نے اپنے اشعار کے اندر فکر و پیغام قرآن ہی کی ترجمانی کی ہے۔ اور انہیں اس بات پر اتنا وثوق ہے کہ مثنوی اسرار و رموز کے آخر میں ''عرضِ حال مصنف بحضور رحمۃ للعالمین ﷺ'' کے ذیل میں یہاں تک لکھ دیا ہے: ؎

گر دلم آئینہ بے جوہر است　　در بحر فم غیرِ قرآں مضمر است
پردہ ناموس فکرم چاک کن　　ایں خیاباں را ز خارم پاک کن
روزِ محشر خوار و رسوا کن مرا!
بے نصیب از بوسۂ پا کن مرا!

''اگر میرے دل کا آئینہ صاف نہیں' اور اگر میرے الفاظ میں قرآن کے علاوہ کوئی اور بات ہے تو اے اللہ! میرے خیالات کو قبولِ عام نہ دے اور اس راستے سے مجھے اس طرح الگ کر دے جیسے خارِ راہ کو راستے سے ہٹا دیا جاتا ہے۔ (اگر میں نے قرآن کی تعلیمات کے خلاف باتیں کی ہوں) تو مجھے محشر کے دن ذلیل و خوار کر دینا اور مجھے رسول اللہ ﷺ کے قدموں کا بوسہ لینے کی بھی اجازت نہ دینا''۔

علامہ کو جو محبت اسلام اور قرآن کے ساتھ تھی ان کے اشعار کے پڑھنے سے اُس کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ آخری شعر پر غور کریں تو معلوم ہوتا ہے کہ انہیں اس بات کا کس قدر یقین تھا کہ انہوں نے اپنے کلام کے اندر قرآن ہی کی ترجمانی کی ہے۔

علامہ اقبال مذہب کا خشک تصور نہیں رکھتے تھے۔ وہ دین کی تشریح و تعبیر میں حسین امتزاج اور اعتدال کے قائل تھے۔ احکامِ دین کے سلسلہ میں وہ روحِ دین کو پیش نظر رکھتے تھے۔ عبادات کی اہمیت تو اپنی جگہ مسلمہ ہے' لیکن علامہ اقبال کے نزدیک عبادات نتیجہ خیز ہونی چاہئیں۔ اگر عبادات مثلاً نماز اور روزہ آدمی کو اچھا انسان نہیں بناتے تو اُن کا

فائدہ؟ وہ مسجد کے کسی کونے میں بیٹھ کر ذکرِ الٰہی میں ہمہ وقت مصروفیت کو روحِ دین کے خلاف سمجھتے تھے۔ وہ کہتے ہیں کہ عبادت کا یہ انداز مسنون نہیں ہے۔ اُن کے نزدیک زندگی ہمہ تن جدوجہد کا نام ہے۔ کیونکہ جب زندگی میں جمود آ جائے تو وہی موت ہے۔ وہ مسلمان کی بے حس زندگی پر تنقید کرتے ہوئے کہتے ہیں: ع

''یہ ناداں گر گئے سجدوں میں جب وقتِ قیام آیا!''

یعنی جب قوم کو بیدار کرنے' آگے بڑھانے اور غالب کرنے کا تقاضا ہو اُس وقت تن آسانی کے ساتھ اللہ کے ذکر میں مشغولیت کی اجازت نہیں۔ بلکہ مسلمان تو رات کے راہب اور دن کے مجاہد ہوتے ہیں۔ رات کو وہ عبادت میں مشغول اپنے ربّ کے ساتھ راز و نیاز کرتے ہیں جبکہ دن کے وقت وہ چاک و چوبند مجاہد ہوتے ہیں۔

فلسفۂ خودی

علامہ اقبال انسان کو خالق کی شاہکار تخلیق تسلیم کرتے ہیں اس لیے وہ انسان کے مقامِ بلند سے واقف ہیں۔ وہ مسجودِ ملائک ہے اور ملائکہ اللہ تعالیٰ کی نورانی' معصوم اور پاکیزہ مخلوق ہیں۔ پس جو اُن کا مسجود ہوا اُس کا مقام کتنا بلند ہو گا۔ اس لیے علامہ اقبال کا زور اِس بات پر ہے کہ انسان احکامِ خداوندی پر پیہم عمل پیرا ہو کر اشرف المخلوقات کے منصب پر فائز رہے نہ کہ اشرفیت کے تقاضوں کو فراموش کر کے حیوانیت کے پست ترین مقام تک گر جائے۔ علامہ اقبال کے فلسفۂ خودی کی بنیاد یہی نظریہ ہے۔ اسی لیے ان کی منزل فنافی اللہ نہیں بلکہ بقاء باللہ ہے۔ وہ خود لکھتے ہیں کہ انسان کا مقصود خدا یا حیاتِ کلی میں جذب ہو جانا اور اپنی ہستی کو مٹا دینا نہیں' بلکہ احکامِ خداوندی کی تعمیل کرتے ہوئے اپنی ذات کو قائم رکھنا ہے۔ دوسرے لفظوں میں انسان خدا کی ذات میں فنا نہ ہو جائے بلکہ خدا کو اپنے اندر جذب کرلے' یعنی خدائی صفات کا حامل بن کر خلیفۃ اللہ کے منصب کا اہل ثابت ہو۔ کیونکہ اگر انسان خود اپنے مقام و مرتبہ اور صلاحیتوں سے آگاہ نہ ہو' بلکہ اپنے آپ کو خود ہی کسی اہمیت کا حامل نہ سمجھے تو وہ کیسے کوئی قابلِ ذکر کارنامہ انجام دے سکتا ہے اور ستاروں پر کمند کیسے ڈال سکتا ہے!

اللہ تعالیٰ نے جب انسان کو وجودِ خاکی میں ڈھالا تو اس میں اپنی روح میں سے پھونکا۔اس روحِ ربانی نے روحِ انسانی کو حقیقی' واقعی' قائم ودائم اوراشرفیت کے مقام پر فائز کر دیا۔اللہ تعالیٰ کے ساتھ روحِ انسانی کے اس قرب وتعلق کواستوار کرنا ہی دراصل معرفتِ خود ہے جسے اقبال خودی کا نام دیتا ہے۔اور جو یہ منزل حاصل کر لیتا ہے اسے معرفتِ خداوندی بھی حاصل ہو جاتی ہے۔اسی کوصوفیاء نے اس طرح بیان کیا ہے کہ مَنْ عَرَفَ نَفْسَهٗ فَقَدْ عَرَفَ رَبَّهٗ ''جس نے اپنے مقام ومرتبہ کو پہچان لیا گویا اسے معرفت ربّ حاصل ہوگئی''۔ یہی وجہ ہے کہ کلامِ اقبال میں خودی کو بہت اہمیت دی گئی ہے۔ کیونکہ اپنی صلاحیتوں سے واقف ہوئے بغیر انسان کوئی قابل ذکر کام انجام دے ہی نہیں سکتا' بلکہ کسی مہم پرآ گے بڑھنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔

خودی کی پہچان انسان کا اپنے خالق کے ساتھ رشتہ مضبوط کر دیتی ہے اورتعلق کی اسی مضبوطی کا نام محبت ہے۔دیکھئے اہل ایمان کے بارے میں قرآن مجید میں آتا ہے کہ انہیں اللہ تعالیٰ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت ہوتی ہے:

﴿وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ﴾ (البقرة:١٦٥)

پھر یہ محبت دوطرفہ ہو جاتی ہے کہ اللہ بھی محبت کرتا ہےان لوگوں سے جواُس کی راہ میں محبت کے تقاضے پورے کرتے ہوں۔عشق خداوندی کے معاملے میں اقبال وصل کی نسبت شوقِ وصل کوزیادہ اہمیت دیتے ہیں' کیونکہ منزل پر پہنچ کرشوقِ سفرختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ وہ ہمہ وقت عشقِ الٰہی کی مستی میں دم بخود رہنا پسند کرتے ہیں۔وہ کہتے ہیں: ؎

تو نہ شناسی ہنوز شوق بمیرد ز وصل

چیست حیاتِ دوام؟ سوختنِ ناتمام!

''تو ابھی اس راز سے آگاہ نہیں ہوا کہ وصل سے شوق ختم ہو جاتا ہے۔(کاش کہ تو جان لے کہ) ہمیشہ کی زندگی کیا ہے؟ مسلسل سلگتے رہنا! (نہ کہ ایک بار بھڑک کرختم ہو جانا!)''

غرض اقبال تمام زندگی شوقِ وصال یعنی عشق الٰہی میں گزارنا چاہتا ہے۔وہ محض علامتی

عبادت کا قائل نہیں بلکہ وہ عبادت کو پوری روحانی توجہ سے ادا کرنا چاہتا ہے' اور حقیقت یہ ہے کہ عبادت کا مقصد بھی یہی ہے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں ہے کہ نماز بے حیائی اور برے کاموں سے بچاتی ہے' اور یہ اسی صورت میں ہوسکتا ہے جب نماز پڑھنے والا شوقِ وصال کے جذبے سے مصروفِ عبادت ہو۔ وہ کہتے ہیں: ؎

شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب' میرا سجود بھی حجاب!

یا پھر: ؎

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالی نہ رہی
فلسفہ رہ گیا تلقینِ غزالی نہ رہی

وہ اس نمازی مسلمان کو روحانیت سے خالی گردانتے ہیں جو رسمی رکوع وسجود میں مشغول ہو۔ وہ کہتے ہیں: ؎

بجھی عشق کی آگ اندھیر ہے
مسلماں نہیں راکھ کا ڈھیر ہے

اسی لیے اقبال دنیا میں رونما ہونے والے تمام نمایاں کارناموں میں عشق ہی کو کارفرما سمجھتے ہیں' کیونکہ عشق ہی وہ قوت ہے جو ناممکن کو ممکن بنا سکتی ہے۔ وہ کہتے ہیں: ؎

صدق خلیلؑ بھی ہے عشق' صبر حسینؓ بھی ہے عشق
معرکۂ وجود میں بدر و حنین بھی ہے عشق

حبِّ رسولؐ

علامہ اقبال اطاعت رسول ﷺ کو عشقِ الٰہی کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ یہی صراطِ مستقیم ہے' یہی دینِ مبین ہے۔ قرآن مجید میں ہے:

﴿اِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُوْنِىْ﴾ (آل عمران: ۳۱)

یعنی اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو رسول اللہ ﷺ کا اتباع کرو' کیونکہ جو رسولؐ کی اطاعت کرتا ہے وہ گویا اللہ ہی کی اطاعت کرتا ہے۔ اور:

﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾

''اور جس نے رسول کی اطاعت کی اس نے گویا اللہ کی اطاعت کی''۔

اور اطاعت محبت کے بغیر نہیں ہوتی' اور اگر بالفرض ہو تو ریاکاری' نمود و نمائش اور بے روح ہو گی۔ پس اطاعتِ رسول ﷺ کے لیے حبِ رسول ﷺ کا ہونا ضروری ہے۔ چنانچہ اقبال کہتے ہیں:

ہر کہ عشقِ مصطفیٰ ؐ سامانِ اوست
بحر و بر در گوشۂ دامانِ اوست

''جسے نبی اکرم ﷺ کے ساتھ محبت کی دولت حاصل ہے تو گویا دنیا کا کل خشک و تر اُس کے دامن کے ایک گوشے میں موجود ہے''۔

بمصطفیٰ ؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است

''خود کو درِ مصطفی ﷺ تک پہنچا کر دم لو' اس لیے کہ اگر تم اس مقام تک نہ پہنچ سکے تو سمجھ لو کہ پھر بولہبی کے سوا اور کچھ ہاتھ نہ آ سکے گا!''

اسلام: دینِ توحید

علامہ اقبال نے عقیدۂ توحید کو دین کی جڑ اور بنیاد قرار دیا ہے۔ اسی سے شجرِ دین پھوٹتا اور نشو و نما پاتا ہے۔ اگر کہیں عقیدہ ہی کمزور ہے تو اس بیج سے صراطِ مستقیم کا پودا جنم نہیں لے سکتا' جبکہ توحید پر پختہ ایمان انسان کو ثابت قدم رکھتا اور طمانیت کی دولت سے مالا مال کرتا ہے' اس کے یقین کو مضبوط کرتا اور عمل کو راسخ کرتا ہے۔ توحید کے حیاتِ انسانی پر جو صحت آفریں اثرات پڑتے ہیں علامہ اقبال ان کی تحسین کرتے ہیں۔

وحدتِ خالق کی بنیاد پر انسانیت میں اخوت کا جذبہ اجاگر کیا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وحدتِ خالق کا مطلب ہے کہ ہر انسان کا خالق ایک ہی ہے خواہ وہ انسان کالا ہو' گورا ہو' امیر ہو' غریب ہو' دنیا کے کسی خطے میں رہتا ہو' کوئی زبان بولتا ہو' اچھا ہو برا ہو' کسی بھی تہذیب سے تعلق رکھتا ہو۔ یہ عقیدہ انسانوں میں یگانگت اور اپنائیت کا احساس پیدا کر

کے محبت اور پیار کے جذبات ابھارتا ہے' دشمنیاں مٹتی ہیں' دوستیاں پروان چڑھتی ہیں' امن وامان قائم ہوتا ہے' دنگا فساد ختم ہوتا ہے۔ علامہ اقبال کہتے ہیں:

کُلُّ مُؤمِنٍ اِخْوَۃٌ اندر دلش
حریت سرمایۂ آب و گلش
نا شکیبِ امتیازات آمدہ
در نہادِ او مساوات آمدہ

''اس کے (یعنی بندۂ مؤمن کے) دل میں یہ حقیقت جاگزیں ہے کہ تمام اہل ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں! اسی طرح جذبۂ حریت بھی اس کے ضمیر میں رچا بسا ہوا ہے' وہ (نسلی' لسانی یا علاقائی) امتیازات سے بالکل ناواقف ہے اور مساوات اس کی سرشت میں موجود ہے!''

توحید باری تعالیٰ حاکمیت کا ایک تصور پیدا کرتی ہے۔ اگر سب لوگ ایک اللہ کے بندے ہیں تو سب کا حاکم بھی ایک ہی ہوا۔ اسی ایک کے حکم کے سامنے سب گردن جھکا دیں گے۔ اسی طرح سیاسی اعتبار سے سب لوگوں کا ایک حاکم پر اتفاق ہو جائے گا' اسی کا حکم مانا جائے گا' اس کے حکم کی موجودگی میں کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت کا مطلق جواز نہ ہوگا۔ حاکمیتِ مطلقہ کے اس تصور کے خلاف دنیا میں وطنی قومیت کا تصور رائج اور ہر دل عزیز ہو رہا ہے۔ علامہ اس مہلک غلط فہمی کا شدت سے احساس کرتے ہوئے راہِ راست کی تلقین کرتے ہیں۔ اقبال لکھتے ہیں:

اس دور میں مے اور ہے' جام اور ہے جم اور ساقی نے بنا کی روشِ لطف و ستم اور
مسلم نے بھی تعمیر کیا اپنا حرم اور تہذیب کے آزر نے ترشوائے صنم اور
اِن تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے
جو پیرہن اس کا ہے وہ مذہب کا کفن ہے

اور:

یہ بُت کہ تراشیدۂ تہذیبِ نوی ہے غارت گرِ کاشانۂ دینِ نبویؐ ہے
بازو ترا توحید کی قوت سے قوی ہے اسلام ترا دیس ہے تو مصطفوی ہے

نظارۂ دیرینہ زمانے کو دکھا دے
اے مصطفوی خاک میں اس بُت کو ملا دے!

اسی طرح معاشی نظام میں توحید کے اصول کو اپناتے ہوئے علامہ اقبال تمام دیگر نظاموں کو بے انصافی پر مبنی قرار دیتے ہیں۔ وہ اسلامی اصولِ ملکیت کی بالادستی پر گہرا یقین رکھتے ہیں' جس کی رو سے ہر شے کا مالک حقیقی دراصل اللہ ہے۔ ساری زمین اللہ کا ملک ہے لہٰذا اللہ کی ملکیت ہے۔ قرآن شریف میں موجود ہے کہ ہر چیز کا مالک اللہ ہے' حتیٰ کہ جو چیزیں انسانوں کی انفرادی ملکیت میں ہیں ان کا مالک بھی درحقیقت اللہ ہی ہے۔ خود انسان بھی اللہ ہی کی ملکیت ہے' بلکہ اس کی تمام صلاحیتیں بھی اللہ ہی کی عطا کردہ اور امانت ہیں۔ ان چیزوں اور صلاحیتوں کے استعمال میں انسان کو اختیار تو دیا گیا ہے لیکن اسے جگہ جگہ تنبیہہ کر دی گئی ہے کہ کسی بھی چیز پر اپنی ملکیتِ مطلقہ کا دعوے دار نہ ہو جائے۔ ملکیت کے بجائے امانت کا یہ تصور توحید کا لازمی نتیجہ ہے۔ بقول شیخ سعدی: ؎

ایں امانت چند روزہ نزد ما است
درحقیقت مالک ہر شے خدا است

''یہ (میرا جملہ مال و اسباب دُنیوی) میرے پاس ایک عارضی امانت ہے' ورنہ ہر شے کا مالک حقیقی تو خدا ہی ہے۔''

علامہ اقبال جاگیر دارانہ نظام کو ظلم و استبداد سے تعبیر کرتے ہیں اور یہی عین اسلامی تعلیم ہے' کیونکہ اسلام میں ناجائز ذرائع سے دولت کمانا جائز نہیں۔ پھر جائز طریقہ سے دولت کمانا مگر اسے جمع کر کے رکھنا بھی درست نہیں' بلکہ مال دار کو کہا گیا ہے کہ تمہاری دولت میں ناداروں اور کمزوروں کا حق ہے جو اُن کو پہنچانا تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر صاحبِ ثروت اس حق کی ادائیگی نہیں کرتے تو وہ سخت گناہگار ہیں۔ یہ صورتِ حال علامہ کو خون کے آنسو رلاتی ہے کہ کارخانہ دار اپنی تجوریاں بھرتا جائے اور مزدور اور کسان عسرت اور بے چارگی کا شکار رہے' جبکہ محنت کسان کی ہو اور کھیتی اللہ تعالیٰ پیدا کرے۔ قرآن میں آتا ہے: ﴿لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى﴾ تو جو زمین میں محنت

نہیں کرتا وہ اس کی پیداوار کا مستحق کیسے بن گیا! علامہ کہتے ہیں کہ متوازن نظامِ معیشت اسلام ہی کا عطا کردہ ہے:۔

اس سے بڑھ کر اور کیا فکر و عمل کا انقلاب
پادشاہوں کی نہیں' اللہ کی ہے یہ زمین!

اور:۔

بندۂ مؤمن امیں' حق مالک است
غیر حق ہر شے کہ بینی ہالک است

''بندۂ مؤمن (اپنے مال و متاع کا صرف) امین ہے' مالک خدا ہے۔ خدا کے سوا جو کچھ دیکھتے ہو سب فانی اور ہلاک ہو جانے والا ہے!''

اور:۔

خواجہ از خونِ رگ مزدور سازد لعلِ ناب
از جفائے دِہ خدایاں کشتِ دہقاناں خراب

''کارخانہ دار تو مزدور کی خون پسینے کی کمائی سے جواہرات میں کھیلتا ہے اور زمیندار کے ظلم سے کسان کی مٹی پلید ہوتی ہے''۔

اس ضمن میں وہ انقلاب کا نعرہ لگاتے ہیں اور زمیندار کو جھنجھوڑتے ہیں اور کاشت کار کو وصولیٔ حق پر ابھارتے ہیں:۔

دِہ خدایا یہ زمیں تیری نہیں' تیری نہیں
تیرے آباء کی نہیں' تیری نہیں' میری نہیں!

اور پھر:۔

جس کھیت سے دہقاں کو میسر نہیں روزی
اُس کھیت کے ہر خوشۂ گندم کو جلا دو!

آج کے رائج الوقت معاشی نظام کی بنیاد سود پر ہے۔ اور سود اسلام میں حرام ہے' بلکہ اسلام تو دولت کو اللہ کی راہ میں اور مساکین اور حاجت مندوں پر خرچ کرنے کی تلقین کرتا ہے۔ اقبال اس تصور کی دل و جان سے حمایت کرتا ہے اور قرآن کے الفاظ ''قُلِ

الْعَفْوُ'' کی ترجمانی کرتا ہے:۔

با مسلماں گفت جاں بر کف بنہ

ہر چہ از حاجت فزوں داری بدہ

''رسول اللہ ﷺ نے مسلمانوں سے کہا کہ جان ہتھیلی پر رکھ لیں (یعنی قتال فی سبیل اللہ کے لیے کمر کس لیں) اور جو کچھ بھی ضرورت سے زائد ہو وہ سب (اللہ کی راہ میں) دے ڈالیں!''

پھر وہ کہتے ہیں:۔

ہیچ خیر از مردکِ زر کش مجو!

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا

''دولت سمیٹنے والے سے کسی بھلائی کی توقع نہ کرو' (اس لیے کہ قرآن نے صاف صاف فرما دیا ہے کہ) تم نیکی کا مقام ہرگز حاصل نہیں کر سکتے جب تک (بجائے سمیٹنے اور جمع کرنے کے) خرچ کرنے کی عادت نہ ڈالو۔''

پھر وہ کہتے ہیں:۔

از ربا آخر چہ می زاید؟ فتن!

کس نداند لذتِ قرضِ حسن

از ربا جاں تیرہ دل چوں خشت و سنگ

آدمی درّندہ بے دندان و چنگ

''سود سے سوائے فساد کے اور کس چیز میں اضافہ ہو سکتا ہے؟ (افسوس کہ) بغیر سود قرض دینے کی لذت کسی کو معلوم نہیں! سود سے روح تاریک اور دل اینٹ پتھر کی طرح سخت ہو جاتا ہے اور انسان بغیر دانتوں اور پنجوں کے درندہ بن جاتا ہے''۔

قرآن اور اقبال

علامہ اقبال جس طرح رسول اللہ ﷺ کو محبوب جانتے تھے اسی طرح کتاب اللہ کی عظمت و جلالت کے واقعی شناسا تھے۔ وہ قرآن کو سرچشمہ ہدایت مانتے تھے اور یقین

رکھتے تھے کہ جس طرح قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے قرآنی ہدایت کے مطابق زندگی بسر کی اور سارے عالم پر چھا گئے‘ آج بھی اگر مسلمان قرآن کے راہنما اصول اپنالیں تو قائد عالم بن سکتے ہیں۔ انسان کی حقیقی کامیابی کے لیے قرآن کافی ہے۔ حیاتِ دُنیوی میں جس جس نظام کے لیے راہنمائی مطلوب ہو قرآن کی آیات وہاں کفایت کرتی ہیں‘ خواہ وہ معاشی نظام ہو یا سیاسی نظام‘ معاشرتی نظام ہو یا نظامِ تعلیم۔

علامہ اقبال نے اپنے دور کی اعلیٰ ترین سطح کی تعلیم حاصل کی‘ انسانی تہذیب وتمدن کی اونچ نیچ کو دیکھا‘ قدیم وجدید فلسفے کو پڑھا‘ وقت کی غالب تہذیبوں کو اپنی آنکھ سے دیکھا‘ مگر آخر اس نتیجہ پر پہنچے کہ حیاتِ دُنیوی میں سکون واطمینان قرآن کی تعلیمات کے علاوہ اور کہیں نہیں۔ اُن کے نزدیک طائفۂ انسانیت کو صحیح سمت میں صرف قرآن ہی چلا سکتا ہے اور صرف یہی هُدًى لِّلنَّاسِ ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی عظمت اور مقام اقبال پر الہام ہوئے ہیں‘ کیونکہ وہ قرآن پاک کے جلال و جمال کو حقیقی طور پر محسوس کرتے ہیں۔ قرآن مجید کو وہ بے نظیر و بے مثل کتاب قرار دیتے ہیں اور اس کی عظمت وجلالت کے سامنے بچھے جاتے ہیں: ؎

آں کتابِ زندہ ‘ قرآنِ حکیم   حکمتِ او لا یزال است و قدیم
نسخۂ اسرارِ تکوینِ حیات   بے ثبات از قوّتش گیرد ثبات
حرفِ او را ریب نے‘ تبدیل نے   آیہ اش شرمندۂ تأویل نے
نوعِ انساں را پیامِ آخریں   حاملِ او رحمۃٌ لِّلعالمین
رہزناں از حفظِ او رہبر شدند   از کتابے صاحبِ دفتر شدند
آنکہ دوشِ کوہ بارش بر نتافت   سطوتِ او زہرۂ گردوں شگافت

’’وہ زندہ کتاب ’’قرآن حکیم‘‘ جس کی حکمت لازوال بھی ہے اور قدیم بھی! زندگی کے وجود میں آنے کے رازوں کا خزینہ‘ جس کی حیات افروز اور قوت بخش تأثیر سے بے ثبات بھی ثبات ودوام حاصل کرسکتے ہیں۔ اس کے الفاظ میں نہ کسی شک وشبہ کا شائبہ ہے نہ ردّ وبدل کی گنجائش اور اس کی آیات کسی تأویل کی محتاج نہیں۔ نوعِ انسانی کے لیے (خدا کا) آخری پیغام‘ جس کے لانے والے

تمام جہانوں کے لیے رحمت قرار پائے (صلی اللہ علیہ وسلم)۔ اسے یاد کر لینے کے باعث یا اس کی حفاظت میں آ کر رہزن اور لٹیرے رہبر و رہنما بن گئے اور اس کتاب کے طفیل وہ خود بہت سی کتابوں کے مصنف بن گئے! وہ (کتاب) جس کے بوجھ کو پہاڑ بھی نہ اٹھا سکے اور جس کے دبدبے سے آسمان کا پتہ بھی پھٹ کر رہ گیا!''

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است — ایں کتابے نیست چیزے دیگر است!
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود — جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود
مثلِ حق پنہاں و ہم پیداست ایں — زندہ و پایندہ و گویاست ایں

''(اس کتاب کے بارے میں) جو بات میرے دل میں پوشیدہ ہے اسے اعلانیہ ہی کہہ گزروں؟ حقیقت یہ ہے کہ یہ کتاب نہیں کچھ اور ہی شے ہے! یہ ذات حق سبحانہٗ وتعالیٰ کا کلام ہے لہٰذا اسی کے مانند پوشیدہ بھی ہے اور ظاہر بھی' اور جیتی جاگتی بولتی بھی ہے اور ہمیشہ قائم رہنے والی بھی!''

صد جہانِ تازہ در آیاتِ اوست — عصر ہا پیچیدہ در آناتِ اوست

''اس کی آیتوں میں سینکڑوں تازہ جہان آباد ہیں اور اس کے ایک لمحے میں بے شمار زمانے موجود ہیں!''

علامہ اقبال کے مندرجہ بالا اشعار پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ وہ اللہ کے کلام کو انسانیت کے لیے واحد نسخۂ حیات جانتے تھے۔ اسی کتاب کا اعجاز ہے کہ اخلاق سے عاری معاشرے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسے صاحبِ جلال وکمال لوگ پیدا ہو گئے اور اُس ردّی معاشرے کی کایا پلٹ گئی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ کتاب کبھی out dated ہونے والی نہیں' وہ ہر زمانے کے تقاضوں پر پوری اترنے والی کتاب اور ہر قسم کے حالات میں راہنما اصول دینے والی تعلیم پر مشتمل ہے۔ یہ اللہ کا کلام ہے' جس طرح ذاتِ باری تعالیٰ ہر طرح کے نقص اور کمزوری سے پاک ہے اسی طرح اس کا کلام بھی کسی قسم کی بوسیدگی کا شکار نہیں ہوسکتا' بلکہ ہر دور میں نئے نئے پیدا ہونے والے مسائل کا بہترین حل پیش کرتا ہے۔

مسلمانوں نے غفلت کو شعار بنا لیا اور قرآن مجید سے اپنا تعلق کمزور کر لیا' جس کا

نتیجہ یہ نکلا کہ مسلمان مغلوب اور ذلیل وخوار ہو گئے' اقوامِ عالم کی نگاہ میں مسلم اُمہ کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ عام مسلمانوں کا تو کیا کہنا' علماء نے بھی لوگوں کو فقہی مسائل میں الجھائے رکھا اور قرآن سے دور کرتے گئے۔ حالت یہاں تک پہنچی کہ مسلمان کا قرآنی تعلیمات سے کوئی واسطہ نہ رہا اور قرآن محض عقیدت کی ایک علامت اور تقدس کا مظہر ٹھہرا' برکت کے لیے تلاوت کیا جاتا' ریشمی غلافوں میں لپیٹ کر اونچی جگہ پر رکھا جاتا' قسمیں اٹھانے کے لیے استعمال کیا جاتا' اس کے الفاظ پر مشتمل تعویذ لکھے جاتے' آیاتِ قرآنی کو من پسند معنی دیے جاتے۔ اُمت کی اس حالت نے علامہ اقبال کو خون کے آنسو رلایا۔ وہ اُمت کی اس پستی کا واحد سبب قرآن سے دوری قرار دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ: ؎

وہ زمانے میں معزز تھے مسلماں ہو کر
اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

وہ اُمت مرحومہ کو قرآن کی طرف پلٹنے کی دعوت دیتے ہیں اور اسی میں کامیابی سمجھتے ہیں: ؎

خوار از مہجوریٔ قرآں شدی شکوہ سنج گردشِ دوراں شدی
اے چو شبنم بر زمیں افتندۂ در بغل داری کتابِ زندۂ

''(اے مسلمان!) تیری ذلت اور رسوائی کا اصل سبب تو یہ ہے کہ تو قرآن سے دور اور بے تعلق ہو گیا ہے' لیکن تو اپنی اس زبوں حالی پر الزام گردش زمانہ کو دے رہا ہے! اے وہ قوم کہ جو شبنم کے مانند زمین پر بکھری ہوئی ہے (اور پاؤں تلے روندی جا رہی ہے)! اٹھ کہ تیری بغل میں ایک کتابِ زندہ موجود ہے (جس کے ذریعے تو دوبارہ بامِ عروج پر پہنچ سکتی ہے!)''

اے گرفتارِ رسوم ایمانِ تو شیوہ ہائے کافری زندانِ تو!
قطع کردی اَمر خود را در زُبُر جادہ پیمائی اِلٰی شَیْءٍ نُکُرْ
گر تو می خواہی مسلمان زیستن نیست ممکن جز بقرآن زیستن

''اے مسلمان! تیرا ایمان رسومات کی بندھنوں میں جکڑا ہوا ہے اور تو خود کفر کے طور طریقوں کے زندان میں اسیر ومقید ہے! تو نے اپنی وحدتِ ملی کو پارہ پارہ کر لیا ہے اور اب ایک خوفناک انجام کی طرف تیزی سے رواں دواں ہے!

(اب) اگر تو (دوبارہ) مسلمان ہو کر جینے کا خواہش مند ہے تو (اچھی طرح جان لے کہ) اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنی حیاتِ نو کی بنیاد قرآن پر قائم کرے!
(اس کتاب کا حق تلاوت تم ادا کرو' پھر جو مقصد و مطلب چاہو حاصل کر لو)''۔

وہ خاص طور پر علماء کو یاد دہانی کراتے ہیں کہ وہ ؎

خود بدلتے نہیں قرآں کو بدل دیتے ہیں
ہوئے کس درجہ فقیہانِ حرم بے توفیق

کا انداز چھوڑ کر قرآن کی خالص تعلیمات کو عام کرنے کا طریقہ اختیار کریں' کیونکہ اُمت کی عظمت رفتہ کی بازیابی کے لیے یہی ایک راستہ ہے۔ وہ کہتے ہیں:

اے کہ می نازی بہ قرآنِ عظیم تا کجا در حجرہ می باشی مقیم!
در جہاں اسرارِ دیں را فاش کن نکتۂ شرع مبیں را فاش کن!

''اے وہ شخص یا قوم جسے حاملِ قرآن عظیم ہونے پر فخر ہے! آخر کب تک حجروں اور گوشوں میں دبکے رہو گے؟ (اٹھو اور) دنیا میں دین حق کے اسرار و رموز کو عام کرو اور شریعت اسلامی کے رموز و حکم کی تشہیر و اشاعت کے لیے سرگرم ہو جاؤ''۔

الغرض علامہ اقبال کے نزدیک اُمت کے جملہ امراض کے لیے شفا بخش نسخہ صرف قرآن حکیم ہے اور ملت کے مردہ جسم میں از سر نو جان ڈالنے کے لیے آبِ حیات بھی قرآن ہی فراہم کرتا ہے۔ ؎

بر خور از قرآں اگر خواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات
می دہد ما را پیامِ **لَا تَخَفْ** می رساند بر مقامِ **لَا تَخَفْ**
گوہر دریائے قرآں سفتہ ام شرحِ رمزِ **صِبْغَةُ اللّٰہ** گفتہ ام
پس بگیر از بادۂ من یک دو جام تا درخشی مثل تیغِ بے نیام!

''(اے مسلمان!) اگر دوام و ثبات اور قوت و استحکام کا طالب ہے تو قرآن کے سامنے دست سوال دراز کر' اس لیے کہ مجھے قرآن ہی کے مخفی چشموں میں آبِ حیات کا سراغ ملا ہے۔ یہ ہمیں بے خوفی کا پیغام ہی نہیں دیتا' بالفعل اس مقام تک پہنچا بھی دیتا ہے جہاں نہ خوف باقی رہتا ہے نہ حزن! میں نے قرآن کے

بحر بیکراں کے موتی بیندھ لیے ہیں اور ''صبغۃ اللہ'' کے اسرار و رموز کی شرح بیان کر دی ہے۔ پس (اگر خدا توفیق دے تو) میری شراب کے ایک دو جام چڑھا (یعنی میرے فکر اور پیغام سے سرشار ہو کر آمادۂ عمل ہو جا) تا کہ تو شمشیر برہنہ کے مانند چمکنے لگے!''

اور: ؎

از یک آئینی مسلماں زندہ است　　پیکرِ ملت ز قرآں زندہ است!
ما ہمہ خاک و دلِ آگاہ اوست　　اعتصامش کن کہ حبل اللہ اوست!
چوں گہر در رشتۂ او سفتہ شو!　　ورنہ مانندِ غبار آشفتہ شو!

''وحدت آئین ہی مسلمان کی زندگی کا اصل راز ہے اور ملت اسلامی کے جسد ظاہری میں روح باطنی کی حیثیت صرف قرآن کو حاصل ہے۔ ہم تو سرتا پا خاک ہی خاک ہیں' ہمارا قلب زندہ اور ہماری روحِ تابندہ تو اصل میں قرآن ہی ہے۔ (اے ملت اسلامی! اب بھی وقت ہے کہ تو) اپنے آپ کو موتیوں کی طرح قرآن کے رشتے میں بیندھ اور پرو لے' ورنہ پھر اس کے سوا اور کوئی صورت نہیں کہ خاک اور دھول کے مانند پریشان اور منتشر (اور ذلیل و خوار) رہ!''

معلوم ہوا کہ علامہ کے نزدیک مسلمان کی انفرادی زندگی بھی قرآن کی روشنی میں کامیاب ہو سکتی ہے اور مسلمان بطور ایک اُمت کے بھی اللہ کی رسّی یعنی قرآن مجید کے ساتھ تعلق مضبوط کر کے ہی عظمت رفتہ حاصل کر سکتے ہیں: ؎

گر تو می خواہی مسلمان زیستن
نیست ممکن جز بقرآن زیستن!

''اگر تو مسلمان بن کر زندہ رہنا چاہتا ہے تو یہ قرآن کے بغیر ممکن نہیں ہے!''

❁❁❁

اکل حلال کی اہمیت

کسب حلال کے معنی ہیں جائز پیشہ کے ذریعے جائز کمائی کرنا' یعنی اللہ اور رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقوں کے عین مطابق روزی کمانا کسب حلال ہے۔اس کے برعکس کسی ناجائز ذریعے سے جورزق کمایا جائے جس میں انسان کی محنت ومشقت نہ ہومثلاً سود وہ حرام یعنی ناجائز ہے۔

قرآن وحدیث میں کسب حلال کی اہمیت

ارشاد باری تعالیٰ ہے:

﴿يٰاَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوْا مِنَ الطَّيِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صَالِحًا﴾ (المؤمنون:٥١)

''اے رسولو! پاکیزہ چیزیں کھاؤ اور نیک عمل کرو''۔

اسی طرح تمام انسانوں کو تلقین فرمائی گئی:

﴿يٰاَيُّهَا النَّاسُ كُلُوْا مِمَّا فِي الْاَرْضِ حَلٰلًا طَيِّبًا﴾ (البقرة:١٦٨)

''اے لوگو! کھاؤ زمین کی چیزوں میں سے حلال اور پاکیزہ''۔

مزید برآں مسلمانوں کو خصوصی تاکید کی گئی:

﴿يٰاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا رَزَقْنٰكُمْ﴾ (البقرة:١٧٢)

''اے ایمان والو! جو پاکیزہ چیزیں ہم نے تم کو عطا فرمائی ہیں ان کو کھاؤ''۔

اسلامی تعلیمات میں حلال روزی کا حصول بنیادی نوعیت کی اہمیت رکھتا ہے' کیونکہ حلال روزی کھا کر جو گوشت پوست بنے گا اس میں قبولِ حق کی صلاحیت زیادہ ہو گی۔ایسا جسم اخلاقی خوبیاں اختیار کرنے میں سہولت محسوس کرے گا۔گویا حلال اور مطہر روزی کھانے والوں کے قلوب واذہان منور ہو کر نیک اعمال کے لیے اعضاء وجوارح کو مستعد بناتے ہیں۔اس کے برعکس حرام ذرائع سے کمائی ہوئی روزی کھانے سے

غیر صالح خون پیدا ہوتا ہے جو کھانے والے کو آسانی کے ساتھ رذائل اخلاق کی طرف لے جاتا ہے۔ پھر قبولِ حق اور صراطِ مستقیم پر چلنے کی صلاحیت بھی باقی نہیں رہتی۔ اس کے فکر و نظر میں کجی پیدا ہو جاتی ہے اور دل نیکی پر آمادہ نہیں ہوتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ اسلامی تعلیمات کی رو سے حلال خور انتہائی سعادت مند اور حرام خور آخری درجے کا بدنصیب ہے تو یہ عین صواب ہے۔

انسان کو دنیا میں آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے۔ تعلیماتِ الٰہیہ نے وحی کے ذریعے واضح کر دیا کہ حق اور جائز کیا ہے اور اس کے مقابل باطل اور ناجائز کیا ہے۔ جو چیزیں محرمات اور ممنوعات میں شامل ہیں ان میں ضرور برائی اور فساد ہے' جبکہ حلال اور مباح چیزوں میں خیر اور بھلائی پائی جاتی ہے' کیونکہ حکیم کا کوئی کام حکمت اور دانائی سے خالی نہیں ہوتا اور اللہ تعالیٰ تو الحکیم ہے۔

جس ٹوکری میں گلے سڑے پھل رکھے ہوں ان کی سڑاند سے انسانی طبیعت پر شدید ناگواری کا احساس ہوتا ہے' جبکہ تازہ اور صاف ستھرے پھلوں کے ٹوکرے سے روح کو تازگی بخشنے والی خوشبو آئے گی۔ اسی طرح حرام روزی کھانے والے سیاہ باطن' شقی القلب' جرائم پیشہ اور موذی بن جاتے ہیں جبکہ حلال روزی کھانے سے روشن ضمیری' طہارتِ قلبی اور فکر و نظر کی صفائی حاصل ہوتی ہے۔

ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ حصولِ رزق کے معاملے میں کبھی غفلت اور لاپرواہی سے کام نہ لے' کیونکہ یہ غفلت انتہائی خطرناک ہے۔ بظاہر حرام روزی کی بے برکتی نظر نہیں آتی لیکن حقیقت نفس الامری کے اعتبار سے اس کی منفی تاثیر نیکیوں اور عبادات کو بے مقصد بنا کر رکھ دیتی ہے۔ نماز کی اہمیت سے کون واقف نہیں! مگر حرام روزی نماز کی تاثیر کو بھی سلب کر لیتی ہے۔ چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنِ اشْتَرٰى ثَوْبًا بِعَشَرَةِ دَرَاهِمَ وَفِيْهِ دِرْهَمٌ حَرَامٌ لَمْ يَقْبَلِ اللّٰهُ لَهٗ صَلَاةً مَا دَامَ عَلَيْهِ))(۱)

''جس شخص نے دس درہم میں کوئی کپڑا خریدا اور ان میں ایک درہم حرام کا بھی تھا تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس کی کوئی نماز قبول نہیں ہو گی جب تک وہ کپڑا اس کے جسم پر رہے گا''۔

اسی طرح روزہ اسلام کا رکن ہے' روزہ رکھنے والوں کو جنت کی بشارت دی گئی ہے' مگر یہاں بھی رزقِ حلال کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ رسول پاک ﷺ فرماتے ہیں:

((كَمْ مِنْ صَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ صِيَامِهِ اِلَّا الْجُوْعُ وَكَمْ مِنْ قَائِمٍ لَيْسَ لَهُ مِنْ قِيَامِهِ اِلَّا السَّهَرُ))[۲]

''بہت سے روزہ دار ایسے ہیں کہ انہیں اپنے روزے سے بھوک اور پیاس کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہوتا اور بہت سے (راتوں کو) قیام کرنے والے ایسے ہیں کہ انہیں جاگنے کے علاوہ کچھ نہیں ملتا''۔

بھوکا اور پیاسا رہنا نیز راتوں کو جاگنا کوئی نیک کام نہیں۔ نیکی تو روزہ رکھنے اور رات کو عبادت کرنے کا نام ہے۔ اگر روزہ دار روزہ کے آداب اور قیام کرنے والا قیام کے آداب کا خیال رکھے' جس کا سب سے بڑا مظہر رزق حلال ہے' تو اس کا روزہ اور قیام اس کے لیے موجب ثواب اور باعث سعادت ورحمت ہوں گے' ورنہ لا حاصل۔

حج اور زکوٰۃ کو بھی اسی پر قیاس کر لیجیے۔ اگر کوئی شخص حرام مال سے پروردہ جسم لے کر اور حرام مال خرچ کر کے سفر حج پر نکلے تو سفر کی صعوبت کے سوا اسے کچھ حاصل نہ ہو گا' اگرچہ وہ زندگی بھر فریضہ حج ادا کرنے پر اور حاجی کہلوانے پر خوش ہوتا رہا ہو۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ لَحْمٌ نَبَتَ مِنْ سُحْتٍ اَلنَّارُ اَوْلٰى بِهٖ))[۳]

''وہ گوشت (اور وہ جسم) جنت میں نہ جا سکے گا جس کی نشوونما حرام مال سے ہوئی ہو' دوزخ کی آگ اس کی زیادہ مستحق ہے''۔

ایک انتہائی جامع مثال کے ذریعے رسول پاک ﷺ نے حرام روزی کی قباحت اور شناعت واضح کی۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ:

((ثُمَّ ذَكَرَ الرَّجُلَ يُطِيْلُ السَّفَرَ اَشْعَثَ اَغْبَرَ يَمُدُّ يَدَيْهِ اِلَى السَّمَاءِ يَا رَبِّ

يَا رَبِّ' وَمَطْعَمُهُ حَرَامٌ وَمَشْرَبُهُ حَرَامٌ وَمَلْبَسُهُ حَرَامٌ وَغُذِىَ بِالْحَرَامِ فَاَنّٰى يُسْتَجَابُ لِذٰلِكَ))(٤)

''پھر آپ ؐ نے ایک ایسے شخص کا ذکر کیا جو طویل سفر کرتا ہے' پراگندہ بال اور غبار آلودہ ہے' اپنے دونوں ہاتھوں کو آسمان کی طرف اٹھاتا ہے اور کہتا ہے: اے پروردگار! اے پروردگار (یعنی دعا مانگتا ہے) حالانکہ اس کا کھانا حرام' اس کا پینا حرام' اس کا لباس حرام اور حرام ہی میں اس کی پرورش ہوئی ہے' پھر اس شخص کی دعا کیونکر قبول کی جائے؟''

شاید آج کا دور ہی یہ دور ہے جس کے بارے میں رسول پاک ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا:

((يَأْتِى عَلَى النَّاسِ زَمَانٌ لَا يُبَالِى الْمَرْءُ مَا اَخَذَ مِنْهُ أَمِنَ الْحَلَالِ أَمْ مِنَ الْحَرَامِ))(٥)

''لوگوں پر ایک زمانہ آئے گا کہ آدمی کو اس کی پروا نہ ہوگی کہ وہ جو لے رہا ہے حلال ہے یا حرام''۔

اگر انسان نفس کے لالچ اور شیطان کے دھوکے میں نہ آئے تو وہ صرف حلال روزی پر اکتفا کر سکتا ہے' ورنہ نفس کا لالچ اور شیطان کا فریب تو ہر برائی کو مزین کر کے دکھاتے ہیں۔ مگر سمجھ لینا چاہیے کہ یہی طمع اور دغا انسان کو لے ڈوبے گا۔ رشوت' ملاوٹ' بددیانتی' چوری اور فرائض منصبی بمطابق معاہدہ ادا کیے بغیر وصول کی ہوئی تنخواہ سراسر مال حرام ہے جس میں کچھ شبہ نہیں۔ مال حرام کی نحوست سے بچنے کی تاکید مزید کے طور پر رسول پاک ﷺ نے فرمایا:

((اَلْحَلَالُ بَيِّنٌ وَالْحَرَامُ بَيِّنٌ وَبَيْنَهُمَا مُشَبَّهَاتٌ لَا يَعْلَمُهَا كَثِيْرٌ مِّنَ النَّاسِ' فَمَنِ اتَّقَى الْمُشَبَّهَاتِ اسْتَبْرَأَ لِدِيْنِهٖ وَعِرْضِهٖ ' وَمَنْ وَقَعَ فِى الشُّبُهَاتِ كَرَاعٍ يَرْعٰى حَوْلَ الْحِمٰى يُوْشِكُ اَنْ يُّوَاقِعَهٗ))(٦)

''حلال بھی ظاہر ہے اور حرام بھی ظاہر ہے' ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ چیزیں ہیں جن کی حقیقت سے بہت سے لوگ واقف نہیں ہیں۔ پس جو شخص شبہ کی چیزوں سے بچا اس نے اپنا دین بچا لیا اور اپنی آبرو کو محفوظ رکھا' اور جو شخص شبہ کی چیزوں میں مبتلا ہوا وہ اس چرواہے کے مانند ہے جو ممنوعہ چراگاہ کے آس پاس ریوڑ چراتا ہے' تو قریب ہے کہ ریوڑ اُس چراگاہ میں داخل ہو جائے''۔

حضرت مقدامؓ بن معدی کرب نبی کریم ﷺ سے روایت کرتے ہیں:

((مَا أَكَلَ اَحَدٌ طَعَامًا قَطُّ خَيْرًا مِنْ أَنْ يَأْكُلَ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ وَاِنَّ نَبِيَّ اللّٰهِ دَاوُدَ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَانَ يَأْكُلُ مِنْ عَمَلِ يَدِهِ)) (۷)

''کسی شخص نے کوئی کھانا اس سے بہتر نہیں کھایا جو وہ اپنے ہاتھ سے کما کر کھائے' کیونکہ اللہ کے نبی حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ہاتھ سے کما کر کھاتے تھے''۔

مسلمان والدین کے لیے یہ فرائض اوّلین میں شامل ہے کہ وہ پاکیزہ اور حلال روزی کمائیں جو وہ خود بھی کھائیں اور اپنے معصوم بچوں کو بھی کھلائیں۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نبی کریم ﷺ سے روایت کرتی ہیں:

((اِنَّ اَطْيَبَ مَا اَكَلْتُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ وَاِنَّ اَوْلَادَكُمْ مِنْ كَسْبِكُمْ)) (۸)

''پاکیزہ ترین چیز وہ ہے جو تم اپنی کمائی میں سے کھاتے ہو' اور تمہاری اولاد بھی تمہاری کمائی سے ہے''۔

علاوہ ازیں خاندان کے دوسرے بالغ افراد بشمول بیوی' بیٹے' بیٹیوں پر بھی لازم ہے کہ اگر وہ سربراہ خاندان کو حرام ذرائع سے روزی کماتا پائیں تو نہ صرف اپنی فرمائشیں کوتاہ کریں بلکہ اسے حرام روزی کمانے سے روکیں اور قلیل مقدار کی بابرکت حلال روزی میں گزارہ کرنے کا اہتمام کریں' ورنہ سربراہِ خانہ کے ساتھ وہ بھی خدا کی گرفت سے نہ بچ سکیں گے۔ العیاذ باللّٰہ...... فاعتبروا یااولی الابصار۔

حواشی

۱) مسند احمد' کتاب المکثرین عن الصحابة' باب باقی المسند السابق۔
۲) مسند احمد' کتاب مسند المکثرین' باب باقی المسند السابق۔
۳) رواہ احمد' والدارمی۔
٤) صحیح مسلم' کتاب الزکاۃ' باب قبول الصدقة من الکسب الطیب وتربیتھا۔
٥) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب من لم یبال من حیث کسب المال۔
٦) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب فضل من استبرأ لدینہ۔ وصحیح مسلم' کتاب المساقاۃ' باب اخذ الحلال وترك الشبھات۔
۷) صحیح البخاری' کتاب البیوع' باب کسب الرجل وعملہ بیدہ۔
۸) سنن الترمذی' کتاب الاحکام عن رسول اللہ ﷺ' باب ما جاء ان الوالد یاخذ من مال ولدہ۔

صوفی اور مجاہد

عرفِ عام میں صوفی ان نیک نہاد' تقویٰ شعار' عبادت گزار اور گوشہ گیر مسلمانوں کو کہا جاتا ہے جو دنیا کے ساتھ واجبی سا تعلق رکھتے ہیں' اُن کا زیادہ وقت صوم وصلوٰۃ اور ذکر و اذکار میں گزرتا ہے۔ دنیا کے دھندوں اور جھمیلوں سے وہ کوئی سروکار نہیں رکھتے۔ اُن کو ملک کے سیاسی' معاشی' معاشرتی اور عدالتی نظام سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی۔ وہ اقتدار کی ہوس سے کلیتًا پاک ہوتے ہیں۔ اُن کو کوئی غرض نہیں ہوتی کہ دوسرے لوگ کیا کر رہے ہیں۔ وہ پورے تحفظات کے ساتھ امر بالمعروف کی اہمیت تو جانتے ہیں' لیکن نہی عن المنکر اُن کے پروگرام میں شامل نہیں ہوتا۔ بے نمازوں' بے دینوں اور ظالموں کے وجود کو وہ برداشت کیے ہوئے ہوتے ہیں۔ اگر حاکمِ وقت شریعت کا نفاذ نہیں کرتا بلکہ خلافِ شریعت آرڈیننس نافذ کرتا ہے تو ان کے ماتھے پر کوئی شکن نہیں پڑتی۔ وہ اس بات کو کافی سمجھتے ہیں کہ ان کی نماز' روزے اور ذکر و اذکار میں کوئی مزاحمت نہ ہو اور اسی کو وہ اپنا وظیفۂ حیات سمجھتے ہیں۔ انہی کی ترجمانی علامہ اقبال نے ان الفاظ میں کی ہے:۔

ملاّ کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت نادان یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ایسے لوگوں کو قیامِ پاکستان کی تحریک سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہماری نماز' روزے اور مذہبی رسومات میں کسی طرح کی رکاوٹ نہیں تو ہم نے علیحدہ ملک کیوں لینا ہے' حالانکہ برعظیم پاک و ہند پر انگریزوں کی حکومت تھی اور ان کا بنایا ہوا قانون نافذ تھا۔ مسلمان غلامی کی زندگی بسر کر رہے تھے۔ وہ یہ نہیں سمجھ رہے تھے کہ مسلمان دنیا میں محض نماز' روزے اور ذکر و اذکار کے لیے نہیں آیا' بلکہ اس کی ذمہ داری ہے کہ کفر کو مٹانے کی جدوجہد کرے' اللہ کی زمین پر اللہ کا قانون نافذ کرے' اس کام میں جس طرح کی قربانی دینا پڑے اس سے دریغ نہ کرے۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کا مقصد دینِ حق کا اظہار تھا۔ آپؐ کی وفات کے بعد ہر مسلمان کی زندگی کا مقصد وہی ہونا چاہیے جو آپؐ کی زندگی کا تھا' یعنی دینِ حق کے غلبے کی کوشش۔ اس سلسلے میں آپؐ کی شب و روز کی جدوجہد ہمارے سامنے

ہے اور وہی اسوۂ حسنہ ہے جس کی پیروی کا ہر مسلمان کو حکم ہے۔ بقول اقبال:

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے   نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے

اپنے نماز روزے کو کافی سمجھنا مسلمان کے لیے بہت بڑا مغالطہ اور فریب ہے۔ سب سے اچھے افرادِ اُمت صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ ان کی زندگیاں اُسوۂ حسنہ کے قریب تر تھیں، وہ دن کے شاہ سوار اور رات کے عبادت گزار تھے۔ وہ کنج عزلت میں بیٹھ کر، ماحول سے کٹ کر زندگی نہیں گزارتے تھے، بلکہ ان کی زندگی تو سراسر جدوجہد اور مشقت سے بھرپور تھی۔ انہوں نے آپ ؐ کی تعلیمات کے مطابق کفر کو مٹانے اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہ کیا اور نہ کبھی کفر اور طاغوت سے مصالحت کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ زندگی اُن کے سامنے تھا۔ پھر وہ اِس فرمانِ نبویؐ سے بھی واقف تھے: ''اگر تم میں سے کوئی کسی برائی کو دیکھے تو اسے اپنے ہاتھ سے مٹا دے، اور اگر اتنی استطاعت نہ ہو تو اپنی زبان سے روکے، اگر اتنی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے اسے بُرا جانے اور یہ کمزور ترین ایمان ہے''۔ (اربعین نووی، حدیث ۳۴)

ظاہر ہے کہ کمزور ترین ایمان مطلوب نہیں بلکہ ایمانِ کامل مطلوب ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ مسلمان برائی کو مٹانے کے لیے اپنی صلاحیتوں اور اختیار کو پورے طور پر کام میں لائے۔ اسلام میں ترکِ دنیا اور رہبانیت نہیں ہے۔ یہاں تو نکاح کرنا مسنون عبادت ہے، بیوی بچوں کی ضروریات پوری کرنا عبادت ہے۔ معاشرے سے کٹ کر زندگی بسر کرنے کا تو اسلام میں کوئی تصور نہیں۔

وحیٔ نبوت سے قبل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک اچھے انسان کی زندگی گزار رہے تھے۔ مکہ کے کفر و شرک اور برائی کے ماحول سے آپ ؐ کو نفرت تھی۔ آپ ؐ اردگرد کی ان غلاظتوں اور نجاستوں سے بےزار تھے۔ چنانچہ آپ ؐ کئی کئی دنوں کے لیے غارِ حرا میں گوشہ گیر ہو جاتے اور وہاں ذکر و فکر میں مشغول رہتے۔ آپ ؐ کو صراطِ مستقیم کی تلاش تھی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ ؐ کو راہِ راست دکھائی۔ نزولِ وحی کے ساتھ آپ ؐ کو مقصدِ بعثت سے آگاہ کر دیا گیا کہ اب آپ بنی نوعِ انسان کو سیدھی راہ دکھائیں جو انہیں حقیقی کامیابی کے ساتھ ہمکنار کرے گی۔ چنانچہ آپ ؐ نبوت کا تحفہ لے کر غارِ حرا سے اُترے اور اپنے مشن میں لگ گئے۔ اس کام میں آپ ؐ اتنے مصروف ہو گئے کہ باقی زندگی میں پھر کبھی غارِ حرا کی زیارت کے لیے تشریف نہیں

لے گئے۔ کیونکہ آپؐ کو اپنی ڈیوٹی سے آگاہ کر دیا گیا تھا اور آپؐ اپنے فرض سے ایک لمحے کے لیے بھی بے خبر نہیں رہ سکتے تھے۔ وہ بڑا ہی بے ذوق محقق ہے جو غارِ حرا میں آپؐ کی خلوت گزینی سے صوفیانہ چلہ کشی کا جواز پیدا کرے۔ اگر ایسا ہوتا تو آپؐ کے جاں نثار صحابہؓ ضرور کئی کئی دن بھوکے پیاسے رہ کر غاروں اور جنگلوں میں تپسیا کرتے۔ مگر اسلام میں ایسا نہیں اور نہ ہی صحابہ نے ایسا کیا۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فریضۂ رسالت ادا کرتے ہوئے اللہ کا پیغام مکہ کے لوگوں تک پہنچایا۔ حد درجہ مخالفت کی گئی' اذیتیں دی گئیں' لالچ دیے گئے' مگر آپؐ اپنے کام میں لگے رہے۔ چند لوگوں نے آپؐ کی آواز پر لبیک کہا تو وہ بھی ظلم وستم کا تختۂ مشق بنائے گئے۔ نوبت یہاں تک پہنچی کہ مکے کی سرزمین آپؐ پر اور آپؐ کے صحابہ پر تنگ کر دی گئی۔ آپؐ کے چند ساتھی اور خود آپؐ مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ وہاں پھر آپؐ پورے جوش وجذبے کے ساتھ اپنے فریضۂ منصبی میں لگ گئے۔ مخالفت ہوئی' کفر ونفاق کے ساتھ مڈبھیڑ کا آغاز ہوا' مسلح جنگیں ہوئیں' قیمتی جانوں کی قربانی دینا پڑی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سرزمین حجاز میں دین اسلام کا غلبہ ہو گیا اور کفر کے لیے سرزمینِ حرم میں بقاء ممکن نہ رہی۔ آپؐ جہانِ فانی سے حیاتِ ابدی کی طرف رخصت ہوئے اور اُمت کو پورے عالَم میں اللہ کی حاکمیت کے نظام کے نفاذ کی ذمہ داری سونپ گئے۔ آپؐ کی وفات کے بعد خلافت راشدہ قائم ہوئی جس میں اقصائے عالم میں دین اسلام غالب ہو گیا اور کفر وشرک کو چھوٹا بن کر رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔

خیر القرون کے بعد آہستہ آہستہ لوگوں میں کمزوری آئی اور عجمی خیالات نے اسلامی تعلیمات میں دراندازی کی تو کئی طرح کے فکر ونظر اور فلسفے ظہور پذیر ہوئے' اُن میں ایک معروف طرزِ حیات صوفی ازم تھا۔ جیسا کہ آغاز میں بیان ہوا' اس میں نماز روزے کی پابندی کو کافی سمجھا گیا۔ باطن کی صفائی اور کردار کی خوبی میں دین کو محصور کر دیا گیا' جبکہ اسلامی تعلیمات کی روح کو فراموش کر دیا گیا۔ بقول اقبال: ؎

وہ صوفی کہ تھا خدمتِ حق میں مرد محبت میں یکتا حمیت میں فرد
عجم کے خیالات میں کھو گیا یہ سالک مقامات میں کھو گیا

سورۃ المائدۃ میں ہے:

﴿يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۚ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ ؕ﴾ (آیت ۱۰۵)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! تم پر لازم ہے فکر اپنی جان کا' تمہارا کچھ نہیں بگاڑتا جو کوئی گمراہ ہوا جبکہ تم ہوئے راہ پر''۔

اس آیت سے بعض صحابہؓ کو غلط فہمی ہوئی کہ انسان پر بس اپنی ذمہ داری ہے' جب وہ خود نیکی پر ہے تو دوسروں کی بدعملی کا اس سے مؤاخذہ نہیں۔ اُس وقت حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے لوگوں کی اس غلط فہمی کو یہ کہہ کر دور کر دیا تھا کہ بدکرداروں کو پوری قوت اور استطاعت کے ساتھ راہِ صواب بتا دینے کے باوجود بھی اگر وہ برائی پر عمل پیرا رہتے ہیں تو اُن کی برائی کی ذمہ داری ان نیکوکاروں پر نہ ہوگی۔ جبکہ اس آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جب تم نیک اعمال کر رہے ہو تو اردگرد کی برائیوں کو روکنے کی ذمہ داری تم پر نہیں۔ مگر آج بھی یہ غلط فہمی پیدا کر کے جہادی طرزِ عمل سے پیچھا چھڑانے کی کوشش کی جا رہی ہے اور اپنے نماز روزوں کو کافی سمجھا جا رہا ہے' اور لاکھوں مسلمان ہیں جو اس غلط فہمی کی آڑ میں نہی عن المنکر کے فریضے سے غافل ہیں اور کفر اور شرک کے ماحول میں زندگی گزار رہے ہیں۔ ہاں پورے اخلاص اور خلوص سے ربّ العزت سے دعائیں مانگ رہے ہیں کہ برائی مٹ جائے اور اسلام کا غلبہ ہو جائے اور یہ بات بھول جاتے ہیں کہ دعائیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی مانگا کرتے تھے' مگر اُس وقت جب عملی طور پر کفر کی بیخ کنی کرتے اور اسلام کے غلبے کے لیے بھرپور جدوجہد بھی کرتے تھے۔ آپؐ کے صحابہ کرام دل وجان اور مال ومنال کے ساتھ آپؐ کے ہمراہ ہوتے تھے۔ یہی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے جو دن کو جہاد کرتے تھے اور رات کو اللہ کے حضور کھڑے ہو کر دعائیں مانگتے تھے' کیونکہ وہ اپنے فرض سے بخوبی آگاہ تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا اُسوۂ حسنہ بھی اُن کے سامنے تھا اور آپ کا یہ فرمان بھی کہ تم میں سے جو برائی کو دیکھے تو ہاتھ سے مٹا دے اور اگر اتنی استطاعت نہ ہو تو زبان سے مٹا دے اور اگر اس کی بھی طاقت نہ ہو تو دل سے برا جانے اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔ (اربعین نووی' حدیث ۳۴)۔ پھر آپؐ کا وہ فرمان بھی ان کے پیش نظر تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جبریل علیہ السلام کو حکم دیا کہ فلاں بستی کو اس کی پوری آبادی کے ساتھ اُلٹ دو۔ جبریلؑ نے عرض کیا اے پروردگار! اس بستی میں تیرا فلاں بندہ بھی ہے جس نے پلک جھپکنے کے برابر بھی کبھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ کا حکم ہوا کہ اس بستی کو اس

بندے پر اور اس کے دوسرے سب باشندوں پر الٹ دو' کیونکہ ایک ساعت کے لیے بھی میری وجہ سے اس بندے کا چہرہ متغیر نہیں ہوا۔ (شعب الایمان للبیہقی)

صوفی کا لفظ نہ قرآن میں ہے نہ حدیث میں۔ یہ لفظ بعد میں ایجاد ہوا اور اس کے مصداق بھی خود انسانوں نے مقرر کیے۔ قرآن وحدیث کی اصطلاح جہاد وقتال ہے۔ صوفی ازم کی سہل انگاری اور جہاد کی مشقت میں کوئی مماثلت نہیں۔ اللہ کو مجاہدین کے ساتھ محبت ہے۔ قرآن میں ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ﴾ (الصّف)

''بے شک اللہ پسند کرتا ہے اُن لوگوں کو جو اس کی راہ میں قطار باندھ کر لڑتے ہیں گویا وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں''۔

ایک اور جگہ ایمان کے دعوے داروں کو متنبہ کیا گیا ہے کہ:

﴿قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨ اقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ۭ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ﴾ (التوبة)

''(اے پیغمبر!) کہہ دیجیے اگر تمہارے باپ' اور بیٹے' اور بھائی' اور عورتیں' اور برادری' اور مال جو تم کماتے ہو' اور سوداگری جس کے بند ہونے سے تم ڈرتے ہو اور رہائش گاہیں جن کو تم پسند کرتے ہو' تم کو زیادہ پیاری ہیں اللہ سے اور اس کے رسول سے اور اس کے راستے میں جہاد سے' تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم بھیجے۔ اور اللہ راستہ نہیں دیتا نافرمانوں کو''۔

قرآن وحدیث کی ان وضاحتوں کے باوجود بھی اگر کوئی مسلمان مروّجہ تصوف کے بے جہاد فلسفے کے ساتھ چمٹا رہتا ہے اور جہاد کی اہمیت سے غافل رہتا ہے تو یقیناً اسے راہِ صواب تلاش کرنی چاہیے۔ نبی اکرم ﷺ کا فرمان ہے کہ:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ))[1]

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسہ بالغزو۔

''جس شخص نے اس حال میں انتقال کیا کہ نہ تو کبھی جہاد میں عملی حصہ لیا اور نہ کبھی جہاد کا سوچا (خواہش کی) تو اس نے ایک قسم کی منافقت کی حالت میں انتقال کیا۔''

جہاد کی اہمیت کا اندازہ اس بات سے لگائیے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جذبۂ جہاد سے سرشار تھے۔ جب دورِ نبویؐ اور عہدِ خلافتِ راشدہ میں بہادری کے کارنامے انجام دینے والے اسلام کے عظیم ترین جرنیل خالد بن ولید رضی اللہ عنہ کی وفات کا وقت آیا تو وہ حسرت سے کہہ رہے تھے کہ ساری عمر جہاد و قتال میں گزاری' شہادت کی تمنا رہی مگر آج گھر میں موت آ رہی ہے! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فرماتے تھے کہ:

((وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِهٖ لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلُ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیَا' ثُمَّ اُقْتَلُ)) (۱)

''قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے! میری دلی آرزو ہے کہ میں راہِ خدا میں شہید کیا جاؤں اور مجھے پھر زندہ کر دیا جائے' اور میں پھر شہید کیا جاؤں اور پھر مجھے زندہ کیا جائے' اور میں پھر شہید کیا جاؤں اور پھر مجھے زندگی عطا فرمائی جائے اور پھر میں شہید کیا جاؤں''۔

جہاد تو نام ہے اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے مال اور جان کی قربانی کرنے کا۔ اور یہ مسلمان کے لیے ایمان و یقین کا جزوِ لاینفک ہے: ؎

میری زندگی کا مقصد تیرے دیں کی سرفرازی ۔۔۔ میں اسی لیے مسلماں میں اسی لیے نمازی!

قرآنِ مجید میں جہاد کی ترغیب پر درجنوں آیات ہیں۔ گویا جہاد کی اہمیت کو کسی طور بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ سورۃ التوبہ کی جہاد کے موضوع پر بہت سی آیات ہیں۔ ان میں سے صرف ایک آیت اس طرح ہے:

﴿اَلَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفَآئِزُوْنَ ﴿۲۰﴾﴾

''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کی راہ میں اپنے

(۱) صحیح البخاری' کتاب الجہاد والسیر' باب تمنی الشہادۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب فضل الجہاد والخروج فی سبیل اللّٰہ۔

مالوں کے ساتھ اور جانوں کے ساتھ (ان کے لیے) اللہ کے ہاں بڑا درجہ ہے اور وہی لوگ مراد کو پہنچنے والے ہیں''۔

تصوف کے حق میں دلائل دیتے ہوئے اصحابِ صفہ کا تذکرہ اتنا ہی بے محل ہے جتنا غارِ حرا میں رسول اللہ ﷺ کی خلوت نشینی سے چلہ کشی کا جواز پیدا کرنا۔ کیونکہ اصحابِ صفہ تو حصولِ تعلیم کے لیے معیشت اور معاشرت کی تمام مصروفیات چھوڑ کر مسجد نبویؐ میں براجمان ہو گئے تھے۔ جونہی ان کی تعلیم و تربیت مکمل ہوتی تھی وہ وہاں سے نکل کر بھرپور زندگی گزارتے تھے اور جہاد کے لیے اپنے آپ کو تیار پاتے تھے۔

چونکہ صوفیاء عموماً نیک نفس، پاک باطن، بلند اخلاق، منکسر المزاج، خوش اطوار اور عبادت گزار ہوتے ہیں، لہٰذا ان کی زندگیوں میں دیکھنے والوں کے لیے کشش ہوتی ہے۔ اسی کشش کا اثر تھا کہ برعظیم پاک و ہند میں صوفیائے کرام کی سیرت و کردار اور شرافت سے متأثر ہو کر ہزاروں غیر مسلموں نے اسلام قبول کیا۔ یہ اُن کا ایک بہت بڑا کارنامہ ہے، لیکن اُن کی دی ہوئی تعلیم میں جو خلا رہ گیا ہے اس کا اعتراف کرنا بھی ضروری ہے۔ انہوں نے لوگوں کو اسلامی اخلاق، پاکیزگیٔ نفس اور عبادات کی اہمیت سے روشناس کرایا، مگر اسلام کی خاطر جان و مال کی قربانی کے باب کو پس منظر میں رکھا۔ ان کی نیت پر شبہ نہیں کیا جا سکتا۔ معلوم ہوتا ہے کہ حالات کے تحت، وقت کی نزاکت کو سمجھتے ہوئے وہ لوگوں کو دائرہ اسلام میں داخل کرنے کا مشن اختیار کیے ہوئے تھے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ آج خود مسلمان دین کو ہمہ پہلو کامل تسلیم کرنے کے باوجود مال و جان کے ساتھ جہاد کی اہمیت کو نظر انداز کر دیں، وہ جہاد جس کا حکم واضح طور پر قرآن مجید میں بار بار دیا گیا ہے۔ کتب حدیث کے درجنوں صفحات میں اس کی اہمیت بتائی گئی ہے اور سب سے بڑھ کر رسول اللہ ﷺ کی اپنی زندگی اور آپ کے اصحاب رضی اللہ عنہم کی زندگیاں جہاد و قتال میں بسر ہوئیں۔ رسالت مآبؐ کی زندگی کا مدنی دَور صرف دس سال ہے۔ اس مختصر مدت میں چھوٹے بڑے درجنوں معرکے ہوئے جن میں سے کچھ میں خود آپؐ نے بنفس نفیس حصہ لیا اور کچھ دیگر سپہ سالاروں کی سرکردگی میں انجام پائے۔ پس یہ حقیقت ہر وقت پیش نظر رہنی چاہیے کہ جہاد کے بغیر اسلام کا تصور ادھورا اور نامکمل ہے۔

نرمی اور ملاطفت

اسلام رحمت اور رأفت کا دین ہے۔ اس کی تمام تعلیمات امن وسلامتی کی ضمانت فراہم کرتی ہیں۔ مسلمان دوسروں کے لیے سہولت اور آسانی پیدا کرتا ہے۔ وہ کسی کے لیے پریشانی اور تکلیف کا باعث نہیں بنتا۔ اسلامی اخلاق صفاتِ عالیہ کا مرقع ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کی شخصیت میں زندگی گزارنے کا کامل اور بہترین نمونہ موجود ہے۔ آپؐ حقیقی معنوں میں معلمِ اخلاق تھے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((بُعِثْتُ لِاُتَمِّمَ حُسْنَ الْاَخْلَاقِ))(۱)

''مجھے اخلاقی خوبیوں کو درجۂ کمال تک پہنچانے کے لیے بھیجا گیا ہے۔''

چنانچہ حیاتِ طیبہ از اوّل تا آخر فضائلِ اخلاق پر ہی مشتمل ہے۔ آپ ﷺ نے اخلاقی محاسن کا جو نمونہ چھوڑا کوئی بڑے سے بڑا انسان اُس کے عشرِ عشیر تک بھی نہیں پہنچ سکا اور نہ ہی پہنچ سکتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے انسانی عظمت کا راز اچھے اخلاق کو قرار دیا ہے۔ جب آپ ﷺ سے پوچھا گیا کہ جو کچھ انسان کو عطا کیا گیا ہے اس میں سب سے بہتر کیا ہے؟ تو آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ ''اچھے اخلاق''۔(۲)

رسول اللہ ﷺ نے اپنی حیاتِ طیبہ کے آخری دَور میں حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا۔ انہیں مدینہ سے رخصت کرتے وقت' جب وہ سواری پر سوار ہونے کے لیے پابہ رکاب تھے' آپؐ نے نصیحت کی کہ اللہ کے بندوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنا۔(۳)

اخلاقی خوبیوں میں ایک بہت بڑی خوبی جس پر اسلام میں بڑا زور دیا گیا ہے' وہ نرم مزاجی ہے۔ مسلمان دوسروں کا ہمدرد' غم گسار اور خیر خواہ ہوتا ہے۔ وہ دوسروں کے

لیے مشکلات اور پریشانیاں پیدا نہیں کرتا' بلکہ وہ معاشرے کا مفید اور بے ضرر فرد ہوتا ہے۔ اُس کی ذات سے کسی کو نقصان کا اندیشہ نہیں ہوتا۔

حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْمُسْلِمُ مَنْ سَلِمَ الْمُسْلِمُوْنَ مِنْ لِّسَانِهٖ وَيَدِهٖ)) (٤)

''مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں''۔

ایک اور جگہ ارشادِ نبویؐ ہے:

((وَالْمُؤْمِنُ مَنْ اَمِنَهُ النَّاسُ عَلٰی دِمَائِهِمْ وَاَمْوَالِهِمْ))(٥)

''اور مؤمن وہ ہے جس کی طرف سے اپنی جانوں اور مالوں کے بارے میں لوگوں کو کوئی خوف وخطر نہ ہو۔''

ویسے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں تمام فضائلِ اخلاق ہی اعلیٰ ترین معیار پر موجود تھے' تاہم اُن صفات میں آپؐ کی نرم مزاجی بہت نمایاں ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نرم مزاجی کا تذکرہ کرتے ہوئے حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں مدینہ منورہ میں دس سال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہا۔ میں چونکہ نوعمر لڑکا تھا اس لیے میرا ہر کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے مطابق نہیں ہوتا تھا' پھر بھی دس سال کی اس مدت میں کبھی آپؐ نے اُف کہہ کر بھی مجھے نہیں ڈانٹا اور نہ کبھی یہ فرمایا کہ تم نے ایسا کیوں کیا یا ایسا کیوں نہیں کیا۔ (سنن ابی داؤد) جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود غلاموں اور خادموں کے ساتھ نرم رویے کی مثالیں چھوڑیں وہاں رحمۃ للعالمینؐ نے ان کمزور لوگوں پر احسان فرماتے ہوئے دوسروں کو بھی تلقین فرمائی کہ ان کے ساتھ نرمی کا سلوک روا رکھا جائے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ ایک شخص رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے خادم کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپؐ نے اس کو کوئی جواب نہ دیا اور خاموش رہے۔ اس نے پھر وہی سوال دہرایا اور کہا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! میں اپنے خادم کو کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپؐ نے فرمایا''ہر روز ستر مرتبہ''۔ (سنن الترمذی)

نرم رویہ رکھنے والے کو دنیا میں عزت اور تکریم ملتی ہے' اس کی شخصیت دوسروں کے لیے کشش کا باعث ہوتی ہے' اُس کی بات پُرتاثیر ہوتی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ نرمی اختیار کرنا خود اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ اس نے اپنے آپ کو الرّء وف اور الرّحیم کہا ہے۔ اور ''تخلّقوا باَخلاقِ اللّٰہ'' کے تحت انسانوں کا بھی اس صفت سے موصوف ہونا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے اور وہ نرم مزاج بندے پر اپنی عنایتوں کے دروازے کھول دیتا ہے۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ رَفِيْقٌ يُحِبُّ الرِّفْقَ وَيُعْطِيْ عَلَى الرِّفْقِ مَا لَا يُعْطِيْ عَلَى الْعُنْفِ وَمَا لَا يُعْطِيْ عَلٰى مَا سِوَاهُ)) (٦)

''یقیناً اللہ تعالیٰ خود مہربان ہے اور نرمی اور مہربانی اُس کو محبوب ہے۔ اور نرمی پر وہ اتنا دیتا ہے جتنا کہ درشتی اور سختی پر نہیں دیتا' اور جتنا کہ نرمی کے ماسوا کسی چیز پر بھی نہیں دیتا''۔

جب کوئی شخص خاص طور پر خادم کوئی غلطی کرتا ہے تو غصہ آنا فطری بات ہے' مگر اس غصّے کو پی جانا اور سختی کو ترک کر کے نرم رویہ اپنانا بڑے عزم و ہمت کی بات ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

((لَيْسَ الشَّدِيْدُ بِالصُّرَعَةِ اِنَّمَا الشَّدِيْدُ الَّذِيْ يَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ)) (٧)

''پہلوان وہ نہیں جو مدّ مقابل کو کُشتی میں پچھاڑ دے' بلکہ درحقیقت پہلوان تو وہ ہے جو غصے کے وقت اپنے نفس کو قابو میں رکھے''۔

غصے میں آدمی کا مزاج اعتدال سے ہٹ جاتا ہے' مگر ایسی حالت میں اللہ کی رضا کی خاطر غصہ پی جانا بڑی فضیلت کی بات ہے۔ بہادر شاہ ظفر کا شعر ہے:

ظفر آدمی اُس کو نہ جانیے گا ہو وہ کیسا ہی صاحبِ فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت موسیٰ

علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا: ''پروردگار! آپ کے بندوں میں کون آپ کی بارگاہ میں زیادہ باعزت ہیں؟'' اللہ تعالیٰ نے فرمایا'' وہ بندے جو (قصوروار پر) قابو پانے کے بعد (اور سزا دینے کی قدرت رکھنے کے باوجود اس کو) معاف کردیں''۔ (۸)

ہر شخص کی یہ خواہش ہوتی ہے کہ دوسرے اُس کے ساتھ نرم رویہ رکھیں، خطا اور غلطی پر سختی نہ کریں بلکہ عفو ودرگزر سے کام لیں۔ کوئی بھی نہیں چاہتا کہ اُس کے ساتھ سخت رویہ رکھا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ تم دوسروں کے لیے وہی پسند کرو جو اپنے لیے پسند کرتے ہو۔ پس ہر شخص کو چاہیے کہ جس طرح وہ خود اپنے ساتھ نرم رویے کی خواہش رکھتا ہے اسی طرح دوسروں کے ساتھ بھی نرمی کے ساتھ پیش آئے، کیونکہ وہ بھی نرمی چاہتے ہیں۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى يُحِبَّ لِاَخِيْهِ مَا يُحِبُّ لِنَفْسِهٖ)) (۹)

''تم میں سے کوئی شخص مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اپنے بھائی کے لیے وہی نہ چاہے جو اپنے لیے چاہتا ہے''۔

نرمی کی خصلت میں خیر ہی خیر ہے۔ نرم مزاج آدمی خوش بخت ہے۔ وہ دنیا میں بھی اس رویے کی برکات سے بہرہ مند ہوتا ہے اور انجام کار بھی اچھائی حاصل کرتا ہے۔ اس کے برعکس سخت مزاج آدمی کا معاملہ ہے کہ زندگی میں لوگ اس سے نفرت کرتے ہیں اور اُس کی سخت مزاجی اُس کے انجام کی خرابی پر منتج ہوتی ہے۔

اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ، حضرت ابوالدرداء اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہم سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ اُعْطِيَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفْقِ فَقَدْ اُعْطِيَ حَظَّهٗ مِنَ الْخَيْرِ، وَمَنْ حُرِمَ حَظَّهٗ مِنَ الرِّفْقِ فَقَدْ حُرِمَ حَظَّهٗ مِنَ الْخَيْرِ)) (۱۰)

''جس شخص کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے نرمی کی خصلت کا اپنا حصہ مل گیا تو اس کو دنیا و آخرت کے خیر میں سے حصہ مل گیا اور جس کو نرمی نصیب نہیں ہوئی وہ دنیا اور

آخرت میں خیر کے حصے سے محروم رہا''۔

کتنی بڑی بات ہے کہ نرم خو آدمی کو رسول اللہ ﷺ نے دوزخ سے رہائی کی خوشخبری سنائی ہے! کسی انسان کے لیے اس سے بڑی نوید اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ جنت میں داخل کیا جائے گا اور جہنم کے دروازے اُس پر بند ہوں گے' گویا نارِ جہنم اُسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اَلَا اُخْبِرُکُمْ بِمَنْ یَحْرُمُ عَلَی النَّارِ اَوْ بِمَنْ تَحْرُمُ عَلَیْهِ النَّارُ؟ عَلٰی کُلِّ قَرِیْبٍ هَیِّنٍ سَهْلٍ)) (۱۱)

''کیا میں تم کو ایسے شخص کی خبر نہ دوں جو دوزخ کے لیے حرام ہے اور دوزخ کی آگ اُس کے لیے حرام ہے؟ سنو! (دوزخ کی آگ ہر ایسے شخص پر حرام ہے) جو لوگوں سے قریب ہونے والا ہو' نرم خو ہو اور لوگوں کے لیے آسانیاں پیدا کرنے والا ہو''۔

درشت مزاجی نرم مزاجی کی ضد ہے۔ پس سخت مزاج آدمی اُن تمام برکات سے محروم رہتا ہے جو نرم خو کو ملنے والی ہیں اور بدبختی اس کا مقدر بن جاتی ہے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے الصادق المصدوق سیدنا ابوالقاسم حضرت محمد ﷺ سے سنا ہے' آپؐ ارشاد فرماتے تھے:

((لَا تُنْزَعُ الرَّحْمَةُ اِلَّا مِنْ شَقِیٍّ)) (۱۲)

''رحم کا مادہ صرف بدبخت کے دل میں سے نکالا جاتا ہے''۔

سخت مزاج آدمی کی بدبختی اس سے زیادہ اور کیا ہوگی کہ اُسے جہنم کی وعید سنائی گئی ہے۔ حارثہ بن وہب رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَا یَدْخُلُ الْجَنَّةَ الْجَوَّاظُ وَلَا الْجَعْظَرِیُّ)) (۱۳)

''سخت گو اور درشت خو آدمی جنت میں نہیں جائے گا''۔

نرمی کی صفت اللہ تعالیٰ کو محبوب ہے۔ نرم خو ربّ کی رحمتوں کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ طبیعت کی نرمی ہر دلعزیزی کی علامت ہے۔ اس کے برعکس سخت مزاجی ہے کہ جو

انسان کے لیے طرح طرح کے مسائل پیدا کرتی ہے۔ سخت مزاج آدمی خود اپنے ہاتھوں پریشانیاں پیدا کر کے انجامِ بد سے دوچار ہوتا ہے۔

حضرت جریر رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ آپؐ نے فرمایا:

((مَنْ يُحْرَمِ الرِّفْقَ يُحْرَمِ الْخَيْرَ)) (۱۴)

''جو شخص نرمی کی صفت سے محروم کیا گیا وہ سارے خیر سے محروم کیا گیا''۔

اسلام دینِ وسط ہے' اس کا کوئی ضابطہ حدِّ اعتدال سے ہٹا ہوا نہیں ہے۔ نرم مزاجی کے سلسلہ میں بھی اسلامی تعلیمات میں انتہا پسندی نہیں ہے۔ نرمی کا رویہ اگرچہ عمومی انداز میں قابلِ تعریف ہے' مگر اس کا استعمال بھی بصیرت کے ساتھ ہوگا۔ بعض اوقات سخت رویہ ضروری ہو جاتا ہے۔ جس شخص کے خلاف چوری' ڈکیتی یا قتل کا جرم ثابت ہو جائے تو قاضی کو اس بات کی اجازت نہیں کہ وہ نرم رویہ اختیار کرتے ہوئے ایسے مجرموں کو معاف کر دے' بلکہ ان مجرموں کو سزا دینا معاشرے میں امن و امان قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے' لہٰذا معاشرے کے امن و امان کو تباہ کرنے والے کسی نرمی کے مستحق قرار نہیں پا سکتے۔

قرآن مجید میں ارشادِ الٰہی ہے:

﴿وَجَزَآءُ سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ؕ﴾ (الشوریٰ: ۴۰)

''اور برائی کا بدلہ ویسی ہی برائی ہے' پھر جو کوئی معاف کرے اور صلح کرے تو اس کا ثواب ہے اللہ کے ذمہ''۔

لہٰذا نرمی کا استعمال بھی عقل و بصیرت کے ساتھ ہوگا۔ نرمی کا سلوک وہاں ہوگا جہاں اصلاح کی امید ہو۔ مگر جہاں صورتِ حال ایسی ہو کہ نرم رویہ اور عفو و درگزر کا معاملہ مثبت نتائج نہیں دے گا' بلکہ نرم رویے سے ناجائز فائدہ اٹھایا جائے گا تو وہاں نرم رویہ یقیناً مناسب نہیں۔ اسوۂ حسنہ سے بھی ہمیں یہی تعلیم ملتی ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سرتاپا حسنِ سیرت سے مزین تھے۔ آپؐ رحمۃ للعالمین تھے۔ نرمی اور عفو و درگزر آپؐ کی امتیازی شان تھی۔ آپؐ نے خون کے پیاسوں کو بھی معاف کیا

اور دشمنوں کے ساتھ بھی نرمی کا سلوک کیا۔ فتح مکہ کے موقع پر آپؐ فاتحانہ شہر میں داخل ہوئے تو آپؐ کے ظالم اور سفاک دشمن آپؐ کے سامنے شکست خوردہ موجود تھے۔ آپؐ نے کمالِ مہربانی کے ساتھ انہیں ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ کی نوید سنائی اور معاف کر دیا' تاہم چند خطرناک افراد کو سزا بھی سنائی جو اس نرم سلوک کے مستحق نہ تھے۔

مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ مسلمان بھائیوں کے ساتھ رحمت' شفقت' رأفت اور مہربانی کا رویہ رکھتا ہے' نیز اُس کو اُن غیر مسلموں کے ساتھ بھی حسن اخلاق کی تعلیم دی گئی ہے جو پُر امن زندگی بسر کر رہے ہوں اور اسلام کے خلاف اُن کے عزائم جارحانہ نہ ہوں۔ لیکن جب کفار و مشرکین مسلمانوں کے خلاف محاذ آرائی کا رویہ اختیار کریں تو پھر وہ کسی نرمی کے مستحق نہیں' بلکہ مسلمانوں کو حکم ہے کہ وہ پوری قوت اور سختی کے ساتھ اُن کو کچل دیں' کیونکہ اسلام کی فطرت میں باطل کی بالا دستی قبول کرنے کی کوئی گنجائش نہیں۔ قرآن مجید میں رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان اس طرح بیان ہوئی ہے:

﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ اَشِدَّاۗءُ عَلَي الْكُفَّارِ رُحَمَاۗءُ بَيْنَهُمْ ......﴾ (الفتح: ۲۹)

''محمد (ﷺ) اللہ کے رسول' اور جو لوگ اُن کے ساتھ ہیں' زور آور ہیں کافروں پر' جبکہ آپس میں نرم دل ہیں''۔

اسی حقیقت کو علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس طرح بیان کیا ہے: ؎

ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

باطل کے سامنے مسلمان لوہے کا چنا ثابت ہوگا۔ باطل کے ساتھ حق کی آویزش آج کی بات نہیں۔ کسی بھی دَور میں حق نے باطل کے ساتھ مصالحت نہیں کی۔ بقولِ اقبال: ؎

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغِ مصطفویؐ سے شرارِ بولہبی

کفر اور اسلام کی جنگ میں مسلمانوں کو پوری قوت اور بہادری کے ساتھ لڑنے کا حکم دیا گیا ہے' بلکہ ایسی حالت میں میدانِ جنگ سے پیٹھ پھیر کر بھاگ جانے کی سزا جہنم بتائی گئی ہے۔ البتہ جب کفار ومشرکین جنگی قیدی بن کر مسلمانوں کے ہاتھ آئیں گے تو وہ ہر طرح کے حسن سلوک کے مستحق ہوں گے۔ نہ اُن کو ستایا جائے گا اور نہ ہی اُن کے ساتھ کسی طرح کا غیر انسانی سلوک روا رکھا جائے گا۔

حواشی

١) موطا امام مالك' كتاب الجامع' باب انه قد بلغه ان رسول الله ﷺ قال بعثت لاتمم حسن الاخلاق۔ ومسند احمد۔

٢) رواه البيهقي في شعب الايمان۔

٣) موطا امام مالك

٤) صحيح البخاری' كتاب الايمان' باب المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده۔ وصحيح مسلم' كتاب الايمان' باب بيان تفاضل الاسلام وای اموره افضل۔

٥) سنن الترمذی' كتاب الايمان' باب ما جاء في ان المسلم من سلم المسلمون من لسانه ويده۔ وسنن النسائی' كتاب الايمان وشرائعه' باب صفة المؤمن۔

٦) صحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب فضل الرفق۔

٧) صحيح البخاری' كتاب الادب' باب الحذر من الغضب۔ وصحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب فضل من يملك نفسه عند الغضب......الخ۔

٨) رواه البيهقي في شعب الايمان۔

٩) صحيح البخاری' كتاب الايمان' باب من الايمان ان يحب لاخيه ما يحب لنفسه۔ وصحيح مسلم' كتاب الايمان' باب الدليل على ان من خصال الايمان ان يحب لاخيه۔

١٠) سنن الترمذی' كتاب البر والصلة عن رسول الله ﷺ' باب ما جاء في الرفق۔

١١) سنن الترمذی' كتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول الله ﷺ' باب منه۔

١٢) سنن الترمذی' كتاب البر والصلة عن رسول الله ﷺ' باب ما جاء في رحمة الناس۔ ومسند احمد۔

١٣) سنن الترمذی' كتاب البر والصلة عن رسول الله ﷺ' باب ما جاء في رحمة الناس۔

١٤) صحيح مسلم' كتاب البر والصلة والآداب' باب فضل الرفق۔

دُکھ اور تکلیف کا اُمید افزا پہلو

اگر اسلام کو امید کا دین کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا' کیونکہ یہ ایسا ضابطہ حیات ہے جو اپنے ماننے والوں کو کسی بھی حال میں مایوس نہیں کرتا۔ غربت اور بدحالی میں یہ فراخی اور خوش حالی کی امید دلاتا ہے۔ بیماری میں صحت کی امید کے ساتھ ساتھ گناہوں کے مٹنے کی نوید سناتا ہے۔ گناہگاروں کو توبہ کا راستہ دکھاتا ہے۔ غرض اسلام وہ طرزِ حیات ہے جو کسی کو ایسی صورتِ حال سے دوچار نہیں کرتا جہاں آگے نکلنے کا کوئی راستہ نہ رہ گیا ہو۔

اسلام میں خودکشی حرام ہے۔ اس لیے کہ خودکشی کرنے والا حالات سے اس قدر دل برداشتہ ہو جاتا ہے کہ وہ موت کو زندگی پر ترجیح دیتا ہے۔ اسلام اپنے ماننے والوں کو ہمیشہ صورت حال کا روشن پہلو دکھاتا ہے اور مایوسی دور کرتا ہے۔

انسانی زندگی میں دکھ سکھ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ آدمی پر بیماری بھی آتی ہے' جو زندگی میں تلخی اور تکلیف کا باعث ہوتی ہے۔ ایسی حالت میں اسلام حوصلہ دیتا ہے کہ بیماری کی وجہ سے انسان کے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''مردِ مؤمن کو جو بھی دکھ' بیماری' پریشانی' رنج وغم اور اذیت پہنچتی ہے' یہاں تک کہ اُسے کانٹا بھی چبھتا ہے تو اللہ تعالیٰ ان چیزوں کے ذریعے اس کے گناہ معاف کر دیتا ہے''۔ (بخاری و مسلم) پس بیماری بھی ایک طرح سے رحمت ہے' کیونکہ کوئی فردِ بشر ایسا نہیں جس سے کبھی گناہ کا صدور نہ ہوا ہو۔ یوں ہر شخص کو اللہ کی رحمت کی ضرورت ہے جو اُس کے گناہوں کو مٹا دے۔ چنانچہ بیماری اور مصیبت گناہوں کا کفارہ بن جاتی ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''کسی مردِ مؤمن کو جو بھی تکلیف پہنچتی ہے' مرض سے یا اس کے علاوہ' اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اس

کے گناہوں کواس طرح جھاڑ دیتا ہے جس طرح خزاں رسیدہ درخت اپنے پتے جھاڑ دیتا ہے''۔ (بخاری ومسلم)

ذرا غور کیجیے! جب کوئی بندہ بیمار ہو اور اس کے سامنے اسلام کی یہ تعلیم ہو کہ بیماری کی تکلیف اُس کے لیے گناہوں کے مٹانے کا وسیلہ بن جائے گی' تو جہاں اُس کے لیے تکلیف قابل برداشت ہو جائے گی وہاں اس کو ایک گونہ سکون بھی ہوگا کہ اس پر سے گناہوں کا بوجھ اتر رہا ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ کے بعض ایمان والے بندوں یا ایمان والی بندیوں پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے مصائب اور حوادث آتے رہتے ہیں' کبھی اس کی جان پر' کبھی اس کے مال پر' کبھی اس کی اولاد پر (اور اس کے نتیجہ میں اس کے گناہ جھڑتے رہتے ہیں) یہاں تک کہ مرنے کے بعد وہ اللہ کے حضور اس حال میں پہنچتا ہے کہ اس کا ایک گناہ بھی باقی نہیں ہوتا''۔ (جامع ترمذی)

بعض لوگ دنیا میں حد سے زیادہ دکھ' تکلیف اور بیماری کا شکار بنتے ہیں۔ ان لوگوں کو اجر اُسی مقدار میں ملے گا جس مقدار میں انہوں نے مصیبت اٹھائی۔

آدمی کے لیے سب سے بڑا صدمہ اُس کے کسی عزیز کی موت ہوتا ہے' مگر موت تو اٹل حقیقت ہے' آج نہیں تو کل ہر کسی کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔ اس ضمن میں اسلامی تعلیمات یہ ہیں کہ کسی عزیز کی وفات پر جزع فزع نہ کی جائے' نہ ماتم کیا جائے' نہ شکوہ و شکایت کے الفاظ زبان پر لائے جائیں' بلکہ اس صدمے کو اللہ کا فیصلہ سمجھ کر صبر کے ساتھ برداشت کیا جائے۔ اللہ کی رضا کی خاطر صدمے کے موقع پر صبر کا یہ مظاہرہ اُس کے لیے اجر عظیم کا باعث بن جائے گا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ اپنے ایمان والے بندے (یا بندی) کے کسی پیارے کو جب میں اٹھالوں' پھر وہ ثواب کی امید میں صبر کرے تو میرے پاس اس کے لیے جنت کے سوا کوئی معاوضہ نہیں ہے''۔ (صحیح بخاری)

اولاد انسان کو کتنی پیاری ہوتی ہے! اس شخص کے صدمے کا اندازہ کیجیے جس کا

لختِ جگراور امیدوں کا سہارا اس کے سامنے دم توڑ دے۔ اُس بچے کے ماں باپ اگر صبر و ثبات اور تحمل کے ساتھ اللہ کی رضا کی خاطر یہ صدمہ برداشت کر لیں اور شکوہ و شکایت اور بے صبری کا مظاہرہ نہ کریں تو انہیں اس کے بدلے میں جنت میں شاندار گھر کی بشارت ہے۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جب اللہ کے کسی بندے کا بچہ انتقال کر جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ روح قبض کرنے والے فرشتے سے فرماتا ہے: ''تم نے میرے بندے کے بچے کی روح قبض کی؟'' وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں! پھر فرماتا ہے: ''تم نے اس کے دل کا پھل اس سے لے لیا؟'' وہ عرض کرتے ہیں جی ہاں! پھر فرماتا ہے: ''اس بندے نے اس حادثے پر کیا کہا؟'' فرشتے عرض کرتے ہیں کہ اس بندے نے آپ کی حمد کی' آپ کا شکر کیا اور ''انا للہ وانا الیہ راجعون'' پڑھا۔ اللہ فرماتا ہے: ''(اس کے صابرانہ رویے پر) اس کے لیے جنت میں ایک عالیشان گھر بناؤ اور اس کا نام بیت الحمد رکھو''۔ (مسند احمد' جامع الترمذی)

بیمار کی عیادت بھی بہت بڑا کارِثواب ہے۔ رسول اللہ ﷺ خود نہ صرف مسلمان بلکہ غیر مسلموں کی عیادت کے لیے بھی تشریف لے جایا کرتے تھے۔ ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''بھوکوں کو کھانا کھلاؤ' بیماروں کی عیادت کرو اور جو لوگ ناحق قید کر دیے گئے ہوں ان کی رہائی کی کوشش کرو''۔ (بخاری)

کبھی کبھی کوئی مصیبت یا پریشانی انسان کی اپنی غلطی کی وجہ سے بھی آن پڑتی ہے۔ ایسی صورت میں انسان عملی طور پر اپنی غلطی کی اصلاح کرے۔ ہر مصیبت اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے۔ ﴿مَا اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ﴾ (التغابن:۱۱)۔ چنانچہ مصیبت کو صرف اللہ کے غضب اور قہر کا ظہور ہی نہیں سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کے لیے اس میں خیر اور رحمت کا بڑا سامان ہے۔ اس کے ذریعے گناہوں کی صفائی اور تطہیر ہوتی ہے' اللہ تعالیٰ کی رحمتیں برستی ہیں' درجات بلند ہوتے ہیں اور اعمال میں کوتاہیوں کی تلافی ہوتی ہے۔

دنیا میں آنے والی تکالیف اور بیماریاں اجر و ثواب کا باعث بنتی ہیں۔ بس شرط یہ

ہے کہ آدمی شکوہ وشکایت زبان پر نہ لائے' صبر کا مظاہرہ کرے اور اجر کی امید رکھے۔ قیامت کے روز بعض لوگ ایسے بھی ہوں گے کہ ان کے اعمالِ حسنہ بخشش کے لیے کافی نہ ہوں گے' مگر دنیا میں برداشت کی جانے والی تکالیف کا اجر اعمالِ حسنہ کی کمی کو پورا کردے گا اور حساب کے وقت اُن پر یہ بات ظاہر ہو جائے گی کہ دنیا کی زندگی میں آنے والی مصیبتیں اور بیماریاں اگر نہ ہوتیں تو نجات نہ ہوسکتی۔ حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''قیامت کے دن جب ان بندوں کو جو دنیا میں مبتلائے مصائب رہے' ان مصائب کے عوض اجر وثواب دیا جائے گا تو وہ لوگ جو دنیا میں ہمیشہ آرام وراحت سے رہے' حسرت کریں گے کہ کاش دنیا میں ہماری کھالیں قینچیوں سے کاٹی گئی ہوتیں''۔ (ترمذی)

اللہ تعالیٰ کی رحمت کا اندازہ کیجیے کہ ایک آدمی جو صحت کے ایام میں ذکر اذکار اور نیک اعمال کرتا ہے' جب کبھی وہ بیمار ہو کر اپنے اعمالِ حسنہ ادا کرنے کے قابل نہ رہے تو اللہ تعالیٰ اپنی مہربانی سے اس کو بیماری کے دنوں میں وہی اجر دیتا ہے جو اُسے اعمال حسنہ کرنے پر ملتا تھا' یہ اس لیے کہ اگر وہ بندہ بیمار نہ ہوتا تو اپنے اعمال حسنہ کے معمولات پر ضرور عمل پیرا رہتا۔

الغرض دنیاوی زندگی میں بندۂ مؤمن کو پیش آنے والے صدمات' تکالیف یا بیماریاں اس کے لیے درجات کی بلندی' گناہوں کی معافی اور نجات کا ذریعہ بن جائیں گی۔ قرآن مجید میں مصائب پر صبر کرنے والے بندوں کو تین چیزوں کی بشارت دی گئی ہے' ان پر اللہ تعالیٰ کی خاص نوازش اور عنایت ہوگی اور وہ رحمت سے نوازے جائیں گے اور ہدایت یاب ہوں گے۔ (البقرۃ:۱۵۷) اللہ تعالیٰ چاہے تو اپنے کسی بندے کو بغیر کسی عمل کے بھی بخشش سے نواز سکتا ہے' مگر بتقاضائے حکمت وہ بندے کی تکالیف اور بیماریوں کو اس کے لیے وسیلۂ نجات بنا دیتا ہے یا پھر کسی دوسرے بندے کی اس کے حق میں کی جانے والی دعا کے طفیل اس کی بخشش کر دیتا ہے۔ بہرحال صبر اور ثبات کی توفیق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہے۔ چنانچہ اسی سے نیکی اور صبر کی توفیق طلب کرنی چاہیے۔ وَمَا تَوْفِيْقِيْ اِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيْمِ

❁❁❁

حیاتِ دُنیوی ـــــ ایک انمول تحفہ

خالق کائنات حکیم مطلق ہے۔ جس طرح اُس کی ذات بے مثل اور بے مثال ہے اسی طرح اُس کی صفات بھی لامحدود وسعت کی حامل ہیں۔ الحکیم بھی اس کی ایک صفت ہے' جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسا دانا ہے کہ اس کا کوئی کام بھی عبث اور فضول نہیں۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمَا خَلَقْنَا السَّمَآءَ وَالْاَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا بَاطِلًا ۭ ذٰلِكَ ظَنُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۚ﴾ (صٓ:۲۷) ''ہم نے آسمان اور زمین کو اور جو کچھ ان کے درمیان ہے بے مقصد پیدا نہیں کیا' بلکہ ایسا تو اُن لوگوں کا خیال ہے جنہوں نے انکار کیا''۔ اس کے علاوہ اگر ذرا غور کریں تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ سارے داناؤں سے بڑے بلکہ سب داناؤں کے خالق سے یہ بات کیسے ممکن ہے کہ وہ کوئی فضول کام کرے؟ اپنے اردگرد کے ماحول میں ہم اُسی شخص کو عقلمند کہتے ہیں جس کے مشاغل اور مصروفیات نتیجہ خیز (productive) اور مثبت ہوں اور اُس شخص کو بے وقوف کہتے ہیں جو عاقبت نااندیشی' کوتاہ نظری اور کم فہمی کی بنا پر ایسے کام کرے جو عدل وانصاف کے خلاف اور نتیجتاً ضرر رساں ہوں یا بے فائدہ ہوں۔ قرآن مجید میں اللہ کے نیک بندوں کی دعا کے الفاظ آئے ہیں جہاں وہ دعا مانگنے کے دوران اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ ﴿رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ﴾ (آل عمران: ۱۹۱) ''اے ہمارے پروردگار! تو نے یہ سب کچھ باطل (بے کار) پیدا نہیں کیا''۔

یوں ہمارا اس بات پر پختہ یقین ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات بامقصد پیدا کی ہے اور اس میں کوئی شے بھی فضول اور بے کار پیدا نہیں کی۔ یہاں یہ سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا کہ مخلوقات میں بعض ایسی انواع بھی ہیں جن میں صرف ضرر کا پہلو ہی نمایاں نظر آتا ہے' کیونکہ ہمارا فہم وادراک ہر شے کی حقیقت معلوم کرنے کی صلاحیت ہی نہیں

رکھتا۔ بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ عقل وشعور اور بیانِ مدعا کی صلاحیت کے علاوہ انسان کی‘ جو اشرف المخلوق ہے‘ ہر صلاحیت میں بعض حیوانات‘ چرند اور پرند کو اس پر فوقیت حاصل ہے۔ عقاب کی قوتِ بصارت‘ کتے کی قوتِ شامہ‘ گھوڑے کی قوتِ سماعت انسان کی قوتوں سے کہیں بہتر ہیں۔ پھر انسان کیسے اس بات کا دعویٰ کر سکتا ہے کہ اسے کائنات کی ہر شے کی کنہ کا علم ہے؟

جب یہ بات طے ہوئی تو تخلیق کائنات کا مقصد سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ جَمِيْعًا مِّنْهُ﴾ (الجاثیۃ: ۱۳) ’’اور اس نے تمہارے کام میں لگا دیا اپنی طرف سے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے سب کا سب‘‘۔ گویا مخلوقات کی ہر نوع انسان کی خدمت میں لگی ہوئی ہے جبکہ انسان کو اشرف المخلوق کے منصب پر فائز کر کے مخدومِ کائنات بنا دیا گیا ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيْٓ اٰدَمَ﴾ (الاسراء: ۷۰) ’’اور ہم نے اولادِ آدم کو شرفِ فضیلت بخشا‘‘۔ مشاہدہ اس بات کا گواہ ہے کہ بیل‘ گائے‘ فاختہ‘ کبوتر‘ مرغا‘ ہرن وغیرہ انسان ہی کے لیے پیدا کیے گئے ہیں کہ ان کا گوشت کھائے۔ گھوڑے‘ گدھے‘ اونٹ وغیرہ پیدا کیے کہ ان سے سواری کا کام لے۔ اناج اور پھل پیدا کیے جو انسان کے کام و دہن کی تسکین کا سامان لیے ہوئے ہیں۔ خوش نما مناظر اور پھول پیدا کیے جو انسانی آنکھوں کے لیے راحت کا باعث ہیں۔ ہاں مخلوق کی کچھ ایسی انواع بھی ہیں جن کے بارے میں ابھی تک انسان معلوم نہیں کر سکا کہ وہ کس اعتبار سے انسان کے لیے مفید ہیں۔ کچھ ایسی چیزیں ہیں جن کا نقصان کا پہلو نمایاں ہے‘ اُن میں پائی جانے والی خوبی بھی انسان نے معلوم کر لی ہے۔ مثلاً چھپکلی گھر کے کیڑے مکوڑوں کو کھا کر ختم کرتی ہے‘ وغیرہ۔ اسی طرح بہت سی ایسی چیزیں ہیں جن کا نفع انسان پر ابھی تک واضح نہیں‘ لیکن اللہ کی مخلوق ہونے کے ناطے ضرور اُن میں انسان کے لیے نفع کا پہلو موجود ہے‘ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کوئی مخلوق عبث پیدا نہیں کی۔ لازماً اللہ تعالیٰ نے کسی مصلحت کے تحت ہی کچھ چیزوں کے استفادی پہلو کو انسان سے خفیہ

رکھا ہے۔

چاند' سورج' پہاڑ' غرض مخلوق کی ہر نوع کے اندر انسانی مفادات رکھ کر اور اُن کو انسان کے لیے مسخر کر کے اللہ تعالیٰ نے انسان کو آزمائش میں ڈال دیا اس وعدے پر کہ اگر وہ اس آزمائش پر پورا اترے گا تو اُسے ایسی ابدی راحتوں سے نوازا جائے گا جو اُس کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آ سکتیں' بصورتِ دیگر اُسے عذابِ الٰہی میں مبتلا رہنا پڑے گا۔ بس عقل مند وہی لوگ ہیں جو اِس امتحان میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے مسلسل جدوجہد کر رہے ہیں اور ناکام وہ ہیں جو اس دنیا کی چمک دمک اور کشش میں منہمک ہو کر اپنے مقصدِ تخلیق کو فراموش کیے بیٹھے ہیں۔

یہ امتحان کس نوعیت کا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انسان کو زندگی گزارنے کا لائحہ عمل قرآن مجید کی صورت میں دے دیا ہے۔ اس میں حقیقی کامیابی حاصل کرنے کا اجمالی خاکہ موجود ہے۔ قرآن وہ واحد کتاب ہے جو کسی ادنیٰ تغیر وتبدل سے بھی پاک ہے۔ اس کے علاوہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ یوں اس کی ہدایات پر بغیر کسی تردّد اور تأمل کے عمل کیا جا سکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ کتاب اپنے برگزیدہ بندے حضرت محمد ﷺ پر بذریعہ وحی نازل کی جنہوں نے اس پر عمل کر کے دکھا دیا۔ یوں ہم علم قرآن سے لیں گے اور عمل رسول اللہ ﷺ سے۔ ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کریں۔ یہی اطاعت اللہ کی اطاعت ہوگی۔ ارشادِ الٰہی ہے: ﴿مَنْ يُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰهَ﴾ (النساء: ۸۰) ''جو رسول کی اطاعت کرتا ہے اس نے گویا اللہ ہی کی اطاعت کی''۔ کیونکہ رسول کی حیثیت اللہ تعالیٰ کے نمائندے کی ہوتی ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے اپنی ساری زندگی خالصتاً اللہ کی اطاعت میں گزاری۔ یہی وجہ ہے کہ آپ ﷺ کی زندگی کو بنی نوع انسان کے لیے بہترین نمونہ قرار دیا گیا ہے۔ فرمایا: ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ (الاحزاب: ۲۱) ''بے شک تمہارے لیے رسول اللہ (ﷺ) کی زندگی میں کامل نمونہ موجود ہے''۔ پس رسول اللہ ﷺ کی مثالی زندگی کے مطابق زندگی بسر کرنا بلاشبہ کامیابی کی دلیل ہے اور اس راستے کو چھوڑ کر کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا سراسر

ناکامی اور نامرادی ہے۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴾ (آل عمران) ''اور جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرتا ہے پس وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا اور ایسا شخص آخرت کی زندگی میں ناکام و نامراد لوگوں میں شامل ہوگا''۔ بقول شاعر: ؎

خلافِ پیمبر کسے راہ گزید
کہ ہرگز بمنزل نخواہد رسید

''جس نے پیغمبر کے خلاف راستہ اختیار کیا وہ کبھی منزل تک نہیں پہنچے گا''۔

قرآن وسنت کے مطابق زندگی گزارنے میں جو رکاوٹیں اور دشواریاں پیش آتی ہیں دین اسلام میں اُن کی واضح طور پر نشاندہی کر دی گئی ہے۔ سب سے پہلی رکاوٹ تو ابلیس ہے جو انسان کو سیدھے راستے پر چلنے سے روکتا ہے۔ وہ بڑا دھوکے باز ہے۔ اسی لیے قرآن مجید میں بتا دیا گیا کہ شیطان کے دھوکے سے بچ کر رہنا۔ ارشاد ہے: ﴿وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرُ ﴾ (لقمٰن) ''اور وہ بڑا دھوکے باز اللہ کے معاملے میں تمہیں دھوکے میں نہ ڈال دے۔'' یوں شیطان بنی آدم کا بدترین دشمن ہے۔ وہ سبز باغ دکھاتا' روشن مستقبل کا لالچ دیتا اور بڑے مؤثر انداز میں دھوکا دیتا ہے۔ اس کا حملہ غیر محسوس انداز کا ہوتا ہے' کیونکہ وہ سامنے نہیں آتا' بلکہ دل میں وسوسے ڈالتا ہے۔ چونکہ وہ ہر چھوٹے بڑے' غریب امیر' نیک و بد کے ساتھ یکساں عداوت رکھتا ہے اس لیے اس کے حملے سے کوئی محفوظ نہیں۔ چنانچہ اس کے حملے سے بچ کر رہنے کی تلقین کی گئی ہے اور اُس کی چال پر لگنے کے نتائج بد سے بار بار آگاہ کیا گیا ہے۔ شیطان کے وار سے بچنا بہت مشکل ہے۔ اسی لیے اُس کے فریب سے بچ کر زندگی گزارنے والے کے لیے طرح طرح کے انعامات کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اسلام ہمیں تعلیم دیتا ہے کہ ہم ہر وقت چوکنے (vigilant) رہیں' مبادا شیطان ہمیں غلط راستے پر لگا کر گمراہ کر دے۔ کتنے ہی اولیاء و صلحاء ایسے گزرے ہیں جو شیطان کے دھوکے میں آ کر اپنا سب کچھ گنوا بیٹھے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَاَتْبَعَهُ الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴾ (الاعراف) ''پس وہ شخص

شیطان کے پیچھے چل پڑا اور بالآخر گمراہوں میں شامل ہو گیا''۔ اس آیت کی تفسیر میں بتایا گیا ہے کہ وہ شخص بنی اسرائیل کا بڑا عالم اور صاحب تصرف درویش ''بلعم بن باعوراء'' تھا جو شیطان کے حملے کا مقابلہ نہ کر سکا اور تمام زندگی کی نیکیاں اور عبادتیں ضائع کر بیٹھا۔ اسی لیے اسلام نے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ ہر وقت اللہ تعالیٰ سے شیطانِ مردود کے شر سے پناہ مانگا کریں اور کہیں: اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّيْطٰنِ الرَّجِيْمِ ''میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں شیطان مردود (کے شر) سے''۔ خاص طور پر جب قرآن کی تلاوت کریں تو آغاز سے پہلے تعوذ پڑھ لیں' تاکہ قرآن سے ہدایت حاصل کرنے میں شیطان رکاوٹ نہ بن سکے۔

دنیا میں اس انداز سے زندگی گزارنا کہ عاقبت کی زندگی سنور جائے' اس راستے میں ایک بڑی رکاوٹ خود فریبی یا خواہش نفس بھی ہے۔ انسان کا نفس اسے برائی پر آمادہ کرتا ہے۔ وہ لالچ میں پڑ کر جلد بازی کر کے دنیاوی مفادات حاصل کرنا چاہتا ہے اور یہ بات فراموش کر دیتا ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے حکم کو نظر انداز کر کے وہ خسارے کا سودا کر رہا ہے۔ یقیناً نبی ﷺ کی نافرمانی گمراہی کی طرف لے جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى﴾ (النساء:١٣٥) ''پس تم خواہش نفس کی پیروی نہ کرو''۔ کیونکہ خواہش نفس کی پیروی تو نری ہلاکت ہے۔ یعنی کوئی کام انجام دیتے وقت یہ ضرور دیکھ لو کہ یہ کام اللہ اور اس کے رسول کے احکام کے خلاف تو نہیں۔ اگر خلاف ہے تو یقیناً خواہش نفس اس کی محرک ہے اور یہ کام امتحان میں ناکامی کی طرف لے جائے گا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ﴾ (القصص:٥٠) ''اور اُس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہے جو اللہ کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنی خواہش پر چلے''۔

ہر شخص کے اندر نفسانی خواہشات ہیں۔ اللہ کے برگزیدہ رسول حضرت یوسف علیہ السلام پکار اٹھے تھے: ﴿وَمَا اُبَرِّئُ نَفْسِيْ ۚ اِنَّ النَّفْسَ لَاَمَّارَةٌۢ بِالسُّوْٓءِ اِلَّا مَا رَحِمَ رَبِّيْ ؕ﴾ (یوسف:٥٣) ''اور میں اپنے نفس کو بریٔ الذمہ نہیں کہتا۔ بے شک نفس تو

برائی پر ابھارتا ہی ہے' مگر میرے ربّ نے ہی مجھ پر رحم کیا''۔ پس نفسانی خواہشات کی بے دریغ اور آزادانہ تکمیل امتحان میں ناکامی کا بہت بڑا سبب ہے۔ اس کے برعکس اپنی خواہشات کو احکامِ شریعت کے تابع رکھنا ہی حقیقی کامیابی ہے۔ قرآن مجید میں ہے:
﴿وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى ۝ فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝﴾ (النّٰزعٰت) ''اور جو کوئی ڈرا اپنے پروردگار کے سامنے کھڑا ہونے سے اور اُس نے اپنے نفس کو خواہش سے روکا' تو بلاشبہ ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانہ جنت ہے''۔

دنیاوی زندگی امتحانی وقفہ ہے۔ دیکھا جائے گا کہ کون اس میں اچھے عمل کرتا ہے اور کامیاب ٹھہرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿اَلَّذِيْ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَيٰوةَ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ۭ﴾ (المُلک: ۲) ''اُس نے موت اور حیات پیدا کی تاکہ وہ تمہیں آزمائے کہ کون اچھے عمل کرتا ہے''۔ ایک شخص اپنی مالی حالت بہتر کرنا چاہتا ہے۔ وہ اس سلسلہ میں بھاگ دوڑ کرتا ہے۔ اُس کے سامنے روزی کمانے کے کئی options آتے ہیں۔ اگر وہ ایسے پیشے کو اختیار کرتا ہے جہاں سے دولت تو آتی ہے مگر وہ پیشہ اختیار کرنا جائز نہیں اور دولت کے لالچ میں وہ شریعت کی پابندی چھوڑ بیٹھا تو نفع کے بجائے حقیقی نقصان میں پڑ گیا۔ کیونکہ جس شخص نے ناجائز دولت کے ذریعے حیاتِ دُنیوی کی ہر آسائش اکٹھی کر لی اور ''بابر بہ عیش کوش کہ عالم دوبارہ نیست'' کے نظریے کے تحت عیش وعشرت اور لہو ولعب میں پڑ کر نافرمانی میں زندگی گزاری تو اُس نے بہت خسارے کا سودا کیا۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿فَاَمَّا مَنْ طَغٰى ۝ وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا ۝ فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى ۝﴾ (النّٰزعٰت) ''اور البتہ جس کسی نے سرکشی اختیار کی' اور دنیا کی زندگی پر ریجھ گیا' تو بے شک اُس کا ٹھکانہ جہنم ہے''۔

یوں دنیا کی زندگی کے ہر لمحے سے فائدہ اٹھانا چاہیے اور تضیعِ اوقات سے اجتناب کرنا چاہیے۔ خودکشی اسی لیے حرام ہے کہ اوّل خودکشی کرنے والا زندگی کے لمحات کی قدر و قیمت سے آگاہ نہیں رہتا' دوسرے وہ ناسازگار حالات سے گھبرا کر مایوسی کا شکار ہو جاتا ہے' حالانکہ مایوسی کسی وقت بھی جائز نہیں۔ حالات بدلتے دیر نہیں لگتی۔

اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:﴿لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ﴾ (الزُّمَر:٥٣) ''اللہ کی رحمت سے مایوس نہ ہو جاؤ''۔

زندگی کے لمحات کی قدر و قیمت جاننے کے لیے اُس واقعے پر غور کیجیے جو عہد نبویؐ میں پیش آیا۔ دو شخصوں کے درمیان آپؐ نے اخوت کا رشتہ قائم فرما دیا۔ اُن میں سے ایک صاحب جہاد میں گئے اور شہید ہو گئے۔ پھر اس کے ہفتہ یا عشرہ بعد دوسرے صاحب کا بھی انتقال ہو گیا۔ صحابہ نے ان کی نماز جنازہ پڑھی۔ رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے پوچھا کہ آپ لوگوں نے اپنے بھائی کے بارے میں کیا دعا کی؟ انہوں نے عرض کیا کہ ہم نے اُس کے لیے یہ دعا کی کہ اللہ اس کی مغفرت فرمائے' اُس پر رحمت فرمائے اور اللہ تعالیٰ اُس کو اپنے شہید بھائی کے ساتھ ملائے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''پھر اس کی وہ نمازیں کہاں گئیں جو اُس نے اپنے شہید ہونے والے بھائی کے بعد پڑھیں اور دوسرے اعمالِ خیر کہاں گئے جو اُس شہید کے اعمال کے بعد اُس نے کیے؟'' اس کے بعد آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ان دونوں کے مقامات میں تو اس سے بھی زیادہ فاصلہ ہے جتنا کہ زمین و آسمان کے درمیان ہے''۔ (ابوداؤد و نسائی)

شہید کا مرتبہ بہت بلند ہے۔ اسی لیے صحابہ کرام ؓ نے بعد میں طبعی موت مرنے والے کے لیے شہید بھائی کی معیت کی دعا کی۔ مگر آپ ﷺ نے فرمایا کہ طبعی موت مرنے والے کا مقام تو شہید بھائی سے بہت بلند ہو گیا ہے' کیونکہ اس کی نیت بھی جہاد میں شہادت پانے کی تھی مگر اس کو موقع نہ ملا۔ پس حسنِ نیت کی بنا پر اس شخص کو بھی شہادت کا رتبہ تو مل گیا' مگر جو دن شہید کی شہادت کے بعد اس شخص کو ملے اس دوران اُس نے جو نمازیں پڑھیں اور نیک عمل کیے وہ شہید ہونے والا تو نہ کر سکا۔ لہٰذا ان دنوں کے اعمال نے اس طبعی موت مرنے والے کا مقام شہید سے بھی بلند کر دیا۔ معلوم ہوا کہ ہر دن جو طلوع ہوتا ہے مسلمان کی زندگی میں بہت اہم ہوتا ہے۔ وہ اس دن میں نمازیں پڑھ کر اور دوسرے نیک اعمال کر کے ڈھیروں اُخروی نفع کما سکتا ہے۔ مسلم شریف کی ایک حدیث میں یہ الفاظ ہیں:

((كُلُّ النَّاسِ يَغْدُوْ فَبَايِعٌ نَفْسَهٗ فَمُعْتِقُهَا اَوْ مُوْبِقُهَا)) (کتاب الطهارة)
''ہر انسان صبح کو نکلتا ہے تو وہ اپنی جان کو بیچتا ہے' پھر یا تو اُسے آزاد کرا لیتا ہے (عذاب سے) یا پھر ہلاک کر ڈالتا ہے''۔

ایک دفعہ ایک شخص نے رسالت مآب ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ آدمیوں میں کون بہتر ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ جس کی عمر لمبی ہوئی اور اُس کے اعمال اچھے رہے''۔ پھر اس نے پوچھا کہ آدمیوں میں بدترین کون ہے؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جس کی عمر لمبی ہوئی اور اعمال برے ہوئے''۔ (مسند احمد)

مسند احمد میں ہے کہ تین آدمی رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اسلام لائے تو آپؐ نے فرمایا کہ ان نو مسلم مسافروں کی خبر گیری میری طرف سے کون اپنے ذمہ لے سکتا ہے؟ طلحہؓ نے عرض کیا کہ میں اپنے ذمہ لیتا ہوں۔ چنانچہ یہ تینوں اُن کے پاس رہنے لگے' اسی اثنا میں رسول اللہ ﷺ نے ایک لشکر کسی جگہ کے لیے روانہ فرمایا' تو ان تینوں صاحبوں میں سے ایک اس لشکر میں چلے گئے اور وہاں شہید ہو گئے' پھر آپؐ نے ایک اور لشکر روانہ فرمایا تو ایک دوسرے ساتھی اس میں چلے گئے اور وہ بھی جا کر شہید ہو گئے' پھر ان میں سے تیسرے جو باقی بچے تھے ان کا انتقال بستر ہی پر ہو گیا۔ کہتے ہیں کہ طلحہؓ نے ذکر کیا کہ میں نے خواب میں ان تینوں ساتھیوں کو جنت میں دیکھا اور یہ دیکھا کہ جو صاحب سب سے آخر میں اپنے بستر پر طبعی موت مرے' وہ سب سے آگے ہیں' اور ان کے قریب ان کے وہ ساتھی ہیں جو دوسرے نمبر پر شہید ہوئے تھے اور ان کے قریب ان کے وہ ساتھی ہیں جو پہلے شہید ہوئے تھے' اس خواب سے میرے دل میں شبہ اور خلجان پیدا ہوا پس میں نے رسول اللہ ﷺ سے اس خواب اور اپنے اس تاثر اور خلجان کا ذکر کیا' آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ اس میں تم کو کیا بات اوپری اور غلط معلوم ہوتی ہے اللہ کے نزدیک اُس مؤمن سے کوئی افضل نہیں' جس کو ایمان اور اسلام کے ساتھ عمر دراز ملے جس میں وہ اللہ کی تسبیح تکبیر اور تہلیل کرے۔ (معارف الحدیث' ج ۲ بحوالہ مسند احمد)

زبان کی حفاظت

انسان حیوانِ عاقل و ناطق ہے۔ یہی دو صفتیں اسے دوسرے جانداروں سے ممتاز کرتی ہیں اور انہی صفات کی بدولت وہ مسئول اور جواب دہ ہے۔ دوسرے تمام جاندار انسان کی خدمت بجا لانے کے لیے پیدا کیے گئے ہیں جبکہ انسان کو اشرف المخلوقات کا مقام حاصل ہے۔ اس برتری اور شرف کے باعث انسان ہمہ وقت ابتلاء و آزمائش میں ہے۔ اس سے یہ مطالبہ ہے کہ وہ عقل و شعور کو کام میں لا کر اپنے اعضاء و قویٰ کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو اپنے خالق و مالک کی رضا میں اور اس کے حکم کے مطابق استعمال کرے۔

انسانی اعضاء میں زبان کو خصوصی اہمیت حاصل ہے۔ زبان سے نکلے ہوئے الفاظ سے سامعین کے قلوب و اذہان میں گفتگو کرنے والے کا مقام متعین ہوتا ہے۔ جو شخص عامیانہ گفتگو کرتا ہو' زبان کے استعمال میں غیر سنجیدہ اور غیر محتاط ہو' بدکلامی اور فضولیات کا عادی ہو' اسے کوئی بھی اچھا اور شریف آدمی نہیں سمجھتا۔ اس کے برعکس جو شخص گفتگو میں شائستہ اور باوقار ہو' سنجیدہ اور ملائم لہجے میں بات کرتا ہو' فضولیات سے پرہیز اور جچی تلی گفتگو کرتا ہو تو لوگ اسے عزت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ انسان کو عزت کا مقام دلانے یا ذلیل کرنے میں زبان کا کردار سب سے زیادہ اہم ہے۔ حضرت ابوسعید خدریؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِذَا اَصْبَحَ ابْنُ آدَمَ فَاِنَّ الْاَعْضَاءَ کُلَّھَا تُکَفِّرُ اللِّسَانَ فَتَقُوْلُ اتَّقِ اللّٰہَ فِیْنَا فَاِنَّا نَحْنُ بِکَ' فَاِنِ اسْتَقَمْتَ اسْتَقَمْنَا وَاِنِ اعْوَجَجْتَ

اعْوَجَجْنَا)) (سنن الترمذی)

''جب آدمی صبح اٹھتا ہے تو اس کے سارے اعضاء عاجزی اور لجاجت کے ساتھ زبان سے کہتے ہیں کہ ہمارے بارے میں خدا سے ڈر' کیونکہ ہم تو تیرے ہی ساتھ بندھے ہوئے ہیں' تو ٹھیک رہی تو ہم ٹھیک رہیں گے اور اگر تو نے غلط روی اختیار کی تو ہم بھی غلط روی اختیار کریں گے''۔

مشہور ہے کہ کسی بادشاہ نے ایک دانا آدمی سے پوچھا کہ کون سا گوشت سب سے اچھا ہوتا ہے؟ اُس نے جواب دیا کہ زبان کا۔ پھر پوچھا کہ سب سے برا گوشت کون سا ہوتا ہے؟ تو اس نے کہا زبان کا۔ گویا وہ دانا آدمی بادشاہ پر یہی بات واضح کرنا چاہتا تھا کہ زبان حصولِ عزت کا ذریعہ بھی ہے اور وہی زبان ذلت کی گہرائیوں میں گرانے والی بھی ہے۔ اگر زبان کے بارے میں انسان محتاط ہو جائے' یعنی زبان سے کوئی ایسی بات نہ نکالے جو نامناسب ہو تو وہ دوسرے بہت سے گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ حضرت سہل ابن سعدؓ سے روایت ہے کہ نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ يَضْمَنْ لِيْ مَا بَيْنَ لَحْيَيْهِ وَمَا بَيْنَ رِجْلَيْهِ اَضْمَنْ لَهُ الْجَنَّةَ))

(صحیح البخاری)

''جو کوئی مجھے اس چیز کی جو اس کے دو جبڑوں کے درمیان ہے (یعنی زبان) اور اس چیز کی جو اس کی دو رانوں کے درمیان ہے (یعنی شرم گاہ)' ضمانت دے تو میں اسے جنت کی ضمانت دیتا ہوں''۔

اس میں رسول اللہؐ نے حصولِ جنت کے لیے زبان کے صحیح استعمال کا بڑا حصہ بتایا ہے۔ ہر انسان کا نامۂ اعمال تیار ہو رہا ہے اور اس میں اچھے برے کاموں کا اندراج ہو رہا ہے۔ پھر نامۂ اعمال کا بیشتر حصہ تو انسان کے منہ سے نکالے گئے الفاظ پر مشتمل ہوگا جو منہ سے نکلتے ہی ریکارڈ ہو جاتے ہیں۔ پھر انسان ہزار پچھتائے مگر وہ الفاظ واپس نہیں ہو سکتے۔ اسی لیے حکماء کہتے ہیں کہ اوّل تولو پھر بولو۔ یعنی جب بھی زبان سے کوئی بات کرنے لگو تو سوچ لو کہ یہ الفاظ فرشتے ریکارڈ کر لیں گے' اگر الفاظ اچھے ہوں تو اچھے نتائج نکلیں گے اور اگر الفاظ نازیبا ہوں گے تو مصیبت کا باعث بنیں گے۔

دانش مند لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ تین علامتیں خدا رسیدہ لوگوں کی ہیں: اوّل کم کھانا' دوم کم سونا' سوم کم بولنا۔ کم کھانا انسان کو غافل ہونے سے بچاتا ہے۔ کم سونا اچھے کام کرنے اور اللہ کے ذکر کے لیے زیادہ وقت دیتا ہے۔ اسی طرح زبان پر ضبط رکھنے سے انسان ہزاروں گناہوں سے بچ جاتا ہے۔ جھوٹ' وعدہ خلافی' غیبت' بہتان' بدکلامی' گالی گلوچ زبان ہی سے صادر ہونے والے گناہ ہیں جو نئے نئے فتنوں' رنجشوں' اختلافات' بدمزگیوں اور تعلقات کی خرابی کا باعث بنتے ہیں۔ پس جو اس سے بچا اس نے بڑی حد تک اپنا دامن آلودہ ہونے سے بچا لیا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((...... مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ))

(صحیح البخاری و صحیح مسلم)

''تم میں سے جو کوئی اللہ پر اور یومِ آخرت پر ایمان رکھتا ہے وہ بھلی بات کہے یا پھر خاموش رہے''۔

اس فرمانِ نبوی کا بھی یہی مطلب ہے کہ بولنے سے پہلے جائزہ لو کہ کیا کہہ رہے ہو۔ اگر تو بھلائی کی بات ہے تو زبان کھولو ورنہ ضبط کر کے زبان کو روک لو۔

ایک طویل حدیث ہے جس میں وعظ و نصیحت کے انداز میں حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ سے گفتگو کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

((...... اَلَا اُخْبِرُكَ بِمَلَاكِ ذٰلِكَ كُلِّهٖ؟)) قُلْتُ بَلٰى يَا نَبِيَّ اللّٰهِ' فَاَخَذَ بِلِسَانِهٖ قَالَ: ((كُفَّ عَلَيْكَ هٰذَا)) فَقُلْتُ يَا نَبِيَّ اللّٰهِ وَاِنَّا لَمُؤَاخَذُوْنَ بِمَا نَتَكَلَّمُ بِهٖ؟ فَقَالَ: ((ثَكِلَتْكَ اُمُّكَ يَا مُعَاذُ' وَهَلْ يَكُبُّ النَّاسَ فِي النَّارِ عَلٰى وُجُوْهِهِمْ اَوْ عَلٰى مَنَاخِرِهِمْ اِلَّا حَصَائِدُ اَلْسِنَتِهِمْ)) (رواہ احمد و الترمذی)

''کیا میں تمہیں وہ چیز بھی بتا دوں جس پر گویا ان سب کا مدار ہے؟'' میں نے کہا ضرور فرما دیجیے! پس آپ نے اپنی زبان پکڑی اور فرمایا: ''اس کو روکو''۔ اس پر میں نے عرض کیا: ''اے اللہ کے نبی! کیا ہم سے ان باتوں کے متعلق بھی

مؤاخذہ ہوگا جو ہم زبان سے نکالتے ہیں؟'' آپؐ نے (ازراہِ محبت) فرمایا:
''معاذ تیری ماں تجھے گم کرے' لوگوں کو اُن کی زبان سے نکلی ہوئی باتیں ہی تو
مُنہ یا ناک کے بل دوزخ میں ڈالیں گی''۔

معلوم ہوا کہ جس شخص کو آخرت میں نجات کی فکر ہو اسے یہاں اس بات کی فکر ضرور کرنی چاہیے کہ زبان کا بے جا استعمال ہرگز نہ کرے۔ بلکہ زبان سے صرف نپے تلے' ضروری' مناسب اور مفید جملے ہی نکالے۔ غصہ میں آکر واہی تباہی بکواس انسان کے لیے مصیبت کا باعث بن جائے گی اور اس وقت تلافی کی کوئی صورت بھی نہ ہوگی۔

حضرت سفیان بن عبداللہ ثقفیؓ فرماتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ ﷺ سے عرض کیا: حضور! میرے بارے میں جن باتوں کا آپؐ کو خطرہ ہو سکتا ہے ان میں زیادہ خطرناک اور خوفناک کیا چیز ہے؟ حضرت سفیانؓ فرماتے ہیں کہ آپ ﷺ نے اپنی زبان پکڑ کر فرمایا: ''(سب سے زیادہ خطرہ) اس سے ہے''۔ (رواہ ترمذی)

زبان کے اکثر گناہ بڑے آسان اور لذیذ ہوتے ہیں جو انسان کی انا کو تسکین دیتے ہیں۔ غیبت کتنی آسان ہے کہ متعلقہ آدمی سامنے تو ہے نہیں اس کے بارے میں جو مرضی کہہ لیا جائے۔ پھر اس میں لذت بھی ہے' کیونکہ مخالف کی برائی کرنا یا سننا نفس کو بہت مرغوب ہے۔ پھر اس سے انا کی تسکین بھی ہوتی ہے' کیونکہ جو شخص کسی کو برا کہتا ہے دراصل وہ یہ دعویٰ کر رہا ہوتا ہے کہ وہ شخص تو برا ہے مگر میں اس برائی سے پاک ہوں۔ انھی وجوہات کی بنا پر زبان غیبت پر دلیر ہو جاتی ہے۔

زبان کا استعمال بڑا حساس معاملہ ہے۔ اس کی اہمیت اور سنگینی کا اندازہ لگانا ضروری ہے۔ اس معاملے میں غفلت گھمبیر نتائج برآمد کر سکتی ہے' لہٰذا خاموش رہنے کو بھی پسند کیا گیا ہے' کیونکہ خاموش رہنے میں انسان زبان کے صحیح استعمال پر مبنی نیکیوں سے تو محروم رہتا ہے مگر اس دوران گناہوں سے بھی تو بچا رہتا ہے۔ چونکہ زبان کا صحیح اور محتاط استعمال کئی مصیبتوں اور پریشانیوں سے بچاتا ہے اس لیے بین الاقوامی اَخلاقی ضابطے بھی خاموشی کو اہمیت دیتے ہیں اور باتونی آدمی کو کہیں بھی اچھا خیال نہیں کیا جاتا۔

کسی غیر ملکی کی انگریزی زبان میں ایک نظم بھی اس سلسلہ میں سبق آموز ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ ایک شخص ویرانے میں جاتا ہے اور وہاں اسے ایک انسانی کھوپڑی ملتی ہے۔ وہ حیرت اور تجسس کے ساتھ وہاں کھڑا ہو جاتا ہے اور اسے تکنے لگتا ہے۔ اس کے ذہن میں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس انسانی کھوپڑی کا یہ حال کیوں ہوا! اس پر کھوپڑی اچانک بولنے لگی اور کہنے لگی کہ میرا یہ حال بولنے کی وجہ سے ہوا۔ وہ شخص اس پر مزید حیران ہوا۔ وہاں سے وہ سیدھا شاہی دربار میں پہنچا۔ اجازت لے کر بادشاہ کے سامنے حاضر ہوا اور کھوپڑی کے بولنے کا واقعہ بیان کر دیا۔ بادشاہ نے اس کی بات پر یقین نہ کیا مگر اس کے اصرار اور ذاتی مشاہدے کی بنا پر کہا کہ میرے یہ آدمی ساتھ لے جاؤ' یہ آ کر مجھے بتائیں کہ کھوپڑی واقعی بولتی ہے تو میں یقین کر لوں گا' ورنہ یہ لوگ تمہیں جھوٹ کی سزا میں وہیں موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ وہ شخص بادشاہ کے آدمیوں کو لے کر وہاں پہنچا۔ کھوپڑی سے مخاطب ہوا مگر کھوپڑی سے کوئی آواز نہ آئی۔ اس نے چلا چلا کر کھوپڑی سے بات کرنے کی کوشش کی مگر کھوپڑی بے حس و حرکت پڑی رہی۔ اس پر اس شخص کو بادشاہ کے آدمیوں نے قتل کر دیا۔ اب کھوپڑی سے آواز آئی ''افسوس! اے شخص! تو نے میرے حال سے عبرت نہ پکڑی کہ بولنے میں خطرہ ہے اور تو بھی بول کر میرے انجام کو پہنچا''۔

حضرت عبداللہ بن مبارکؒ کا واقعہ اس ضمن میں مشہور ہے کہ وہ حج پر جا رہے تھے تو راستے میں انہیں ایک خاتون ملی۔ آپؒ نے اس سے بات چیت کرنا چاہی تو آپ کے ہر سوال کے جواب میں وہ قرآن کی آیت پڑھتی۔ مثلاً جب آپ نے پوچھا کہ آپ کو کہاں جانا ہے تو اس نے کہا: ﴿لِلّٰهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ سَبِيلًا﴾ (آل عمران: ۹۷) یعنی مجھے حج کے لیے جانا ہے۔ جب آپ نے پوچھا کہ بھوک ہو تو کھانا پیش کروں؟ تو کہنے لگی: ﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ﴾ (البقرۃ: ۱۸۳) یعنی میرا روزہ ہے۔ الغرض اسی طرح وہ ہر بات کا جواب قرآن کی آیت پڑھ کر دیتی۔ مکہ مکرمہ پہنچ کر اس خاتون کے بیٹوں سے ملاقات

ہوئی تو حضرت عبداللہ بن مبارکؒ نے ان سے پوچھا کہ تمہاری والدہ سے میں نے جو بات بھی پوچھی اس نے اس کے جواب میں قرآن مجید کی آیت تلاوت کی۔ اس پر انہوں نے بتایا کہ ہماری والدہ متقی اور حافظ قرآن خاتون ہے۔ جب سے اس نے یہ آیت پڑھ کر غور کیا ہے کہ ﴿مَا يَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ﴾ (قٓ) ''کوئی لفظ انسان کی زبان سے نہیں نکلتا جسے محفوظ کرنے کے لیے ایک حاضر نگران موجود نہ ہو'' اس دن سے یہ ہمارے ہر سوال کے جواب میں آیت قرآنی ہی پڑھتی ہیں تاکہ نامۂ اعمال میں صرف قرآنی آیات ہی درج ہوں اور اس کے علاوہ کوئی بات نہ ہو۔

ان سبق آموز واقعات اور قرآن وسنت کی روشنی میں ہمارے لیے لازم ہے کہ ہم زبان کے استعمال میں غیر محتاط رویہ ترک کر کے اپنے آپ کو کئی قسم کے گناہوں سے بچالیں' کیونکہ گناہوں سے بچنے کی کوشش ہر اُس شخص پر لازم ہے جس کا یومِ آخرت پر ایمان ہے۔

آسودہ زندگی کا راز

دنیا میں ہر شخص کی یہ خواہش ہے کہ اُسے آسودہ، خوشحال، ہلکی پھلکی اور care free زندگی میسر ہو۔ یہ خواہش کوئی بری خواہش نہیں، لیکن اس خواہش کے پورا کرنے کے لیے جو ذرائع استعمال کیے جاتے ہیں وہ اکثر و بیشتر حصولِ مقصد میں کامیابی سے ہمکنار نہیں کرتے۔ اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ مالی اعتبار سے خوشحال لوگ، جن کو مادی دنیا کی تمام نعمتیں میسر ہوں، اندر سے انتہائی کرب ناک زندگی بسر کر رہے ہوتے ہیں۔ بالفاظ دیگر دنیا کی تمام نعمتیں انہیں سکون واطمینان اور حقیقی آسودگی نہیں دے سکتیں۔

اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہونے کے ناطے انسان کو پیش آنے والی ہر صورتِ حال کا حل پیش کرتا ہے۔ چنانچہ مذکورہ بالا مسئلے کے حل کے لیے اگر اسلامی تعلیمات کا مطالعہ کیا جائے تو خاطر خواہ رہنمائی ملتی ہے۔ رسول پاک ﷺ کا فرمان ہے:

((اُنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ اَسْفَلَ مِنکُمْ وَلَا تَنْظُرُوْا اِلٰی مَنْ هُوَ فَوْقَكُمْ فَهُوَ اَجْدَرُ اَنْ لَّا تَزْدَرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ)) (صحیح مسلم)

''تم ان لوگوں کی طرف دیکھو جو تم سے دُنیوی ساز وسامان کے اعتبار سے کم ہیں اور ان لوگوں کی طرف مت دیکھو جو مال و دولت اور ساز وسامان میں تم سے بڑھے ہوئے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں تمہارے دل میں اللہ کی نعمت کی بے وقعتی اور ناقدری پیدا نہیں ہوگی''۔

اس حدیث کے الفاظ پر غور کرنے سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ دنیا میں پرسکون اور ہلکی پھلکی زندگی گزارنے کا ایک اکسیر نسخہ ہے جو اس میں بتا دیا گیا ہے۔

دنیا میں ہر شخص کو کسی نہ کسی حد تک دنیاوی نعمتیں اور سہولتیں میسر ہوتی ہیں۔ اگر کسی شخص کی نگاہیں ان لوگوں کی حالت کو دیکھیں جن کے پاس اُس سے کم تر درجے کی

سہولتیں ہیں، جیسا کہ حسن و جمال میں کمی، صحت و تندرستی میں کمی، مال و دولت اور عزت و مرتبے میں کمی، تو ایسے شخص کے اندر جذبۂ شکر پیدا ہو گا کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بہت سے لوگوں سے اچھی بود و باش دے رکھی ہے۔ اس ضمن میں شیخ سعدیؒ کا واقعہ نہایت سبق آموز ہے کہ وہ ایک لمبے سفر میں تھے کہ جوتا گھس کر ٹوٹ گیا اور ننگے پاؤں سفر جاری رکھنا پڑا جس سے پاؤں میں چھالے پڑ گئے، چلنا مشکل ہو گیا۔ سوچنے لگے کہ میں کس قدر کم درجے کا انسان ہوں کہ مجھے جوتا بھی میسر نہیں۔ تھوڑا سا آگے گئے تو کیا دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کے دونوں پاؤں نہیں اور وہ رینگتا ہوا زمین پر چل رہا ہے۔ شیخ سعدیؒ اس وقت سجدے میں گر پڑے اور اللہ کے حضور شکر ادا کیا کہ جوتا نہیں تو اللہ نے پاؤں تو دے رکھے ہیں۔ پس آنحضرت ﷺ کے مختصر سے الفاظ حکمت کا بھرپور خزانہ ہیں۔

آج کتنے لوگ ہیں جن کو صاف ستھری رہائشیں میسر ہیں، اچھی اچھی سواریاں دروازے پر کھڑی ہیں، سامانِ آسائش و آرائش وافر مقدار میں موجود ہے، کھانے پینے کی بھی کمی نہیں، مگر وہ مسلسل کرب کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کی خواہشات ہیں کہ بڑھتی ہی جا رہی ہیں۔ ذہن تفکرات سے مملو ہے۔ رات کی نیند اور دن کا چین نصیب نہیں۔ اگر ایسے لوگوں کو قریب سے دیکھا جائے تو معلوم ہو گا کہ یہ دنیا کی سہولتوں اور آسائشوں کے حصول میں اپنی تمام صلاحیتیں اور توانائیاں خرچ کر رہے ہیں، مگر پھر بھی پریشان ہیں، کیونکہ اُن کی نگاہ ان لوگوں کی طرف جمی ہوئی ہے جو دنیاوی رتبے کے اعتبار سے اُن سے کہیں بلند ہیں۔ اب ایک ہی صورت ہے کہ ایسے لوگ دنیاوی عیش و آرام میں انتہائی بلندی پر پہنچ جائیں تو شاید اُنہیں سکون نصیب ہو جائے، مگر یہ ممکن نہیں، کیونکہ یہاں تو ہر بڑے سے بڑا موجود ہے۔ لہٰذا جو شخص اپنے سے اوپر کے لوگوں کی طرف دیکھتا ہے ہمیشہ پریشان ہی رہتا ہے۔ مذکورہ بالا حدیث کے دوسرے حصے میں رسول اللہ ﷺ نے یہی فرمایا ہے کہ اپنے سے اوپر والے کی طرف نگاہ نہ کرو، ورنہ تمہارے دل میں اللہ کی نعمت کی ناقدری اور بے وقعتی پیدا ہو جائے گی۔

اس بات سے ہرگز انکار نہیں کہ ضروری ساز و سامان انسانی زندگی کے لیے ناگزیر ہے یعنی رہائش کے لیے چھت' تن ڈھانپنے کے لیے کپڑے' پیٹ بھرنے کے لیے خوراک۔ چنانچہ ان سہولتوں اور ضرورتوں کے حصول کے لیے تگ و دو کرنے سے اسلام میں ہرگز نہیں روکا گیا' بلکہ محنت کر کے روزی کمانے والے کی تحسین کی گئی ہے۔ خود رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو سوال کرتے دیکھا تو اُس کے لیے رسی اور کلہاڑی کا انتظام کر کے جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لانے کی ترغیب دی تاکہ وہ باعزت طریقے سے اپنی ضروریاتِ حیات پوری کر سکے۔ مگر ان چیزوں کے حصول کو مقصد زندگی قرار دینے سے آپ ﷺ نے منع فرمایا ہے' تاکہ انسان دنیا کی محبت میں وارفتہ ہو کر پہنچ سے دور کی چیزوں کی محرومی کے غم وفکر میں مبتلا نہ رہے۔ جہاں تک اس دنیا کا تعلق ہے تو یہ دنیا ایسی چیز ہے کہ اس روئے زمین پر کبھی کوئی انسان ایسا پیدا نہیں ہوا جو یہ کہہ دے کہ میری ساری خواہشات پوری ہو گئی ہیں۔ اس لیے کہ خواہشات کی کوئی انتہا نہیں۔ متنبّی کا ایک شعر ہے:؎

وَمَا قَضٰی اَحَدٌ مِنْھَا لِبَانَتَہٗ
وَمَا انْتَھٰی اَرْبٌ اِلَّآ اِلٰی اَرْبٍ

یعنی آج تک ایک شخص بھی ایسا نہیں گزرا جس نے اس دنیا کی ساری لذتوں' راحتوں اور خواہشوں کو پورے طور پر حاصل کر لیا ہو' بلکہ اس دنیا کا حال یہ ہے کہ ابھی ایک خواہش پوری نہیں ہوئی ہوتی کہ دوسری خواہش ابھر آتی ہے۔ اس طرح جو شخص جتنا دنیوی سہولتوں کے حصول کے پیچھے بھاگتا ہے وہ بھاگتا ہی چلا جاتا ہے اور سکون واطمینان نام کی چیز اُس سے اتنی ہی دور ہوتی چلی جاتی ہے۔

چینی لٹریچر میں ایک کہانی ملتی ہے۔ کہتے ہیں ایک شخص تھا جسے زیادہ سے زیادہ زمین کا مالک ہونے کا شوق تھا۔ کسی نے اسے بتایا کہ فلاں جگہ ایک آدمی ہے جس سے انتہائی کم قیمت پر وافر زمین مل سکتی ہے۔ چنانچہ یہ شخص لمبا سفر کر کے اس کے پاس پہنچا اور اپنا شوق بیان کیا۔ اس آدمی نے اس شخص کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے کہا کہ

یہاں سے پیدل چل پڑیں اور چلتے جائیں' شام تک اسی جگہ واپس آ جائیں۔ اس طرح جہاں تک آپ پہنچ جائیں گے وہ زمین تمہاری ہو گی۔ بس یاد رکھیں کہ یہاں غروبِ آفتاب سے قبل واپس ضرور پہنچنا ہے' ورنہ کوئی زمین بھی آپ کو نہ ملے گی۔ وہ شخص بڑا خوش ہوا اور تیز گام چل پڑا۔ زیادہ سے زیادہ زمین کے حصول کے لالچ میں وہ دوڑتا ہوا آگے بڑھتا گیا اور اس طرح زیادہ دور نکل گیا۔ واپس پہنچنے کا خیال آیا تو واپس بھاگا تاکہ غروبِ آفتاب سے قبل زمین کے مالک کے پاس پہنچ جائے اور اتنی ساری زمین کا مالک بن جائے۔ جب منزل بالکل قریب آ گئی تو وہ تھک کر چور ہو گیا تھا۔ ہمت کر کے آگے بڑھتا گیا اور غروبِ آفتاب سے چند لمحے قبل شرط پوری کرتے ہوئے واپس پہنچ گیا اور خوش ہوا کہ جیت گیا' مگر اتنا تھک چکا تھا کہ گر کر وہیں ڈھیر ہو گیا اور پھر اٹھ نہ سکا۔ پس اس کی زمین اس کے کسی کام نہ آئی' بلکہ زیادہ سے زیادہ زمین کے حصول کی خواہش میں اُس کو زندگی سے ہاتھ دھونے پڑے۔

اسلامی لٹریچر میں ہوس کی اس کیفیت کو طولِ اَمل کہا جاتا ہے' یعنی لمبی خواہش' خواہش در خواہش۔ پس جو شخص اس چکر میں پڑ گیا یوں سمجھئے کہ بربادی اُس کا مقدر بن گئی۔ ایک اور حدیث میں اس مضمون کو ایک دوسرے انداز میں بیان کیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا نَظَرَ اَحَدُکُمْ اِلٰی مَنْ فُضِّلَ عَلَیْہِ فِی الْمَالِ وَالْخَلْقِ فَلْیَنْظُرْ اِلٰی مَنْ ھُوَ اَسْفَلَ مِنْہُ مِمَّنْ فُضِّلَ عَلَیْہِ)) (صحیح البخاری و صحیح مسلم)

''جب تم میں سے کسی کی نظر اُس شخص پر پڑے جو مال اور حسن و جمال میں اُس سے اونچے درجے پر ہو تو اسے چاہیے کہ وہ ایسے شخص کی طرف نگاہ کرے جو حسن و جمال اور مال و دولت میں اس سے کمتر ہو۔''

غور کیجیے کہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اپنے ماحول میں اپنے سے برتر لوگوں پر نگاہ نہ پڑے! یہ تو ممکن نہیں' کیونکہ کوئی انسان اپنے ماحول سے بے تعلق ہو کر نہیں رہ سکتا۔ چنانچہ اس کا علاج بھی روحانی امراض کے معالجِ اعظم نے بایں الفاظ بتا دیا کہ جب

تمہاری نگاہ اونچے لوگوں پر پڑے تو (اس کی تاثیر دور کرنے کے لیے) اپنے سے نیچے والے لوگوں کی طرف دیکھو تاکہ جذبۂ شکر پیدا ہو' ورنہ اونچے لوگوں کے خلاف حسد پیدا ہوگا' پھر حسد کے نتیجے میں بغض ظاہر ہوگا۔ اور بغض کے بعد نفرت اور دشمنی پیدا ہوگی جس سے معاشرے میں فساد برپا ہوگا جبکہ فرمانِ رسول ﷺ پر عمل کرنے سے نہ صرف یہ کہ انسان حسد' بغض' عناد اور بدخواہی جیسی امراضِ قبیحہ سے بچ جاتا ہے' بلکہ اس کے دل میں تشکر وامتنان کے سوتے پھوٹتے ہیں جو اسے خیر کثیر کا مستحق بنادیتے ہیں۔ بالفاظ قرآنی: ﴿لَئِنْ شَكَرْتُمْ لَاَزِيْدَنَّكُمْ......﴾ (ابراھیم: ۷) ''اگر تم شکر ادا کرتے رہو تو میں تمہیں ضرور زیادہ دوں گا''۔ اگر حقیقت بین نگاہ سے دیکھا جائے تو آخرت کی زندگی کے مقابلہ میں حیاتِ دُنیوی بالکل بے حقیقت ہے۔ قرآن شریف میں ہے: ﴿وَمَا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ﴾ (آل عمران: ۱۸۵' الحدید: ۲۰) یعنی دنیا کی زندگی تو محض دھوکے کا سامان ہے۔ یعنی ضروری نہیں کہ جس کو یہاں کی آسانیاں ملیں وہ حقیقی کامیابی بھی حاصل کرلے' یا جس کو متاع دنیا سے قلیل مقدار میسر آئی ہو وہ حقیقت میں ناکام ہو' بلکہ اس کا الٹ بھی ہوسکتا ہے۔ اور اکثر و بیشتر دنیاوی آسائشیں ابدی ناکامی کا باعث بن جاتی ہیں۔ اس حیات مستعار کی بے وقعتی آنحضور ﷺ نے ان الفاظ میں بیان کی ہے:

((لَوْ كَانَتِ الدُّنْيَا تَعْدِلُ عِنْدَ اللّٰهِ جَنَاحَ بَعُوْضَةٍ مَا سَقٰى كَافِرًا مِنْهَا شَرْبَةَ مَاءٍ)) (ترمذی' ابن ماجہ)

''اگر اللہ کے نزدیک دنیا کی قدر و قیمت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو وہ ایک گھونٹ پانی بھی نہ دیتا۔''

رسول پاک ﷺ اور آپؐ کے باصفا وفادار ساتھیوں نے عسرت اور افلاس کی زندگی گزاری مگر وہ انتہا درجہ کے کامیاب انسان تھے جبکہ قارون دنیا کا مالدار ترین شخص ہونے کے باوجود دشمن خدا ورسول اور انتہائی درجے کا بدبخت انسان تھا۔ معلوم ہوا کہ دنیا کا مال ومتاع واقعی نرا دھوکہ ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ اس دنیا کی حقیقت سوائے وہم و خیال کے کچھ نہیں۔

كُلُّ مَا فِي الْكَوْنِ وَهْمٌ اَوْ خَيَالٌ
اَوْ عُكُوْسٌ فِي الْمَرَايَا اَوْ ظِلَالٌ

''جو کچھ اس کائنات میں ہے سب وہم وخیال ہے' یعنی بے حقیقت ہے۔ یا تو یہ آئینے کے اندر کے عکس ہیں یا پھر چیزوں کے سائے ہیں''۔

مختصر یہ کہ دنیا کی آسائشوں اور سہولتوں کے حصول کی جدوجہد اور متاعِ دنیا سے بقدرِ ضرورت فائدہ اٹھانا ہرگز مذموم نہیں۔ خود قرآن میں ہے کہ: ﴿لَا تَنْسَ نَصِيْبَكَ مِنَ الدُّنْيَا﴾ (القصص:۷۷) یعنی ''دنیا سے اپنا حصہ نہ بھولیے''۔ البتہ جو چیز ہلاکت خیز اور تباہ کن ہے وہ یہ ہے کہ دنیا طلبی کے پیچھے انسان اس طرح پڑ جائے کہ حلال وحرام کی حدود و قیود کی پروا نہ کرتے ہوئے اپنے سے بہتر حیثیت کے لوگوں کی صف میں کھڑا ہونے کی کوشش میں لگا رہے اور اس طرح اپنی تمام توانائیاں اور صلاحیتیں دنیا طلبی میں صرف کر کے درہم و دینار کا بندہ بن جائے۔ اور اس خسارے کی تجارت میں اس قدر منہمک ہو جائے کہ گویا یہی اس کا مقصودِ اصلی ہے۔ پھر اسی جدوجہد میں آئندہ کی نہ ختم ہونے والی زندگی کی تیاری سے بھی غافل رہے اور خسرانِ مبین کا مستحق ہو جائے۔ زندگی کا خوبصورت اور پسندیدہ انداز یہ ہے کہ حلال وحرام کی تمیز ہر وقت پیشِ نظر رہے۔ دنیاوی نعمتوں سے محروم لوگوں کی طرف نگاہ کر کے میسر سہولتوں پر خدا کا شکر ادا کرے۔ روزی کمانے کی جدوجہد میں اس حد تک ہی مصروف ہو کہ خدا فراموشی کی نوبت نہ آئے۔ اس اندازِ زیست سے نہ مایوسی طاری ہوگی نہ ڈیپریشن (Depression) ہو گا' بلکہ آئندہ کی کامیاب زندگی کی اُمید دل میں نشاط وانبساط پیدا کرے گی اور حقیقی زندگی کی طرف مراجعت سہل ہوگی۔ بقول اقبال: ؎

نشانِ مردِ مؤمن با تو گویم
چوں مرگ آید تبسم بر لبِ اُوست

''میں تجھے مردِ مؤمن کی نشانی بتاتا ہوں جب اسے موت آتی ہے تو اُس کے لبوں پر مسکراہٹ ہوتی ہے۔''

مسواک کی اہمیت وفضیلت

اسلام جہاں فکر ونظر کی پاکیزگی کی تعلیم دیتا ہے وہاں جسمانی اور ظاہری صفائی پر بھی زور دیتا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شخص بدنی صفائی کی اہمیت سے نا آشنا ہے وہ روحانی ترفع بھی حاصل نہیں کرسکتا۔

اسلام میں صفائی کو نصف ایمان کہا گیا ہے۔ نماز پنجگانہ کے لیے وضو کو لازمی قرار دیا گیا ہے۔ وضو کے بغیر نماز نہیں ہوتی' اور وضو کیا ہے! ہاتھ پاؤں دھونا' ناک صاف کرنا' کلی اور غرارہ کر کے مُنہ اور گلا صاف کرنا۔ یوں پانی کے استعمال سے اعضاء کو دھو کر چستی حاصل کرنا اور پھر اللہ کے حضور حاضر ہونے کے لیے اپنے آپ کو تیار پانا۔ وضو کرتے وقت مُنہ اور گلے کی صفائی کے لیے مسواک کرنے کی ترغیب دی گئی ہے' تاکہ دیگر ظاہری اور باطنی فوائد کے علاوہ دانتوں کی بھی حفاظت رہے اور انسان بہت سی بیماریوں سے بچا رہے۔

درخت کی ٹہنی کا ایک ٹکڑا جس کے ایک سرے کو چبا کر ریشے بنا لیتے ہیں اور اس سے دانتوں کی صفائی کا کام لیتے ہیں' مسواک کہلاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ مسواک کو غیر معمولی اہمیت دیتے تھے۔ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ:

((لَوْ لَا اَنْ اَشُقَّ عَلٰی اُمَّتِیْ لَاَمَرْتُھُمْ بِالسِّوَاکِ مَعَ کُلِّ صَلَاۃٍ)) (متفقٌ علیہ)

''اگر مجھے یہ خیال نہ ہوتا کہ میری اُمت پر بہت مشقت پڑ جائے گی تو میں ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حتمی حکم دیتا''۔

چنانچہ خود آپ ﷺ مسواک کا خصوصی اہتمام فرماتے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ:

''رسول اللہ ﷺ کا معمول تھا کہ دن یا رات میں جب بھی آپؐ سوتے تو اٹھنے

کے بعد وضو کرنے سے پہلے مسواک ضرور فرماتے''۔(مسند احمد' سنن ابی داؤد)

ایک دفعہ جب اُم المؤمنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے پوچھا گیا کہ جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم باہر سے گھر تشریف لاتے ہیں تو سب سے پہلے کیا کام کرتے ہیں؟ تو انہوں نے جواب دیا کہ ''سب سے پہلے آپؐ مسواک فرماتے ہیں''۔(صحیح مسلم)

مسواک کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پسندیدگی اس حد تک تھی کہ جب آپؐ آخری بیماری کے سبب صاحب فراش تھے تو ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہؓ کے ہاتھ میں مسواک دیکھی تو اشارے سے طلب کی' جس پر انہوں نے مسواک دانتوں میں چبا کر نرم کی اور پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دی۔

صفائی پسند شخص کبھی گوارا نہیں کرتا کہ اس کے دانتوں میں خوراک کے ریشے اٹکے رہیں اور گلے میں بلغم جمی رہے جس سے مُنہ میں تعفن پیدا ہو اور ناگوار بو کا احساس ہو۔ رات کو سو کر اٹھنے کے بعد جو شخص مسواک کرتا ہے وہ یقیناً نظافت' پاکیزگی اور تازگی محسوس کرتا ہے۔

اکثر عمل ایسے ہوتے ہیں کہ ان کے ظاہری فوائد تو نمایاں ہوتے ہیں مگر روحانی طور پر ان کی تاثیر قابل ذکر نہیں ہوتی۔ اسی طرح کچھ عمل روحانی ترفع کا باعث ہوتے ہیں لیکن جسمانی نشوونما میں ان کا عمل دخل شاذ ہوتا ہے' مگر مسواک وہ عمل ہے کہ جو جسم کو بہت سی بیماریوں سے محفوظ رکھتا ہے اور ساتھ ہی ساتھ اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا باعث بنتا ہے' اور ربّ کی خوشنودی تو نری رحمت ہی ہے۔ اس سلسلے میں بھی حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلسِّوَاكُ مَطْهَرَةٌ لِلْفَمِ مَرْضَاةٌ لِلرَّبِّ)) (رواہ البخاری)

''مسواک مُنہ کو بہت زیادہ صاف کرنے والی اور اللہ تعالیٰ کو بہت زیادہ خوش کرنے والی چیز ہے''۔

مسواک ایک معمولی سا عمل ہے جس پر نہ زیادہ وقت لگتا ہے' نہ محنت اور نہ سرمایہ' مگر اس کی اہمیت کا اندازہ لگائیں تو یہ نہایت اونچے درجے کا عمل ہے جس کے

اندر بے شمار فوائد موجود ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ کا پسندیدہ عمل رہا ہے۔ اور چونکہ یہ ربّ تعالیٰ کی رضا کا باعث بنتا ہے اس لیے آپ ﷺ نے اپنی اُمت کو بھی اس کی ترغیب دی ہے۔ حضرت عائشہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''وہ نماز جس کے لیے مسواک کی جائے اس نماز کے مقابلے میں جو بلا مسواک پڑھی جائے' ستر گنا فضیلت رکھتی ہے''۔ (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

نماز خود کتنا فضیلت والا کام ہے! مگر مسواک ہے کہ اس کے ثواب کو بدرجہا زیادہ کر دیتی ہے۔ ستّر (۷۰) کا عدد عربی میں کثرت کے لیے محاورتاً بولا جاتا ہے' اور اگر سبعین سے مراد خاص ستّر کا عدد ہو تب بھی کوئی بعید نہیں۔

نماز اللہ کے حضور حاضری کا نام ہے۔ نماز کی حالت میں آدمی اپنے خالق اور مالک کے ساتھ ہم کلام ہوتا ہے۔ اس حاضری سے پہلے آلۂ گفتگو کو بتکلف پاک و صاف کرنا ضروری بھی ہے' کیونکہ بدبو نہ اللہ کو پسند ہے' نہ فرشتوں کو' بلکہ انسانوں کو بھی ناگوار ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسی چیز کھا کر مسجد میں جانے سے منع فرمایا ہے جس سے بدبو پیدا ہو۔ تمباکو نوشی کے منع ہونے کی دیگر وجوہات کے علاوہ ایک بڑی وجہ یہ بھی ہے کہ اس سے مُنہ میں بدبو پیدا ہوتی ہے جو پاس کھڑے ہونے والوں کے تکدرِ خاطر کا باعث بنتی ہے۔ کوئی شخص رسول اللہ ﷺ پر درود پڑھ رہا ہو مگر مُنہ سے بدبو آ رہی ہو تو یہ منظر کیسا رہے گا' جبکہ رحمت کے فرشتے بھی قریب نہ آ رہے ہوں اور اللہ تعالیٰ خود بھی راضی نہ ہو رہا ہو! تو یہ مسواک ہی ہے جو مُنہ کی بدبو دُور کر کے طبیعت کے انقباض کو رفع کرتی اور انشراح کی کیفیت پیدا کرتی ہے۔ چونکہ مسواک مُنہ کی صفائی کرتی ہے اور صفائی ایک مسلّمہ اخلاقی خوبی ہے اس لیے یہ ہر زمانے میں قابل تعریف رہی ہے اور پیغمبروں کا طریقہ رہا ہے۔ پیغمبر اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہوتے ہیں۔ اچھے عادات و خصائل ان کا کردار ہوتے ہیں۔ جو چیز انہیں پسند ہوتی ہے وہ واقعی پسندیدہ ہوتی ہے اور ان کی ناپسند قابل نفرت ہوتی ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((اَرْبَعٌ مِنْ سُنَنِ الْمُرْسَلِيْنَ :اَلْحَيَاءُ وَالتَّعَطُّرُ وَالسِّوَاكُ وَالنِّكَاحُ))

(سنن الترمذی)

''چار چیزیں پیغمبروں کی سنتوں میں سے ہیں: ایک حیاء' دوسرے خوشبو لگانا' تیسرے مسواک اور چوتھے نکاح''۔

دیکھئے یہ چاروں چیزیں ہر راست رو' صفائی پسند اور پاک باز انسان کو مرغوب ہیں۔

مسواک کی اس فضیلت اور اہمیت کے پیش نظر یہ ہمیشہ متقی اور پرہیزگاروں کا طریقہ رہا ہے۔ آج بھی اکثر نمازی اپنی جیب میں ہر وقت مسواک موجود رکھتے ہیں' تاکہ جب بھی ضرورت محسوس کریں یا نماز کے لیے وضو کریں تو اس وقت مسواک کر لیں۔ اگر درخت کی خشک یا تر ٹہنی کی مسواک میسر نہ ہو تو ٹوتھ برش بھی استعمال کیا جا سکتا ہے جو کہ مسواک کے قائم مقام ہے' البتہ مسواک میسر ہونے کی صورت میں مسواک کے استعمال ہی کو ترجیح دینی چاہیے۔

حقوقِ ہمسایہ

اسلام امن اور سلامتی کا دین ہے۔ یہاں معاشرے کے افراد کے حقوق وفرائض کا بطریق احسن تعین کیا گیا ہے۔ انسان کا قریب ترین رابطہ تو اپنے ماں باپ' اولاد اور رشتہ داروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ انسان کا مستقل واسطہ اپنے ہمسایوں سے ہوتا ہے۔ اگر چہ ہمسایوں میں دفتر کے ساتھی' سفر کے ساتھی' کاروبار کے ساتھی اور ہم مجلس بھی شامل ہیں' اور سبھی حسن سلوک کے مستحق ہیں' مگر حقیقی ہمسایہ تو وہ ہے جس کی جائے رہائش قریب ترین ہو۔ اس ہمسائے کے ساتھ شب وروز کا تعلق ہوتا ہے لہٰذا اس کے حقوق کی ادائیگی کا خاص طور پر خیال رکھنے کی تاکید کی گئی ہے۔ اگر ہمسائے ایک دوسرے کے ساتھ ہمدردی اور خیرخواہی کے جذبات رکھتے ہوں گے تو ان کی زندگی میں امن وسکون رہے گا اور ان کو خوشگوار ماحول میں زندگی گزارنے کا موقع ملے گا۔ اس کے برعکس اگر ہمسایوں کی آپس میں مفاہمت (understanding) نہ ہو تو دونوں خاندانوں کی زندگی بے مزا اور تلخ ہو جاتی ہے۔

آپس کی زندگی خوشگوار انداز میں گزارنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمسائے ایک دوسرے کے ساتھ اچھے تعلقات رکھیں۔ حقوقِ ہمسایہ کے بارے میں اسلام میں اس قدر تاکید ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے مروی ایک حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں:

((مَا زَالَ جِبْرِيْلُ يُوْصِيْنِي بِالْجَارِ حَتّٰى ظَنَنْتُ اَنَّهٗ سَيُوَرِّثُهٗ)) (۱)

''جبریل علیہ السلام پڑوسی کے حق کے بارے میں مجھے برابر وصیت اور تاکید کرتے رہے یہاں تک کہ میں خیال کرنے لگا کہ وہ اس کو وارث قرار دے دیں گے''۔

گویا شریعت اسلامیہ میں ہمسائے کے حقوق کی اہمیت انتہائی قریبی رشتہ داروں ہی کی مانند ہے۔

ماں باپ کے حقوق کی ادائیگی کے متعلق قرآن و سنت کے واضح احکام موجود ہیں۔ یہاں تک کہ اگر ماں باپ فاسق و فاجر' حتیٰ کہ کافر ہوں تب بھی ان کا اکرام اور خدمت اولاد پر لازم ہے۔ اسی طرح ہمسائے کے بارے میں بھی یہی حکم ہے کہ ہمسایہ بہر حال حسن سلوک کا مستحق ہے' خواہ وہ کافر ہی کیوں نہ ہو۔ جامع الترمذی میں ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہما کے ہاں بکری ذبح ہوئی' جب وہ گھر آئے تو انہوں نے گھر والوں سے پوچھا کیا تم لوگوں نے ہمارے یہودی پڑوسی کے لیے بھی گوشت کا ہدیہ بھیجا ہے؟ گویا انہوں نے گھر والوں سے پوچھ کر اطمینان کر لیا کہ کہیں ایسا تو نہیں کہ اسے یہودی ہونے کی وجہ سے ہدیہ سے محروم رکھا گیا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن تین چیزوں کو اللہ اور رسولؐ کی محبت کا معیار قرار دیا ہے اُن میں سے ایک پڑوسی کے ساتھ حسن سلوک بھی ہے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن ابی قراد رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے وضو کا استعمال شدہ پانی لے کر اپنے جسموں پر ملنے لگے۔ آپؐ نے ان سے دریافت فرمایا: ''تمہارے اس عمل کا سبب کیا ہے؟'' انہوں نے عرض کیا: ''بس اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت''۔ اس پر آپؐ نے فرمایا: ''جو شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسولؐ کے ساتھ محبت کرے تو اسے چاہیے کہ وہ تین کام کرے:

(۱) بات کرے تو سچ بولے (۲) جب اس کے پاس امانت رکھی جائے تو پوری دیانت داری کے ساتھ واپس لوٹائے (۳) اپنے پڑوسی کے ساتھ اچھا رویہ رکھے''۔(۲)

اس حدیث میں جہاں صدقِ مقال اور امانت داری کو اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ محبت کے مظاہر قرار دیا گیا ہے وہاں ہمسائے کے ساتھ حسن سلوک کو بھی لازمی قرار دے کر اُس کی حد درجہ اہمیت کو واضح کر دیا گیا ہے۔

اکثر اوقات جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اخلاقی تعلیمات کا تذکرہ کرتے تو ہمسائے کے ساتھ اچھے سلوک کا بھی تاکیداً ذکر فرماتے۔ حضرت ابوشریح عدوی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے کانوں سے آپؐ کا یہ ارشاد سنا ہے جب کہ میری آنکھیں آپؐ کو دیکھ رہی تھیں۔ آپؐ نے فرمایا:

((مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ جَارَهٗ وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيُكْرِمْ ضَيْفَهٗ ...... وَمَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَلْيَقُلْ خَيْرًا اَوْ لِيَصْمُتْ))(۳)

''جو کوئی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے ہمسائے کا اکرام کرے' اور جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے ...... اور جو شخص اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ وہ منہ سے اچھی بات نکالے یا پھر خاموش رہے''۔

اگرچہ حسن سلوک میں تمام اخلاقی محاسن آ جاتے ہیں تاہم ہمسائے کے اکرام کی اہمیت مزید واضح کرنے کے لیے رسول اللہ ﷺ نے چند متعین حقوق کی نشاندہی کر دی ہے' تاکہ ہمسائے ان کی رعایت کریں اور آپس میں پیار و محبت سے رہیں۔ حضرت معاویہ بن حیدہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((حَقُّ الْجَارِ اِنْ مَرِضَ عُدْتَهٗ وَاِنْ مَاتَ شَيَّعْتَهٗ وَاِنِ اسْتَقْرَضَكَ اَقْرَضْتَهٗ وَاِنْ اَعْوَرَ سَتَرْتَهٗ وَاِنْ اَصَابَهٗ خَيْرٌ هَنَّاْتَهٗ وَاِنْ اَصَابَتْهُ مُصِيبَةٌ عَزَّيْتَهٗ وَلَا تَرْفَعْ بِنَائَكَ فَوْقَ بِنَائِهٖ فَتَسُدَّ عَلَيْهِ الرِّيحَ وَلَا تُؤْذِيهِ بِرِيحِ قِدْرِكَ اِلَّا اَنْ تَغْرِفَ لَهٗ مِنْهَا))(۴)

''پڑوسی کے حقوق تم پر یہ ہیں کہ اگر وہ بیمار ہو جائے تو اس کی عیادت اور خبرگیری کرو' اور اگر انتقال کر جائے تو اس کے جنازے کے ساتھ جاؤ (اور تدفین کے کاموں میں ہاتھ بٹاؤ)' اور اگر وہ (اپنی ضرورت کے لیے) قرض مانگے تو (بشرطِ استطاعت) اس کو قرض دو' اور اگر وہ کوئی برا کام کر بیٹھے تو پردہ پوشی کرو' اور اگر اسے کوئی نعمت ملے تو اس کو مبارک باد دو' اور اگر اسے کوئی مصیبت پہنچے تو تعزیت کرو' اور اپنی عمارت اس کی عمارت سے اس طرح بلند نہ کرو کہ اس کے گھر کی ہوا بند ہو جائے' اور (جب تمہارے گھر کوئی اچھا کھانا پکے تو) تمہاری ہانڈی کی مہک اس کے لیے (اور اس کے بچوں کے لیے) باعثِ ایذا نہ ہو (یعنی اس کا اہتمام کرو کہ ہانڈی کی مہک اس کے گھر تک نہ جائے) اِلّا یہ کہ اس میں سے کچھ اس کے گھر بھی بھیج دو (اس صورت میں

کھانے کی مہک اس کے گھر تک جانے میں کوئی مضائقہ نہیں)''۔

ہمسائے کے اِن حقوق میں اوّل بیمار پرسی ہے۔ ہمسایہ بیمار ہو جائے تو اس کے ہاں جا کر اس کا حال دریافت کیا جائے' اُس کے ساتھ حوصلہ بڑھانے والی باتیں کی جائیں۔ اگر اس کو دوا دارو کے ضمن میں کوئی ضرورت درپیش ہو تو اُس کی مدد کی جائے۔ مزاج پرسی خود بہت بڑا فضیلت کا کام ہے۔ رسول اللہ ﷺ اکثر مزاج پرسی کے لیے تشریف لے جاتے تو مریض کا حوصلہ بڑھاتے اور یہ کہہ کر مریض کا دل خوش کرتے کہ یہ بیماری تمہارے گناہوں کو مٹا دے گی۔ آپؐ نے فرمایا کہ اگر ہمسائے کا انتقال ہو جائے تو اس کا جنازہ پڑھے' یعنی کفن دفن میں لواحقین کا ہاتھ بٹائے۔ یہ کام بھی بہت بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے' پھر ہمسائے کے معاملے میں تو اس کی تاکید بھی ہے۔ بعض اوقات ہمسائے کو کسی واقعی ضرورت کے لیے قرض لینا پڑتا ہے تو ایسی صورت میں اپنی استطاعت کے مطابق ہمسائے کی مدد کرنا لازم ہے۔ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے۔ بشری تقاضے کے تحت اگر ہمسائے سے کوئی برا کام سرزد ہو جائے تو اس کی پردہ پوشی کی جائے۔ انسان کا نفس تو اُسے دوسرے کی برائی اچھالنے ہی کا حکم دیتا ہے' مگر اسلام نے پردہ پوشی کی تلقین کی ہے۔ ہر شخص میں کمزوریاں ہیں اور کوئی شخص یہ پسند نہیں کرتا کہ اُس کی خامیاں دوسروں پر ظاہر ہوں۔ بس جو دوسروں کی خامیوں کو چھپائے گا اللہ تعالیٰ اس کی خامیوں پر پردہ ڈالے گا۔ چنانچہ ہمسائے کی خامیوں اور کوتاہیوں کو چھپانے کی تاکید کی گئی ہے' یعنی کسی ایسی بات کی اطلاع پا کر ہمسائے کی خیر خواہی کرتے ہوئے اسے اچھی نصیحت تو کی جائے مگر اُس کی غلطی کو دوسرے لوگوں پر ظاہر نہ کیا جائے۔

دکھ سکھ ہر انسان کے ساتھ ہے۔ اگر ہمسائے کو کوئی خوشی میسر آئے تو اسے مبارک دے' اس کی خوشی پر خوش ہو کر اس کی خوشی کو دوبالا کرے۔ اس طرح اچھے جذبات کا اظہار محبت کو بڑھانے کا باعث ہوگا۔ اسی طرح اگر ہمسائے کو کوئی صدمہ یا تکلیف پیش آ جائے تو اس کے ساتھ اظہارِ ہمدردی کرے' اس کے غم میں شریک ہو اور اسے سہارا دے۔ آپ ﷺ نے یہ بھی فرمایا کہ اپنا گھر تعمیر کرتے وقت ہمسائے کی سہولت کا خیال

رکھا جائے۔ اپنی عمارت کو اس انداز سے بلند نہ کیا جائے کہ ہمسائے کے گھر کی ہوا بند ہو جائے۔ غرض کوئی ایسا اقدام نہ کیا جائے جو ہمسائے کے لیے اذیت اور مشکل کا باعث ہو۔ دیکھئے آپؐ نے اخیر میں یہاں تک فرما دیا کہ اگر کسی کے ہاں اچھا کھانا پکے تو کھانے کی مہک کو ہمسائے کے گھر تک پہنچنے سے روکے تاکہ وہ احساسِ محرومی کی اذیت سے دوچار نہ ہوں کہ ہمسائے کے ہاں تو پلاؤ اور بریانی کی خوشبو آ رہی ہے مگر ہمیں اتنا اچھا کھانا میسر نہیں ہے۔ ظاہر ہے اچھے کھانے کی مہک تو دیوار کے پار بھی جائے گی' تو ایسی صورت میں آپؐ نے ارشاد فرمایا کہ جب کھانا پک جائے تو اُس میں سے تھوڑا سا ہمسائے کے ہاں بھی بھیج دیا جائے تاکہ وہ بھی اس اچھے کھانے میں شریک ہو جائیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمسائے کے حقوق کا معاملہ کتنا نازک اور حساس ہے کہ اُس کے حق میں معمولی سے معمولی تکلیف بھی شریعت میں گوارا نہیں۔

ہمسائے کے حقوق کی اہمیت کے پیش نظر جہاں ہمسائے کے ساتھ ہر طرح سے اچھا سلوک کرنے کی تاکید کی گئی ہے وہاں بدسلوکی کے عواقب سے بھی آگاہ کر دیا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں: ''وہ آدمی مجھ پر ایمان نہیں لایا جو ایسی حالت میں اپنا پیٹ بھر کر رات کو سو جائے جبکہ اس کے برابر رہنے والا اس کا پڑوسی بھوکا ہو اور اس آدمی کو اس کے بھوکا ہونے کی خبر بھی ہو''۔(۵)

معلوم ہوا کہ اگر ہمسائیگی میں کوئی نادار اور مفلس رہ رہا ہو تو اس کے حالات سے باخبر رہنا ضروری ہے' کیونکہ اگر وہ رات کو بھوکا سو گیا تو رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق انسان کا ایمان ہی آپ ﷺ پر نہ رہا' تو ایسے شخص کا انجام کیا ہوگا؟ اسی طرح آپؐ نے اس شخص کو دوزخی کہا ہے جو اپنے ہمسائے کے لیے تکلیف و اذیت کا باعث ہو' اسے پریشان اور تنگ کرتا ہو۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں:

((لَا يَدْخُلُ الْجَنَّةَ مَنْ لَا يَاْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ))(۶)

''وہ آدمی جنت میں داخل نہ ہو سکے گا جس کی شرارتوں اور ایذا رسانیوں سے اس کے پڑوسی محفوظ نہ ہوں''۔

ہمسائے کے حقوق کے بارے میں کوتاہی پر اس سے زیادہ سخت الفاظ کیا ہو سکتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ ، وَاللّٰهِ لَا يُؤْمِنُ)) قَالُوْا : وَمَا ذَاكَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ؟ قَالَ: ((اَلْجَارُ لَا يَأْمَنُ جَارُهُ بَوَائِقَهُ))(۷)

''اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں' اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں' اللہ کی قسم وہ شخص مؤمن نہیں''۔عرض کیا گیا: اے اللہ کے رسول! ایسا کون شخص ہے؟ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ''وہ آدمی جس کے پڑوسی اس کی شرارتوں سے مأمون نہ ہوں''۔

ویسے تو مسلمان کی شان یہ ہے کہ وہ کسی بھی مسلمان بھائی کا بدخواہ نہیں ہو سکتا' بلکہ وہ دوسرے مسلمانوں کا خیر خواہ' ہمدرد اور وفادار ہوتا ہے' مگر ہمسائے کے حقوق کے معاملے میں تو اتنی تاکید کا تقاضا یہ ہے کہ ہم لوگ ہر وقت اس بات کا خیال رکھیں کہ ہمارا ہمسایہ ہم سے ناراض تو نہیں' بلکہ کبھی کبھی دریافت بھی کر لینا چاہیے کہ اسے کوئی شکایت تو نہیں؟ اگر کوئی شکایت ہو تو بلا تاخیر اس کا ازالہ کرنا چاہیے۔ اس طرح باہمی خوشگوار تعلقات سکون و اطمینان کا باعث ہوں گے اور آخرت کا اجر اس پر مستزاد ہو گا۔ اگر ایسا اتفاق ہو کہ کسی اکھڑ اور بدمزاج ہمسائے سے سابقہ پڑ جائے تو اسلامی اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے ساتھ ہمیشہ نرمی کا معاملہ کیا جائے اور اس کی مدد اور خیر خواہی کا کوئی موقع ضائع نہ کیا جائے۔ اس کا اثر یہ ہو گا کہ وہ شخص بھی ضرور اپنا رویہ بدل لے گا اور اس طرح آپ کو خوش اخلاقی کا اچھا بدلہ مل جائے گا۔

حواشی

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب الوصاۃ بالجار۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلۃ والآداب' باب الوصیۃ بالجار والاحسان الیہ۔

(۲) شعب الایمان للبیہقی۔

(۳) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب من کان یومن باللّٰہ والیوم الآخر فلا یؤذ جارہ۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب الحث علی اکرام الجار والضیف ولزوم الصمت......

(۴) رواہ الطبرانی فی الکبیر۔ (۵) مسند بزار۔ ومعجم کبیر للطبرانی۔

(۶) صحیح مسلم' کتاب الایمان' باب بیان تحریم ایذاء الجار۔ (۷) مسند احمد۔

خوش طبعی اور مزاح

خالق کائنات نے انسان کو تخلیق کیا تو اُس نے اپنی مشیت کے تحت اسے کمزور پیدا کیا۔اس کے اندر جذبات' احساسات اور فطری تقاضے رکھے۔انسان کو اس بات کا پابند کیا کہ وہ اپنے فطری تقاضوں پر کڑی نظر رکھے' انہیں کنٹرول کرے اور آزاد نہ چھوڑے۔یہی انسان کا امتحان ہے کہ آیا وہ جذبات کی رو میں بہہ جاتا ہے یا جذبات کو قابو میں رکھ کر ہدایت کی راہ پر چلتا ہے۔ جو اِس کوشش میں کامیاب ہو گیا وہی مردِ میدان ہے' وہی حقیقی کامیاب انسان ہے۔

اسلام فطری داعیات کو کنٹرول کرنے کی تلقین کرتا ہے' کچلنے کی نہیں۔انسان کے اندر محبت کے جذبات و داعیات ہیں۔پس اُسے ماں' باپ' اہل وعیال' تمام مسلمان بھائیوں' خصوصاً رشتہ داروں اور ہمسایوں کے ساتھ محبت کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ انسان کے اندر نفرت کے داعیات بھی ہیں۔ چنانچہ اُسے ان جذبات کی تشفی کے لیے برے اعمال و افعال' ممنوعات' مکروہات' کفر وشرک اور برے انسانوں سے نفرت کرنے کو کہا گیا ہے۔انسان کے اندر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے جذبات ہیں۔ ان کو کام میں لانے کے لیے نیکیوں اور بھلائی کے کاموں میں سبقت لے جانے کے راستے کھلے رکھے گئے ہیں۔ دولت کی محبت کو متوازن رکھنے کے لیے اچھی خوراک' اچھا لباس' اچھی رہائش' اچھی سواری اور دنیاوی ضرورت کی چیزوں پر خرچ کرنے کی اجازت دی گئی ہے' مگر نمود ونمائش کی خاطر فضول رسموں اور اسراف وتبذیر سے روکا گیا ہے۔

خوشی کے موقع پر خوشی کے اظہار اور غم کے موقع پر غمزدہ ہونے سے نہیں روکا گیا' البتہ خوشی کے موقع پر حدود سے تجاوز کرتے ہوئے ناچ گانے' فضول خرچی اور لہو ولعب سے روکا گیا ہے۔اسی طرح کسی صدمے کی صورت میں افسردہ ہونے سے نہیں روکا گیا'

البتہ بے صبری کے مظاہرے' چیخنا' چلانا' شکوہ شکایت سے منع کیا گیا ہے۔اس لیے کہ یہ خوشیاں اور غم انسان کے ساتھ لگے ہوئے ہیں' ان سے فرار کسی طرح ممکن نہیں۔پس حدود کے اندر رہ کر خوشی منانا اور غم کے موقع پر غمزدہ ہونے سے نہیں روکا گیا۔غضب ناک ہونا' غصہ میں آنا' پنجہ آزمائی' لڑنا بھڑنا بھی بعض طبائع میں پایا جاتا ہے۔ان جذبات کے اظہار کو بھی راہ دی گئی ہے کہ خدا اور رسولؐ کے دشمن اگر اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کریں تو ان کو کچلنے کے لیے میدان میں اُترو اور اپنے جذبات کا اظہار کرو' مگر اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ لڑائی بھڑائی سے بچتے رہو۔ ؎

ہو حلقہ یاراں تو بریشم کی طرح نرم
رزمِ حق و باطل ہو تو فولاد ہے مؤمن!

فطری جذبات میں ہنسنا' مسکرانا' خوش طبعی اور مزاح بھی شامل ہے۔اس سے انسانی طبیعت میں انبساط پیدا ہوتا ہے۔خوشی کی بات ہو تو ہنسنے مسکرانے پر پابندی نہیں۔ آپس میں خوش طبعی اور مزاح کی باتیں کرنے کی بھی اجازت ہے۔خود رسول اللہ ﷺ سے مزاح اور خوش طبعی کے واقعات ملتے ہیں۔جب خوش طبعی اور مزاح سیرتِ طیبہ میں موجود ہے تو اس کی پیروی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' تابعینؒ' تبع تابعینؒ اور اُمت کے صالحین کی زندگیوں میں بھی خوش طبعی کے واقعات ملتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ نے مذاق کرنے سے منع بھی کیا ہے' مگر یہ وہ مذاق ہے جس میں کسی کی اہانت اور تحقیر ہو۔

اگر ہر وقت سنجیدگی کا غلبہ ہو تو زندگی تلخ ہو کر رہ جاتی ہے۔کبھی کبھی خوش طبعی' ہنسی مذاق' مزاح اور شگفتہ گفتگو طبیعت میں فرح اور انبساط کا باعث بنتی ہے۔البتہ ان جذبات کا بے محابہ اظہار مذموم ہے۔اسی لیے ایسا مزاح جس میں خلافِ حقیقت باتیں' کذب و افترا اور جہالت ہو' اس کی اجازت نہیں۔

رسول اللہ ﷺ پر فکرِ آخرت کا غلبہ تھا۔آپؐ اکثر فکرمند اور غمگین رہا کرتے تھے۔ بایں ہمہ سیرتِ طیبہ میں کبھی کبھی خوش طبعی اور مزاح کا اظہار بھی ملتا ہے' جس سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو ہمت ملتی تھی کہ وہ آپؐ کے رعب و ادب کے باوجود بے تکلفی کے ساتھ

آپؐ سے بات چیت کر لیتے تھے۔ اسلام میں نفس کے حقوق بھی تسلیم کیے گئے ہیں۔ اور نفس کا ایک حق یہ بھی ہے کہ کبھی کبھی انسان سنجیدگی سے نکلے اور ہنسے مسکرائے' خوش طبعی' دل لگی کی باتیں کرے اور فرحت محسوس کرے۔ سیرتِ طیبہ علیٰ صاحبہا الصلاۃ والسلام اور سوانح صحابہؓ میں خوش طبعی کے واقعات تاریخ کا حصہ ہیں۔ یہ واقعات اصولِ شریعہ بھی متعین کرتے ہیں' خوش طبعی کا باعث بھی ہیں اور علم و ذہانت بھی بڑھاتے ہیں۔

۞ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھا: یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم! آپؐ ہم سے مذاق بھی فرما لیتے ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: ''ہاں' مگر میں کبھی غلط بات نہیں کرتا''۔ (ترمذی)

۞ ایک دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خادمِ خاص حضرت انس رضی اللہ عنہ کو یَاذَا الْاُذُنَیْن سے خطاب فرمایا' یعنی دو کانوں والا۔ آپؐ کا یہ خطاب بے تکلفی' پیار اور از راہِ مذاق تھا' مگر یہ کوئی حقیقت کے خلاف بات نہ تھی۔ ہر شخص کی طرح حضرت انس رضی اللہ عنہ کے بھی دو کان تھے۔ پھر ہوسکتا ہے کہ آپؐ کی مراد یہ ہو کہ انسؓ ہر بات متوجہ ہو کر سنتے تھے اور جو بھی ارشادِ نبویؐ سنتے تھے اس کے سننے کا حق ادا کرتے تھے' یعنی اس پر عمل بھی کرتے تھے۔

۞ حضرت اَنس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میرے چھوٹے بھائی نے ایک پرندہ پالا ہوا تھا جس کے ساتھ وہ کھیلتا تھا۔ وہ پرندہ مر گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے چھوٹے بھائی کو از راہِ مذاق فرمایا: یَا اَبَا عُمَیْر مَا فَعَلَ النُّغَیْرُ ''اے ابوعمیر! وہ نغیر کہاں جاتا رہا؟'' حالانکہ آپؐ جانتے تھے کہ وہ پرندہ مر گیا ہے۔ ظاہر ہے آپؐ نے حضرت انسؓ کے چھوٹے بھائی کو بے تکلفی' موانست اور پیار کی وجہ سے ان الفاظ کے ساتھ پکارا۔ فقہاء نے تو آپؐ کے اس طرح کے مزاحیہ جملوں سے کئی مسائل کا استخراج کیا ہے۔ گویا آپؐ کا مزاح بھی حکیمانہ اور معلمانہ ہوتا تھا۔

۞ زاہر بن حرام رضی اللہ عنہ نامی ایک صحابی دیہاتی آبادی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاں

آتے اور اپنے ساتھ آپ ﷺ کے لیے سبزی ترکاری لایا کرتے۔ جب واپس ہوتے تو آپؐ انہیں کھانے پینے کا کچھ شہری سامان عطا فرماتے۔ ایک دفعہ آپؐ نے فرمایا: ''زاہر ہمارا جنگل ہے اور ہم اس کے شہر ہیں''۔

۞ حضرت زاہر رضی اللہ عنہ کے ساتھ آپؐ کی بے تکلفی اور تعلق خاطر ملاحظہ ہو کہ ایک دفعہ آپؐ نے انہیں بازار میں دیکھا تو پیچھے سے جا کر اُن کی آنکھوں پر ہاتھ رکھ دیا۔ حضرت زاہرؓ پکارے کون ہے؟ کون ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے ان کی آنکھوں سے ہاتھ اٹھا لیا اور فرمایا: ''کون شخص ہے جو اس غلام کو خریدے!'' زاہرؓ نے عرض کیا کہ حضور ﷺ! اگر آپ مجھے بیچیں گے تو بہت کم قیمت پائیں گے۔ آپؐ نے فرمایا: ''نہیں، تم اللہ کے نزدیک کم قیمت نہیں، بلکہ بیش قیمت ہو!''

۞ ایک بوڑھی عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس آئی۔ دورانِ گفتگو آپؐ نے فرمایا: ''کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی''۔ یہ سن کر وہ عورت حیران اور فکر مند ہوئی۔ جب اس کی حیرت پریشانی کی حدود میں آنے لگی تو آپؐ نے فرمایا کہ ''جنت میں سب عورتیں جوان ہو کر جائیں گی، وہاں کوئی بوڑھی نہ ہو گی''۔ یہ سن کر اس عورت کو اطمینان ہوا، اُس کی فکر مندی خوشی میں بدل گئی اور وہ مسکرانے لگی۔ اس مزاح سے جہاں خوش طبعی کا اظہار ہوا وہاں اُمت کو علم و حکمت کا سبق بھی ملا کہ بسا اوقات آدمی آیت و روایت کے غلط معنی سمجھ لیتا ہے، جیسا کہ بڑھیا نے ((لَا تَدْخُلُ الْجَنَّةَ عَجُوْزٌ)) سے ظاہری معنی سمجھے کہ کوئی بوڑھی عورت جنت میں نہ جائے گی اور پریشان ہو گئی۔ جب آپؐ نے اس کا صحیح مفہوم بتایا تو بڑھیا کی پریشانی خوشی میں بدل گئی اور اُمت کو کلامِ نبی ﷺ کے فہم کا ایک اصول مل گیا۔

۞ ایک شخص حاضر خدمت ہوا اور عرض کی کہ مجھے سواری کے لیے اونٹ چاہیے۔ آپؐ نے فرمایا: ''میں تجھے اونٹنی کا بچہ دوں گا''۔ اُس شخص نے حیرت سے کہا: یا رسول اللہؐ! اونٹنی کے بچے کا میں کیا کروں گا، وہ میرا بوجھ کیسے سنبھالے گا؟ مجھے تو آپؐ اُونٹ ہی دیجیے۔ جب وہ شخص زیادہ حیران ہوا تو آپؐ نے فرمایا کہ ''اللہ کے بندے! ہم

آپؐ کو اونٹ ہی دیں گے' وہ بھی تو اونٹنی کا بچہ ہی ہوگا''۔ یہ سن کر وہ شخص خوش ہو گیا۔ تعجب کے بعد اگر خوشی ملے تو وہ فراواں ہو جاتی ہے۔

۞ ایک انصاری عورت رسول اللہ ﷺ کے پاس حاضر تھی۔ آپؐ نے اس کو فرمایا: جلدی سے جاؤ' تمہارے شوہر کی آنکھوں میں سفیدی ہے۔ وہ گھبرائی ہوئی جلدی سے اپنے شوہر کے پاس گئی۔ جب شوہر نے اسے اتنا گھبرایا ہوا دیکھا تو پوچھا بات کیا ہے جو تم اس قدر پریشان نظر آ رہی ہو؟ کہنے لگی کہ مجھے رسول اللہ ﷺ نے خبر دی ہے کہ تمہاری آنکھوں میں سفیدی ہے۔ جب اس کے شوہر نے سنا تو بات سمجھ گیا اور کہنے لگا کہ سفیدی کے ساتھ سیاہی بھی تو ہے اور سب لوگوں کی آنکھوں میں سفیدی تو ہوتی ہے۔ تب وہ سمجھی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس طرح اس کے ساتھ خوش طبعی کا اظہار کیا ہے۔ وہ ہنسی اور خوش ہوئی کہ رسول اللہ ﷺ نے اس کے ساتھ خوش طبعی کی بات کی اور بے تکلفی روا رکھی۔ دیکھئے اس مزاح میں خوش طبعی کا عنصر تو ہے مگر خلافِ واقعہ کوئی بات نہیں۔

قرآن مجید میں ہے کہ رمضان شریف میں سحری کا وقت اُس وقت تک ہے جب تک سفید ڈورا صبح ہونے کی وجہ سے سیاہ ڈورے سے الگ نہ نظر آئے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ نے ایک سفید اور ایک سیاہ ڈورا اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا اور اُس وقت تک کھاتے پیتے رہے جب تک دونوں دھاگے ایک دوسرے سے الگ الگ نظر نہ آئے۔ اس طرح دن کی روشنی نمودار ہو گئی۔ رسول اللہ ﷺ کو خبر ہوئی تو آپؐ نے مسکراتے ہوئے عدی کو فرمایا: ''تمہارا تکیہ تو بہت لمبا چوڑا ہے'' کہ اس کے نیچے دن اور رات دونوں آ گئے۔ کیونکہ قرآن مجید کے الفاظ ''خیط الابیض'' اور ''خیط الاسود'' کا مطلب سیاہ اور سفید دھاگے نہ تھا بلکہ اس سے مراد صبح صادق کا سفید خط اور رات کا سیاہ خط تھا۔

رسول اللہ ﷺ سے مزاح کے واقعات دیکھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم بھی آپس میں خوشگوار مزاح سے لطف اندوز ہوتے تھے۔

۞ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ حضرت ابوبکر' حضرت عمر اور حضرت علی رضی اللہ عنہم اکٹھے کہیں جا

رہے تھے۔ تینوں حضرات اس طرح چل رہے تھے کہ حضرت علیؓ دوسرے دو کے درمیان تھے۔ شیخین دراز قد تھے اور حضرت علیؓ کا قد چھوٹا تھا۔ دونوں کو مذاق سوجھا تو کہنے لگے: علی! تم تو ہم دونوں کے درمیان اس طرح ہو جیسے لَنَا کے درمیان نقطہ۔ حضرت علیؓ نے سنا تو کہنے لگے کہ ٹھیک ہے مگر یہ تو دیکھو اگر میں تمہارے درمیان سے نکل جاؤں تو تم لَا رہ جاؤ گے' یعنی میرے بغیر تمہاری حیثیت لَا کی طرح ہے جس کا معنی ہے کچھ نہیں۔ لَنَا کے درمیان میں سے نون ہٹا دیا جائے تو باقی لَا رہ جاتا ہے۔

۞ ایک دفعہ چند صحابہؓ ایک جگہ بیٹھے کھجوریں کھا رہے تھے۔ ان کو مذاق جو سوجھا تو جو بھی کھجور کھاتا وہ گٹھلی حضرت علیؓ کے سامنے رکھ دیتا۔ اس طرح ساری گٹھلیاں حضرت علیؓ کے سامنے اکٹھی ہو گئیں۔ اس پر ایک صاحب بولے کہ لگتا ہے کہ ساری کھجوریں علی ہی کھا گئے ہیں۔ اس پر حضرت علیؓ نے جواب دیا کہ ایسا نہیں' بلکہ لگتا ہے کہ تم سب گٹھلیوں سمیت کھجوریں کھا گئے ہو اور میں گٹھلیاں نکال کر کھا رہا ہوں۔

۞ ایک دفعہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ ایک لڑکی سے باتیں کر رہے تھے۔ دورانِ گفتگو آپؓ کو مذاق سوجھا تو کہنے لگے مجھے تو خالق خیر نے پیدا کیا ہے اور تجھے خالق شر نے۔ اس سے وہ یہ سمجھی کہ اگر مجھے خالق شر نے پیدا کیا ہے تو میں تو برائی ہی برائی ہوں۔ یہ سمجھ کر وہ رونے لگی۔ اس پر حضرت عمرؓ نے ہنس کر کہا اللہ کی بندی خیر اور شر کا پیدا کرنے والا ایک ہی اللہ ہے۔ اُسی نے مجھے پیدا کیا اور اُسی نے تجھے پیدا کیا اور وہی ہر چیز کا خالق ہے' خالق دو نہیں ایک ہی ہے۔ اس پر وہ لڑکی ہنس پڑی۔

۞ ایک شخص مسجد میں داخل ہوا اور جوتا باہر اتار گیا۔ نماز پڑھنے کے بعد واپس ہوا تو وہاں جوتا نہ تھا۔ کسی یہودی نے اس کا جوتا چرا کر قریب کے کنیسہ میں رکھ دیا۔ وہ شخص اپنا جوتا اِدھر اُدھر تلاش کرتا ہوا کنیسہ کے اندر گیا تو وہاں اپنا جوتا پڑا ہوا دیکھا۔ اس پر جوتے کو مخاطب کر کے کہنے لگا: تیرا برا ہو' میں تو اسلام لایا مگر تو یہودی ہو گیا۔

۞ ایک نابینا کی شادی ہوئی۔ ایک دن اس کی بیوی نے اسے کہا: کاش تو میرا حسن و جمال اور گورا رنگ دیکھ سکتا! نابینا کو مذاق سوجھا' کہنے لگا: اگر تو ایسی ہی حسین ہوتی

تو آنکھوں والے تجھے میرے لیے کیوں چھوڑتے!

۞ ایک شخص کسی کے ہاں مہمان ہوا' وہ وہاں چار دن رُکا۔ صاحب خانہ چار دن اسے بیل کا گوشت کھلاتا رہا۔ آخر مہمان میزبان سے کہنے لگا: لگتا ہے تمہارے بیل کی ذبح کے بعد کی زندگی اس کی طبعی عمر سے زیادہ لمبی ہے۔

۞ ایک شخص کو اپنے نوکر پر غصہ آیا۔ کہنے لگا میرا دل چاہتا ہے کہ تجھے ایسا تھپڑ رسید کروں کہ تو مدینہ جا کر گرے۔ نوکر نے برجستہ جواب دیا کہ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی اگر آپ مجھے ایک تھپڑ اور ماریں تاکہ میں مکہ پہنچ جاؤں اور حج کی سعادت حاصل کرلوں۔

سیرتِ طیبہؐ اور صحابہؓ کے مذکورہ واقعات کتب حدیث میں صحیح اسناد کے ساتھ ملتے ہیں' جبکہ قرونِ اولیٰ کے دوسرے لوگوں کے واقعات تاریخ اسلام میں موجود ہیں۔ معلوم ہوا کہ اسلام روکھا پھیکا طرزِ زندگی نہیں سکھاتا' بلکہ تمام طبعی جذبات کے اظہار کی مناسب شرائط اور حدود وآداب کے ساتھ اجازت دیتا ہے۔

۞۞۞

عفو ودرگزر

اسلامی اخلاق کا ایک نمایاں وصف

رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ میں فضائل اخلاق کی تکمیل کے لیے مبعوث کیا گیا ہوں۔ چنانچہ آپ ﷺ کی سیرت وکردار کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی زندگی تمام اخلاقی خوبیوں کا مرقع تھی۔ پھر آپ ﷺ کے فرائض منصبی میں یہ بھی شامل تھا کہ آپؐ لوگوں کو اچھے اخلاق کی تعلیم دیں اور انہیں مضبوط کردار وعمل سے مزین کریں۔

اخلاقی خوبیوں میں ایک اہم صفت عفو ودرگزر ہے' جس کا مطلب ہے دوسروں کے ساتھ نرمی کا سلوک کرنا' کوتاہیوں اور خطاؤں سے درگزر کرنا' انتقام لینے کی طاقت ہونے کے باوجود معاف کردینا اور مؤاخذہ نہ کرنا۔ رسول اللہ ﷺ نے زندگی بھر کسی شخص سے بدلہ نہیں لیا جس نے آپ ﷺ کو اذیت پہنچائی' برا بھلا کہا' بدسلوکی کی یا زخمی کیا۔ آپ ﷺ نے ہمیشہ اپنے دشمنوں سے عفو ودرگزر کا معاملہ فرمایا۔ فتح مکہ کے موقع پر جب آپ ﷺ فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوئے تو آپ کے سامنے وہ لوگ موجود تھے جنہوں نے آپ کو ستانے میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی تھی۔ مگر آپ ﷺ نے ﴿لَا تَثْرِيْبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ﴾ فرما کر اُن کو معاف کر دیا اور بدلہ نہ لیا۔

اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنیٰ میں ایک نام ''العفو'' ہے' یعنی سراسر معافی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ خود بے حساب معاف کرنے والا ہے اور معاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَهُوَ الَّذِيْ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ عِبَادِهٖ وَيَعْفُوْا عَنِ السَّيِّاٰتِ﴾ (الشوریٰ:۲۵) ''وہی ہے جو اپنے بندوں کی توبہ قبول کرتا ہے اور برائیوں سے درگزر فرماتا ہے''۔ بلکہ جب کوئی گناہگار اللہ کی گرفت سے خوف کھا کر سچی توبہ کرتا

ہے' اپنے قصوروں پر نادم ہوتا ہے اور آئندہ زندگی میں پھر ان گناہوں کے قریب نہیں جاتا تو اللہ تعالیٰ اس کے گناہوں کو نہ صرف معاف کر دیتا ہے بلکہ انہیں نیکیوں سے بدل دیتا ہے۔ از روئے الفاظِ قرآنی: ﴿..... اِلَّا مَنْ تَابَ وَاٰمَنَ وَعَمِلَ عَمَلًا صَالِحًا فَاُولٰٓئِكَ يُبَدِّلُ اللّٰهُ سَيِّاٰتِهِمْ حَسَنٰتٍ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۝﴾ (الفرقان) ''.....مگر جس کسی نے توبہ کی اور ایمان لایا اور اچھا عمل کیا تو اللہ اس کی برائیوں کو نیکیوں میں بدل دے گا۔ بے شک اللہ بخشنے والا مہربان ہے''۔ انسان پر جو بھی مصیبت آتی ہے اکثر و بیشتر وہ اس کی اپنی ہی غلطیوں کا نتیجہ ہوتا ہے' مگر اللہ تعالیٰ مہربانی فرماتے ہوئے ہر گناہ اور خطا پر گرفت نہیں کرتا' بلکہ عفو کا معاملہ فرماتا ہے۔ قرآن مجید میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَمَآ اَصَابَكُمْ مِّنْ مُّصِيْبَةٍ فَبِمَا كَسَبَتْ اَيْدِيْكُمْ وَيَعْفُوْا عَنْ كَثِيْرٍ ۝﴾ (الشوریٰ) ''اور جو مصیبت بھی تم پر واقع ہوتی ہے سو وہ تمہارے اپنے ہاتھوں ہی کی کمائی کا بدلہ ہوتا ہے' اور بہت سے گناہ تو اللہ تعالیٰ معاف بھی کر دیتا ہے''۔

خطا کار کو معاف کر دینا اللہ تعالیٰ کو بہت پسند ہے۔ اللہ تعالیٰ خود رحمٰن اور رحیم ہے اور اپنے بندوں کی خطاؤں کو معاف کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے محبوب بندوں کا یہ وصف نمایاں ہوتا ہے کہ وہ انتقام لینے کی بجائے معاف کرنے کو بہتر سمجھتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ تقریباً دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم رہے مگر اُن دس سالوں میں آپ نے نہ انہیں کبھی ڈانٹ پلائی اور نہ ہی سخت سست کہا' حالانکہ وہ نوعمر تھے اور کام کرنے میں ان سے غلطیاں بھی ہوئیں۔ آپؓ خود اعتراف کرتے ہیں کہ مدینہ میں مَیں دس سال تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہا اور میں نوعمر لڑکا تھا' اس لیے میرا ہر کام رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مرضی کے بالکل مطابق نہیں ہوتا تھا' لیکن (دس سال کی) اس مدت میں کبھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اُف تک بھی نہیں کہا اور نہ کبھی یہ فرمایا کہ تم نے یہ کیوں کیا یا یہ کیوں نہیں کیا؟ (سنن ابی داود)

حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ایک حدیث نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((اَلْخَلْقُ عِيَالُ اللّٰهِ، فَاَحَبُّ الْخَلْقِ اِلَى اللّٰهِ مَنْ اَحْسَنَ اِلٰى عِيَالِهٖ)) (رواہ البیہقی

فی شعب الایمان) ''ساری مخلوق اللہ تعالیٰ کا کنبہ ہے۔ پس مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ کا محبوب ترین بندہ وہ ہے جو اُس کے کنبے کے ساتھ حسن سلوک کرے''۔ چنانچہ مخلوق کے ہر فرد کے ساتھ حسن سلوک اور نرمی کا برتاؤ اللہ تعالیٰ کو پسند ہے۔ خاص طور پر جب کوئی شخص کسی مصیبت زدہ کے لیے ہمدردی کا اظہار کرے اور اُس کے لیے آسانی پیدا کرنے کی کوشش کرے، لوگوں کی خطاؤں سے درگزر کرے، تو اس کا یہ عمل بہت بڑے اجر و ثواب کا باعث ہوتا ہے۔

رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلی کسی اُمت میں ایک آدمی تھا۔ جب موت کا فرشتہ اس کی روح قبض کرنے آیا تو اس سے پوچھا کہ تو نے دنیا میں کوئی نیک عمل کیا تھا؟ اس نے عرض کیا کہ میرے علم میں میرا ایسا کوئی عمل نہیں ہے۔ اس سے کہا گیا ذرا غور سے نظر ڈال! اس نے پھر عرض کیا کہ میرے علم میں کوئی چیز نہیں سوائے اس کے کہ میں لوگوں کے ساتھ کاروبار اور لین دین کرتا تھا تو میرا رویہ ان کے ساتھ درگزر اور احسان کا ہوتا تھا۔ میں پیسے والوں کو بھی مہلت دیتا تھا اور غریبوں اور ناداروں کو تو معاف بھی کر دیتا تھا۔ تو اللہ نے اُس شخص کے لیے جنت میں داخلے کا حکم فرما دیا۔ (متفق علیہ)

ایک شخص نے رسول اللہ ﷺ سے دریافت کیا کہ میں اپنے خادم کا قصور کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپ ﷺ نے اس کو کوئی جواب نہیں دیا بلکہ خاموش رہے۔ اس نے پھر پوچھا کہ یارسول اللہ ﷺ میں اپنے خادم کو کتنی دفعہ معاف کروں؟ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ہر روز ستر مرتبہ''۔ (جامع ترمذی) ستر دفعہ کہنا عربوں کا محاورہ ہے۔ گویا قصور معاف کرنا کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی حد مقرر کی جائے۔ خادم کے قصور معاف ہی کرتے رہنا چاہیے۔ قصور معاف کرنا بہت اونچے درجے کی نیکی ہے جو انسان کی قدر و منزلت میں اضافے کا باعث بنتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا کہ اے پروردگار! آپ کے بندوں میں کون آپ کی بارگاہ میں زیادہ باعزت ہیں؟ ارشاد ہوا: ''وہ بندے جو (قصوروار پر) قابو پالینے کے بعد (اور سزا کی طاقت رکھنے کے باوجود) اس کو معاف کر

دیں''۔ (شعب الایمان للبیہقی)

ایک شخص حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو گالیاں دینے لگا۔ اُس وقت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی پاس کھڑے تھے۔ وہ آدمی گالیاں دے رہا تھا' حضرت ابوبکر صدیقؓ خاموش کھڑے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تبسم فرما رہے تھے۔ جب اس آدمی نے بہت زیادہ بدزبانی کی تو حضرت ابوبکرؓ نے بھی اس کی بعض باتوں کو اس پر پلٹ دیا۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ناراضگی کے ساتھ وہاں سے چل دیے۔ حضرت ابوبکرؓ آپ کے پیچھے چل پڑے اور عرض کیا یارسول اللہؐ! یہ کیا بات تھی کہ وہ شخص مجھے گالیاں دیتا رہا اور آپؐ وہاں تشریف فرما رہے' پھر جب میں نے کچھ جواب دیا تو آپ ناراض ہو کر چل دیے؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب تک تم خاموش تھے اور صبر کر رہے تھے تو تمہارے ساتھ اللہ کا ایک فرشتہ تھا جو تمہاری طرف سے جواب دے رہا تھا' پھر جب تم نے خود جواب دیا تو (وہ فرشتہ تو چلا گیا اور) شیطان بیچ میں آ گیا۔ اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اے ابوبکر! تین باتیں ہیں جو سب کی سب بالکل حق ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ جس بندے پر کوئی ظلم وزیادتی کی جائے وہ محض اللہ کے لیے اس سے درگزر کرے (اور انتقام نہ لے) تو اللہ تعالیٰ اس کے بدلے میں اس کی بھرپور مدد فرمائیں گے۔ دوسری بات یہ ہے کہ جو شخص صلہ رحمی کے لیے دوسروں کو دینے کا دروازہ کھولے گا تو اللہ تعالیٰ اس کے عوض اس کو اور زیادہ دیں گے۔ اور تیسری بات یہ ہے کہ آدمی اپنی دولت بڑھانے کے لیے سوال کا دروازہ کھولے گا' یعنی بھیک مانگنا شروع کر دے گا تو اللہ تعالیٰ اس کی دولت کو اور زیادہ کم کر دیں گے۔ (مسند احمد)

دنیا کی زندگی میں عفو و درگزر کی عادت اختیار کرنا بڑی خوبی کی بات ہے' کیونکہ حساب کتاب کے دن ہر شخص کی خواہش ہو گی کہ اُس کے گناہوں کو معاف کر دیا جائے۔ تو جو شخص دنیا کی زندگی کے معاملات میں دوسروں کے ساتھ نرمی اور درگزر کا عادی ہو اللہ تعالیٰ حساب کتاب کے وقت اُس کے ساتھ بھی نرمی کا معاملہ فرمائے گا۔ مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ اس ضمن میں ایک سبق آموز واقعہ بیان کرتے ہیں کہ دہلی

شہر میں ایک شخص نان چنے بیچتا تھا۔ اس کی عادت تھی کہ اگر کوئی کھوٹا پیسہ بھی دے دیتا تو لے لیتا اور واپس نہ کرتا۔ اپنے اس رویے کی بدولت وہ شہر میں مشہور تھا۔ بچے تو اکثر کھوٹے سکے لے کر آتے اور اس سے نان چنے لے کر کھاتے۔ اس شخص کی وفات کا وقت آیا تو اس نے شہر کے ایک متقی بزرگ کو بلایا اور کہا کہ میری وجۂ شہرت بتائیے۔ بزرگ کہنے لگے شہر کا بچہ بچہ جانتا ہے کہ تم گاہک کا کھوٹا کھرا نہیں دیکھتے' بلکہ جو بھی کوئی دیتا ہے قبول کر لیتے ہو۔ اس پر اُس نے اس متقی بزرگ سے کہا کہ آپ گواہ رہیں اور جب میرا حساب کتاب ہونے لگے تو کہہ دینا اے اللہ یہ تیرے بندوں کا کھوٹا کھرا نہیں دیکھتا تھا لہٰذا تو بھی اس کے کھوٹے کھرے کو نہ دیکھ اور اسے معاف کر دے۔ مجھے قوی اُمید ہے کہ مہربان ربّ میری خطائیں معاف کردے گا۔ کسی نے کیا خوب کہا ہے :۔

کرو مہربانی تم اہل زمیں پر
خدا مہرباں ہو گا عرشِ بریں پر

عدل وانصاف کے تقاضے پورے کرتے ہوئے اگر چہ ظلم وزیادتی کا بدلہ لینا جائز ہے مگر فضیلت اور عزیمت اسی میں ہے کہ بدلہ لینے کی طاقت رکھنے کے باوجود محض اللہ کی رضا کے لیے معاف کردیا جائے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے: ﴿وَجَزٰٓؤُا سَيِّئَةٍ سَيِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۚ فَمَنْ عَفَا وَاَصْلَحَ فَاَجْرُهٗ عَلَى اللّٰهِ ۭ﴾ (الشوریٰ: ٤٠) ''اور برائی کا بدلہ تو اسی طرح کی برائی ہے' مگر جو درگزر کرے اور (معاملے کو) درست کر دے تو اس کا بدلہ اللہ کے ذمے ہے''۔ گویا جو شخص قصوروار کو معاف کر دیتا ہے اللہ تعالیٰ ضرور ایسے شخص کو ثوابِ عظیم سے نوازتا ہے' کیونکہ اللہ تعالیٰ کو عفو ودرگزر پسند ہے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ہم نے ایک دفعہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ آپ مسکرا رہے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پوچھا یارسول اللہ کون سی چیز ہنسی کا سبب ہوئی؟ آپؐ نے فرمایا: میرے دو اُمتی اللہ کے سامنے گھٹنے ٹیک کر کھڑے ہو گئے ہیں۔ ایک کہتا ہے یاربّ اس نے مجھ پر ظلم کیا' میں بدلہ چاہتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ ظالم سے فرماتا ہے

کہ اپنے ظلم کا بدلہ ادا کرو۔ ظالم جواب دیتا ہے یا ربّ! اب میری کوئی نیکی باقی نہیں رہی کہ ظلم کے بدلہ میں اسے دے دوں۔ اس پر وہ مظلوم کہتا ہے کہ اے اللہ! میرے گناہوں کا بوجھ اس پر لاد دے۔ یہ کہتے ہوئے رسول اللہ ﷺ آبدیدہ ہو گئے اور فرمانے لگے کہ وہ بڑا ہی سخت دن ہو گا۔ لوگ چاہیں گے کہ اپنے گناہوں کا بوجھ کسی اور کے سر دھر دیں۔ اب اللہ تعالیٰ طالب انتقام سے فرمائے گا کہ نظر اٹھا کر جنت کی طرف دیکھ۔ وہ سر اٹھائے گا‘ جنت کی طرف دیکھے گا تو عرض کرے گا یا ربّ! اس میں تو چاندی اور سونے کے محل موتیوں کے بنے ہوئے ہیں! یا ربّ! یہ محل کس نبی‘ صدیق اور شہید کے ہیں؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا جو اِس کی قیمت ادا کرتا ہے اس کو دے دیے جاتے ہیں۔ وہ کہے گا یا ربّ! اس کی قیمت کون ادا کر سکتا ہے؟ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ تو اس کی قیمت ادا کر سکتا ہے۔ اب وہ عرض کرے گا یا ربّ کس طرح؟ اللہ تعالیٰ ارشاد فرمائے گا وہ اس طرح کہ تو اپنے بھائی کو معاف کر دے۔ وہ کہے گا یا ربّ میں نے معاف کیا۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرمائے گا اب تم دونوں ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے جنت میں داخل ہو جاؤ۔

یہاں ایک اشکال پیدا ہوتا ہے کہ وہ دن تو عمل کا نہیں بلکہ جزا کا ہے‘ لیکن اللہ تعالیٰ اس دن طالب انتقام کو معاف کرنے کا موقع دیتا ہے جس کے نتیجہ میں ظالم اور مظلوم دونوں کو جنت میں داخل فرما دیتا ہے! یہ اشکال اُس وقت بے حقیقت ہو جاتا ہے جب یہ یقین پختہ ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ **يَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَاءُ** اور **يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَاءُ** کی شان رکھتا ہے۔ اس کی کوئی صفت محدود نہیں اور پھر اس کی رحمت تو ہر چیز پر غالب ہے۔ اگر وہ چاہے گا تو حقوق اللہ کی کوتاہیاں بھی معاف کر دے گا اور حقوق العباد میں قصور بھی معاف کر دے گا۔ اس کے سامنے کوئی رکاوٹ نہ ہو گی۔ گویا معاف کرنا اللہ تعالیٰ کی کریمانہ صفت ہے۔ اور اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو بھی اسی صفت کے ساتھ متصف دیکھنا پسند کرتا ہے۔ ایک مسنون دعا کے الفاظ اس طرح ہیں:

اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ (ترمذی)

''اے اللہ تُو تو بہت معاف کرنے والا ہے اور معافی کو پسند کرتا ہے' پس مجھے معاف فرما دے''۔

معاف کرنا نہایت اونچے درجے کے ثواب کا کام ہے' مگر اس کی بھی کچھ حدود ہیں۔ جہاں اس بات کی قوی امید ہو کہ زیادتی کرنے والے کا رویہ بدلا ہوا ہے اور وہ معافی ملنے کی صورت میں اپنی اصلاح کر لے گا وہاں تو معاف کرنا مستحسن ہے' مگر جہاں اس بات کی توقع نہ ہو اور اس کے آثار نظر نہ آئیں وہاں انتقام لینا ہی بہتر ہے' تاکہ مجرم اپنے کیے کا بدلہ پائے اور دوسروں کو عبرت ہو۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اسلامی عدالت سے سزا پائے تو اس کی معافی کا بھی کسی کو اختیار نہیں رہتا۔ یعنی چوری ثابت ہو جانے پر چور کا ہاتھ کاٹا جائے گا اور قاتل کو موت کی سزا دی جائے گی۔

غصہ کے برے نتائج اور علاج

انسان کو عقل وشعور کی نعمت دے کر آزمائش میں ڈال دیا گیا ہے۔اس نعمت کی وجہ سے انسان اچھائی اور برائی میں تمیز کر سکتا ہے' اپنا نفع اور نقصان سوچ سکتا ہے۔انسان کو چاہیے کہ وہ خوبیوں اور اچھائیوں کو اپنائے اور برائیوں اور گناہ کے کاموں سے احتراز کرے۔اللہ تعالیٰ نے جائز و ناجائز اور حلال وحرام کو واضح کر دیا ہے۔انسانی فطرت کے اندر کچھ طبعی عوارض پیدا کر دیے گئے ہیں اور انسان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اپنی فطری کمزوریوں کو اپنے کردار وعمل پر غالب نہ آنے دے' بلکہ ان پر کنٹرول کرے۔یہی انسان کا امتحان ہے اور یہی اس کی آزمائش ہے۔

انسانی کمزوریوں میں ایک کمزوری غصہ ہے۔جب کوئی شخص اپنے مزاج کے خلاف کوئی چیز دیکھتا یا سنتا ہے تو اس کی طبیعت میں اشتعال پیدا ہوتا ہے۔اس اشتعال کے نتیجے میں وہ زبان اور ہاتھ کا ناجائز استعمال کر کے ایسے کام کر گزرتا ہے جو اس کے لیے سراسر نقصان کا باعث ہوتے ہیں۔بعد میں وہ انسان اکثر اپنے کیے پر پشیمان اور شرمندہ بھی ہوتا ہے مگر اب وقت گزر چکا ہوتا ہے۔غصے کو کنٹرول نہ کرنا نہ صرف اخلاقی برائی ہے بلکہ یہ کئی طرح کے نقصانات کا باعث بنتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ دین اسلام میں غصے کا اظہار انتہائی قابل مذمت فعل ہے' جبکہ غصے پر کنٹرول کرنا تحسین وآفرین کے لائق ہے۔قرآن مجید میں جہاں اللہ تعالیٰ کے پسندیدہ بندوں کی صفات بیان کی گئی ہیں وہاں اُن کی ایک نمایاں صفت یہ بھی ہے کہ جب انہیں غصہ آتا ہے تو وہ درگزر کر جاتے ہیں: ﴿وَاِذَا مَا غَضِبُوْا هُمْ يَغْفِرُوْنَ﴾ (الشوریٰ) ایسے لوگوں کا شمار یقیناً محسنین میں ہوتا ہے اور محسنین اللہ کے محبوب بندے ہوتے ہیں۔جیسا کہ قرآن مجید میں ارشاد ہے: ﴿وَالْكَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ﴾ (آل عمران) ''اور جو

غصے کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کر دیتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ ایسے نیک لوگوں کو پسند کرتا ہے''۔

غصہ انسان کو بہت سی حسرتوں' مایوسیوں اور ناکامیوں سے دوچار کرتا ہے' جبکہ اس پر ضبط کرنا بہت سی خوبیوں اور شادمانیوں کا ذریعہ بنتا ہے۔ غصے کی حالت میں انسان پر شیطان کا حملہ بڑا آسان ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اس وقت انسان ایسا فعل کر گزرتا ہے جس پر اسے بعد میں خود اپنے رویے پر افسوس ہوتا ہے' مگر اس وقت تیر کمان سے نکل گیا ہوتا ہے اور سوائے پشیمانی کے کچھ ہاتھ نہیں آتا۔

عام طور پر نوکروں اور ماتحتوں پر زیادہ غصہ آتا ہے' کیونکہ ان کی طرف سے کسی ردِ عمل کا خطرہ نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر اللہ کا خوف ہی انسان کو زیادتی کرنے سے روک سکتا ہے' ورنہ مشتعل ہو کر مالک اور افسر اپنے نوکر یا ماتحت سے بدزبانی بھی کر لیتا ہے اور بعض اوقات ناکردہ گناہ اس کے سر پر ڈال کر اسے سزا بھی دے ڈالتا ہے' مگر یہ بات ظلم کے زمرے میں آتی ہے اور زیادتی کرنے والا خود اللہ کے ہاں سزا کا مستوجب ہو جاتا ہے۔

میاں بیوی ہمہ وقت کے ساتھی ہوتے ہیں۔ ایک جگہ رہتے ہوئے بعض معاملات میں اختلاف ہو جانا خارج از امکان نہیں ہے۔ اگر فریقین ٹھنڈی طبیعت کے مالک ہوں تو معاملہ جلد رفع دفع ہو جاتا ہے' بصورتِ دیگر بات طول پکڑ لیتی ہے' شوہر مشتعل ہو جاتا ہے' بیوی کے گزشتہ حسن سلوک کو فراموش کر کے مغلوب الغضب ہو جاتا ہے' گالی گلوچ کرتا ہے اور بعض اوقات نوبت مار پیٹ تک پہنچ جاتی ہے اور وہ پاگل ہو کر طلاق کا لفظ بول دیتا ہے اور ایسے موقع پر اکثر لوگ تو ''طلاق طلاق طلاق'' کہہ دیتے ہیں۔ تھوڑی دیر کے بعد جب ہوش ٹھکانے آتے ہیں تو پشیمان ہوتے ہیں اور پریشان ہو کر علماء سے مسئلہ پوچھتے ہیں اور وہ کہتے ہیں طلاق واقع ہو چکی ہے۔ اب بحث کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ میں نے تو غصے میں کہہ دیا تھا' میرا ارادہ طلاق دینے کا نہ تھا۔ تو جواب ملتا ہے کہ طلاق کی مثال بندوق کی گولی کی طرح ہے۔ اگر بندوق کسی شخص سے غیر ارادی طور پر بھی چل جائے تو نشانہ بننے والا آدمی تو مر جاتا ہے۔ اب بندوق جس کے ہاتھ سے چل گئی وہ

ہزار کہے کہ میرا ارادہ قتل کرنے کا نہیں تھا مگر مقتول تو زندہ نہیں ہوسکتا۔ گویا ایک پل کا غصہ پورے خاندان کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ غصے پر قابو پانے کی تلقین کی گئی ہے تاکہ آدمی برے نتائج سے بچ سکے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضور! مجھے کوئی نصیحت فرمائیے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((لَا تَغْضَبْ)) فَرَدَّدَ مِرَارًا قَالَ: ((لَا تَغْضَبْ)) (۱)

''غصہ مت کیا کرو''۔ اس شخص نے پھر وہی درخواست کئی بار دہرائی کہ حضرت ! مجھے اور نصیحت فرمائیے' مگر آپؐ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ ''غصہ مت کیا کرو''۔

ہوسکتا ہے کہ نصیحت کی درخواست کرنے والا وہ شخص مشتعل مزاج ہو اور اس کے حق میں سب سے بڑی نصیحت غصے سے رکنا ہو' اسی لیے اس کے بار بار پوچھنے پر ہر دفعہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشتعال انگیزی سے باز رہنے کی تاکید کی۔ مگر آپؐ کی یہ نصیحت ہر شخص کے لیے ہے' کیونکہ غصے میں آنے کی فطری کمزوری ہر شخص کے اندر موجود ہے جس کے برے نتائج سے محفوظ رہنے کی ہر کسی کو ضرورت ہے۔

غصہ جہاں انسان کو دنیا کی زندگی میں طرح طرح کی مشکلات اور مصائب میں گرفتار کرتا ہے وہاں انسان کی متاعِ ایمان کو بھی برباد کر دیتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ الْغَضَبَ لَيُفْسِدُ الْاِيْمَانَ كَمَا يُفْسِدُ الصَّبِرُ الْعَسْلَ)) (۲)

''غصہ ایمان کو ایسے خراب کر دیتا ہے جیسے ایلوا شہد کو خراب کر دیتا ہے۔''

شہد شیریں ترین شے ہے' مگر ایلوا اس قدر کڑوا ہوتا ہے کہ وہ شہد کو بھی کڑوا کر دیتا ہے۔ اسی طرح اشتعال انگیزی اتنی بری ہے کہ وہ ایمان میں خرابی کا باعث بنتی ہے۔ اچھا بھلا مسلمان غصے میں آ کر مخالف پر جھوٹے الزام لگاتا ہے اور بعض اوقات تو کلماتِ کفر بول دیتا ہے۔ پس غصے کی شر انگیزی اور ہلاکت کے پیش نظر اس سے بچ کر رہنا ضروری ہے۔

ایک دفعہ راقم الحروف کو ایک جیل کے دورہ کا موقع ملا۔ وہاں مختلف نوعیتوں کے سزا

---

(۱) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب الحذر من الغضب۔

(۲) رواہ البیہقی فی شعب الایمان۔

یافتہ مجرموں کو پابند سلاسل دیکھا۔ کچھ لوگوں کے ساتھ بات چیت بھی کی اور دریافت کیا کہ وہ کس جرم کے نتیجے میں یہاں پہنچے۔اس پر اکثر قیدیوں کا یہ جواب تھا کہ غصہ آ گیا تھا جس سے بات بڑھ گئی اور انجام کار جیل میں بند ہونا پڑا۔قتل کے مجرموں اور سزائے موت پانے والوں میں سے بھی اکثر نے یہی کہا کہ مخالف کی کسی بات پر غصہ آ گیا' میں نے پستول نکالا اور فائر کر دیا' میرا مخالف وہیں ڈھیر ہو گیا اور مجھے مقدمہ کا سامنا کرنا پڑا۔ زر کثیر بھی صرف ہوا اور سزا بھی ہو گئی۔

غصے پر قابو پانا کوئی آسان کام نہیں' خاص طور پر جب اس کا نشانہ کوئی کمزور شخص بن رہا ہو۔ ایسے موقع پر مغلوب الغضب شخص کو چونکہ اس بات کی فکر نہیں ہوتی کہ مدمقابل کی طرف سے کسی طرح کا ردِعمل ہوگا' اس لیے وہ بڑی بے باکی کے ساتھ غصے کا اظہار کرتا ہے۔ ایسی حالت میں غصے پر قابو پانا واقعی بڑی ہمت کا کام ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لَیْسَ الشَّدِیْدُ بِالصُّرَعَةِ' اِنَّمَا الشَّدِیْدُ الَّذِیْ یَمْلِكُ نَفْسَهٗ عِنْدَ الْغَضَبِ)) (۳)

''پہلوان اور طاقتور وہ نہیں ہے جو مدمقابل کو پچھاڑ دے' بلکہ پہلوان اور شہ زور درحقیقت وہ ہے جو غصہ کے وقت اپنے نفس پر قابو رکھے۔''

جو شخص غصہ آنے پر آپے سے باہر نہ ہو اور نفس پر ضبط کر لے وہ بڑا بہادر اور صاحبِ عزیمت بلکہ صاحب فضیلت شخص ہے۔ وہ خود بعد میں اپنے طرزِ عمل پر خوش ہوگا اور اپنے آپ کو شاباش دے گا کہ اگر غصے میں آ کر کوئی اقدام کر گزرتا تو بھیانک نتائج کا سامنا کرنا پڑتا۔

ظفر آدمی اُس کو نہ جانیے گا' ہو وہ کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا

پس غصے کو پی جانا بڑی فضیلت کا باعث ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

(۳) صحیح البخاری' کتاب الادب' باب الحذر من الغضب۔ وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب فضل من یملك نفسه عند الغضب وبای شیء یذهب۔

((مَا تَجَرَّعَ عَبْدٌ جَرْعَةً اَفْضَلَ عِنْدَ اللّٰهِ عَزَّوَجَلَّ مِنْ جَرْعَةِ غَيْظٍ يَكْظِمُهَا ابْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ تَعَالٰى)) (٤)

''کسی بندہ نے کسی چیز کا کوئی گھونٹ ایسا نہیں پیا جو اللہ کے نزدیک غصہ کے اس گھونٹ سے افضل ہو جسے کوئی بندہ اللہ کی رضا کی خاطر پی جائے۔''

اللہ تعالیٰ کو بندے کا ہر وہ عمل پسند ہے جو وہ اس کی رضا کے لیے کرے۔ چنانچہ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی رضا اور اس کے خوف سے غصہ آنے پر ضبط سے کام لے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں وہ بڑا انعام و اکرام پائے گا۔ حضرت سہل بن معاذ رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ كَظَمَ غَيْظًا وَهُوَ يَقْدِرُ عَلٰى اَنْ يُّنَفِّذَهٗ دَعَاهُ اللّٰهُ عَلٰى رُءُوْسِ الْخَلَائِقِ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ حَتّٰى يُخَيِّرَهٗ فِيْ اَيِّ الْحُوْرِ شَاءَ)) (٥)

''جو شخص غصہ کو پی جائے درآنحالیکہ اس میں اتنی طاقت اور قوت ہو کہ وہ اپنے غصہ کے تقاضے کو پورا کر سکتا ہو تو اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ساری مخلوق کے سامنے اس کو بلائیں گے اور اختیار دیں گے کہ حورانِ جنت میں سے جس حور کو چاہے اپنے لیے منتخب کر لے۔''

اسی طرح ایک موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ:

((مَنْ كَفَّ غَضَبَهٗ كَفَّ اللّٰهُ عَنْهُ عَذَابَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ)) (٦)

''جو کوئی اپنے غصہ کو روکے اور پی جائے اللہ تعالیٰ قیامت کے دن اس سے عذاب روک لے گا۔''

گویا غصے پر ضبط کرنا نہ صرف دنیا کی زندگی میں بہت سے نقصانات اور برے نتائج سے بچاتا ہے بلکہ آخرت کی سزاؤں سے بھی محفوظ کرتا ہے۔

مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے مواعظ میں ایک سبق آموز واقعہ ملتا ہے کہ ایک مفلس آدمی تھا' بڑی مشکل سے اپنے بال بچوں کا پیٹ پالتا تھا۔ مہینوں تک اس کے ہاں گوشت نہ پکتا تھا۔ ایک دفعہ دال اور سبزی وغیرہ کھاتے چھ ماہ گزر گئے تو ایک دن وہ

---

(٤) مسند احمد۔

(٥) جامع الترمذی' کتاب صفة القيامة والرقائق والورع عن رسول اللہ ﷺ' باب منه۔

(٦) رواه البيهقي في شعب الايمان۔

پکانے کے لیے گوشت لے کر آیا اور اپنی بیوی کے حوالے کر کے خود مزدوری کرنے چلا گیا۔ جب وہ شام کو گھر آیا تو خوب بھوک لگ رہی تھی۔ بیوی نے کھانا لا کر رکھا۔ کھانے لگا تو سالن میں نمک بہت زیادہ تھا۔ اب اس کا خون کھول گیا۔ غصہ عروج پر تھا کہ اگر چھ ماہ بعد گوشت ملا بھی تو وہ بیوی نے نمک زیادہ ڈال کر خراب کر دیا۔ وہ چاہ رہا تھا کہ بیوی پر برس پڑے' برا بھلا کہے' بلکہ مار دھاڑ کرے۔ اچانک اس کے دل میں خیال آیا کہ یہی کام اگر میری بیٹی کے ہاتھوں ہو جاتا تو کیا میں یہ پسند کرتا کہ اس کا شوہر اس کو مار پیٹ کرے؟ ہرگز نہیں! یہ خیال آنا تھا کہ وہ غصہ پی گیا اور بیوی کو کچھ نہ کہا۔ جب یہ شخص فوت ہو گیا تو وقت کے ایک بزرگ نے اسے خواب میں دیکھا۔ بزرگ نے پوچھا: بھئی تمہارے ساتھ کیا معاملہ ہوا؟ کہنے لگا: اللہ تعالیٰ نے ایک ایک کر کے میرے گناہ گنوانے شروع کیے' میں اعتراف کرتا رہا اور سمجھ گیا کہ اب تو دوزخ میں ڈالا جاؤں گا۔ اتنے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا: تمہیں یاد ہے کہ تم نے میری بندی کا قصور معاف کر دیا تھا جبکہ اس نے سالن میں نمک زیادہ کر دیا تھا اور تم شدید غصے میں تھے! جاؤ آج میں تمہاری خطائیں معاف کرتا ہوں۔ چنانچہ میری بخشش ہو گئی۔

اس اخلاقی کمزوری پر قابو پانے کے سلسلہ میں بھی ہمیں رسول اللہ ﷺ سے مؤثر ہدایات ملتی ہیں۔ آپؐ نے فرمایا: ((وَاِذَا غَضِبَ اَحَدُکُمْ فَلْیَسْکُتْ)) (۷) ''جب تم میں کسی کو غصہ آئے تو چاہیے کہ وہ اس وقت خاموشی اختیار کر لے (یہ بات آپؐ نے تین بار فرمائی)۔''

اس نصیحت کی اہمیت کے پیش نظر اس کو رسول اکرم ﷺ نے بار بار دہرایا تاکہ آدمی اشتعال انگیزی اور جلد بازی سے رک کر نتائج بد سے محفوظ رہے۔

غصہ کی حالت میں انسان کا خون کھول جاتا ہے' یعنی وجود میں حدت پیدا ہو جاتی ہے۔ شیطان بھی آگ سے بنایا گیا ہے' چنانچہ انسان کی اس کیفیت کو شیطان کے ساتھ خصوصی نسبت ہے۔ اس لیے اس کے علاج کے لیے برودت تجویز کی جاتی ہے۔ حضرت عطیہ بن عروہ السعدی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

(۷) مسند احمد۔

((اِنَّ الْغَضَبَ مِنَ الشَّیْطَانِ وَاِنَّ الشَّیْطَانَ خُلِقَ مِنَ النَّارِ وَاِنَّمَا تُطْفَأُ النَّارُ بِالْمَاءِ' فَاِذَا غَضِبَ اَحَدُکُمْ فَلْیَتَوَضَّأْ)) (۸)

''غصہ شیطان کے اثر سے آتا ہے اور شیطان کا مادۂ تخلیق آگ ہے اور آگ پانی سے بجھائی جاتی ہے' لہٰذا تم میں سے جب کسی کو غصہ آئے تو اس کو چاہیے کہ وہ وضو کرلے۔''

غصے کی حالت میں جب آدمی وضو کرے گا تو اس کے اعضاء پر پانی پڑنے سے گرمی زائل ہو جائے گی اور بندہ جلد ہی پرسکون ہو جائے گا۔ جب دو آدمیوں کے درمیان تو تکار ہو رہی ہو اور بات بڑھ رہی ہو تو ان میں سے ایک اگر خاموشی اختیار کرلے اور جواب نہ دے تو بھی غصہ فرو ہو جائے گا۔ خاموشی اختیار کرنا اس وقت آسان ہو جائے گا جب آدمی اس جگہ سے چلا جائے' گویا فریقین کے درمیان فاصلہ ہو جائے۔ جب مخالفین ایک دوسرے سے دور ہو جائیں گے تو انہیں نارمل ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ اسی طرح ہیئت بدلنے سے بھی غصہ فرو ہو جاتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا غَضِبَ اَحَدُکُمْ وَھُوَ قَائِمٌ فَلْیَجْلِسْ' فَاِنْ ذَھَبَ عَنْهُ الْغَضَبُ وَاِلاَّ فَلْیَضْطَجِعْ)) (۹)

''جب تم میں سے کسی کو غصہ آئے اور وہ کھڑا ہو تو بیٹھ جائے۔ پس اگر بیٹھنے سے غصہ جاتا رہے تو فبہا اور اگر پھر بھی غصہ باقی رہے تو چاہیے کہ لیٹ جائے''۔

ایک موقع پر نبی اکرم ﷺ نے دو آدمیوں کو دست و گریبان دیکھا' ان میں سے ایک دوسرے کو گالی دے رہا تھا اور اس کا چہرہ سرخ ہو رہا تھا' رگیں پھول رہی تھیں' آپؐ نے اسے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ پڑھنے کی تلقین کی۔ (الحکمۃ' ص ۴۹۵' بحوالہ بخاری و مسلم) ظاہر ہے کہ تعوذ سے شیطان دور بھاگتا ہے۔ جب شیطان موقع سے بھاگ گیا تو غصہ بھی خود بخود فرو ہو جائے گا۔

---

(۸) سنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب ما یقال عند الغضب۔

(۹) سنن ابی داؤد' کتاب الادب' باب ما یقال عند الغضب۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سیرت وکردار

قرآن وحدیث اور تاریخ کی روشنی میں

آپؓ کا نام عبداللہ تھا اور کنیت ابوبکر۔ کنیت کی شہرت نام پر غالب رہی۔ صدیق اور عتیق دو لقب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پائے۔ جن دس صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو آپؐ نے زندگی میں جنت کی بشارت دی، جنہیں ''عشرۂ مبشرہ'' کہا جاتا ہے، ان میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا نام سرفہرست ہے۔ آپؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بچپن کے دوست اور سلیم الفطرت انسان تھے۔ آزاد مردوں میں آپ نے سب سے پہلے اسلام قبول کیا (فتح الباری)۔ آپؓ کی فضیلت کا ذکر زبانِ حق ترجمان سے بکثرت موجود ہے۔ آپؓ کی فضیلت میں کئی آیات نازل ہوئیں جن کی تلاوت تا قیامِ قیامت ہوتی رہے گی۔ آپؓ ہر کٹھن موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہے اور کفار سے ایذائیں برداشت کرتے رہے۔ آپؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رفاقت کا حق ادا کر دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اس بات کا اعتراف کر کے حضرت ابوبکر کو سند فضیلت عطا فرمادی کہ ''کوئی ایسا شخص نہیں ہے جس نے ہمارے ساتھ حسن سلوک کیا ہو یا ہمیں کچھ دیا ہو اور ہم نے اس کا بدلہ نہ چکا دیا ہو، سوائے ابوبکرؓ کے۔ انہوں نے ہمارے ساتھ جو حسن سلوک کیا اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ ہی قیامت کے دن دے گا۔ اور کسی شخص کا مال بھی اتنا میرے کام نہیں آیا جتنا ابوبکرؓ کا مال کام آیا......'' (جامع ترمذی)

اصحابِ رسول اگرچہ سب کے سب صحابیت کے شرف سے مشرف تھے تاہم ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امتیازی حیثیت کو وہ بھی تسلیم کرتے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں: ''ابوبکر ہمارے سردار ہیں۔ وہ ہم میں سب سے بہتر اور افضل ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ہم میں سے سب سے زیادہ محبوب ہیں''۔ (ترمذی)

ایک موقعہ پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''ایسے لوگوں کے لیے جن میں ابوبکر موجود ہوں مناسب اور درست نہیں کہ ابوبکر کے سوا کوئی دوسرا شخص ان کا امام ہو''۔ (جامع ترمذی)

یہ فرمانِ رسولؐ اس بات پر سند کی حیثیت رکھتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد خلافت کے حق دار ابوبکر ہی تھے۔ چنانچہ مشاورت میں یہی طے پایا اور وہی آپ ﷺ کے بعد خلیفہ بنے۔ اس طرح کا اشارہ آپؐ نے اس وقت بھی دیا جب ایک عورت آپ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئی اور کچھ دریافت کرنا چاہا۔ آپؐ نے فرمایا: ''پھر کبھی آنا''۔ اس عورت نے عرض کیا کہ اگر میں پھر آؤں اور آپؐ کو نہ پاؤں تو میں کیا کروں؟ آپؐ نے فرمایا: ''اگر تم مجھے نہ پاؤ تو ابوبکر کے پاس آ جانا''۔ (صحیحین) اس طرح آپ ﷺ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو اپنا نائب قرار دے دیا۔

ایک دو نہیں بلکہ کئی موقعوں پر آپ ﷺ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان فرمائی جس سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ آپؐ کی وفات کے بعد خلافت کا بار اٹھانے کے لیے حضرت ابوبکر صدیق سے موزوں تر کوئی شخصیت نہ تھی۔ حضرت محمد بن حنفیہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا کہ اُمت میں رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے بہتر اور افضل کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا کہ ابوبکر۔ میں نے کہا ان کے بعد کون؟ تو انہوں نے فرمایا کہ عمر۔ محمد بن حنفیہ کہتے ہیں کہ پھر مجھے خطرہ پیدا ہوا (کہ اگر میں اسی طرح دریافت کروں کہ عمر کے بعد کون؟) تو یہ نہ کہہ دیں کہ عثمانؓ۔ (اس لیے میں نے اس طرح سوال کیا) پھر عمر کے بعد آپؓ؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں تو مسلمانوں میں کا ایک آدمی ہوں''۔ (صحیح بخاری)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے الفاظ سے جہاں اُن کی اخلاقی بلندی کا اظہار ہو رہا ہے وہاں حقیقت حال بھی عیاں ہے' کیونکہ شیخین کی تمام دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم پر فضیلت احادیث رسول کی روشنی میں مسلمہ ہے۔ حضرت حذیفہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''میں نہیں جانتا کہ میں کب تک تم لوگوں میں باقی رہوں گا' پس (جب میرا وصال ہو جائے تو) تم میرے بعد ان دونوں ابوبکر اور عمر (رضی اللہ عنہما) کی اقتدا کرنا''۔ (ترمذی)

یہ امر مسلم ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے فرامین خواہش نفس کے تابع نہیں ہوتے بلکہ ان کی زبان تو وحی کی ترجمان ہوتی ہے' کیونکہ خود قرآن مجید میں آیا ہے کہ: ﴿وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى ۝ إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى ۝﴾ (النجم) ''وہ خواہش نفس سے بات نہیں کرتے وہ تو وہی فرماتے ہیں جو اللہ کی طرف سے وحی کی جاتی ہے''۔

مذکورہ بالا حدیث کی تائید میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی فیصلہ کن بات ملاحظہ ہو۔ وہ فرماتے ہیں ''ہم لوگ رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ابوبکرؓ کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے۔ ان کے بعد عمرؓ ان کے بعد عثمان۔ پھر ہم رسول اللہ ﷺ کے تمام اصحاب کو چھوڑ دیتے تھے۔ ان کے درمیان ایک کو دوسرے پر فضیلت نہیں دیتے تھے''۔ (صحیح بخاری)

ظاہر ہے عبداللہ بن عمرؓ کی یہ رائے حضور ﷺ کے طرزِ عمل کو دیکھ کر ہی تھی۔ کیونکہ حضرت ابوبکرؓ کے حق میں اسی طرح کی فضیلت کئی مرتبہ رسول اللہ ﷺ بیان فرما چکے تھے۔

جب رسول اللہ ﷺ کے لیے قریش مکہ کی شدید مخالفت کی وجہ سے مکہ میں رہنا ممکن نہ رہا تو اللہ تعالیٰ نے انہیں مدینہ کی طرف ہجرت کا حکم دیا۔ چنانچہ یہ حکم پاکر آپ سیدھے حضرت ابوبکرؓ کے ہاں گئے جو آپؐ کے سچے جاں نثار اور راز داں تھے اور اُن کو رفیق سفر بنایا۔ دونوں دوست روانہ ہوئے۔ حضرت عائشہ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہما نے رخت سفر تیار کیا۔ جلدی میں توشہ دان باندھنے کو کوئی چیز نہ ملی تو حضرت اسماء نے اپنے کمر بند کو پھاڑ کر دو ٹکڑے کیے۔ اس پر آپ ﷺ نے حضرت اسماء کو ''ذات النطاقین'' کا نام دیا۔ قریش نے آپ ﷺ کا پیچھا کیا اور گرفتاری پر انعام کا اعلان کیا۔ کئی لوگ آپ ﷺ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ آپؐ مکہ مکرمہ کے قریب ثور پہاڑ کے ایک غار میں تین دن تک روپوش رہے۔ اس خطرناک گھڑی میں ابوبکر رضی اللہ عنہ آپ کے ساتھ رہے۔ اس واقعے کا ذکر خود قرآن مجید میں بایں الفاظ مذکور ہے:

﴿إِلَّا تَنْصُرُوْهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللّٰهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُوْلُ لِصَاحِبِهٖ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللّٰهَ مَعَنَا ۚ فَأَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ.....﴾ (التوبة: ٤٠)

''اگر تم نہ مدد کرو گے رسول کی تو اس کی مدد کی ہے اللہ نے جس وقت نکالا تھا اس کو کافروں نے' اُس وقت وہ دو ہی شخص تھے جن میں (ایک ابوبکر تھے) دوسرے (خود رسول اللہ ﷺ) جب وہ دونوں غار (ثور) میں تھے اس وقت پیغمبر اپنے رفیق کو تسلی دیتے تھے کہ غم نہ کر اللہ ہمارے ساتھ ہے' تو اللہ نے ان پر تسکین نازل فرمائی......''

غار میں قیام کے دوران رسول اللہ ﷺ کی رفاقت وہ بڑی فضیلت ہے جو کسی دوسرے صحابی کو نصیب نہ ہو سکی۔ آپ ﷺ کے ساتھ ابوبکر کی ان رفاقتوں کا ذکر کرتے ہوئے آپؐ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

((اَنْتَ صَاحِبِیْ فِی الْغَارِ وَصَاحِبِیْ عَلَی الْحَوْضِ)) (ترمذی)

''تم غار میں میرے ساتھی تھے اور آخرت میں حوضِ کوثر پر بھی میرے ساتھی ہو گے''۔

آپ ﷺ کے جاں نثار تو اور بھی بہت تھے مگر سفر ہجرت میں آپ کے ساتھ مصاحبت کے شرف میں ابوبکر کا کوئی ہمسر نہیں۔ سورۃ التوبۃ کی آیت ۴۰ کی تفسیر کا مطالعہ کریں تو وہاں ابوبکرؓ کی صحابیت کو خالق کائنات کی سند مل چکی ہے' کیونکہ وہاں صاحبہ کے الفاظ ہیں کہ آپؐ نے اپنے صاحب کو کہا اور وہ صاحب بلاشرکت غیرے ابوبکر ہی تھے۔ ابوبکرؓ کی یہ وہ فضیلت ہے کہ حضرت عمر اپنی تمام زندگی کی نیکیوں کے بدلے میں حضرت ابوبکر کی اس رات کا اجر لینے کے خواہش مند تھے۔ (بحوالہ معارف الحدیث' جلد ہشتم' ص ۲۲۸' حدیث ۱۴۴)

عشرۂ مبشرہ میں حضرت ابوبکر کا نام سب سے اوپر ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''جبریل امین میرے پاس آئے' میرا ہاتھ پکڑا اور مجھے جنت کا وہ دروازہ دکھلایا جس سے میری اُمت جنت میں داخل ہو گی''۔ (یہ سن کر) ابوبکرؓ نے عرض کیا: حضورؐ! میرے دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ میں بھی اس وقت حضورؐ کے ساتھ ہوتا اور میں بھی اس دروازہ کو دیکھتا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ''ابوبکر! تم کو معلوم ہونا چاہیے کہ میری اُمت میں سب سے پہلے تم جنت میں داخل ہو گے''۔ (سنن ابی داؤد) ہو سکتا ہے جبریلؑ کی یہ آمد شب

معراج میں ہو یا کسی اور وقت معراج کی طرح کا یہ ملااعلیٰ کا سفر ہو یا کشف کے طور پر جبریل سے آپؐ کی ملاقات ہوئی ہو۔ تاہم جب ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ بات سنی تو خواہش ظاہر کی کہ کاش میں بھی اس وقت آپ کے ساتھ ہوتا اور جنت کا وہ دروازہ دیکھ لیتا۔ اس کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو وہ خوشخبری سنائی جو اس حدیث میں مذکور ہے' یعنی ابوبکر! سن رکھو میری اُمت میں سے سب سے پہلے تم جنت میں داخل ہو گے۔

ہجرتِ مدینہ کے بعد جب غزوات کا سلسلہ شروع ہوا تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ان سب لڑائیوں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مشیر اور ہم رکاب رہے۔ غزوۂ بدر حق و باطل کے درمیان پہلا فیصلہ کن معرکہ تھا۔ اس غزوہ میں ابوبکر تیغ بکف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر مامور رہے' جو بھی بری نیت سے آپؐ کی طرف آتا ابوبکر رضی اللہ عنہ کمالِ شجاعت سے اسے بھگا دیتے۔ (زرقانی' جلد ۱)

اس معرکے میں مسلمانوں کو قلیل تعداد اور بے سروسامانی کے باوجود فتح مبین حاصل ہوئی۔ مالِ غنیمت کے علاوہ تقریباً ستر قیدی مسلمانوں کے ہاتھ آئے۔ آپؐ نے صحابہؓ کے ساتھ مشورہ کیا تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے یہ تھی کہ یہ سب اپنے ہی بھائی بند ہیں' ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کرنا چاہیے اور فدیہ کی ادائیگی کی شرط پر ان کو آزاد کر دینا چاہیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی یہی رائے تھی۔ (صحیح مسلم) چنانچہ اسی رائے کے مطابق عمل کیا گیا۔ (اگرچہ اللہ تعالیٰ کے ہاں پسندیدہ تر رائے عمر فاروق کی تھی کہ ان سب کو تہہ تیغ کرنا چاہیے تاکہ کفار پر اسلام کی دھاک بیٹھ جائے اور وہ آئندہ کے لیے کبھی مقابلے کی جرأت نہ کریں۔ تاہم ابوبکر صدیق کی رائے وہی تھی جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تھی۔ بحوالہ سورۃ الانفال: ۶۸)

جنگ اُحد میں ابتدائی ہزیمت کے بعد جب مجاہدین دوبارہ صف آرا ہوئے اور کفارِ مکہ بھاگ کھڑے ہوئے تو جس جماعت نے ان کا تعاقب کیا اس میں ابوبکر بھی شامل تھے۔ (بخاری) اس طرح بعد میں ہونے والے تمام غزوات میں آپ شریک ہو کر دادِ شجاعت دیتے رہے۔

چھ ہجری میں غزوۂ بنی مصطلق پیش آیا۔اس میں ابوبکرؓ رسول اللہ ﷺ کے ہمرکاب تھے۔ واپسی پر مجاہدین شب کے وقت مدینہ کے قریب اترے۔ اُمّ المؤمنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا اس سفر میں آپؐ کے ساتھ تھیں۔صبح جب وہاں سے کوچ کیا تو اُمّ المؤمنین باہر گئی ہوئی تھیں۔ واپس آئیں تو لشکر کوچ کر چکا تھا۔ چنانچہ پریشان اور غمگین پڑاؤ کی جگہ پر لیٹ گئیں۔حضرت صفوان بن معطل رضی اللہ عنہ عمر رسیدہ صحابی تھے جو کوچ کے بعد قیام گاہ کا جائزہ لے کر سب سے آخر میں روانہ ہوتے تھے۔انہوں نے جب اُمّ المؤمنینؓ کو دیکھا تو احترام کے ساتھ اونٹ پر سوار کر کے انہیں مدینہ لے آئے۔منافقین تو ہمہ وقت فتنہ پردازی کے لیے تیار رہتے تھے۔چنانچہ اس واقعہ کو بھی انہوں نے غلط رنگ میں اچھالا۔حضرت عائشہ اور ابوبکر رضی اللہ عنہما دونوں کو رسول اللہ ﷺ کے ہاں غیر معمولی تقرب تھا چنانچہ رشک کی وجہ سے بعض مسلمانوں کو بھی زبان کھولنے کی ہمت ہوگئی۔غضب یہ ہوا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ایک عزیز مسطحؓ بن اثاثہ جس کی آپ کفالت کرتے تھے وہ بھی اس سازش میں منافقین کا ہمنوا ہوگیا۔اس بات پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سخت افسوس ہوا۔اس واقعہ کی حقیقت سورۃ النور کے دوسرے رکوع میں بایں الفاظ بیان کر کے اس کو بہتان عظیم قرار دیا گیا:

''جن لوگوں نے (حضرت عائشہ پر) تہمت لگائی وہ تمہاری ہی جماعت سے ہیں۔اس کو تم اپنے لیے شر نہ سمجھو بلکہ وہ تمہارے لیے خیر ہے۔ان میں ہر شریک گناہ کو بقدرِ شرکت سزا ملے گی'اور ان میں سے جس نے بہت زیادتی کی ہے اس پر سخت عذاب ہوگا...... جب تم نے یہ بات سنی تھی تو تم نے یوں کیوں نہ کہہ دیا کہ ہم اس لائق نہیں کہ ایسی بات زبان پر لائیں۔اللہ پاک ہے'یہ تو بڑا بہتان ہے''۔

چنانچہ جب آسمانوں سے بھی حضرت عائشہؓ پر الزام کو بہتانِ عظیم کہہ دیا گیا تو حضرت ابوبکرؓ کو مسطحؓ پر ناراضی ہوئی اور انہوں نے اس کی کفالت سے ہاتھ کھینچ لیا۔اس پر یہ آیات نازل ہوگئیں:

﴿وَلَا يَأْتَلِ أُولُوا الْفَضْلِ مِنكُمْ وَالسَّعَةِ أَن يُؤْتُوا أُولِي الْقُرْبَىٰ وَالْمَسَاكِينَ وَالْمُهَاجِرِينَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۖ وَلْيَعْفُوا وَلْيَصْفَحُوا ۗ أَلَا تُحِبُّونَ أَن يَغْفِرَ

اللّٰهُ لَكُمْ ۚ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۲﴾ (النور)

''تم میں فضیلت والے اور صاحب حیثیت لوگ رشتہ داروں' مسکینوں اور مہاجرین فی سبیل اللہ کو نہ دینے کی قسم نہ کھائیں' اور چاہیے کہ انہیں معاف کر دیں اور ان سے درگزر کریں' کیا تم یہ نہیں چاہتے کہ اللہ تم کو بخش دے؟ اور اللہ بڑا بخشنے والا رحمت والا ہے''۔

اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اللہ تعالیٰ سے بخشش مانگی اور مسطح ؓ کی کفالت خوشدلی کے ساتھ بحال کر دی۔ ان آیات میں جہاں ابوبکر رضی اللہ عنہ کو صاحب مال کہا گیا ہے وہاں انہیں صاحب فضیلت بھی تسلیم کیا گیا ہے اور خالق کائنات کی طرف سے ان کے حق میں یہ بہت بڑا اعزاز ہے۔

۷ھ میں خیبر پر فوج کشی ہوئی۔ اس مہم پر ابوبکر رضی اللہ عنہ کو سپہ سالار مقرر کیا گیا تھا مگر کامیابی نہ ہو سکی۔ بعد ازاں خیبر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں فتح ہوا۔ (صحیح مسلم)

قریش نے عہد شکنی کرتے ہوئے صلح حدیبیہ کا معاہدہ توڑا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دس ہزار کے لشکر کے ساتھ مکہ روانہ ہوئے۔ مسلمان بڑے عزت و وقار کے ساتھ مکہ میں داخل ہوئے۔ حضرت ابوبکرؓ بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ اسی موقع پر ابوبکرؓ نے اپنے ضعیف العمر باپ ابوقحافہ کو حضور کی خدمت میں حاضر کیا۔ آپؐ نے فرمایا: ان کو کیوں تکلیف دی ہے' میں خود ان کے پاس چلا جاتا۔ پھر آپؐ نے ان کے سینہ پر ہاتھ پھیرا اور مشرف بہ اسلام کیا۔ (اصابہ)

رجب ۹ھ میں حالات کا تقاضا ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم تبوک کا قصد کریں۔ یہ زمانہ عسرت اور تنگ حالی کا تھا۔ جنگی تیاری کے سلسلہ میں آپؐ نے انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی۔ تمام صحابہؓ نے حسب توفیق حصہ لیا۔ مگر تاریخ کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ اپنے گھر کا تمام اثاثہ لے کر حاضر ہو گئے۔ جب آپؓ سے پوچھا گیا کہ اہل و عیال کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو تو عرض کی کہ ان کے لیے اللہ اور اس کا رسول کافی ہے۔ (سنن ابی داؤد' ج ۱' ص ۲۰)

۹ھ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر مکہ روانہ کیا۔ بعدازاں سورۃ التوبۃ کی آیات نازل ہوئیں جن میں مشرکین سے ان الفاظ میں اظہارِ براءت کیا گیا تھا:

﴿یٰٓاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِکُوْنَ نَجَسٌ فَلَا یَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِھِمْ ھٰذَا ۚ﴾ (التوبۃ:۲۸)

''اے اہل ایمان! مشرک تو پلید ہیں' پس اب وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے نزدیک نہ آنے پائیں''۔

چنانچہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مکہ روانہ کیا تاکہ وہ حج کے موقع پر یہ اعلانِ عام کر دیں۔ جب حضرت علیؓ مکہ پہنچے تو حضرت ابو بکرؓ نے اُن سے پوچھا کہ کیا آپ کو امیر حج بنا کر بھیجا گیا ہے تو انہوں نے جواب دیا نہیں! امیر حج تو آپ ہی ہیں' میں تو حج کے موقع پر یہ اعلان کرنے کے لیے بھیجا گیا ہوں کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک مسجد حرام کے قریب نہ آئے۔

۱۰ھ میں رسول اللہ ﷺ ہزاروں کی تعداد میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ حجۃ الوداع کے لیے تشریف لے گئے۔ حج کے بعد واپس مدینہ منورہ تشریف لائے تو ایک مفصل خطبہ دیا جس میں آپؐ کے وصال کی طرف اشارہ تھا۔ حضرت ابو بکرؓ حقیقت حال تک پہنچ گئے اور رونے لگے جبکہ دوسرے لوگ حضرت ابو بکرؓ کے آنسو بہانے پر متعجب ہوئے اور وصال کا اشارہ نہ سمجھ پائے۔ اس خطبے کے بعد رسول اللہ ﷺ بیمار ہو گئے۔ بیماری بڑھتی گئی اور آپؐ اب مسجد بھی نہ جا سکتے تھے۔ چنانچہ حکم دیا گیا کہ ابو بکر صدیقؓ نماز پڑھائیں۔ (بخاری) حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے تعمیل ارشاد میں نماز پڑھائی۔ آپؓ نے رسول اللہ ﷺ کی مرضِ وفات میں سترہ نمازوں کی امامت کی۔ پیر کے دن رسول اللہ ﷺ نے وفات پائی۔ لوگوں کا ہجوم فرطِ غم سے اوسان کھو رہا تھا۔ حضرت عمرؓ کا یہ حال تھا کہ رسول اللہ ﷺ کی وفات کا انکار کر رہے تھے۔ اس موقع پر حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور لوگوں سے مخاطب ہو کر کہا: ''تم میں سے جو کوئی محمد ﷺ کی عبادت کرتا تھا (وہ جان

لے کہ) وہ تو وفات پا گئے' اور تم میں سے جو کوئی اللہ کی بندگی کرتا تھا تو وہ زندہ ہے' اس کو موت نہیں ۔ پھر آپؓ نے ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ......الخ﴾ سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۴ پڑھی جس کو سن کر سب لوگوں کو آپ ﷺ کی وفات کا یقین آ گیا۔ (صحیح بخاری)
جب آپ ﷺ کی تدفین پر آراء میں اختلاف ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے فرمانِ رسول کا حوالہ دے کر فرمایا کہ انبیاءؑ وہیں دفن ہوتے ہیں جہاں ان کی وفات ہوتی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ کو اُمّ المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے حجرے میں دفن کیا گیا جہاں آپ فوت ہوئے تھے۔ (موطا امام مالک)

اب خلیفہ کے انتخاب کے مرحلے پر مختلف آراء سامنے آئیں اور فیصلہ کرنا مشکل ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ آگے بڑھے اور ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں ہاتھ دیتے ہوئے کہا کہ آپ ہمارے سردار اور ہم لوگوں میں سب سے بہتر ہیں۔ رسول اللہ ﷺ آپ کو سب سے زیادہ عزیز رکھتے تھے۔ (بخاری) چنانچہ لوگوں نے آپ کی بیعت کر لی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور چند دوسرے اصحابؓ نے بوجوہ فوری بیعت تو نہ کی البتہ آپؓ کے ساتھ تعاون کیا۔ (طبقات ابن سعد) چھ ماہ بعد حضرت علیؓ نے بھی حضرت ابوبکرؓ کی بیعت کر لی۔ (صحیح بخاری) اور تعاون جاری رکھا۔

خلافت کی ذمہ داری سنبھالتے ہی مشکلات اور خطرات کا طوفان آ گیا۔ مدعیانِ نبوت اٹھ کھڑے ہوئے۔ مرتدین نے مسائل کھڑے کر دیے اور منکرین زکوٰۃ نے بھی سر اٹھایا' مگر اس موقع پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کمال ثابت قدمی اور پامردی کا مظاہرہ کیا۔ جس لشکر کو رسول اللہ ﷺ نے اپنی حینِ حیات شام پر حملہ کا حکم دیا تھا' اُس کی روانگی کے بارے میں تشویش ہوئی اور مختلف آراء سامنے آئیں تو آپؓ نے فرمایا: ''خدا کی قسم! اگر مدینہ منورہ اس طرح آدمیوں سے خالی ہو جائے کہ درندے آ کر میری ٹانگیں کھینچنے لگیں تب بھی میں اس مہم کو نہیں روک سکتا'' (تاریخ الخلفاء) چنانچہ حضرت اسامہ بن زید رضی اللہ عنہما کی سرکردگی میں یہ لشکر روانہ ہوا اور چالیس دن کے بعد کامیاب و کامران واپس لوٹا۔
آپ نے مرتدین اور نبوت کے جھوٹے دعویداروں کی شورشوں کو بڑی دانائی اور

حکمت عملی سے دبایا۔ رائے عامہ کے خلاف منکرین زکوٰۃ کے ساتھ اس انداز میں کارروائی کی کہ وہ خود زکوٰۃ لے کر بارگاہِ خلافت میں حاضر ہو گئے۔ (صحیح بخاری)

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی وحی نبوت کا سلسلہ ختم ہوا۔ قرآن مجید کے اجزاء متفرق تھے۔ آیات اور سور کی ترتیب آپ ﷺ نے بتا دی تھی' تاہم کسی کے پاس مکمل نسخہ موجود نہ تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے حکم سے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے قرآن کے متفرق اجزاء کو کتاب کی صورت میں مدوّن کر دیا۔ پھر اس نسخے کو محفوظ کر لیا گیا' یہاں تک کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد خلافت میں اس سے نقل کر کے متعدد نسخے تیار کیے اور دوسرے شہروں میں بھیج دیے۔ (صحیح بخاری) اس طرح حضرت ابوبکرؓ ہی جامع القرآن تھے۔

شام پر رومی اور ایران پر کیانی خاندان کی حکومت تھی۔ یہ حکومتیں اس وقت کی سپر پاور تھیں۔ لہٰذا وہ عربوں کو خاطر میں نہ لاتے تھے اور ان کو اپنا باجگزار بنانا چاہتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے جزیرہ نمائے عرب تک اسلام کا غلبہ حاصل کر لیا تو بادشاہوں کو دعوتِ اسلام کے خطوط بھیجے۔ پھر جلد ہی آپ کی رحلت ہو گئی تو خلیفہ اوّل نے عراق اور شام کے خلاف لشکر بھیجے' جس کے نتیجہ میں کامیابیاں بھی ہوئیں اور کثیر تعداد میں مال غنیمت بھی ہاتھ لگا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے سوا دو سال بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی زندگی کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ مسلسل پندرہ دن تک شدید بخار میں مبتلا رہے۔ مسجد میں جانے سے معذور ہوئے تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ نماز پڑھائیں۔ پھر ساتھیوں سے مشورہ کر کے حضرت عمرؓ کے لیے جانشینی کا پروانہ لکھوا دیا۔ وفات سے قبل وصیت کی کہ مجھے پرانے کپڑوں کا کفن دینا۔ پوچھا گیا تو فرمایا: ''زندہ لوگ مردوں کی بہ نسبت نئے کپڑوں کے زیادہ مستحق ہیں''۔ پیر کے روز تریسٹھ سال کی (مسنون) عمر میں جان جان آفریں کے سپرد کر دی۔ (طبقات ابن سعد) نماز جنازہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے پڑھائی اور رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن ہو کر یارِ غار نے رسول اللہ ﷺ کی دائمی رفاقت حاصل کر لی۔

۞ ۞ ۞

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کی سیرت وکردار

قرآن وحدیث اور تاریخ کی روشنی میں

نام عمرؓ کنیت ابوحفص اور لقب فاروق ۔ والد کا نام خطاب تھا۔ آٹھویں پشت میں آپ کا سلسلۂ نسب رسول اللہ ﷺ سے جا ملتا ہے۔ آپؐ رسول اللہ ﷺ سے عمر میں ۱۳ سال چھوٹے تھے۔ عرب میں رائج شریفانہ مشاغل مثلاً نسب دانی' پہلوانی اور خطابت میں نام پیدا کیا۔ اس ماحول میں پڑھنے لکھنے کا رواج کم تھا مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان چند لوگوں میں شمار ہوتے تھے جو لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ بڑے ہوئے تو تجارت کا پیشہ اختیار کیا اور اس سلسلہ میں دور دراز کے سفر بھی کیے۔

عمر اپنے ڈھب پر زندگی گزار رہے تھے۔ جب اُن کی عمر ۲۷ سال کی ہوئی تو مکہ میں رسول اللہ ﷺ اسلام کی تبلیغ کا آغاز کر چکے تھے اور چند لوگ اسلام میں داخل بھی ہو چکے تھے۔ عمر نے اس طرف توجہ کی تو غضبناک ہوئے۔ ابتدا میں جو لونڈی غلام اسلام میں داخل ہوئے ان کو زدوکوب کرنے سے بھی گریز نہ کرتے' مگر کسی شخص کو بھی ان کی سختی اسلام سے بددل نہ کر سکی۔

عمر بااثر شخصیت کے مالک تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے ان کے اسلام لانے کی دعا کی۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے دعا کی:

((اَللّٰهُمَّ اَعِزَّ الْاِسْلَامَ بِاَحَبِّ هٰذَيْنِ الرَّجُلَيْنِ اِلَيْكَ بِاَبِيْ جَهْلٍ اَوْ بِعُمَرَ ابْنِ الْخَطَّابِ)) قَالَ وَكَانَ اَحَبُّهُمَا اِلَيْهِ عُمَرُ)) (۱)

''اے اللہ اسلام کو عزت اور قوت عطا فرما ان دو آدمیوں ابوجہل اور عمر بن خطاب میں سے کسی ایک کے ذریعہ سے جو تیرے نزدیک زیادہ پسندیدہ ہے''۔ (تو ان دونوں میں عمرؓ اللہ کے ہاں زیادہ پسندیدہ تھے (جنہیں اللہ نے

ہدایت عطا فرما دی)۔''

ہوا یوں کہ ابوجہل نے اعلان کیا کہ جو شخص محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کر دے اسے سو اونٹنیاں اور ایک ہزار اوقیہ چاندی انعام میں دی جائے گی۔ عمر نے ابوجہل سے بات کر لی اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کے ارادے سے تلوار لے کر چل پڑے۔ راستے میں اتفاقاً نعیم بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوگئی۔ وہ پوچھنے لگے اس طیش میں کدھر جا رہے ہو؟ عمر نے جواب دیا محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ نعیم نے کہا عمر! کچھ خبر بھی ہے تمہاری بہن اور بہنوئی اسلام قبول کر چکے ہیں۔ اس پر رُک گئے اور بہن کے گھر پہنچے۔ بہن اُس وقت سورۂ طٰہٰ کی آیات تلاوت کر رہی تھی۔ عمر نے دروازے کے باہر سے آواز سن لی۔ دروازہ کھلوایا تو پوچھا تم کیا پڑھ رہی تھی؟ بہن نے جواب دیا ہم نے اسلام قبول کر لیا ہے۔ اس پر عمر غصے سے لال پیلے ہو گئے۔ عمر نے اپنے بہنوئی کو مارنا شروع کیا۔ جب بہن بچانے کے لیے آگے بڑھی تو اس پر بھی ہاتھ اٹھایا۔ بہن نے کہا عمر کچھ بھی کر لو اب ہم اسلام کو چھوڑنے والے نہیں۔ بہن کے منہ سے یہ الفاظ سن کر اور اس کے جسم سے خون بہتا ہوا دیکھ کر عمر کا دل پسیج گیا۔ کہنے لگے تم لوگ جو پڑھ رہے تھے مجھے بھی سناؤ۔ چنانچہ انہوں نے سورۂ طٰہٰ کی تلاوت شروع کی۔ جب یہ آیت تلاوت کی ﴿اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۭ لَهُ الْاَسْمَاۗءُ الْحُسْنٰى ⑧﴾ تو عمر کی دنیا بدل گئی۔ دل نے حق کو پہچان لیا۔ بول اٹھے کہ بلاشبہ عبادت کے لائق فقط اللہ ہی ہے۔ اُسی وقت کلمۂ شہادت پڑھ کر حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔

نمی دانی کہ سوزِ قرأتِ تو
دگرگوں کرد تقدیرِ عمرؓ را

رات وہیں گزاری اور صبح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر ہو کر اپنے اسلام کا اعلان کیا۔ پھر کہا کہ ہم لات اور عزیٰ کی پرستش وادیوں کے نشیب و فراز میں کرتے تھے اور کیا اللہ کی عبادت ہم چھپ کر کریں گے؟ ایسا نہیں ہوگا' بلکہ آج سے ہم خانہ کعبہ کے صحن میں نماز ادا کریں گے۔ چنانچہ یہ پہلا موقع تھا کہ مسلمانوں نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے

ساتھ مل کر خانہ کعبہ میں علی الا علان نماز پڑھی ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ خدا کی قسم عمرؓ کے اسلام لانے سے پہلے ہماری طاقت نہ تھی کہ ہم بیت اللہ کے قریب علانیہ نماز پڑھ سکیں ۔ (معارف الحدیث' جلد ۸) اسی موقع پر رسول اللہ ﷺ نے وفورِ انبساط کے ساتھ عمر رضی اللہ عنہ کو 'فاروق'' کے لقب سے نوازا۔ یہ واقعہ ۷ نبوی کا ہے۔

۱۳ نبوی میں جب مسلمانوں کو مکہ سے مدینہ ہجرت کر جانے کی اجازت ملی تو حضرت عمرؓ بھی رسول اللہ ﷺ کی اجازت کے ساتھ عازمِ مدینہ ہوئے۔ پہلے حرم کعبہ میں داخل ہو کر طواف کیا اور نماز پڑھی' پھر اعلانیہ ہجرت کے سفر کا آغاز کرتے ہوئے مشرکین مکہ سے کہا کہ جس کو مقابلہ کرنا ہو وہ مکہ سے باہر نکل کر میرا راستہ روکے ۔ مگر کسی کو ہمت نہ ہوئی ۔ (زرقانی' ج ا' ص ۳۷۱) مدینہ پہنچ کر حضرت عمرؓ عوالی (قبا) میں رفاعہ بن منذر کے ہاں ٹھہرے۔ بعد ازاں رسول اللہ ﷺ خود بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی معیت میں ہجرت کر کے مدینہ پہنچ گئے ۔ مدینہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے غریب الوطن مہاجرین کی آبادکاری کے سلسلہ میں مواخات کا بے نظیر و بے عدیل انتظام فرمایا۔ ہر مہاجر کو اس کے ہم رتبہ و ہم حیثیت انصاری کا بھائی بنا دیا گیا ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلامی بھائی عتبان بن مالکؓ قرار پائے جو قبیلہ بنی سالم کے معزز رئیس تھے۔

مدینہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے نماز باجماعت ادا کرنے کے لیے مسجد بنائی ۔ اب ضرورت محسوس ہوئی کہ کس طرح لوگوں کو جماعت کا وقت قریب ہونے کی اطلاع دی جائے ۔ اس بارے میں رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ فرمایا تو مختلف آراء سامنے آئیں' مگر آپؐ نے کسی کو پسند نہ فرمایا۔ حضرت عبداللہ بن زید رضی اللہ عنہ نے خواب میں دیکھا کہ کوئی شخص انہیں اذان کے کلمات سکھا رہا ہے۔ چنانچہ صبح ہوئی تو انہوں نے وہ کلمات رسول اللہ ﷺ کو بتائے ۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا یہ سچا خواب ہے۔ پھر آپ ﷺ نے بلال رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ انہی کلمات کو پکار کر اذان دیں ۔ عمرؓ بن خطاب نے جب اذان کے الفاظ سنے تو باہر نکل کر رسول اللہ ﷺ کے پاس آئے اور کہنے لگے قسم اُس ذات پاک کی جس نے آپؐ کو دین حق کے ساتھ مبعوث فرمایا ہے'

میں نے ویسا ہی خواب دیکھا ہے جیسا عبداللہ بن زید نے دیکھا ہے۔تو رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: فللّٰه الحمد[2] اذان کے وہی الفاظ اب ہر نماز کے وقت بلند آواز میں پکارے جاتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے کچھ بندے ایسے پاک باز' متقی اور صاف باطن ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اُن کے قلوب کو الہامی تعلیمات کے ساتھ نوازتا ہے۔ایسی تقویٰ شعار ہستیاں ہر اُمت میں موجود رہی ہیں اور رسول اللہ ﷺ کی اُمت کے ایسے افراد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی شخصیت کو ممتاز مقام حاصل ہے۔آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم سے پہلی اُمتوں میں محدث یعنی ایسے لوگ ہوتے تھے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے الہام کی نعمت سے خاص طور پر نوازے جاتے تھے۔تو اگر میری اُمت میں سے کسی کو اس نعمت سے خاص طور پر نوازا گیا تو وہ عمر ہیں''۔[3]

آپ رضی اللہ عنہ کی اسی خصوصیت کا نتیجہ ہے کہ کئی مقامات پر حق تعالیٰ کی طرف سے آپ کے ذہن میں وہ باتیں ڈالی گئیں جن کی موافقت میں وحی نازل ہوئی اور وہ آیات قرآن پاک کا حصہ بن گئیں۔حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ:

> وَافَقْتُ رَبِّیْ فِیْ ثَلَاثٍ: فِیْ مَقَامِ اِبْرَاهِیْمَ وَفِی الْحِجَابِ وَفِیْ اُسَارٰی بَدْرٍ[4]
>
> ''میں نے تین باتوں میں اپنے پروردگار سے موافقت کی (یعنی میری رائے وہ ہوئی جو ربّ العالمین کا حکم آنے والا تھا): مقامِ ابراہیم کے بارے میں اور پردے کے مسئلہ میں اور غزوۂ بدر کے قیدیوں کے سلسلہ میں''۔

مقامِ ابراہیم سفید رنگ کا ایک پتھر ہے جس پر کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خانہ کعبہ کی تعمیر کی تھی۔معجزانہ طور پر اس پتھر میں ابراہیم علیہ السلام کے پاؤں کے نشانات نمایاں ہو گئے۔یہ پتھر خانہ کعبہ کے پاس پڑا رہتا تھا۔اس پتھر کی فضیلت کے پیش نظر حضرت عمر کی خواہش ہوئی کہ کاش یہاں نماز ادا کرنے کا حکم دیا جائے۔چنانچہ سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۲۵ نازل ہوگئی: ﴿وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّی﴾ ''اور مقامِ ابراہیم کو نماز کی جگہ بنالیا کرو''۔رسول اللہ ﷺ کی ہدایت کے مطابق طوافِ کعبہ کے بعد مقامِ

ابراہیم پر دو رکعتیں پڑھی جاتی ہیں۔ تاہم یہ ایک مستحب عمل ہے' یعنی اگر آسانی سے مقام ابراہیم کے قریب نماز پڑھی جا سکے تو فبہا' ورنہ مسجد حرام میں یہ نماز جہاں جگہ ملے پڑھی جا سکتی ہے۔

رسول اللہ ﷺ کے گھروں میں آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا بضرورت آنا جانا رہتا تھا۔ پردے کی پابندی کا حکم نہ تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو یہ بات پسند نہ تھی۔ ان کی خواہش تھی کہ ازواجِ مطہرات رضی اللہ عنہن پردہ کیا کریں۔ چنانچہ سورۃ الاحزاب کی آیات نازل ہو گئیں' جن میں ازواج النبی اور مسلمان خواتین کو حکم دیا گیا کہ وہ پردے کی پابندی کیا کریں۔

جنگ بدر کفر اور اسلام کے درمیان پہلی جنگ تھی۔ اس میں کفار کے آدمی قیدی بن کر مسلمانوں کے ہاتھ لگے۔ چونکہ ابھی اس ضمن میں اللہ کا حکم نہ پہنچا تھا اس لیے رسول اللہ ﷺ نے صحابہ کرامؓ سے مشورہ کیا۔ بعض نے مشورہ دیا کہ اُن کے ساتھ حسن سلوک کرتے ہوئے انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور خود رسول اللہ ﷺ کی بھی یہی رائے تھی۔ مگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا کہنا تھا کہ ان سب کو قتل کر دیا جائے تاکہ نہ صرف ان اَشرار کا خاتمہ ہو جائے بلکہ مسلمانوں کا رعب کفار پر چھا جائے اور وہ آئندہ کبھی مقابلے پر آنے کی جرأت نہ کریں۔ اس موقع پر عمل پہلی رائے پر کیا گیا مگر بعد ازاں سورۃ الانفال کی آیات ۶۷' ۶۸ نازل ہوئیں جن میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے کی تصویب کی گئی۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا مزاج قبولِ اسلام کے بعد مکمل طور پر تبدیل ہو گیا تھا اور وہ پورے طور پر اسلامیت میں رنگے گئے تھے۔ ان کے خیالات پر صبغۃ اللہ غالب آ گیا تھا۔ وہ سراپا اسلام ہو گئے' ان کی زبان حق کی ترجمان ہو گئی۔ ان کے بارے میں رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ جَعَلَ الْحَقَّ عَلٰى لِسَانِ عُمَرَ وَقَلْبِهٖ)) (۵)

''اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان اور اس کے دل میں حق رکھ دیا ہے''۔

اسی طرح ایک اور موقع پر نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

''اللہ تعالیٰ نے عمر کی زبان پر حق رکھ دیا ہے جس کا وہ اظہار کرتے ہیں''۔ (۶)

گویا حق گوئی ان کا طرۂ امتیاز تھا' مگر کبھی کبھی اجتہادی خطا آپؓ سے بھی ہوئی ہے' کیونکہ اجتہادی خطا سے کوئی فردِ بشر مبرا نہیں۔ مجموعی طور پر آپؓ نے جس معاملے کو حق سمجھا وہ حق ہی ہوتا تھا۔ یہ خوبی آپؓ کی امتیازی خصوصیت تھی۔ حضرت عمر فاروق کو ۱۶سال تک رسول اللہ ﷺ کی صحبت نصیب ہوئی۔ اس عرصہ میں آپ کو رسول اللہ ﷺ کی اس قدر قربت حاصل ہوئی کہ آپؓ مزاج شناسِ رسالت ہو گئے۔ یہاں تک کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((لَوْ كَانَ بَعْدِیْ نَبِيًّا لَكَانَ عُمَرُ)) (۷)

''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمر بن خطاب ہوتے''۔

عربوں میں لکھنے پڑھنے کا رواج نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے جب نبوت کا اعلان کیا اُس وقت قریش میں صرف سترہ آدمی خواندہ تھے۔ ان خواندہ لوگوں میں حضرت عمر بھی تھے۔ بعد ازاں انہوں نے عبرانی زبان بھی سیکھ لی تھی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی علمیت کا خود رسول اللہ ﷺ نے اعتراف کیا ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''میں سو رہا تھا' اسی حال میں میرے پاس دودھ کا بھرا ہوا پیالہ لایا گیا۔ میں نے خوب سیر ہو کر پیا' یہاں تک کہ میں نے سیرابی کا اثر اپنے ناخنوں تک محسوس کیا۔ پھر میں نے وہ دودھ جو میرے پینے سے بچ گیا تھا عمر بن خطابؓ کو دے دیا کہ وہ اس کو پی لیں''۔ بعض صحابہؓ نے پوچھا اے اللہ کے رسول! آپؐ نے اس کی تعبیر کیا بتائی؟ آپؐ نے فرمایا ''علم''۔ (۸)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مختلف درجات و فضائل کے افراد تھے۔ کچھ مقام و مرتبہ کے لحاظ سے دوسروں کی نسبت بلند تھے۔ دین کی سمجھ بوجھ ان میں زیادہ تھی۔ پھر وہ دین کے احکام پر پختگی کے ساتھ عمل پیرا تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ دین کا فہم رکھنے والے ممتاز صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں شامل تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میں نے سوتے میں خواب دیکھا کہ لوگوں کو میرے سامنے لایا جاتا ہے اور اُن سب نے کرتے پہن رکھے ہیں۔ ان میں سے بعض کے کرتے صرف سینے تک ہیں اور کچھ ایسے ہیں جن کے کرتے سینے سے کچھ نیچے تک ہیں۔ اسی اثنا میں عمر بن خطاب بھی میرے سامنے لائے گئے۔ ان کا کرتہ اتنا لمبا

تھا کہ زمین کے ساتھ لگ رہا تھا اور وہ اس کو زمین پر گھسیٹ کر چل رہے تھے۔ بعض صحابہ نے پوچھا حضور ﷺ! آپؐ نے اس کی کیا تعبیر دی؟ آپؐ نے فرمایا: ''دین''۔(۹)

گویا حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا فہم دین باقی لوگوں کی نسبت بہت زیادہ تھا۔ لباس جسم کو گرمی سردی سے بچاتا اور حفاظت کرتا ہے۔ دین جسم کا روحانی لباس ہے جو اُس کو عذاب سے بچاتا اور وسیلہ نجات بنتا ہے۔ پس حضرت عمرؓ کے لباس کی وسعت کی تعبیر یہ بتائی گئی کہ وہ دین میں مضبوط اور روحانی طور پر بلند مرتبے پر فائز ہیں۔

مشرکین مکہ اور مسلمانوں کے درمیان پہلا قابل ذکر تصادم بدر کے میدان میں ہوا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس موقع پر رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رہے۔ جنگ میں بھرپور حصہ لیا۔ ان کا ماموں دشمن اسلام عاص بن ہشام ان کی تلوار کی زد میں آیا تو انہوں نے اسے جہنم واصل کیا اور عملاً ثابت کر دیا کہ اسلام کے مقابلہ میں قرابت داری کی کوئی حیثیت نہیں۔ اس جنگ میں کفار کے ستر آدمی مارے گئے اور ستر قیدی بنے۔ قیدیوں کے بارے میں مشورہ ہوا تو حضرت عمرؓ کے مشورے کی تائید میں قرآنی آیات نازل ہو گئیں جن کی تفصیل پیچھے گزر چکی۔

۳ ہجری میں جنگ اُحد ہوئی۔ ابتدا میں مسلمانوں کو فتح حاصل ہوئی۔ پھر جب درے پر مامور صحابہؓ کی غلطی کی بنا پر دشمن کے گھڑ سواروں نے اچانک حملہ کر دیا تو مسلمانوں کے پاؤں اکھڑ گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے دندانِ مبارک شہید ہو گئے اور آپؐ ایک گڑھے میں گر کر لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہو گئے۔ اس پر ابوسفیان نے بلند آواز لگائی کہ رسول اللہ ﷺ اپنے ساتھیوں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما سمیت شہید ہو گئے ہیں۔ اس پر حضرت عمرؓ نے بلند آواز میں جواب دیا کہ اے دشمن خدا! ہم سب زندہ ہیں۔ غزوۂ اُحد کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی صاحبزادی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کا نکاح رسول اللہ ﷺ کے ساتھ ہوا۔

۴ ہجری میں جب بنونضیر کو اُن کی بدعہدی کی وجہ سے مدینہ سے جلاوطن کیا گیا تو اس واقعے میں بھی حضرت عمر شریک تھے۔ ۵ ہجری میں غزوۂ خندق میں بھی حضرت عمر شریک تھے اور خندق کے ایک حصے کی حفاظت پر مامور تھے۔ ۶ ھ میں صلح حدیبیہ کا واقعہ

پیش آیا۔ رسول اللہ ﷺ اپنے اصحاب کے ساتھ عمرہ کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ مکہ سے دو منزل دور تھے کہ اطلاع ملی کہ قریش مسلمانوں کو مکہ میں داخل نہیں ہونے دیں گے۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو مکہ بھیجا گیا۔ بعدازاں شرائط معاہدہ طے ہوئیں تو ایسا لگتا تھا کہ مسلمان دب کر صلح کر رہے ہیں۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو سخت اضطراب ہوا اور انہوں نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ سوال جواب کیے۔ اندازِ گفتگو سے سوءِ ادب کا پہلو نکلتا تھا۔ چنانچہ بعدازاں ندامت محسوس کی اور کفارے کے طور پر روزے رکھے، نفل پڑھے، خیرات کی اور غلام آزاد کیے۔

جنگ تبوک کے موقع پر جب رسول اللہ ﷺ نے انفاق فی سبیل اللہ کی ترغیب دی تو حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بڑی مقدار میں مال لے آئے۔ رسول اللہ ﷺ نے دریافت فرمایا: ''اہل وعیال کے لیے کیا چھوڑ آئے ہو؟'' اس پر حضرت عمرؓ نے جواب دیا کہ جتنا لے کر آیا ہوں اتنا ہی اہل وعیال کے لیے چھوڑ آیا ہوں۔ (۱۰) گویا آپؓ نے گھر کے کل مال کا نصف لا کر رسول اللہ ﷺ کے قدموں میں ڈال دیا۔

ربیع الاول ۱۱ھ کے آغاز میں رسول اللہ ﷺ صاحب فراش ہوئے۔ ۱۲ ربیع الاول کو آپؐ کا وصال ہو گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم صدمے سے بے حال ہو رہے تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اُس وقت ہوش وحواس کھو بیٹھے اور کہنے لگے کہ جو شخص یہ کہے گا کہ رسول اللہ ﷺ وفات پا گئے میں اس کی گردن اڑا دوں گا۔ وہ تو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے جنہوں نے آ کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی تصحیح کر کے حقیقت واضح کر دی۔ رسول اللہ ﷺ کی رحلت کے بعد جب خلیفہ کے انتخاب پر اختلاف رائے ہوا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی، جس پر دوسروں نے بھی بیعت کے لیے ہاتھ بڑھا دیے''۔ (۱۱)

حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے عہد میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ ان کے دست و بازو اور مشیر رہے۔ حضرت ابوبکرؓ نے اپنے بعد خلافت کی وصیت حضرت عمر فاروق کے حق میں کر دی۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کی مدت ساڑھے دس سال رہی اور یہ سارا زمانہ عسکری کارروائیوں میں گزرا۔ اسلامی تاریخ کا یہ سنہری دور ہے جس میں اسلامی سلطنت کی

وسعت ساڑھے بائیس لاکھ مربع میل تک پہنچ گئی۔ حضرت عمرؓ کی فتوحات' اولیات' اصلاحات اور فلاحی کارناموں کی فہرست اتنی طویل ہے کہ اس مضمون میں اس کے لیے گنجائش نہیں' اس کے لیے الگ سے ایک کتاب درکار ہے۔ آپ کا اندازِ زیست' لباس اور خوراک انتہائی سادہ تھے۔ آپؓ کے کرتے میں کئی کئی پیوند لگے ہوتے تھے۔ اپنے عہدیداروں کو بھی یہی انداز اختیار کرنے کا حکم دیتے۔ خلاف ورزی پر سزا دیتے اور عہدے سے ہٹا دیتے۔ ۱۵ھ میں جب لوگوں کے وظیفے مقرر ہوئے تو آپ کا وظیفہ پانچ ہزار درہم سالانہ مقرر ہوا' اور یہی رقم ہر بدری صحابی کی تھی۔

حضرت عمرؓ فجر کی نماز پڑھانے کے لیے کھڑے ہوئے تو ایک مجوسی غلام ابولولو نے خنجر کے وار کر کے آپ کو شدید زخمی کر دیا اور پھر خودکشی کر لی۔ اس زخمی حالت میں آپؓ نے اپنے بیٹے عبداللہؓ کی وساطت سے اُمّ المؤمنین حضرت عائشہؓ سے اجازت حاصل کر لی کہ انہیں رسول اللہ ﷺ اور ابوبکر صدیقؓ کے ساتھ دفن کیا جائے۔ چنانچہ حضرت صہیبؓ نے آپؓ کی نماز جنازہ پڑھائی اور آپؓ روضۂ اقدس میں ابوبکر صدیق کے پہلو میں دفن ہوئے۔

حواشی

(۱) سنن الترمذی' ابواب المناقب' باب مناقب عمر بن الخطابؓ۔
(۲) سنن ابی داوٗد' کتاب الصلاۃ' باب بدء الاذان۔
(۳) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب مناقب عمر بن الخطاب۔
(٤) صحیح مسلم' کتاب فضائل الصحابۃ' باب من فضائل عمرؓ۔
(٥) سنن الترمذی' ابواب المناقب' باب مناقب عمرؓ۔
(٦) سنن ابی داوٗد' کتاب الخراج والامارۃ' باب فی تدوین العطاء۔
(٧) سنن الترمذی' ابواب المناقب' باب مناقب عمرؓ۔
(٨) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب مناقب عمر بن الخطابؓ۔
(٩) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب تفاضل اھل الایمان فی الاعمال۔
(١٠) سنن الترمذی' ابواب المناقب' باب فی مناقب ابی بکر وعمر کلیھما۔
(١١) صحیح البخاری' کتاب المناقب' باب لو کنت متخذًا خلیلاً۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی سیرت و کردار

قرآن وحدیث اور تاریخ کی روشنی میں

نام عثمان' کنیت ابوعبداللہ اور ابوعمر' لقب ذوالنورین۔ والد کا نام عفان تھا۔ پانچویں پشت میں آپ کا سلسلۂ نسب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جدامجد عبدمناف سے جا ملتا ہے۔حضرت عثمانؓ کے اجداد میں اُمیہ بن شمس تھے جو قریش کے سرداروں میں شمار ہوتے تھے۔ خاندان بنواُمیہ اسی اُمیہ بن شمس کی طرف منسوب ہے۔ اس خاندان کے اندر بڑے بڑے نامور لوگ پیدا ہوئے ہیں۔حضرت عثمانؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عمر میں تقریباً چھ سال چھوٹے تھے۔آپؓ مکہ کے ان چند لوگوں میں شمار ہوتے ہیں جو پڑھنا لکھنا جانتے تھے۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا اعلان کیا تو اوّلین اسلام قبول کرنے والے لوگوں میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے' جنہوں نے اپنے حلقۂ احباب میں دعوت وتبلیغ کے کام کا آغاز کردیا۔ایک روز جب حضرت عثمانؓ سے اسلام کے بارے میں بات ہورہی تھی تو وہ اس قدر متاثر ہوئے کہ قبولِ اسلام کا ارادہ کرلیا۔اسی دوران رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وہاں تشریف لے آئے اور حضرت عثمان کو دیکھ کر فرمایا: عثمان! اللہ کی جنت قبول کر' میں تیری اور تمام خلق کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہوں۔حضرت عثمانؓ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے یہ الفاظ سنے تو بے اختیار کلمہ پڑھ کر توحید اور رسالت کی گواہی دے دی۔ اس وقت بنو ہاشم اور بنواُمیہ ایک دوسرے کے حریف تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہاشمی تھے جبکہ عثمان اُموی۔مگر حضرت عثمانؓ کا دل خاندانی تعصب سے پاک تھا اس لیے انہوں نے حق کی آواز پر بلاخوف وخطر لبیک کہہ دیا اور اپنے خاندان والوں کی اذیتوں کا نشانہ بننے لگے۔لیکن کوئی سختی آپؓ کے پائے ثبات میں لغزش نہ پیدا کرسکی۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی دامادی میں قبول کرلیا اور اپنی بیٹی رقیہ رضی اللہ عنہا کا نکاح آپؓ سے

کر دیا۔ سیدہ رقیہ کا عقد پہلے ابولہب کے بیٹے عتبہ سے ہوا تھا۔ ابولہب رسول اللہ ﷺ کا سگا چچا مگر بدترین دشمن تھا' اس نے بیٹے کو مجبور کر کے بی بی رقیہ کو طلاق دلوا دی تھی۔ حضرت عثمانؓ کی خوش نصیبی کہ انہیں رسول اللہ ﷺ کی دامادی کا شرف حاصل ہو گیا۔

جب اسلام قبول کرنے والوں پر قریش کے سرداروں نے ظلم وستم کی انتہا کر دی تو رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دی۔ چنانچہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ بی بی رقیہ رضی اللہ عنہا کو ساتھ لے کر حبشہ چلے گئے اور چند سال وہاں گزارے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''میری اُمت میں عثمان پہلا شخص ہے جس نے اپنی زوجہ کے ساتھ ہجرت کی''۔ (اصابہ' ج ۸) جب آپؓ حبشہ سے واپس آئے تو مکہ کے حالات بدتر تھے۔ قریش نے مسلمانوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اب رسول اللہ ﷺ نے اپنے ساتھیوں کو مدینہ ہجرت کر جانے کی ہدایت کی۔ چنانچہ حضرت عثمانؓ بی بی رقیہؓ کے ساتھ مدینہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ مدینہ پہنچ کر جب رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین اور انصار کے درمیان رشتہ اخوت قائم کیا تو حضرت عثمان کو اوس بن ثابت انصاری کا بھائی قرار دیا۔ یہ اوسؓ حضرت حسانؓ کے بھائی تھے۔ دونوں خاندانوں میں اس قدر محبت اور الفت پیدا ہو گئی کہ حضرت حسان حضرت عثمان کی شہادت پر حد درجہ سوگوار رہے اور ایک مرثیہ بھی کہا۔

۲ھ میں غزوۂ بدر پیش آیا۔ اتفاق کی بات کہ اس وقت بنت رسولؐ، زوجہ عثمان حضرت رقیہ رضی اللہ عنہا شدید بیمار ہو گئیں۔ رسول اللہ ﷺ ۳۱۳ ساتھیوں کے ساتھ مدینہ سے روانہ ہوئے تو حضرت عثمان کو سیدہ رقیہ کی تیمارداری کے لیے مدینہ چھوڑ گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے انہیں بتا دیا کہ مدینہ میں رکے رہنے کے باوجود انہیں غزوۂ بدر میں شریک سمجھا جائے گا اور مالِ غنیمت میں سے حصہ بھی ملے گا (صحیح بخاری)۔ حضرت رقیہؓ اسی علالت میں وفات پا گئیں۔ جب زید بن حارثہ رسول اللہ ﷺ کی اونٹنی پر سوار بدر کی فتح کی خوشخبری لے کر مدینہ میں داخل ہوئے اُس وقت حضرت عثمانؓ متوفیہ کی تجہیز وتکفین میں مصروف تھے۔ رسول اللہ ﷺ جنگ سے واپس آئے تو آپؐ کو صدمہ ہوا۔ آپؐ نے حضرت عثمانؓ کی دلجوئی کی۔ انہیں بدر کا مجاہد قرار دیا اور مالِ غنیمت میں سے حصہ دیا۔ اگرچہ

حضرت عثمانؓ طبعاً نرم مزاج تھے لیکن بعد کے تمام غزوات میں شریک ہوتے رہے۔

۳ ہجری میں غزوۂ اُحد پیش آیا جس میں تیر انداز درّہ سے ہٹ گئے تو مسلمانوں کی فتح شکست میں بدل گئی۔ مجاہدین اچانک غیر متوقع حملے کی تاب نہ لا کر منتشر ہو گئے۔ خود رسول اللہ ﷺ کو سخت زخم آئے اور آپؐ کی شہادت کی خبر اڑ گئی۔ حضرت عثمان بھی اس غزوہ میں شامل تھے۔ اس موقع پر جو اجتہادی غلطی ہوئی اور اس کے نتیجہ میں پسپائی ہوئی اللہ تعالیٰ نے اس غلطی کی معافی کا اعلان قرآن مجید میں ان الفاظ میں کر دیا: ﴿وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ﴾(آل عمران) ''اللہ نے ان کو معاف کر دیا ہے اور بے شک اللہ بڑا بخشنے والا اور بڑا حلم والا ہے''۔

۶ ھ میں رسول اللہ ﷺ عمرہ کے لیے مکہ روانہ ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ مشرکین اس پر آمادہ نہیں کہ مسلمان مکہ میں داخل ہوں۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمانؓ کو سفیر بنا کر گفت و شنید کے لیے قریش کے پاس مکہ بھیجا۔ وہاں حضرت عثمانؓ کو دیر لگی تو افواہ پھیل گئی کہ قریش نے حضرت عثمانؓ کو شہید کر دیا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ بڑے غم زدہ ہوئے اور تمام موجود صحابہؓ سے عثمانؓ کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے بیعت لی۔ اس بیعت کا ذکر قرآن مجید میں بایں الفاظ آیا ہے: ﴿لَقَدْ رَضِيَ اللّٰهُ عَنِ الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ يُبَايِعُوْنَكَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ﴾(الفتح:۱۸) ''بے شک اللہ راضی ہو گیا اُن اہل ایمان سے جنہوں نے درخت کے نیچے آپؐ سے بیعت کی''۔ چونکہ حضرت عثمانؓ اُس وقت حاضر نہ تھے اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کی طرف سے خود بیعت کی اور اپنے ہاتھ کو حضرت عثمانؓ کا ہاتھ قرار دیا۔ یہ حضرت عثمانؓ کے لیے بہت بڑی فضیلت تھی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ (صلح حدیبیہ کے موقع پر) رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عثمان اِس وقت یہاں موجود نہیں' وہ اللہ اور اُس کے رسولؐ کے کام سے مکہ گئے ہوئے ہیں۔ میں خود ان کی طرف سے بیعت کرتا ہوں''۔ پھر آپؐ نے اپنا ایک دست مبارک اپنے ہی دوسرے ہاتھ پر رکھا (اور اس طرح بیعت لے لی)۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ کا دست مبارک جس سے آپؐ نے عثمانؓ کی طرف سے بیعت کی وہ عثمانؓ کے

حق میں ان دوسرے تمام لوگوں کے ہاتھوں سے بہتر تھا جنہوں نے خود اپنی طرف سے بیعت کی تھی۔ (ترمذی)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ جب بات چیت کے لیے مکہ پہنچے تو قریش نے مسلمانوں کے مکہ میں داخلے پر رضامندی کا اظہار نہ کیا اور حضرت عثمان سے کہا کہ وہ خود عمرہ کر لیں' جسے حضرت عثمانؓ نے قبول نہ کیا اور واپس حدیبیہ پہنچ گئے۔ وہاں قریش کی طرف سے بات چیت کرنے کے لیے نمائندے پہنچے اور وہ معاہدہ طے پایا جو تاریخ میں ''صلح نامہ حدیبیہ'' کے نام سے مشہور ہے۔ چونکہ اس موقع پر اہل ایمان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے رضامندی کا اظہار کیا گیا لہٰذا اس بیعت کو ''بیعت رضوان'' کہا جاتا ہے۔ اور اسی بنیاد پر صحابہ کے نام کے ساتھ رضی اللہ عنہ لکھا جاتا ہے۔

۹ھ میں جب قیصر روم کی طرف سے عرب پر متوقع حملے کی اطلاع ملی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عسکری تیاری شروع کر دی اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو انفاق کی ترغیب دی۔ یہ زمانہ سخت تنگی' شدید گرمی اور فصلوں کی تیاری کا تھا۔ اس موقع پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفیر عام کا اعلان فرما دیا کہ ہر شخص اس مہم کے لیے اپنے گھر سے نکلے گا۔ یہ غزوۂ تبوک تھا جسے ''جیش العسرہ'' بھی کہا جاتا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود فکر مند تھے۔ بہرحال آپؐ کی ترغیب پر سب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق مال دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے سو اونٹ مع ساز و سامان دیے۔ جب دوبارہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ترغیب دلائی تو دو سو اونٹ مع سامان دیے۔ تیسری بار رغبت دلانے پر تین سو اونٹ مع سامان پیش کر دیے اور اس مہم میں تیس ہزار سے زیادہ مجاہدین کا خرچہ برداشت کیا۔ اس کے علاوہ ستر گھوڑے اور ایک ہزار دینار نقدی کی صورت میں پیش کیے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس نقدی کو دامن میں ڈالے اس میں اپنا دست مبارک پھیر رہے تھے اور خوش ہو کر فرما رہے تھے ''آج کے بعد عثمان کا کوئی کام اس کو نقصان نہیں پہنچائے گا''۔ یہ الفاظ آپ نے دہرا کر کہے۔ (مستدرک حاکم' جامع ترمذی)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحاب ہجرت کر کے مدینہ پہنچے تو یہاں پانی کی

سخت قلت تھی۔ تمام شہر میں میٹھے پانی کا صرف ایک کنواں بئر رومہ تھا' جو ایک یہودی کی ملکیت تھا۔ وہ اس کا پانی من پسند قیمت پر فروخت کرتا تھا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ کون اللہ کا بندہ ہے جو بئر رومہ کو خرید کر سب مسلمانوں کو اس سے پانی لینے کی اجازت دے دے تو اللہ تعالیٰ جنت میں اس کو اس سے بہتر عطا فرمائے گا! اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے بارہ ہزار درہم میں نصف کنواں خرید لیا' یوں کہ ایک دن کنواں حضرت عثمان کا ہوگا اور ایک دن یہودی کا۔ حضرت عثمان پانی مفت دیتے تھے اور یہودی قیمت لیتا تھا۔ اب مسلمان حضرت عثمان کی باری کے دن اتنا پانی لے لیتے کہ ان کو دو دن کے لیے کافی ہوتا اور یہودی کی باری کے دن کوئی مسلمان پانی نہ خریدتا' چونکہ یہودی کا نفع ختم ہوگیا اس لیے اب وہ کنوئیں کا دوسرا نصف بھی فروخت کرنے پر آمادہ ہوگیا اور حضرت عثمانؓ نے وہ حصہ بھی آٹھ ہزار درہم میں خرید کر عام مسلمانوں کے لیے وقف کر دیا۔ (جامع الترمذی' سنن النسائی)

مدینہ منورہ میں مسجد نبوی کی تعمیر ہوئی مگر جلد ہی وہ نمازیوں کے لیے تنگ ہوگئی۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کون اللہ کا بندہ ہے جو فلاں گھرانے کے قطعہ زمین کو (جو مسجد سے ملحق ہے) خرید کر ہماری مسجد میں شامل کر دے تو اللہ اس کو جنت میں اس سے بہتر قطعہ عطا فرمائے گا! اس پر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے وہ قطعہ زمین اپنے ذاتی مال سے خرید کر مسجد نبوی میں شامل کر دیا۔ (جامع ترمذی' سنن النسائی)۔ یہ مسجد نبوی کی پہلی توسیع تھی جو حضرت عثمانؓ کے ہاتھوں انجام پائی۔

رمضان ۲ھ میں رسول اللہ ﷺ کی بیٹی سیدہ رقیہ رضی اللہ عنہا جو حضرت عثمان کی اہلیہ تھیں' قضائے الٰہی سے وفات پا گئیں۔ حضرت عثمانؓ کے لیے یہ بہت بڑا صدمہ تھا کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھ رشتہ دامادی ختم ہوگیا۔ ایک دن رسول اللہ ﷺ نے حضرت عثمان کو غمزدہ اور پریشان دیکھا تو فرمایا: عثمان تمہارا یہ کیا حال ہے؟ انہوں نے جواب دیا: میرے ماں باپ آپؐ پر قربان ہوں' کیا کسی شخص پر بھی ایسی مصیبت آئی ہے جو مجھ پر آئی ہے۔ آپؐ کی صاحبزادی جو میرے ہاں تھیں وہ وفات پا گئیں۔ اللہ ان پر رحمت فرمائے۔

اس سے میری کمر ٹوٹ گئی اور آپؐ سے دامادی کے رشتے کا جو شرف مجھے نصیب تھا اب وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''عثمان! تم ایسا کہتے ہو؟''۔ حضرت عثمانؓ نے عرض کیا: ہاں یا رسول اللہ جو میں نے کہا ہے اس پر اللہ کی قسم کھاتا ہوں۔ آپؐ نے فرمایا: ''اے عثمان! یہ جبریل امین ہیں جو مجھے اللہ کا حکم پہنچا رہے ہیں کہ میں اپنی بیٹی مرحومہ رقیہ کی بہن اُمّ کلثوم کا نکاح تم سے کر دوں اسی مہر پر جو رقیہ کا تھا اور اسی کے مثل معاشرت پر''۔ اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹی اُمّ کلثومؓ کا نکاح حضرت عثمانؓ سے کر دیا۔ (ابن عساکر) رسول اللہ ﷺ کے ساتھ اس دوہری دامادی کی وجہ سے حضرت عثمان کا لقب ''ذُوالنورَین'' ہوا' یعنی دو نوروں والا۔

بعد ازاں جب حضرت اُمّ کلثومؓ بھی وفات پا گئیں تو رسول اللہ ﷺ نے لوگوں سے کہا کہ حضرت عثمان کا نکاح کر دیں۔ اگر میری کوئی تیسری بیٹی ہوتی تو اس کا نکاح بھی عثمان ہی سے کر دیتا۔ آپؐ نے یہ بھی فرمایا کہ میں نے عثمان سے اپنی بیٹیوں کا نکاح وحی کے ذریعے ملے ہوئے اللہ تعالیٰ کے حکم ہی سے کیا تھا۔ (ابن عساکر)

رسول اللہ ﷺ کی نگاہ میں حضرت عثمانؓ کے مقام و مرتبہ کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کی دوسری بیٹی (اُمّ کلثوم) کا انتقال ہو گیا تو آپؐ نے فرمایا: ''اے عثمان! اگر میری دس بیٹیاں ہوتیں تو میں ان میں سے ایک کے بعد ایک کا تم سے نکاح کر دیتا' کیونکہ میں تم سے بہت راضی اور خوش ہوں''۔ (معجم اوسط طبرانی' ابن عساکر)

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔ انہوں نے دو سال اور چار ماہ خلافت کی اور وفات سے قبل حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو خلیفہ نامزد کر گئے۔ حضرت عمرؓ نے ساڑھے دس سال خلافت کی۔ آپؓ کا دور عظمتِ اسلام کا سنہری دور تھا۔ حضرت عمرؓ نے شہادت کے وقت خلافت کو چھ صحابہؓ کے اندر محدود کر دیا۔ ان سب حضرات نے اپنی رائے کو عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ کی رائے پر منحصر کر دیا کہ ان میں سے جس کو چاہیں خلیفہ مقرر کر دیں۔ چنانچہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے تین دن تک اہم شخصیات کے ساتھ مشورہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی خلافت کا اعلان کیا۔ سب سے

پہلے حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کی اور پھر تمام مہاجرین و انصار' بلادِ اسلامیہ کے امراء اور تمام مسلمانوں نے بیعت کی۔

حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ چند روز کم بارہ سال خلیفہ رہے۔ آپؓ نے حضرت ابوبکر صدیق اور حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہما کے نظم و نسق کو بغیر کسی تبدیلی کے رائج رکھا۔ اگرچہ آپؓ طبعاً نرم مزاج تھے مگر نفاذِ شریعت کے معاملے میں کسی طرح کی نرمی برداشت نہیں کرتے تھے۔ عہد فاروقی میں عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ مصر کے گورنر تھے۔ حضرت عثمانؓ نے مسلمانوں کے مفاد میں انہیں معزول کر دیا۔ اسی طرح گورنر کوفہ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ کو معزول کر کے ولید بن عقبہ کو والی کوفہ مقرر کیا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ بصرہ کے والی تھے۔ یہ بھی بہت بڑی شخصیت تھے' مگر جب اُن کے خلاف عوام کی شکایات سنیں تو انہیں معزول کر کے عبداللہ بن عامر کو اس منصب پر مامور کیا۔

آپؓ کے عہد میں اسلامی حکومت کا دائرہ پہلے سے وسیع ہو گیا۔ نئی فتوحات کا سلسلہ جو حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں شروع ہوا تھا وہ حضرت عثمانؓ کی خلافت کے دوران جاری رہا۔ آذربائیجان اور طبرستان فتح ہوئے۔ اسلامی افواج قہستان' طغارستان' بلخ' خوارزم' آرمینیا اور تفلیس تک پہنچ گئیں۔ خلافت عثمانی کے بعد اتنا علاقہ کبھی اسلامی سلطنت میں شامل نہ رہا۔ حضرت عثمانؓ کے عہد خلافت میں بحری طاقت مضبوط تھی۔ تمام مفتوحہ علاقوں میں عوام کی بہبودی اور راحت رسانی کے بہت سے کام ہوئے' متعدد نہریں کھودی گئیں' چشمے جاری ہوئے' سڑکیں بنائی گئیں' پھل دار درخت لگائے گئے' تجارتی وسائل کو محفوظ اور پرامن بنایا گیا' پولیس کا محکمہ قائم ہوا۔ مسلمان خوش حال ہو گئے' زر و دولت کی کثرت ہو گئی۔ اس طرح کی صورت حال حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں تو منفی اثرات نہ دکھا سکی مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی نرم مزاجی کے نتائج سامنے آنا شروع ہو گئے۔ یہودیوں نے' جن کی اسلام دشمنی قدیم سے چلی آ رہی ہے' سازشوں کا جال بچھایا۔ عبداللہ بن سبا یہودی تھا۔ عہد عثمانی میں منافقانہ اسلام قبول کیا۔ یہ سازشی ذہن کا مالک تھا۔ فتنے پر فتنہ اٹھانے میں ماہر تھا۔ پہلے تو بلادِ اسلامیہ کی مقتدر شخصیات کو نشانے پر رکھا'

بعد ازاں خود حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ کی معزولیت کی آواز اٹھائی۔ اس سازش کی بنیاد اس نے فضیلت علیؓ پر رکھی اور لوگوں کو اپنا ہم خیال بنانا شروع کیا۔ یہی فتنہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کا سبب بنا اور اُمت کے اندر وہ انتشار پھیلا کہ پھر سکون و اطمینان ہمیشہ کے لیے رخصت ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ یہ فتنہ ''الفتنة الکبریٰ'' کہلاتا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی الٰہی حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مظلومانہ شہادت کی خبر مل چکی تھی۔ جامع ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے خطاب میں ایک عظیم فتنہ کا ذکر فرمایا اور عثمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ بندہ اس فتنہ میں مظلومیت کے ساتھ شہید ہوگا۔ اسی طرح ایک دن آپؐ ابوبکرؓ عمر اور عثمان رضی اللہ عنہم کے ساتھ کوہِ ثبیر پر تھے کہ کوہِ ثبیر حرکت کرنے لگا یہاں تک کہ اُس کے پتھر اوپر سے نیچے گرنے لگے۔ آپؐ نے پہاڑ پر پاؤں مارا اور فرمایا: اُسکن ثبیر! (اے ثبیر ساکن ہو جا) کیونکہ اس وقت تیرے اوپر ایک نبی' ایک صدیق اور دو شہید ہیں۔ (جامع ترمذی) بعد ازاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیشین گوئی کے مطابق عمر اور عثمان رضی اللہ عنہما شہید ہوئے۔ گویا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو اپنی شہادت کا پوری طرح یقین تھا' اسی لیے وہ اس کے لیے تیار تھے۔ وہ اُس وقت دنیا کی سب سے عظیم اور طاقتور سلطنت کے فرمانروا تھے' اگر طاقت کے ساتھ ان بلوائیوں کو کچلنا چاہتے تو ذرا بھی مشکل نہ تھا بلکہ آپ کو اس بات کا مشورہ دیا جا رہا تھا' مگر آپ کو اپنی جان کی خاطر کسی ایک کلمہ گو کا خون بہانا بھی گوارا نہ تھا۔ چنانچہ آپؓ نے کوئی مزاحمت نہ کی اور بلوائی دیوار پھلانگ کر آپؓ کے گھر کے اندر گھس گئے اور آپؓ کو شہید کر دیا۔ اس وقت آپؓ قرآن مجید کی سورۃ البقرۃ تلاوت کر رہے تھے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے آزاد کردہ غلام مسلم بن سعید سے روایت ہے کہ جس دن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ شہید کیے گئے اس دن انہوں نے بیس غلام آزاد کیے اور پاجامہ منگوا کر پہنا اور اسے مضبوط باندھا' ورنہ انہوں نے نہ اسلام لانے سے پہلے اور نہ اسلام لانے کے بعد کبھی پاجامہ پہنا تھا۔ اور فرمایا میں نے گزشتہ شب خواب میں رسول

اللہ ﷺ کو ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما کے ساتھ دیکھا۔ ان حضرات نے مجھ سے فرمایا: عثمان صبر پر قائم رہو، کل تم ہمارے پاس روزہ افطار کرو گے۔ اس کے بعد آپؓ نے قرآن مجید منگوایا اور اس کو سامنے رکھ کر کھولا۔ پھر اسی حال میں شہید کر دیے گئے کہ قرآن مجید آپؓ کے ہاتھوں میں تھا۔ (ابن احمد)

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے ممتاز صحابہ میں سے تھے۔ آپؓ رسول اللہ ﷺ کے دوہرے داماد تھے۔ آپ لکھنا پڑھنا جانتے تھے۔ کوئی آیت نازل ہوتی تو آپؐ حضرت عثمانؓ کو بلا کر لکھوا دیتے۔ اُن کے خطبات ''خیر الکلام ما قل و دل'' کے مصداق ہوتے۔ قرآن مجید کے ساتھ آپ کو خصوصی لگاؤ تھا۔ حدیث کی روایت میں شیخین کی طرح حد درجہ محتاط تھے۔ صحیحین میں آپ کی مرویات صرف ۱۶ ہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ وہ پہلے شخص ہیں جنہوں نے قرآن مجید کو ایک مصحف کی شکل میں جمع کر دیا جو ایک عظیم کارنامہ تھا۔ یہ نسخہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاس رہا، بعد ازاں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس اور ان کی وفات کے بعد اُم المؤمنین حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے سپرد ہوا۔ جب اسلامی سلطنت کی حدود دُور دُور تک پھیل گئیں تو لوگ اپنے اپنے لہجے میں قرآن پڑھنے لگے۔ حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ نے اس صورت حال کا احساس کرتے ہوئے مصدقہ نسخہ حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا سے منگوایا، اس کی نقلیں قریشی قراءت کے مطابق تیار کیں اور تمام صوبوں میں بھیج دیں۔ اس طرح حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمام اُمت کو قرآن مجید کی ایک قراءت پر جمع کر دیا۔ جہاں تک اجزائے قرآن کو ایک کتاب کی صورت میں جمع کرنے کا تعلق ہے تو یہ کام حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں اُن کے دورِ خلافت میں انجام پا چکا تھا۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ انتہائی رقیق القلب تھے۔ جنت اور دوزخ کا تذکرہ ہوتا تو جذبات پر قابو نہ رکھ سکتے۔ اسی طرح موت اور قبر کو یاد کر کے بہت روتے۔ فرماتے تھے کہ قبر آخرت کی پہلی منزل ہے، یہاں آسانی ہوئی تو آگے بھی آسانی ہو جائے گی۔

رسول اللہ ﷺ کے محبّ اور محبوب تھے۔ آپؐ کی اطاعت اور اتباع ان کی آرزو

تھی۔ ہر کام میں مسنون طریقہ پیش نظر رکھتے۔ حیا آپ کا امتیازی وصف تھا۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے کہ عثمانؓ سے تو فرشتے بھی حیا کرتے ہیں۔ (صحیح مسلم)

آپؓ کو اللہ تعالیٰ نے مالی وسعت دی تھی۔ آپؓ عثمان غنی کہلاتے تھے۔ آپؓ جہاں فی سبیل اللہ خرچ کرنے میں فراخ دل تھے اسی طرح خود اپنی ذات پر بھی خرچ کرتے تھے کہ یہ بھی شکر نعمت کا ایک انداز ہے۔ ہاں نمود و نمائش اور اسراف کے قریب بھی نہیں جاتے تھے۔ اپنے عزیز و اقارب کی ضروریات کا ہر وقت خیال رکھتے۔ ثروت اور کشادگی کے باوجود طبیعت میں سادگی اور تواضع تھی۔ لونڈی اور غلام موجود ہوتے مگر اکثر اپنے کام خود کر لیتے اور ان کو تکلیف نہ دیتے۔ ہر جمعہ کے دن ایک غلام آزاد کرتے اور کسی جمعہ کو ناغہ ہو جاتا تو اگلے جمعہ کے دن دو غلام آزاد کرتے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر آپؓ نے جس فیاضی سے مال دیا اس کا ذکر پیچھے ہو چکا ہے۔

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ صبر و تحمل کا پیکر تھے۔ اتنی بڑی سلطنت کا حکمران ہونے کے باوجود مظلومانہ شہادت کو قبول کیا مگر باغیوں کے خلاف کارروائی کا حکم نہ دیا۔ رات کی عبادت آپ کو مرغوب تھی۔ رات کا اکثر حصہ نماز اور ذکر و اذکار میں گزارتے جبکہ دن کے اوقات میں امورِ سلطنت میں مصروف رہتے۔ نرم مزاج ہونے کے باوجود انتظامی معاملات کو حسن تدبیر کے ساتھ انجام دیتے۔ ملکی دفاع کی اہمیت سے ہر وقت باخبر رہتے۔ بحری فتوحات کا آغاز آپ کے عہد خلافت میں ہوا۔ صوبوں کے گورنروں کی کارکردگی پر نگاہ رکھتے۔ جس کے بارے میں شکایات ملتیں، تحقیق و تفتیش کے بعد اگر مناسب سمجھتے تو فوراً معزول کر دیتے۔ عدل و انصاف کے معاملہ میں کسی کی رو رعایت نہ کرتے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی سیرت وکردار

قرآن وحدیث اور تاریخ کی روشنی میں

نام علیؓ کنیت ابوالحسن اور ابوتراب' لقب حیدر۔ والد کا نام ابوطالب اور والدہ کا نام فاطمہ تھا۔آپؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حقیقی چچازاد بھائی تھے۔رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے والد کی وفات کے بعد پیدا ہوئے تھے۔ چنانچہ آپؐ کے اوّلین کفیل آپؐ کے دادا عبدالمطلب تھے۔ جب ان کی وفات ہوگئی تو وہ وصیت کر گئے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی کفالت ابوطالب کریں۔ابوطالب قبیلہ کے سردار تھے مگر وہ صاحبِ ثروت نہ تھے۔تاہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے فرزند سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے۔اسی طرح کی محبت آپ کی چچی کو بھی آپؐ کے ساتھ تھی۔

چالیس سال کی عمر میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو نبوت سے سرفراز کیا گیا اُس وقت حضرت علیؓ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کے فرد اور آپ کے زیر کفالت تھے۔آپؐ نے اپنے گھر میں نبوت کا اظہار کیا تو حضرت علیؓ جو اُس وقت صرف دس سال کے تھے' حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔اس سے پہلے حضرت خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا اسلام لا چکی تھیں۔ ابتدا میں حضرت علیؓ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چھپ چھپ کر اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ جب ابوطالب کو علم ہوا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حقیقتِ حال دریافت کی۔آپؐ نے بتایا کہ چچا جان مجھے اللہ نے رسول بنا کر بھیجا ہے اور میں آپ کو بھی قبول اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔اس پر ابوطالب نے کہا کہ میں اپنے آباء واَجداد کا مذہب نہیں چھوڑ سکتا لیکن بخدا جب تک میں زندہ رہوں گا تم کو کوئی گزند نہیں پہنچے گی۔تاریخ شاہد ہے کہ انہوں نے یہ عہد آخری حد تک پورا کیا۔ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر مکہ والوں نے عرصۂ حیات تنگ کر دیا اور اُن کا معاشرتی مقاطعہ کر کے انہیں شعب ابی طالب میں محصور کر دیا تو چچا ابوطالب

نے بھتیجے کو تنہا نہ چھوڑا بلکہ اپنے قبیلہ والوں کے ساتھ تین سال تک شعب ابی طالب میں بھوک پیاس برداشت کی۔

رسول اللہ ﷺ قریش اور قبائل عرب کو اسلام کی دعوت دیتے رہے۔ ادھر قریش کی دشمنی اور مخالفت بھی زور پکڑتی گئی۔ جب قریش نے بدسلوکی کی انتہا کر دی اور حق کی مخالفت اور رسول اللہ ﷺ کو ایذائیں پہنچانے میں حد سے گزر گئے تو رسول اللہ ﷺ طائف کی طرف چلے گئے تاکہ اہل طائف کو اسلام کی دعوت دیں، مگر وہاں بھی آپ کی بات نہ سنی گئی، بلکہ وہاں سے آپ ﷺ لہولہان ہو کر مکہ واپس آئے۔ یہاں قریش نے دارالندوہ میں رسول اللہ ﷺ کے قتل کا منصوبہ بنایا۔ اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو خبردار کر دیا اور ہجرت کرنے کا حکم دیا۔ آپ ﷺ نے ہجرت کے لیے رخت سفر باندھا۔ جس بستر پر رات کو قاتلانہ حملہ ہونے والا تھا اس بستر پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کو لٹایا اور خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لے کر مدینہ کی طرف چل پڑے۔

خطرے کی رات رسول اللہ ﷺ کے بستر پر لیٹ کر گہری نیند سونا حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جرأت، شجاعت اور وفاداری کا عدیم المثال واقعہ ہے۔ جب صبح تک رسول اللہ ﷺ گھر سے باہر تشریف نہ لائے تو انہوں نے جھانک کر دیکھا تو بستر پر علی تھے۔ چنانچہ وہ بے نیل مرام واپس ہو کر رسول اللہ ﷺ کے تعاقب میں نکلے، مگر آپؐ تک نہ پہنچ سکے۔ آپ ﷺ بخیریت مدینہ پہنچ گئے۔ رسول اللہ ﷺ کے پاس کفار کی امانتیں تھیں۔ حضرت علیؓ وہ امانتیں مالکوں کے سپرد کر کے چند دن کے بعد عازمِ مدینہ ہوئے۔ مدینہ پہنچ کر رسول اللہ ﷺ نے بے سروسامان مہاجرین اور مدینہ کے رہائشیوں کے درمیان رشتۂ مواخات قائم فرمایا تو رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کسی انصاری کا بھائی بنانے کے بجائے اپنا بھائی قرار دیا۔

ہجرت کے دوسرے سال رسول اللہ ﷺ نے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کر دیا۔ دونوں پر پانی چھڑکا اور دعائیں دیں۔ اس عظیم جوڑے کی شادی انتہائی سادگی کے ساتھ انجام پائی۔ رخصتی کے وقت نہ کوئی دھوم دھام تھی نہ کسی رسم و

رواج کی پابندی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایک دبیز چادر میں اپنی لخت جگر کو گھر سے رخصت کیا۔ یہ وہ حالات تھے جب خود رسول اللہ ﷺ کے گھر میں فاقہ کشی تھی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھی غربت اور ناداری کے سوا کچھ نہ تھا۔ (مسند امام احمد بن حنبل)

گھر کے کام کاج خصوصاً چکی پیستے پیستے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا پریشان ہوگئی تھیں۔ اُن کو اطلاع ملی کہ رسول اللہ ﷺ کے پاس کچھ لونڈی غلام آئے ہیں' چنانچہ حضرت فاطمہؓ نے ایک خادم کا تقاضا کیا۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: کیا میں تم کو تمہارے مانگے کی چیز سے بڑھ کر نہ دوں؟ اور وہ یہ کہ جب بستر پر جانے لگو تو تینتیس بار سبحان اللہ' تینتیس بار الحمد للہ اور چونتیس بار اللہ اکبر پڑھ لیا کرو۔ (بخاری' کتاب الجہاد)

ایک دفعہ بیٹی کے گھر آئے' پوچھا علی کہاں ہیں؟ کہنے لگیں مسجد میں گئے ہیں۔ آپؐ نے باہر نکل کر مسجد میں دیکھا تو وہاں انہیں اس حال میں لیٹے ہوئے پایا کہ پشت پر مٹی لگی ہوئی تھی۔ آپ ﷺ نے اپنے دست مبارک سے مٹی صاف کی اور دو مرتبہ فرمایا: ((اجلس یا اباتراب!)) ''ابوتراب! اُٹھ کے بیٹھو''۔ (صحیح بخاری)

۲ھ میں جنگ بدر ہوئی۔ انفرادی مقابلوں میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے ولید بن عتبہ آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے پہلے ہی وار میں اسے جہنم واصل کیا۔ (سیرت ابن ہشام)

غزوۂ بدر کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے اپنی تلوار ذوالفقار حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں دے دی اور پھر زندگی بھر واپس نہ لی۔ (السیرۃ النبویہ' از ابوالحسن علی ندوی)

جنگ بدر میں رسول اللہ ﷺ کا علم حضرت علی رضی اللہ عنہ کے پاس ہی تھا۔ (الطبقات الکبریٰ)

ہجرت کے تیسرے سال ماہِ شوال میں غزوۂ اُحد پیش آیا جس میں تیراندازوں کے درّہ چھوڑنے کی وجہ سے مسلمانوں کے لشکر میں بھگدڑ مچ گئی۔ رسول اللہ ﷺ کو زخم آیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ڈھال میں پانی لے کر آپ کے زخم کو دھویا۔ اس جنگ میں علی رضی اللہ عنہ میمنہ سنبھالے ہوئے تھے۔ مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد علم آپ نے اپنے ہاتھ میں لیا۔ آپؓ نے اس جنگ میں خوب دادِ شجاعت دی اور کئی مشرکوں کو قتل کیا۔ (البدایہ والنہایہ)

شوال ۵ ھ میں غزوۂ احزاب پیش آیا۔ دشمن نے دور ونزدیک سے دس ہزار کے لشکر کے ساتھ مدینہ پر حملہ کیا۔ رسول اللہ ﷺ نے دفاعی حکمت عملی کے طور پر مدینہ میں داخلے کے راستے کو خندق کھود کر محفوظ کرلیا۔ ایک تنگ جگہ سے کچھ دشمن خندق عبور کر کے مدینہ میں داخل ہو گئے جن میں عمرو بن عبدوُد بھی تھا جو اکیلا ہزار شہسواروں کے برابر سمجھا جاتا تھا۔ اُس نے مدمقابل کے لیے للکارا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ مقابلہ پر آئے۔ عمرو بن عبدوُد اتنا متکبر تھا کہ اپنے گھوڑے سے اتر کر اُن کے مقابلہ میں آ گیا۔ دوبدو لڑائی ہوئی۔ دفعتاً حضرت علی رضی اللہ عنہ کی تلوار کے وار نے اس کا کام تمام کر دیا اور مغرور عمرو بن عبدوُد زمین پر ڈھیر ہو گیا۔

۶ ھ میں بیعت رضوان ہوئی اور صلح نامہ حدیبیہ تحریر ہوا۔ حضور ﷺ لکھوا رہے تھے اور حضرت علی لکھ رہے تھے۔ جب فریق معاہدہ کے طور پر ''محمد رسول اللہ'' (ﷺ) لکھا گیا تو کفار کے نمائندہ سہیل نے کہا کہ ''محمد بن عبداللہ'' لکھا جائے۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی کو حکم دیا کہ پہلا لکھا ہوا مٹا دیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کہا کہ بخدا میں تو اس کو نہیں مٹا سکتا۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا مجھے بتاؤ ''رسول اللہ'' کہاں لکھا ہے' میں خود مٹائے دیتا ہوں۔ (صحیح مسلم)

۷ ھ میں غزوۂ خیبر ہوا۔ خیبر مدینہ سے ستر میل دور ایک یہودی کالونی تھی' جو مضبوط قلعوں پر مشتمل تھی۔ وہ مسلمانوں کے خلاف سازشوں کا گڑھ تھا۔ ادھر سے ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ چودہ سو صحابہ کو ساتھ لے کر خیبر کی طرف روانہ ہوئے۔ جب محاصرے نے طول پکڑا اور القموص کے مضبوط قلعے کی تسخیر باقی رہ گئی تو آپؐ نے فرمایا کل جھنڈا اسی کے سپرد ہوگا جس کے ہاتھ سے خیبر فتح ہوگا۔ سب انتظار میں تھے کہ یہ اعزاز کس کے حصے میں آتا ہے۔ حضور ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بلایا۔ ان کی آنکھیں دکھتی تھیں۔ آپؐ نے اُن کی آنکھوں میں لعابِ دہن لگایا' دُعا کی اور جھنڈا اُن کے ہاتھ میں تھما دیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ قلعہ میں داخل ہوئے' مشہور جنگجو مرحب مقابلے پر آیا۔ دونوں نے ایک دوسرے پر وار کیے' حضرت علی رضی اللہ عنہ کا وار کامیاب رہا۔ مرحب کا خود اور

سر دونوں کٹ گئے۔اس پر خیبر فتح ہو گیا۔

۸ ھ میں رسول اللہ ﷺ نے مکہ پر حملہ کرنے کا ارادہ کیا اور راز کو خفیہ رکھا۔ حاطب بن ابی بلتعہ مہاجر نے قریش مکہ کو خط کے ذریعے حملے کی اطلاع دینا چاہی مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ؐ کو آگاہ کر دیا کہ ایک عورت یہ خط لے کر مکہ جا رہی ہے۔ چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت علی اور حضرت زبیر رضی اللہ عنہما کو گھوڑوں پر دوڑایا کہ اس عورت سے خط برآمد کر کے لے آؤ۔ ان دونوں حضرات نے خاخ کے مقام پر اس عورت کو جا لیا۔ پہلے تو اُس نے انکار کیا' بعد ازاں جب یہ حضرات سختی سے پیش آئے تو اپنے سر کے بالوں سے نکال کر خط ان کے حوالے کر دیا۔ جب وہ خط رسول اللہ ﷺ کے پاس پہنچا تو آپ نے حاطب ؓ سے پرسش کی۔ حاطب ؓ نے غلطی تسلیم کر لی۔ آپ ؐ نے اس کا عذر قبول کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہنے لگے حضور! مجھے اجازت دیں تو میں اس منافق کی گردن اڑا دوں۔ آپ ﷺ نے فرمایا: حاطب بدری صحابی ہے' کیا تمہیں معلوم نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے بدریوں کے تمام گناہ معاف کر دیے ہیں؟ (صحیح بخاری)

۸ ھ میں طے شدہ پروگرام کے مطابق رسول اللہ ﷺ دس ہزار صحابہ کے ساتھ مدینہ سے چلے اور مکہ میں فاتحانہ داخل ہوئے' جہاں سے آٹھ سال پہلے نکالے گئے تھے۔ مسلمانوں کا جوش و خروش اور خوشی دیدنی تھی۔ رسول اللہ ﷺ نے حرم کے اندر نصب کیے ہوئے بت توڑنے شروع کیے۔ آپ ؐ ﴿جَآءَ الْحَقُّ وَزَهَقَ الْبَاطِلُ ۚ إِنَّ الْبَاطِلَ كَانَ زَهُوْقًا﴾ پڑھتے جاتے تھے۔ پھر کعبہ کے اندر سے ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کی مورتیوں کو الگ کیا۔ ایک پیتل کا بت رہ گیا جو کافی اونچا تھا۔ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو کندھوں پر اٹھا کر بلند کیا جنہوں نے حسب ارشادِ نبوی ؐ اس بت کو پاش پاش کر دیا۔ (بخاری)

۹ ھ میں جب نبی اکرم ﷺ تبوک کی طرف روانہ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اپنا جانشین بنا کر مدینہ میں چھوڑا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کہنے لگے: یا رسول اللہ! آپ مجھے بچوں اور عورتوں کے ساتھ چھوڑ کر جا رہے ہیں؟ اس پر آپ ؐ نے فرمایا: اے علی! کیا تم اس

بات پر راضی نہیں ہو کہ میرے ساتھ تمہاری حیثیت وہی ہو جو ہارونؑ کی موسیٰؑ کے ساتھ تھی۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ میرے بعد کوئی نبی نہ ہوگا۔ (صحیح بخاری)

۹ھ کے حج میں نبی اکرم ﷺ نے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر مکہ روانہ کیا۔ بعد ازاں سورۂ براءت کی ابتدائی آیات نازل ہوئیں تو آپؐ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو پیچھے بھیجا کہ قربانی کے دن لوگوں کو منیٰ کے اندر یہ آیات سنا دیں اور انہیں آگاہ کر دیں کہ کوئی کافر جنت میں نہ جا سکے گا' نیز اس سال کے بعد کوئی مشرک نہ حج کر سکے گا اور نہ برہنہ طواف کر سکے گا......

۱۱ھ میں نبی مکرم ﷺ نے اپنی وفات سے تین ماہ قبل حجۃ الوداع ادا کیا۔ اس میں آپؐ نے ۶۳ اونٹ اپنے ہاتھ سے ذبح کیے اور ۳۷ اونٹ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو ذبح کرنے کو کہا۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا اور سو کا عدد پورا کیا۔

حجۃ الوداع کے موقع پر ایامِ تشریق منیٰ میں گزار کر آپؐ نے طوافِ وداع کیا اور پھر مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ راستے میں غدیر خم کے مقام پر ایک خطبہ دیا جس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی خصوصیت اور شان کا ذکر ان الفاظ میں کیا: ''اے اللہ! میں جس کا دوست ہوں تو یہ علی بھی اس کے دوست ہیں۔ اے اللہ! جو علی سے دوستی رکھے تو اس سے دوستی فرما اور جو اس سے دشمنی رکھے تو اس کے ساتھ دشمنی کا معاملہ فرما''۔ اس موقع پر حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مبارک باد دی۔ (احمد)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کی نسبت یہ الفاظ کہنے کا سبب یہ تھا کہ بعض لوگوں نے ان کی بے جا شکایت کی تھی اور آپؐ نے اس کے جواب کے طور پر حضرت علی رضی اللہ عنہ کی فضیلت بیان فرمائی۔

حجۃ الوداع کے بعد رسول اللہ ﷺ مدینہ تشریف لے آئے۔ ابتدائے ربیع الاوّل میں بیمار ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ پوری تندہی کے ساتھ آپؐ کی خدمت اور تیمارداری میں لگ گئے۔ اس دوران جب آپ مسجد میں نہ جا سکتے تھے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مقرر کیا کہ وہ لوگوں کو نماز پڑھائیں۔ چنانچہ حضرت ابوبکرؓ نے آپ ﷺ کی زندگی میں مسجد نبوی

میں سترہ نمازوں کی امامت کرائی۔مختصر علالت کے بعد ۱۲ ربیع الاول پیر کے دن آپؐ دنیائے فانی سے دارالبقا کی طرف مراجعت فرما گئے۔حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ہاتھوں آپؐ کی تجہیز وتکفین ہوئی۔

سقیفہ بنی ساعدہ میں خلیفہ اوّل کے طور پر لوگوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔چونکہ خلیفہ کے چناؤ کی مجلس میں حضرت علی رضی اللہ عنہ موجود نہ تھے اس لیے ان کو ابوبکرؓ سے شکوہ رہا۔دوسرے حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کی سوگوار زندگی نے اُن کو خانہ نشین بنا دیا تھا۔چھ ماہ بعد جب حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا انتقال ہوگیا تو آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیعت کر لی اور خلافت صدیقی کے دوران پورے طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مشیر خاص رہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ ازواج نے میراث طلب کرنے کا ارادہ کیا تو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ ہم وارث نہیں بناتے، ہم نے جو چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے۔حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا نے خیبر کے خمس میں سے جو کچھ بچا تھا اُس کا اور فدک اور مدینہ کی غنیمت کا ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے مطالبہ کیا مگر انہوں نے بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان سنا دیا کہ ''ہم (انبیاء کرام علیہم السلام) وارث نہیں بناتے، ہم نے جو چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے'' اور کہا کہ آلِ محمدؐ اس مال سے اپنی ضروریات پوری کریں گے، میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقہ کیے ہوئے مال میں کوئی تصرف نہیں کرسکتا۔(صحیح بخاری)

اندریں حالات حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کو ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے تاحیات شکوہ رہا اور یہ چھ ماہ کا عرصہ تھا۔جب حضرت فاطمہ کی رحلت کا وقت آیا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اُن کی عیادت کے لیے گئے۔بنت الرسول سے معذرت کی اور وہ اُن سے خوش ہو گئیں۔جب حضرت فاطمہؓ کی وفات ہوگئی تو نماز جنازہ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے پڑھائی۔(طبقات ابن سعد)

جب تک حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا زندہ رہیں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے کوئی اور نکاح نہیں کیا۔ البدایہ والنہایہ میں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے شروع ہی میں بیعت

کر لی تھی اور اُن کے پیچھے نمازیں پڑھتے رہے۔ البتہ حضرت فاطمہؓ کی وفات تک کوئی سرگرمی نہیں دکھائی۔ چھ ماہ بعد پھر بیعت کی جو پہلی بیعت کی توثیق تھی۔

تاریخ شاہد ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت صدیقی کے دوران حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ساتھ بھرپور تعاون کیا۔ اور تو اور حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنے ایک بیٹے کا نام ابوبکر رکھا۔ نیز حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ایک بیٹے محمد نامی کو گود لیا' جو تاریخ میں محمد بن حنفیہ کے نام سے مشہور ہے۔ بعد ازاں اسے ایک علاقے کی گورنری کے اہل بھی سمجھا۔ (البدایہ والنہایہ)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی وفات کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت فاروقی کو دل و جان سے قبول کیا اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے مشیر خاص اور معاون رہے۔ دونوں اس قدر شیر و شکر تھے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اپنی بیٹی اُمِ کلثوم حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی زوجیت میں دے دی۔ (مجالس المؤمنین از قاضی نور اللہ الشوستری)

جب حضرت عمر رضی اللہ عنہ بیت المقدس کے سفر پر گئے تو اپنی جگہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو قائم مقام خلیفہ بنا کر گئے۔ (تاریخ ابن خلدون)

نہاوند کا معرکہ پیش آیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی رائے کو دوسروں کی رائے پر ترجیح دی اور ان کی تجویز پر عمل کیا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے بارے میں انتہائی اچھی رائے رکھتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے اپنے ایک بیٹے کا نام عمر رکھا۔ یہ عام سی بات ہے کہ لوگ اپنے بچوں کے نام اچھے آدمیوں کے ناموں پر ہی رکھتے ہیں۔ جس شخص سے نفرت ہو اس کے نام پر تو کوئی بھی اپنے بیٹے کا نام نہیں رکھتا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی وفات ہوئی۔ جسد مبارک چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ آئے' چہرے سے کپڑا ہٹایا اور کہا اے ابوحفص اللہ کی رحمتیں ہوں آپ پر۔ واللہ! رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کوئی ایسا نہیں ہے جس کے نامۂ اعمال کے ساتھ میں اللہ کے سامنے جانا پسند کروں۔ (احمد)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے بعد حضرت عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ بنے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ ان کے بھی مشیر و معاون رہے۔ جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے خلاف بلوہ ہوا تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی بھرپور حمایت کی۔ باغیوں نے امیر المؤمنین عثمان غنیؓ کے گھر کی ناکہ بندی کر لی تو حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما باغیوں کو روک رہے تھے، مگر حضرت عثمان غنی رضی اللہ عنہ ان کو قسم دے کر کہہ رہے تھے کہ کوئی کارروائی نہ کریں اور اپنے گھر چلے جائیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے بھی مدافعت اور مقابلے کی اجازت طلب کی مگر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اجازت نہ دی۔ باغی مکان کے پیچھے سے دیوار پھاند کر اندر داخل ہوئے اور حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو شہید کر دیا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے بعد لوگوں کے شدید اصرار پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے خلافت کی ذمہ داری قبول کی۔ عثمانی خلافت کا نصف آخر شورش اور بغاوت میں گزرا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کو خلافت ملی ہی اُس وقت جب حالات اچھے نہیں تھے۔ اس لیے خلافت کا بار سنبھالتے ہی آپ کو شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، حتیٰ کہ اسلامی سلطنت کی توسیع کا کام تو بالکل رک گیا۔ مسلمان آپس میں دست و گریبان ہو گئے۔ خونریز لڑائیوں میں ہزاروں اہل اسلام جاں بحق ہوئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے سامنے سب سے پہلا مطالبہ یہ رکھا گیا کہ وہ قاتلین عثمان سے بدلہ لیں، مگر حضرت علی رضی اللہ عنہ کا موقف تھا کہ قصاص کا اجراء بغیر کسی دعویٰ اور بغیر کسی دلیل اور حجت کے صحیح نہیں۔ (الاصابہ)

حضرت طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما قصاصِ عثمانؓ کے مطالبہ کرنے والوں میں پیش پیش تھے۔ وہ دونوں مکہ گئے اور اُم المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا جو حج کے لیے آئی ہوئی تھیں، اُن سے ملے اور ان کو ساتھ لے کر بصرہ آئے اور حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کرنے لگے۔ حضرت علی، عائشہ، طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہم کے درمیان مذاکرات ہوئے، حضرت علیؓ نے اُن کو مطمئن کر دیا۔ لیکن یہ بات تخریب کار سبائیوں کو پسند نہ آئی۔ مفسدین نے رات کے وقت موقع پا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لشکر پر یکا یک حملہ کر دیا۔ ہنگامہ کارزار اس قدر گرم ہوا کہ طرفین کے ہزاروں آدمی مارے گئے۔ نتیجہ حضرت علیؓ کے حق میں نکلا۔ جب حضرت علی رضی اللہ عنہ کو اور اُدھر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اصل حقیقت کا علم ہوا تو زار و قطار روئے مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ اس جنگ کو جنگِ جمل کہتے ہیں، کیونکہ

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا اونٹ پر سوار ہو کر میدان میں آئی تھیں۔ یہ جنگ بصرہ کے مقام پر ۳۶ ھ میں ہوئی۔ طلحہ اور زبیر رضی اللہ عنہما بھی مقتول ہوئے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا زندگی بھر اس واقعہ کو یاد کر کے روتی اور پچھتاتی تھیں اور کہتی تھیں کہ کاش میں یوم الجمل سے پہلے مرگئی ہوتی۔ (البدایہ والنہایہ)

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ شام کے حاکم تھے۔ انہوں نے حضرت علیؓ سے حضرت عثمانؓ کے قصاص کا مطالبہ کر دیا اور حضرت علیؓ کی طرف سے اپنی معزولی کے حکم کو تسلیم نہ کیا بلکہ اپنے بہت سے حامی پیدا کر لیے۔ اس پر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اہل شام سے جنگ کا ارادہ کر لیا اور کوفہ سے شام کی طرف چل پڑے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ بھی اپنے حامیوں کو لے کر فرات کی طرف روانہ ہوئے۔ صفین کے مقام پر دونوں لشکر آمنے سامنے آ گئے۔ مصالحت نہ ہو سکی اور بڑی جنگ چھڑ گئی۔ جنگ کئی دن تک جاری رہی۔ شامی شکست کھا رہے تھے کہ انہوں نے نیزوں پر قرآن اٹھایا اور جنگ بند ہو گئی اور مذاکرات شروع ہو گئے۔ حضرت علیؓ نے تحکیم منظور کر لی، مگر ان کے اکثر ساتھیوں نے معاملے کو دوسرا رنگ دے کر "لا الحکم الا اللہ" کی صدا بلند کی۔ یہ لوگ ایک بڑی جماعت تھے۔ بعد میں یہ خوارج مشہور ہوئے۔ ان لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی بیعت توڑ دی۔ حضرت علیؓ نے ان خارجیوں کی تنبیہ کی خاطر نہروان کا قصد کیا۔ نہروان کے مقام پر خارجیوں سے جنگ ہوئی۔ سب خارجی ہلاک ہو گئے، صرف دس لوگ بچے۔ یہ لوگ روپوش ہو گئے اور سازشیں کرتے رہے۔ ان ہی کے ایک آدمی عبدالرحمٰن بن ملجم نے بعد ازاں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو شہید کیا۔ (فتح الباری) حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چار سال نو ماہ خلافت کی۔ آپؓ کی نماز جنازہ آپؓ کے بیٹے حضرت حسن رضی اللہ عنہ نے پڑھائی۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کو بچپن ہی سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب ہوئی اور آپؓ شروع ہی سے نبوی تربیت میں رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی بیٹی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح آپ کے ساتھ کر دیا۔ آپ اُن چند صحابہ میں سے تھے جنہیں پڑھنا لکھنا آتا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف موقعوں پر آپ کی فضیلت بیان کی۔ ایک دفعہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے

حضرت علیؓ کو ایک لشکر کا امیر بنا کر بھیجا۔ جب فتح یاب ہو کر واپس آئے تو لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کی آپؐ سے شکایت کی جو کہ غلط فہمی کی بنا پر تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شکایت کرنے والوں پر ناگواری ظاہر فرمائی اور حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بارے میں فرمایا: ''علی مجھ سے ہے اور میں اُس سے ہوں' اور وہ ہر ایمان والے کا ولی ہے''۔ (جامع ترمذی)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کے بعد جب مدینہ پہنچے تو مہاجرین اور انصار کے درمیان اخوت کا رشتہ قائم فرمایا۔ ایک مہاجر کو ایک انصاری کا بھائی قرار دیا۔ اُس وقت حضرت علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ان کی آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔ عرض کیا آپؐ نے تمام اصحاب کے درمیان رشتۂ مواخاۃ قائم فرما دیا ہے مگر میرے اور کسی دوسرے کے درمیان آپؐ نے مواخاۃ قائم نہیں فرمائی۔ اس پر آپؐ نے ارشاد فرمایا: تم میرے بھائی ہو دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ (جامع ترمذی)

حضرت علی رضی اللہ عنہ کہتے ہیں قسم ہے اُس ذات کی جو دانے کو پھاڑ کر پودا نکالتی ہے اور جس نے جانداروں کو پیدا کیا۔ نبی اُمی صلی اللہ علیہ وسلم نے خصوصی طور پر مجھ سے فرمایا تھا کہ مجھ سے وہی محبت کرے گا جو مومن صادق ہوگا اور وہی شخص مجھ سے بغض رکھے گا جو منافق ہوگا۔ (مسلم)

حضرت علی رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ مجھ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اے علی! تمہیں عیسیٰ ابن مریم سے خاص مشابہت ہے۔ یہودیوں نے ان کے ساتھ بغض و عداوت کا رویہ اختیار کیا یہاں تک کہ ان کی ماں مریم صدیقہ پر بہتان لگایا اور نصاریٰ نے ان کے ساتھ ایسی محبت کی کہ ان کو اس مرتبہ پر پہنچایا جو مرتبہ ان کا نہیں تھا'' حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ دو طرح کے آدمی میرے بارے میں ہلاک ہوں گے۔ ایک محبت میں غلو کرنے والے جو میری وہ خوبیاں بیان کریں گے جو مجھ میں نہیں ہیں' دوسرے بغض وعداوت میں حد سے بڑھنے والے' جن کی عداوت ان کو اس بات پر آمادہ کرے گی کہ وہ مجھ پر بہتان لگائیں۔ (مسند احمد)

اس حدیث میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ ارشاد فرمایا اُس کا ظہور حضرت علی رضی اللہ عنہ

کی زندگی میں ہی ہو گیا تھا۔ خوارج کا فرقہ پیدا ہوا جو عداوت اور مخالفت میں اس حد تک چلا گیا کہ آپ کو بے دین اور واجب القتل قرار دیا۔ اور انہی کے ایک شخص ابن ملجم نے آپؓ کو شہید کر دیا اور اپنے اس عمل کو اعلیٰ درجہ کا جہاد فی سبیل اللہ سمجھا۔ اس کے برعکس آپ کی محبت میں اس حد تک غلو کرنے والے بھی پیدا ہو گئے جنہوں نے آپ کو مقامِ الوہیت تک پہنچا دیا اور ایسے بھی جنہوں نے آپ کو نبوت و رسالت کے لائق سمجھا۔ بلکہ یہ بھی کہا کہ جبریل وحی نبوت لے کر غلطی سے محمد ﷺ کے پاس چلے گئے' اللہ نے تو علی رضی اللہ عنہ کے پاس بھیجا تھا۔ اس عقیدے کے لوگ آج بھی موجود ہیں' وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں امامت مانتے ہیں اور ہر امام کو معصوم سمجھتے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ کو حضرت علی رضی اللہ عنہ' اپنی بیٹی فاطمہ رضی اللہ عنہا اور ان کی اولاد سے بہت محبت تھی۔ ایک دفعہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت حسن اور حسین رضی اللہ عنہما کا ہاتھ پکڑا اور فرمایا: جس نے مجھ سے محبت کی اور ان دونوں اور ان کے والد والدہ سے محبت کی تو وہ قیامت کے دن جنت میں میرے درجہ میں میرے ساتھ ہو گا۔ (ترمذی)

رسول اللہ ﷺ کی زبان سے نکلے ہوئے ان الفاظ سے یقیناً حضرت علیؓ کی بڑی فضیلت کا اظہار ہوتا ہے' مگر اس سے دوسرے صحابہؓ کے فضائل سے چشم پوشی کرنا قرین انصاف نہیں۔ اُمت کا متفقہ عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے بعد ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مقام سب سے بلند ہے۔ ان کے بعد عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ ہیں اور پھر حضرت علی رضی اللہ عنہ۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ جب رسول اللہ ﷺ کے بعد امیر المؤمنین بنے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اُن کی مخالفت نہیں کی بلکہ ان کے ساتھ تعاون کرتے رہے۔ اگر اُن کی خلافت جائز نہ ہوتی تو حضرت علی رضی اللہ عنہ اسے کبھی تسلیم نہ کرتے' جیسا کہ اُن کے فرزند حضرت حسینؓ نے یزید کی خلافت کو ناجائز سمجھا تو تسلیم نہ کیا۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ کے بعد عمر رضی اللہ عنہ اور عثمان رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوئے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے ان کے ساتھ بھی بھرپور تعاون کیا اور اُن کی خلافت کو حق سمجھا۔ محمد بن حنفیہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیٹے ہیں جن کی والدہ کا نام خولہ تھا جو حنفیہ قبیلے سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد ماجد حضرت علی رضی اللہ عنہ سے

دریافت کیا کہ اُمت میں رسول اللہ ﷺ کے بعد سب سے بہتر و افضل کون ہے؟ تو انہوں نے فرمایا ابوبکر رضی اللہ عنہ! میں نے کہا ان کے بعد کون؟ تو انہوں نے فرمایا عمر رضی اللہ عنہ! محمد بن حنیفہ کہتے ہیں کہ پھر مجھے خطرہ ہوا کہ اگر میں اسی طرح دریافت کروں کہ عمر کے بعد کون؟ تو یہ نہ کہہ دیں کہ عمر کے بعد عثمان رضی اللہ عنہ۔ اس لیے میں نے سوال اس طرح کیا کہ پھر عمر کے بعد آپؓ؟ تو انہوں نے فرمایا کہ میں تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمانوں میں کا ایک آدمی ہوں۔ (صحیح بخاری)

اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں ابوبکر کے برابر کسی کو نہیں سمجھتے تھے' ان کے بعد عمر' ان کے بعد عثمان۔ پھر ہم رسول اللہ ﷺ کے تمام اصحاب کو چھوڑ دیتے تھے۔ ان کے درمیان ایک کو دوسرے پر فضیلت نہیں دیتے تھے۔ (صحیح بخاری) آج تک یہی فیصلہ صائب اور قرین انصاف ہے۔

اصحابِ رسولؐ کی استقامت کی چند روشن مثالیں

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم وہ پاک باز ہستیاں تھیں جنھوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا مقدس چہرہ اپنی آنکھوں سے دیکھا اور آپؐ کے ساتھ محبت اور فرمانبرداری کا حق ادا کر دیا۔ جہاں مال کی ضرورت ہوئی مال خرچ کیا اور اگر جان دینے کا موقع آیا تو جان دینے سے بھی دریغ نہ کیا۔ صحابہؓ انسان تھے' ان سے خطائیں اور تقصیریں بھی ہوئیں' مگر اُن کی تمام تر جدوجہد اسلام کی سربلندی کے لیے تھی۔ وہ اپنے افعال میں نیک نیت تھے۔ یہی وجہ ہے کہ ربِّ کائنات نے کتابِ ہدایت میں اُن پاک باز ہستیوں سے راضی ہونے کا اعلان کر دیا رَضِیَ اللّٰہُ عَنْھُمْ وَرَضُوْا عَنْہُ۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے تربیت یافتہ تھے۔ مکہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوّلین مخاطب یہی لوگ تھے' جو عام انسان تھے اور اس بگڑے ہوئے معاشرے کے افراد تھے' مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے اُن کے اندر وہ تبدیلی آئی کہ جس معاشرے میں وہ رہ رہے تھے اس کے طور طریقوں سے انہیں شدید نفرت ہوگئی اور انہوں نے دل و جان سے اسلام کو پسند کر لیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی گواہی دے کر آپؐ کے ہر حکم کو بطیبِ خاطر قبول کر لیا۔ یہ کوئی آسان کام نہ تھا' کیونکہ اس بگڑے ہوئے معاشرے میں رہتے ہوئے انقلاب کی آواز لگانا بھڑوں کے چھتے میں ہاتھ ڈالنے کے مترادف تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے نتیجہ میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو وہ اذیتیں برداشت کرنا پڑیں کہ جن کے ذکر سے انسان کانپ اٹھتا ہے مگر وہ ان تکلیفوں کو

خندہ پیشانی سے برداشت کرتے رہے اور اپنی حقیقی کامیابی جانتے ہوئے **فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ** کا نعرہ لگاتے رہے۔

اسلام کی دعوت پر آغاز ہی میں لبیک کہنے والے اکثر و بیشتر معاشرے کے پسماندہ لوگ اور غلام تھے' جو عام طور پر دولت مند سرداروں کے زیر بار احسان تھے' مگر ان لوگوں نے حق کی حمایت میں اپنے مالی نقصان کو پر کاہ کے برابر حیثیت نہ دی۔ ایسا بھی ہوا کہ کسی شخص نے اسلام قبول کیا تو قرض خواہ ساہوکار نے اسے قرضہ معاف کرنے کا لالچ دے کر اسلام چھوڑ دینے کی ترغیب دی' مگر اس نے صاف انکار کر دیا' بلکہ اسے اپنے ایمان کا امتحان سمجھ کر اسلام کے لیے زیادہ پختہ ہو گئے۔ عاص بن وائل کے ذمہ حضرت خباب رضی اللہ عنہ کی اُجرت تھی' جب انہوں نے تقاضا کیا تو کہنے لگا کہ جب تک محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کی نبوت کا انکار نہ کرو گے تمہاری رقم نہیں دوں گا۔ اس پر حضرت خبابؓ نے کہا کہ ایسا تو ہرگز نہ ہو سکے گا۔ اگر تم مر کر دوبارہ زندہ ہو جاؤ تو بھی میں محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کا انکار نہیں کروں گا۔ (صحیح بخاری) ایسا بھی ہوتا کہ کوئی شخص ایمان لاتے ہی اپنے مورث کی جائیداد سے محروم ہو جاتا۔ جیسا کہ ہجرت کر کے جانے والے تقریباً سب اصحابِ رسول کو یہ نقصان اٹھانا پڑا مگر کسی کے پاؤں میں ذرہ برابر لغزش نہ آئی۔ الغرض کسی طرح کا لالچ اصحابِ رسولؐ کو حق سے برگشتہ نہ کر سکا۔ عیسائی شاہِ حبشہ نے جب اپنے دربار میں جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق دریافت کیا تو حضرت جعفرؓ نے شاہی دربار کے رعب کو کچھ بھی اہمیت نہ دی اور نہ اس بات کو خاطر میں لائے کہ نصرانی بادشاہ ناراض ہو جائے گا' بلکہ بھرے مجمع میں حق کا اعلان اس طرح کیا جس طرح قرآن مجید میں تھا۔ یعنی ''عیسیٰ خدا کے بندے اور اس کے رسول ہیں' اس کی روح اور اس کا کلمہ ہیں''۔ یہ سن کر نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا عیسیٰ بن مریم اس کے سوا ایک تنکے سے بھی زیادہ نہیں۔ (مسند احمد بن حنبل)

اسلام کی خاطر سختیاں برداشت کرنے میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی استقامت کی مثال نہیں ملتی۔ وہ غلام تھے۔ اُن کا آقا اُمیہ بن خلف انہیں لوہے کی زرہ پہنا کر دھوپ میں ڈال دیتا۔ لڑکے انہیں مکہ کی سنگلاخ پہاڑیوں پر گھسیٹتے پھرتے مگر ان کی قوتِ ایمانی

میں ذرہ برابر کمزوری نہ آئی بلکہ وہ مسلسل اَحد اَحد پکارتے رہے۔

حضرت عمار اور یاسر رضی اللہ عنہما بھی حد درجہ ستائے گئے۔ ایک دفعہ حضرت یاسر' حضرت عمار اور اُمّ عمار حضرت سمیہ رضی اللہ عنہم کو اذیت پہنچائی جا رہی تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کے پاس سے گزرے۔ آپؐ نے فرمایا: ''آلِ یاسر صبر کرو' اے آلِ یاسر صبر کرو' کیونکہ تم سے وعدہ کیا گیا ہے کہ تمہیں جنت ملے گی''۔ ابوجہل نے برچھی مار کر حضرت سمیہ رضی اللہ عنہا کو شہید کر دیا۔ (اُسد الغابہ) اسلام میں سب سے پہلے شرفِ شہادت اس خاتون کو نصیب ہوا۔

حضرت خباب بن ارت رضی اللہ عنہ نے اپنے اسلام کا اعلان کیا تو اُن پر حد درجہ سختی کی گئی تا کہ وہ اسلام چھوڑ دیں۔ حضرت خبابؓ اُمّ انمار کے غلام تھے۔ مشرکوں نے حضرت خبابؓ کے لیے کوئلے دہکائے اور انہیں ننگی پیٹھ ان کے اوپر لٹا دیا۔ حضرت خبابؓ کی چربی نے اس آگ کو بجھایا۔ (اسد الغابہ) مگر یہ سختی حضرت خبابؓ کے پائے استقامت میں لغزش نہ پیدا کر سکی۔

حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ مکہ کے خوبصورت ترین نوجوان تھے' انتہائی خوش لباس تھے' خوشحال ماں باپ کے بیٹے تھے۔ اس نوجوان پر اللہ مہربان ہوا' اس نے اسلام قبول کیا مگر اپنے والدین اور قوم کے خوف سے اپنے اسلام کو چھپائے رکھا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خفیہ ملاقاتیں کرتا رہا۔ ایک دن کسی نے اُن کو نماز پڑھتے دیکھ لیا تو جا کر ان کی والدہ اور قوم کے افراد کو بتا دیا۔ اس پر انہیں پابند سلاسل کر دیا گیا۔ یہ وہاں سے نکل کر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ جب دوسرے مسلمانوں کے ساتھ واپس مکہ آئے تو ان کی خستہ حالت قابل رحم تھی۔ ناز و نعم میں پروردہ یہ نوجوان اپنا حسن و جمال اور خوش پوشی اسلام پر قربان کر چکا تھا۔ یہ وہی مصعب بن عمیرؓ ہیں جنہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت سے پہلے مبلغ بنا کر مدینہ میں بھیجا تھا۔ جہاں اُن کی تبلیغ سے بہت سے لوگ اسلام لے آئے۔ (ابن سعد)

حضرت عثمان بن مظعون رضی اللہ عنہ ولید بن مغیرہ کی پناہ میں تھے۔ اسلام قبول کر چکے تھے مگر آسودہ زندگی گزار رہے تھے۔ خیال آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو تکلیفیں اٹھائیں اور

میں آرام میں رہوں، ایسا نہیں ہوسکتا۔ چنانچہ ولید بن مغیرہ کی پناہ سے نکل گئے۔ اب ان پر بھی سختیاں شروع ہوئیں۔ حق گوئی کی پاداش میں ایک کافر نے غصے میں آ کر اُن کے منہ پر ایسا تھپڑ مارا کہ ان کی ایک آنکھ سیاہ ہوگئی۔ اس پر ولید بن مغیرہ نے کہا میرے بھتیجے! اگر تم میری پناہ میں رہتے تو تمہیں ہرگز تکلیف نہ پہنچتی۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے کہا تمہاری بات ٹھیک ہے لیکن اللہ کی قسم میرا دل چاہ رہا ہے کہ اللہ کے دین کی خاطر میری تندرست آنکھ کو بھی وہی تکلیف پہنچے جو دوسری کو پہنچی ہے۔ میں اُس ذات کی پناہ میں ہوں جو بہت عزت والے اور بڑی قدر والے ہیں۔ ولید نے حضرت عثمانؓ سے کہا دوبارہ میری پناہ میں آ جاؤ مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ (البدایہ)

حضرت ابوفکیہ رضی اللہ عنہ کو اسلام لانے پر مشرکین دھوپ میں لٹا دیتے، پھر پشت پر پتھر رکھ دیتے۔ یہاں تک کہ اُن کے حواس جاتے رہتے۔ ایک دن اُمیہ نے اُن کے پاؤں میں رسی باندھی اور لوگ انہیں گھسیٹنے لگے۔ پھر انہیں تپتی ہوئی زمین پر لٹا دیا۔ اسی دوران راہ میں ایک گبریلا جا رہا تھا۔ اُمیہ نے حقارت کے ساتھ کہا ''ابوفکیہ تیرا پروردگار یہی تو نہیں؟'' انہوں نے جواب دیا: ''میرا اور تیرا پروردگار اللہ تعالیٰ ہے''۔ اس پر اُس نے زور سے آپ کا گلا دبایا۔ ابوفکیہ کا سنگ دل بھائی جو پاس ہی کھڑا تھا کہنے لگا اس کو اور اذیت دو (اسد الغابہ) ان ساری سختیوں کے باوجود ابوفکیہ رضی اللہ عنہ کے پائے استقلال میں ذرا بھر لغزش نہ آئی۔

حضرت زبیر بن العوام رضی اللہ عنہ جب اسلام لائے تو ان کے چچا ان کو چٹائی میں لپیٹ دیتے اور آگ کا دھواں ان کی ناک میں سے گزارتے اور کہتے کفر کی طرف واپس لوٹ آؤ۔ حضرت زبیرؓ کہتے اب کبھی کافر نہ بنوں گا (طبرانی)۔ ایک شخص نے آپ کے جسم پر زخموں کے نشان دیکھے تو کہنے لگا میں نے اتنے زخم کسی اور کے جسم پر نہیں دیکھے۔ حضرت زبیرؓ نے کہا اللہ کی قسم ان میں سے ہر زخم مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں اللہ کی خاطر لگا ہے۔ (طبرانی)

حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو ان کے چچا حکم بن ابوالعاص بن

امیہ نے انہیں رسّی میں باندھ دیا اور کہا تم نے اپنے باپ دادا کا دین چھوڑ کر نیا دین اختیار کرلیا ہے' جب تک تم اس دین کو نہ چھوڑو گے میں تمہیں نہیں کھولوں گا۔ اس پر حضرت عثمانؓ نے اللہ کی قسم کھا کر کہا کہ میں اس دین کو ہرگز نہ چھوڑوں گا۔ جب حَکَم اُن کی استقامت کے سامنے بے بس ہوگیا اور محسوس کرلیا کہ عثمان اپنے دین کو نہیں چھوڑے گا تو ان کی رسّی کھول دی۔ (ابن سعد)

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مردوں میں سب سے پہلے اسلام لے آئے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست و بازو بن گئے۔ ہمہ وقت آپؐ کی صحبت میں رہتے اور اسلام کی تبلیغ میں لگ گئے۔ آپؓ کی دعوت پر کئی لوگوں نے اسلام قبول کیا۔ جب مرد صحابہ کی تعداد اڑتیس تک پہنچ گئی تو حضرت ابوبکرؓ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ اب کھل کر اسلام کی تبلیغ کرنی چاہیے مگر آپؐ نے اجازت نہ دی۔ جب ان کا اصرار زیادہ ہوا تو آپؐ نے اجازت دے دی۔ چنانچہ ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ حرم شریف کے اندر مجمع عام میں اسلام کی دعوت کے لیے کھڑے ہو گئے۔ وہاں دوسرے مسلمان بھی موجود تھے۔ حضرت ابوبکر کا بیان سن کر مشرکین آپؓ پر پل پڑے اور آپ کو مارنا شروع کردیا۔ اتنا مارا کہ آپؓ بے ہوش ہو گئے۔ بنوتیم والے انہیں ان کے گھر لے گئے۔ جب انہیں ہوش آیا تو پوچھا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال ہے۔ اس پر بنوتیم والے بھی آپ کو چھوڑ کر چلے گئے۔ آپ کی والدہ نے کچھ کھانے کو کہا تو آپ نے انکار کردیا۔ آپ کے سخت اصرار پر وہ آپ کو دارارقم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گئیں۔ ابوبکر کو دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر رقت طاری ہوگئی' ان پر جھک گئے اور ان کا بوسہ لیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا اے اللہ کے رسول میری والدہ کے حق میں دعا فرمائیں کہ وہ حق قبول کرلیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ کی والدہ کو حق کی دعوت دی اور اُن کے حق میں دعا کی۔ چنانچہ ان کی والدہ نے اسلام قبول کرلیا۔

جب حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی خبر ہوئی تو انہوں نے اپنے بھائی کو حالات سے آگاہی کے لیے مکہ بھیجا۔ بھائی مکہ پہنچا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں اور آ کر حضرت ابوذرؓ کو اطلاع دی کہ وہ عمدہ کلام سناتے ہیں اور عمدہ اخلاق

اختیار کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ یہ سن کر حضرت ابوذرؓ خود سامانِ سفر لے کر مکہ کی طرف چل پڑے۔ وہاں حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ملاقات ہوئی اور آپ اُن کی معیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں سنیں اور اسی جگہ مسلمان ہو گئے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اپنے قبیلے میں واپس جانے کو کہا مگر حضرت ابوذرؓ نے کہا قسم ہے اُس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں اس کلمۂ توحید کا کافروں کے درمیان کھڑے ہو کر پورے زور سے اعلان کروں گا۔ چنانچہ وہ چل کر مسجد حرام میں آئے اور کلمۂ شہادت بلند کیا۔ یہ سن کر مشرکین اُن پر حملہ آور ہو گئے۔ اُن کو اتنا مارا کہ وہ لہولہان ہو گئے۔ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے آ کر انہیں کافروں سے چھڑایا مگر اگلے دن ابوذر نے پھر ایسا ہی کیا اور کافروں نے پھر انہیں زدوکوب کیا۔ (صحیح بخاری)

مشہور واقعہ ہے کہ عمر بن خطاب رضی اللہ عنہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سرگرمیوں کا علم ہوا تو انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا اور تلوار لے کر چل پڑے۔ راستے میں انہیں معلوم ہوا کہ ان کی بہن فاطمہؓ اور بہنوئی سعید بن زیدؓ مسلمان ہو چکے ہیں۔ اس پر عمر بن خطاب غصے سے لال پیلے ہو کر بہن کے گھر کی طرف چل پڑے۔ بہن اور بہنوئی نے اسلام کا اقرار کیا تو عمر نے سعید بن زید کو بری طرح پیٹنا شروع کر دیا۔ بہن چھڑانے آئی تو اس کا چہرہ بھی زخمی کر دیا۔ بہن کا خون دیکھ کر عمر کا دل پسیجا۔ بہن اور بہنوئی سے گفتگو کی۔ اُن کی استقامت دیکھ کر عمر نے بھی اسلام قبول کر لیا۔ میاں بیوی پر یہ سختی انہیں اسلام سے برگشتہ نہ کر سکی بلکہ عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام کا باعث بن گئی۔ (صحیح بخاری) اونٹ چرانے والے یہ وہی عمر ہیں جو اسلام لانے کی بدولت امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ بنے اور جن کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''اگر میرے بعد کوئی نبی ہوتا تو عمرؓ ہوتے۔''

اسلام کی خاطر اصحابِ رسولؐ نے طرح طرح کی تکلیفات برداشت کیں مگر اُن کے پائے استقلال متزلزل نہ ہوئے۔ اپنے عزیز رشتہ داروں، ماں باپ سے کٹ جانا معمولی بات نہیں، کیونکہ یہی لوگ مشکل کی گھڑی میں کام آتے ہیں۔ اصحابِ رسول رضی اللہ عنہم کو قطع علائق کا بھی سامنا کرنا پڑا مگر انہوں نے دنیا کی تمام محبتوں کو اسلام کی خاطر قربان کر دیا۔

حضرت سعد بن ابی وقاص رضی اللہ عنہ نے اسلام قبول کیا تو اُن کی ماں سخت ناراض ہوئی اور قسم کھائی کہ جب تک وہ اسلام نہ چھوڑیں گے وہ نہ ان سے کلام کرے گی اور نہ کھائے پیے گی۔ ماں نے تین دن بھوک پیاس میں گزارے اور فاقے کی شدت سے بے ہوش ہو گئی مگر حضرت سعدؓ پر اس کا کچھ اثر نہ ہوا۔ انہوں نے اپنی ماں سے صاف کہہ دیا کہ اگر تم ہزار بار بھی مر وتب بھی میں اس دین کو نہ چھوڑوں گا۔ (اسد الغابہ)

حضرت عیاش بن ابی ربیعہ اور حضرت سلمہ بن ہشام رضی اللہ عنہما اسلام لائے تو کفار نے دونوں کے پاؤں کو اکٹھا باندھ دیا مگر اُن کی یہ سختی بے اثر رہی (طبقات ابن سعد)۔ اسی طرح حضرت خالد بن سعید رضی اللہ عنہ اسلام لائے تو ان کے باپ نے اُن پر سختی شروع کی' کوڑے مارے' قید کیا' کھانے پینے کو کچھ نہ دیا' گھر کے تمام افراد نے اُن کے ساتھ بول چال بند کر دی' مگر اس سختی کا حضرت خالدؓ پر ذرا بھی اثر نہ ہوا اور انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ چھوڑا اور اہل خانہ کی لاتعلقی اور تکالیف کو اسلام کی خاطر بطیب خاطر گوارا کر لیا۔

حضرت عبداللہ بن حذافہ رضی اللہ عنہ گرفتار ہو کر رومی بادشاہ کے سامنے پیش کیے گئے' اُس نے طرح طرح سے آپ کو دین اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کی۔ سب سے پہلے اُس نے یہ کہا کہ اے عبداللہ میں تمہیں اپنے ملک اور سلطنت میں شریک کر لوں گا اگر تم اسلام چھوڑ دو' مگر حضرت عبداللہؓ نے صاف انکار کر دیا۔ بادشاہ نے قتل کی دھمکی دی جو بے اثر رہی۔ پھر اس نے حضرت عبداللہؓ کو سولی پر لٹکا دیا اور ان کو خوفزدہ کرنے کے لیے اُن پر اس طرح تیروں کی بارش کر دی کہ تیر ان کے جسم کے پاس سے گزریں۔ پھر انہیں عیسائیت قبول کرنے کو کہا' مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ پھر انہیں اُبلتے ہوئے پانی کی دیگ میں ڈالنے کی دھمکی دی اور اُن کے سامنے ایک قیدی کو ابلتے پانی میں ڈال کر ہلاک بھی کر ڈالا۔ اب اُن کے سامنے عیسائیت پیش کی مگر حضرت عبداللہؓ نے صاف صاف انکار کر دیا۔ بادشاہ عبداللہؓ کی استقامت سے بہت متاثر ہوا کہ یہ کس قسم کا انسان ہے اور اس کی اسلام کے ساتھ کس درجہ وابستگی ہے کہ وہ اس کی خاطر ہر تکلیف برداشت کرنے کے لیے تیار ہے بلکہ اپنی جان دینا بھی اس کو عین گوارا ہے۔ اب بادشاہ نے کہا کہ تم

میرے سر کا بوسہ لے لو تو میں تمہیں آزاد کر دوں گا۔ حضرت عبداللہؓ نے کہا صرف مجھے نہیں بلکہ تمام مسلمان قیدیوں کو چھوڑنے کا وعدہ کرو۔ چنانچہ اس نے وعدہ کر لیا۔ حضرت عبداللہؓ نے بادشاہ کے سر کا بوسہ لیا اور تمام مسلمان قیدیوں کو لے کر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خدمت میں حاضر ہو گئے اور بتا دیا کہ میں ہرگز اس نصرانی بادشاہ کے سر کا بوسہ نہیں لینا چاہتا تھا مگر میں نے تمام مسلمان قیدیوں کی آزادی کی خاطر ایسا کر لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے اس کام سے بہت خوش ہوئے۔ (کنزالعمال)

اصحابِ رسولؐ میں عبداللہ نامی چار شخصیات نہایت ممتاز اور صاحبِ عزیمت و فضیلت تھیں، جن کے لیے ''عبادلہ اربعہ'' کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔ وہ تھے عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن عمرؓ، عبداللہ بن زبیر اور عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم۔ ان کے یادگار کارنامے، خدمات اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بے مثال محبت اُمت کے لیے سرمایۂ افتخار ہے۔ ان کے علاوہ اصحابِ رسولؐ میں ایک عبداللہ اور بھی ہیں جنھوں نے اسلام کی خاطر اپنی ہر شے قربان کر دی۔ صرف تن میں جان باقی تھی وہ بھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور شہادت کے لیے پیش کر دی۔ قبل از اسلام عبدالعزیٰ نام تھا۔ ابھی شیرخوارگی کے دور میں تھے کہ والد فوت ہو گیا۔ چچا کی سرپرستی میں بچپن اور لڑکپن گزارا۔ جوان ہوئے تو چچا نے ضرورت کی ہر چیز مہیا کر کے انہیں خود کفیل کر دیا۔ ہجرتِ نبویؐ کے بعد جب دُور و نزدیک اسلام کا چرچا ہوا تو اس نوجوان کے مقدر بھی جاگ اٹھے۔ اس نے قبولِ اسلام کا ارادہ کر لیا بلکہ دل ہی دل میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔ چچا کا زیرِ بار احسان تھا۔ انتظار کرتا رہا کہ چچا اسلام لے آئے تو وہ بھی اپنے اسلام کا اعلان کر دے۔ اسی انتظار میں ماہ و سال گزر گئے، یہاں تک کہ مکہ فتح ہو گیا۔ اب اس جوان میں مزید صبر کا یارا نہ رہا۔ اپنے چچا کے پاس جا کر اپنے اسلام کا اعلان کر دیا۔ یہ سن کر چچا آپے سے باہر ہو گیا، ڈرایا دھمکایا، مگر بے اثر۔ آخر چچا نے کہا تمہارے پاس جو کچھ ہے وہ میں نے دیا ہے، وہ سب کچھ میں تجھ سے چھین لوں گا۔ یہ جوان کہنے لگا یہ دنیاوی چیزیں چند روز تک مجھ سے ویسے ہی چھن جائیں گی، آپ لے لیں گے تو پھر کیا۔ چچا نے اس سے ہر چیز لے لی۔ چچا

نے تقاضا کیا تو بدن کے کپڑے' پاؤں کے جوتے اور تہبند بھی اتار کر چچا کے حوالے کر دیا۔ مادرزاد برہنہ ماں کے گھر گئے۔ ماں نے دیکھ کر آنکھیں بند کر لیں اور پریشان ہو کر پوچھا تو جواب دیا کہ میں مؤمن و مؤحد ہو گیا ہوں' مجھے ستر پوشی کے لیے کپڑا دے دیجیے۔ ماں نے ایک کمبل دیا' جوان نے اس کے دو ٹکڑے کیے۔ ایک کو تہبند کے طور پر باندھا اور دوسرا چادر کے طور پر اوڑھ کر مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ رسول اللہ ﷺ سے ملاقات ہوئی۔ حالات سنائے۔ نام بتایا تو آپؐ نے فرمایا: نہیں' آج سے تمہارا نام عبداللہ ہے' تم یہیں ہمارے قریب ٹھہرو اور مسجد میں رہا کرو۔ ایک دن اونچی آواز میں قرآن کریم کی تلاوت کر رہے تھے۔ عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے ٹوکا تو آپ ﷺ نے فرمایا: عمر اس کو چھوڑ دو' یہ تو خدا اور رسول کے لیے سب کچھ چھوڑ آیا ہے۔

جنگ تبوک کا موقع آیا جس میں اصحابِ رسول نے اونٹ' گھوڑے اور درہم و دینار پیش کیے۔ حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ کے پاس جسم و جان کے سوا کچھ بھی تو نہیں تھا۔ انہوں نے رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر کہا' حضورؐ میرے حق میں شہادت کی دعا فرمائیے۔ آپؐ نے فرمایا کسی درخت کا چھلکا اتار کر لے آؤ۔ آپؐ نے وہ چھلکا عبداللہؓ کے بازو پر باندھا اور دعا کی اے اللہ میں عبداللہ کا خون کفار پر حرام کرتا ہوں۔ عبداللہؓ نے اس دعا پر حیرت کا اظہار کیا' کیونکہ وہ تو شہادت کے آرزومند تھے۔ اس پر حضور ﷺ نے فرمایا: جب تم راہِ خدا میں نکل پڑے اب اگر بخار سے بھی مر جاؤ تو تم شہید ہو۔ تبوک پہنچے تو عبداللہ کو واقعی بخار آ گیا جس سے وہ فوت ہو گئے۔ رسول اللہ ﷺ نے اپنے ہاتھ سے ان کی قبر بنائی۔ دفن کے بعد دعا کی اے اللہ میں آج شام تک اس مرنے والے سے خوش رہا ہوں' تو بھی اس سے راضی ہو جا۔ (بحوالہ موت انسانیت کے دروازے پر' از ابوالکلام آزاد)

اصحابِ رسولؐ نے ڈھونڈ ڈھونڈ کر اور تلاش کر کے اسلام حاصل کیا۔ انہوں نے حصولِ اسلام کی راہ میں حد سے زیادہ تکالیف اٹھائیں' وہ دولتِ اسلام کے حقیقی قدردان ہوئے۔ آج ہم لوگوں کو مفت میں اسلام کی دولت مل گئی۔ پیدا ہوتے ہی کان

میں توحید و رسالت کی آواز ڈال دی گئی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم لوگ نعمت ایمان پر اللہ کا شکر ادا کریں، خود اسلام کے احکام سیکھیں، اُن پر دل و جان سے عمل کریں اور اپنے دائرہٴ اختیار میں اسلام کی باتیں دوسروں تک پہنچائیں۔ اسلام کی جامع تعلیمات کو فروغ دیں اور دین کی سربلندی کے لیے اپنا مال اور صلاحیتیں صرف کریں تاکہ عند اللہ سرخرو ہوسکیں۔ اسلام سب سے بڑی بلکہ حقیقی نعمت ہے، اس کی قدر کرنا ضروری ہے، کیونکہ قدر و قیمت والی چیز کی قدر نہ کرنا جاہلانہ بات ہے جس کا انجام انتہائی خوفناک ہے۔

الجہاد فی الاسلام

اسلام مکمل ضابطۂ حیات ہے۔ یہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے جامع ہدایات دیتا ہے۔ اسلام امن کا دین ہے۔ امن کے قیام کے لیے اجتماعی اور منظّم جدو جہد ضروری ہے۔ اس جدو جہد کے نتیجے میں عوام الناس سکھ کا سانس لیں گے۔ چونکہ معاشرے میں قیامِ امن کے لیے شریعت اسلامی کا نفاذ ضروری ہے' اس لیے مسلمان کسی غیر مسلم حکومت کے تحت اسلامی زندگی نہیں گزار سکتے ہیں۔ اسلامی احکام پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان پورے طور پر آزاد ہوں۔ لہٰذا اپنی آزادی کی حفاظت کے لیے ٹھوس بنیادوں پر جدو جہد کرنا ہر مسلمان کے فرائض میں شامل ہے۔

جہاد ہر اس سعی و جہد کو کہتے ہیں جو اللہ کے دین کی سربلندی کے لیے کی جائے۔ اسی لیے جہاد کا آغاز ہر مسلمان اپنی ذات سے کرے گا' حقوق اللہ اور حقوق العباد کی ادائیگی کو اپنے لیے لازم ٹھہرائے گا اور پھر دوسروں کو اس کی ترغیب دے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ انسان کی نجات صرف دین اسلام کے قبول کرنے میں ہے۔ قرآن مجید میں ہے: ﴿وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ﴾(آل عمران: ۸۵) ''جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی اور دین اختیار کرے گا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا''۔ چنانچہ بنی نوع انسان کے ساتھ ہمدردی کی خاطر مسلمان کوشش کریں گے کہ سب لوگ اسلام میں داخل ہو جائیں' لیکن ایسا ہونا آسان نہیں' کیونکہ اسلام کے علاوہ دوسرے کئی نظریات انسانوں نے پیدا کر رکھے ہیں جن کے ساتھ ان کے دنیوی مفادات وابستہ ہیں اور وہ ان مفادات کو قربان نہیں کرنا چاہتے۔ پھر شیطان اولادِ آدم کا ازلی دشمن ہے' وہ نہیں چاہتا کہ انسان نجات کا راستہ اختیار کرے۔

دین کی سربلندی کے لیے جدو جہد زبان سے بھی کی جا سکتی ہے' قلم سے بھی' مال

سے بھی اور ضرورت ہو تو تلوار سے بھی۔ زبان کا جہاد یہ ہے کہ انسان دوسرے لوگوں کو زبان سے سمجھائے بجھائے اور انہیں صراطِ مستقیم کی طرف دعوت دے اور اُن کو اس کے فوائد ذہن نشین کرائے۔ جہاد بالقلم یہ ہے کہ اپنی تحریروں کے ذریعے مخلوقِ خدا کو خدا کے احکام سے واقف کرے اور یہ باور کرائے کہ خالق کے احکام انسانوں کے بنائے ہوئے ضابطوں پر ہر لحاظ سے فوقیت رکھتے ہیں۔ جہاد بالمال یہ ہے کہ اپنا مال دین کی سربلندی کے لیے خرچ کرے، یعنی اُن تحریکات اور سرگرمیوں میں مالی تعاون پیش کرے جن کا مقصد اعلائے کلمۃ اللہ ہو۔ جہاد بالسیف جہاد کی آخری صورت ہے جس کی ضرورت اس وقت پیش آتی ہے جب نفاذِ اسلام کے راستے میں رکاوٹیں پیدا کی جائیں، مسلمانوں کو ظلم وستم کا نشانہ بنایا جائے، کفر کی بالادستی قائم کرنے اور اسلام کو مٹانے کے لیے کارروائیاں کی جائیں۔ اس وقت ضروری ہوگا کہ کفر کی سیاسی اور عسکری قوت کو توڑا جائے تا کہ وہ اپنے شیطانی عقائد واعمال پھیلانے کے قابل نہ رہے۔ البتہ جو لوگ اپنے غلط عقیدوں پر قائم رہنا چاہیں، انہیں قبولِ اسلام پر مجبور نہیں کیا جائے گا، مگر انہیں اس بات کی اجازت بھی نہ ہوگی کہ وہ اپنے باطل عقائد ونظریات دوسروں میں پھیلائیں۔

ایسا بھی ہوگا کہ کفر کی طاقت اسلامی علاقے پر حملہ آور ہو جائے اور مسلمانوں کو غلام بنانے کی کوشش کرے۔ ایسی صورت میں ان کے خلاف مال اور جان کے ساتھ جہاد کیا جائے گا۔ اس جہاد کا مقصد نہ مالی فوائد حاصل کرنا ہوگا نہ کوئی دنیوی منافع، بلکہ اس کا مقصد کفر کے غلبے کا توڑ اور اسلام کو سربلند کرنے کے علاوہ کچھ نہ ہوگا ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت نہ کشور کشائی!

اہل اسلام کے لیے ضروری ہے کہ دنیا میں عزت اور وقار کی زندگی گزارنے کے لیے اور آخرت میں اعزاز واکرام پانے کے لیے ہر وقت جہاد کے لیے تیار رہیں اور اس ضمن میں کسی غفلت اور سستی کا شکار نہ ہوں، اگر ایسا نہ ہوا تو ذلت اور خواری ان کا مقدر بن جائے گی اور وہ جان جس کو بچانے کے لیے انہوں نے جہاد سے گریز کیا وہ ذلیل وخوار ہو کر زندہ رہے گی اور آخرت کا خسارہ عذاب کی صورت میں ان کے حصہ میں آئے گا۔

مجاہدانہ زندگی بسر کرنا رسول اللہ ﷺ کا مشن تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ کے واحد پسندیدہ دین کو غالب کرنے میں لگے رہے۔آ پؐ نے اس فرض کی ادائیگی میں کما حقہ جدو جہد کی یہاں تک کہ الرفیق الاعلیٰ سے جا ملے۔ رسول اللہ ﷺ کی پیروی میں ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ آ پؐ کے مشن کی تکمیل میں لگ جائے۔ اس مقصد کی خاطر جو بھی جدو جہد کی جائے گی وہ جہاد کہلائے گی۔ جہاد کے بغیر مسلمان کی زندگی اسلامی زندگی نہیں ہو گی۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے ساتھیوں کی زندگیاں سراسر جہاد تھیں۔ وہ ہر وقت رسول اللہ ﷺ کے حکم کے منتظر رہتے تھے کہ کب جہاد کے لیے نکلنے کا اعلان ہو اور وہ اس مقدس فرض کی ادائیگی کے لیے چل پڑیں۔ جذبہ جہاد اُن لوگوں کے اندر کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔ جہاد کے بارے میں قرآن مجید کی بہت سی آیات اُن کے سامنے موجود تھیں۔سورۃ التوبہ میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَهَاجَرُوْا وَجٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ۙ اَعْظَمُ دَرَجَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ وَاُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْفَاۗىِٕزُوْنَ ⑳ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُمْ بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَّجَنّٰتٍ لَّهُمْ فِيْهَا نَعِيْمٌ مُّقِيْمٌ ㉑ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ اِنَّ اللّٰهَ عِنْدَهٗٓ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ㉒﴾

''اللہ کے ہاں تو انہی لوگوں کا درجہ بڑا ہے جو ایمان لائے اور جنہوں نے اس کی راہ میں گھر بار چھوڑے اور جان و مال سے جہاد کیا' وہی کامیاب ہیں۔ اُن کا رب انہیں اپنی رحمت' خوشنودی اور ایسی جنتوں کی بشارت دیتا ہے جہاں ان کے لیے پائیدار عیش کے سامان ہیں۔ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ یقیناً اللہ کے پاس خدمات کا صلہ دینے کو بہت کچھ ہے۔''

پھر اسی سورت میں مسلمانوں کی زندگی میں جہاد کی اہمیت کو واضح کرتے ہوئے فرمایا:

﴿اَمْ حَسِبْتُمْ اَنْ تُتْرَكُوْا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِيْنَ جٰهَدُوْا مِنْكُمْ وَلَمْ يَتَّخِذُوْا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلَا رَسُوْلِهٖ وَلَا الْمُؤْمِنِيْنَ وَلِيْجَةً ۭ وَاللّٰهُ خَبِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ⑯﴾

''کیا تم لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ یونہی چھوڑ دیے جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے یہ تو دیکھا ہی نہیں کہ تم میں سے کون وہ لوگ ہیں جنہوں نے (اُس کی راہ میں)

جاں فشانی کی اور اللہ اور رسولؐ اور مؤمنین کے سوا کسی کو جگری دوست نہ بنایا۔ جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔''

گویا جہاد کے بغیر زندگی گزارنا حقیقی فوز و فلاح کے راستے میں رکاوٹ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَنْ مَاتَ وَلَمْ يَغْزُ وَلَمْ يُحَدِّثْ بِهٖ نَفْسَهٗ مَاتَ عَلٰى شُعْبَةٍ مِنْ نِفَاقٍ))(۱)

''جو شخص اس طرح مر گیا کہ نہ اس نے کبھی جہاد کیا اور نہ اپنے دل کے ساتھ کبھی اللہ کی راہ میں لڑنے کے بارے میں بات کی تو وہ ایک قسم کے نفاق پر مرا۔''

الغرض جہاد ایک مسلمان کی ہر وقت کی تمنا ہے۔ اگر اس تمنا کے بغیر دنیاوی لذات میں گم ہو کر زندگی گزار دی تو گویا یہ زندگی مؤمنانہ نہیں بلکہ منافقانہ ہے۔ مسلمان کو تو جذبۂ جہاد سے سرشار رہنا چاہیے اور شہادت کی تمنا کرنی چاہیے کہ شہادت کی موت تو دنیا کی خوشحال اور نعمتوں بھری زندگی سے کروڑوں گنا سے بھی زیادہ پُر کشش، لذیذ اور خوبصورت زندگی کا باعث بنے گی۔ اللہ کی راہ میں جان دینے والا شہید ہے اور شہید کے لیے جنت کا وعدہ ہے اور جنت وہ مقام ہے کہ اس کی نعمتوں کی حقیقت جاننا کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ شہید کو دوزخ کی آگ سے محفوظ و مامون رکھا جائے گا۔ حضرت ابوعبس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا اغْبَرَّتْ قَدَمَا عَبْدٍ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَتَمَسَّهُ النَّارُ)) (۲)

''یہ نہیں ہو سکتا کہ کسی بندے کے قدم راہِ خدا میں چلنے سے گرد آلود ہوئے ہوں پھر ان کو دوزخ کی آگ چھو سکے۔''

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اپنا یہ حال تھا کہ خود اپنے لیے شہادت کی شدید تمنا رکھتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((وَالَّذِيْ نَفْسِيْ بِيَدِهٖ لَوْ لَا اَنَّ رِجَالًا مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ لَا تَطِيْبُ اَنْفُسُهُمْ اَنْ يَتَخَلَّفُوْا عَنِّيْ وَلَا اَجِدُ مَا اَحْمِلُهُمْ عَلَيْهِ مَا تَخَلَّفْتُ عَنْ سَرِيَّةٍ تَغْزُوْ فِيْ

(۱) صحیح مسلم، کتاب الامارۃ، باب ذم من مات ولم یغز ولم یحدث نفسہ بالغزو۔

(۲) صحیح البخاری، کتاب الجھاد والسیر، باب من اغبرت قدما فی سبیل اللّٰہ۔

سَبِیْلِ اللّٰہِ وَالَّذِیْ نَفْسِیْ بِیَدِہٖ لَوَدِدْتُ اَنِّیْ اُقْتَلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْیٰی ثُمَّ اُقْتَلُ)) (۳)

''اُس پاک ذات کی قسم جس کے قبضہ میں میری جان ہے اگر یہ بات نہ ہوتی کہ بہت سے اہل ایمان کے دل اس پر راضی نہیں کہ وہ جہاد کے سفر میں میرے ساتھ چلنے سے پیچھے رہ جائیں اور میرے پاس ان کے لیے سواریوں کا انتظام نہیں ہے (اگر یہ مجبوری حائل نہ ہوتی) تو میں راہِ خدا میں جہاد کے لیے جانے والی ہر جماعت کے ساتھ جاتا (اور جہاد کی ہر مہم میں حصہ لیتا)۔ قسم اس ذات پاک کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے' میری دلی آرزو ہے کہ میں راہِ خدا میں شہید کیا جاؤں اور پھر مجھے زندہ کر دیا جائے اور میں پھر شہید کیا جاؤں' اور پھر مجھے زندہ کیا جائے اور میں پھر شہید کیا جاؤں اور پھر مجھے زندگی عطا فرمائی جائے اور پھر میں شہید کیا جاؤں۔''

رسول اللہ ﷺ شہادت کی موت کی فضیلت سے کماحقہ آگاہ تھے اس لیے وہ اپنے لیے شہادت کی تمنا رکھتے تھے' مگر آپ ﷺ کا مقام ومرتبہ تو شہادت کی موت کے بغیر ہی بہت بلند تھا۔ آپؐ تو امام الانبیاء تھے' حاملِ مقامِ محمود تھے' چنانچہ اللہ تعالیٰ کے حکیمانہ فیصلے کے مطابق آپؐ کی وفات تو بیماری سے ہوئی' مگر آپؐ نے شہادت کی موت کی فضیلت پورے طور پر واضح فرما دی۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَا اَحَدٌ یَدْخُلُ الْجَنَّۃَ یُحِبُّ اَنْ یَّرْجِعَ اِلَی الدُّنْیَا وَلَہٗ مَا عَلَی الْاَرْضِ مِنْ شَیْءٍ اِلَّا الشَّھِیْدُ یَتَمَنّٰی اَنْ یَرْجِعَ اِلَی الدُّنْیَا فَیُقْتَلَ عَشْرَ مَرَّاتٍ لِمَا یَرٰی مِنَ الْکَرَامَۃِ)) (٤)

''جنت میں پہنچ جانے کے بعد کوئی شخص بھی پسند نہیں کرے گا کہ اس کو پھر دنیا میں

---

(۳) صحیح البخاری' کتاب الجہاد والسیر' باب تمنی الشھادۃ۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب فضل الجھاد والخروج فی سبیل اللّٰہ۔

(٤) صحیح البخاری' کتاب الجہاد والسیر' باب تمنی المجاھد ان یرجع الی الدنیا۔ وصحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب فضل الشھادۃ فی سبیل اللّٰہ تعالیٰ۔

اس حال میں واپس کر دیا جائے کہ دنیا کی ساری چیزیں اس کی ہوں (وہ سب کا مالک ہو) البتہ جو راہ خدا میں شہید ہو کر جنت میں پہنچے گا وہ اس کی آرزو کرے گا کہ اس کو پھر دنیا میں واپس کر دیا جائے اور وہ پھر (ایک دفعہ نہیں) دس دفعہ راہ خدا میں شہید کیا جائے ......وہ یہ آرزو اس لیے کرے گا کہ جنت میں دیکھے گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہیدوں کا کیسا اکرام و اعزاز ہے (اور وہاں ان کا کیا مقام و مرتبہ ہے)۔''

موت وہ اٹل حقیقت ہے کہ اس کا انکار ممکن نہیں۔ پھر موت کے بعد حقیقی اور نہ ختم ہونے والی زندگی شروع ہو جائے گی جس میں یا تو لذت' چین' سکون اور ہر طرح کی نعمتیں ہوں گی یا بداعمالی کی سزا کے طور پر آگ کا عذاب ہوگا۔ اس دنیا میں انسان حق کا ساتھ دیتے ہوئے صاف ستھری زندگی گزارنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس راستے میں اسے طرح طرح کی تکلیفیں پہنچتی ہیں مگر وہ صبر سے کام لیتا ہے تاکہ وہ آخرت کے عذاب سے بچا رہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ انسان کمزور پیدا کیا گیا ہے' انتہائی کوشش کے باوجود اُس سے گناہ کا ارتکاب ہو جاتا ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ سے مغفرت طلب کرتا ہے۔ شہید فی سبیل اللہ کو دوزخ کے عذاب سے بچاؤ اور جنت میں داخلے کی بشارت ہے اور جس کو اگلی زندگی کا سکھ اور چین ملا اُس کو اور کیا چاہیے؟ چنانچہ جب شہید فی سبیل اللہ کو جنت ملے گی تو وہ تمنا کرے گا کہ اسے بار بار زندہ کر کے شہادت کی موت مارا جائے۔ یہ اس لیے کہ وہ شہادت کی لذت اور اس کے نتیجے میں ملنے والی نعمتوں سے متمتع ہو چکا ہوگا اور اس کے لیے جانکنی کا مرحلہ انتہائی آسان ہوگا۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((مَا يَجِدُ الشَّهِيْدُ مِنْ مَسِّ الْقَتْلِ اِلَّا كَمَا يَجِدُ اَحَدُكُمْ مِنْ مَسِّ الْقَرْصَةِ)) (۵)

''راہِ خدا میں شہید ہونے والا بندہ قتل کیے جانے کے بعد بس اتنی ہی تکلیف محسوس کرتا ہے جتنی تکلیف تم میں سے کوئی آدمی چیونٹی کے کاٹ لینے کی محسوس

(۵) سنن الترمذی' کتاب فضائل الجہاد عن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باب ما جاء فی فضل المرابط۔

کرتا ہے۔''

جو شخص جہاد فی سبیل اللہ میں نکلتا ہے اس کو اس شخص کے برابر اجر ملتا ہے جو دن کو روزہ رکھتا ہو اور رات بھر عبادت کرتا ہو۔ پھر اگر وہ مجاہد فی سبیل اللہ بیمار ہو کر بھی فوت ہو جائے تو اسے شہادت کا مقام عطا ہو جاتا ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل جہاد فی سبیل اللہ کے برابر ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم لوگ اس عمل کو کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ صحابہؓ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دو یا تین مرتبہ یہ سوال کیا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی فرمایا کہ تم لوگ اس عمل کو کرنے کی استطاعت نہیں رکھتے۔ تیسری دفعہ آپؐ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی راہ میں جہاد کرنے والے کی مثال تو اس شخص کی سی ہے جو ہمیشہ روزے سے رہے، رات بھر عبادت کرتا رہے، اللہ کے احکام کی تعمیل میں مصروف رہے، روزے اور نماز (میں مسلسل مصروف رہے، ان) سے (ذرا بھی) سست نہ ہو، یہاں تک کہ مجاہد فی سبیل اللہ (جہاد سے) واپس لوٹ آئے۔ (مسلم)

اسلام کی سربلندی کے لیے کی جانے والی ہر کوشش خواہ زبان سے ہو یا قلم سے، ہاتھوں سے ہو یا پاؤں سے، دل سے ہو یا دماغ سے، تیر سے ہو یا تلوار سے، وہ جہاد ہے جس کے بغیر کسی کا اسلام معتبر ہے نہ ایمان۔ لہٰذا ہر مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اپنے عمل کا جائزہ لیتا رہے اور اس بات سے کبھی بے خبر نہ ہو کہ وہ فریضۂ جہاد سے عہدہ برآ ہو رہا ہے یا نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ جہاد نہ صرف ایک مسلمان کی تمنا اور آرزو ہے بلکہ اُس کے ایمان و اسلام کا ٹیسٹ ہے۔

اہلِ سنت والجماعت کون؟

حضرت عبداللہ بن عمروؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''بنی اسرائیل بہتر فرقوں میں تقسیم ہوئے اور میری اُمت تہتر فرقوں میں تقسیم ہو گی' اور یہ سب جہنمی ہوں گے سوائے ایک فرقہ کے (وہی جنتی ہوگا)۔ صحابہؓ نے عرض کیا حضورؐ وہ کون سا فرقہ ہوگا؟ آپؐ نے فرمایا: جو اس راستے پر ہوگا جس پر میں ہوں اور میرے اصحاب ہیں۔'' (ترمذی)

آج رسول اللہ ﷺ کے اس فرمان کی صداقت ظاہر و باہر ہے۔ اُمت مرحومہ کئی فرقوں میں بٹ چکی ہے اور ہر فرقہ اپنے آپ کو حق پر سمجھتا ہے اور مطمئن ہے۔ نہ صرف یہ بلکہ دوسروں کو حق سے منحرف سمجھتا ہے۔ ہر فرقے نے اپنا مخصوص نام رکھا ہوا ہے اور علامتیں اختیار کر رکھی ہیں اور وہ اپنے آپ کو نجات یافتہ سمجھتا ہے۔ تمام فرقے اپنے آپ کو حق اور دوسروں کو غلط ثابت کرنے کی کشاکش میں لگے ہوئے ہیں۔ ان فرقوں میں ایک فرقے کا نام ''اہل سنت والجماعت'' ہے۔ بلاشبہ یہ نام نہایت جامع اور خوب ہے' کیونکہ اسی فرقے کو آپؐ نے جنتی فرمایا ہے اور یہی وہ فرقہ ہے جس کے افراد کا یہ زعم ہے کہ وہ حق پر ہیں۔ حضرت عرباض بن ساریہؓ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''......تم میں سے جو میرے بعد زندہ رہے گا' وہ بڑے اختلاف دیکھے گا (تو ایسی حالت میں) تم اپنے اوپر میرے طریقے اور میرے خلفائے راشدین کے طریقے کی پیروی لازم کر لینا' اس کو مضبوطی سے تھام لینا اور دانتوں سے پکڑ لینا۔ اور دین میں نئی نکالی ہوئی باتوں سے اپنے آپ کو الگ رکھنا۔ اس لیے کہ دین میں نکالی ہوئی ہر بات بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔'' (مسند احمد' سنن ترمذی' سنن ابی داؤد' سنن ابن ماجہ)

نام کی حد تک تو یہ فرقہ سب سے اعلیٰ ہے' کیونکہ اس میں رسول اللہ ﷺ کی سنت اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے تعامل پر کفایت کی گئی ہے۔ سنت رسول کی اہمیت تو واضح ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے طریقے کو اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے نمونہ کے طور پر پیش کیا ہے۔ آپ انسانِ کامل تھے اور آپؐ کی زندگی بہترین نمونہ ہے۔ آپؐ کا ہر عمل معیار کی اعلیٰ ترین سطح پر ہے۔ اُمت کے افراد کے لیے آپ کے کردار و عمل کی کماحقہ پیروی تو ممکن نہیں' کیونکہ وہ براہِ راست اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں تھے' ہاں ان کے طریقے پر چلنے کی افرادِ اُمت کو تعلیم دی گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿وَمَا اٰتٰکُمُ الرَّسُوْلُ فَخُذُوْهُ وَمَا نَهٰکُمْ عَنْهُ فَانْتَهُوْا﴾ (الحشر:۷) ''جو تمہیں رسولؐ دیں وہ لے لو اور جس سے روکیں اُس سے رک جاؤ''۔ جہاں تک اصحابِ رسولؐ کی پیروی کا تعلق ہے تو ان کے عمل کو صحت کی سند رسول اللہ ﷺ نے عطا فرمائی ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت محمد ﷺ کے اصحاب اُمت کے بہترین لوگ تھے۔ دلوں کے اعتبار سے انتہا درجے کے نیک' علم کے اعتبار سے کامل' کم تکلف کرنے والے' اللہ نے انہیں اپنے نبی کی صحبت کے لیے اور اپنے دین کو قائم کرنے کے لیے چن لیا تھا' پس تم ان کی بزرگی کو سمجھو اور ان کے نقشِ قدم پر چلو اور جہاں تک ممکن ہو ان کے عادات و اخلاق کو اختیار کرو' وہی لوگ ہدایت کے سیدھے راستے پر تھے۔ (رزین)

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی حقانیت پر رسول اللہ ﷺ کے بہت سے فرمودات کتب حدیث میں موجود ہیں۔ ایک خطبے میں آپؐ نے فرمایا: میرے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے (حقوق کی ادائیگی) کے بارے میں اللہ سے ڈرو' اللہ سے ڈرو۔ ان کو میرے بعد (سب وشتم اور طعن وتشنیع کے لیے) تختۂ مشق نہ بنانا۔ (یاد رکھو) جس نے ان سے محبت کی اس نے میری محبت کی وجہ سے ان سے محبت کی اور جس نے ان سے بغض رکھا۔ اس نے مجھ سے بغض ہی کی وجہ سے ان سے بغض رکھا۔ اور جس نے ان کو تکلیف پہنچائی اس نے مجھے تکلیف پہنچائی اور جس نے مجھے تکلیف پہنچائی' اس نے اللہ کو تکلیف دی اور اس بات کا

پورا خطرہ ہے کہ (اللہ) ایسے شخص کو مبتلائے عذاب کر دے۔ (جامع ترمذی)

اصحاب النبیؐ کی فضیلت قرآن مجید میں ان الفاظ میں بیان ہوئی ہے:

﴿وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ ۙ رَّضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوْا عَنْهُ وَاَعَدَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ تَحْتَهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝۱۰۰﴾ (التوبۃ)

''اور مہاجرین اور انصار میں سے جنہوں نے ایمان لانے میں سبقت کی اور وہ جنہوں نے نیکوکاری کے ساتھ ان کی پیروی کی اللہ ان سے خوش ہے اور وہ اللہ سے خوش ہیں' اور اُس نے ان کے لیے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں' وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہ ہے بڑی کامیابی۔''

گویا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اللہ تعالیٰ کے ہاں قبولیت کا درجہ حاصل ہے اور وہ لوگ بھی حقیقی کامیابی کے ساتھ بہرہ مند ہوں گے جو ان کی پیروی کریں گے۔

پس اہل سنت والجماعت یعنی سنت رسولؐ پر عمل کرنے والے اور اصحابِ رسولؐ کے طریقہ پر چلنے والے کامیاب و کامران ہیں۔ لیکن صرف نام ہی کافی نہیں ہوتا۔ جس شخص کا نام غلام محمد ہے وہ اسم بامسمّٰی تبھی ہوگا جب وہ اپنے اخلاق و اعمال میں رسول اللہ ﷺ کی اطاعت کرتا ہو اور اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نام نرا دھوکہ ہے۔ اسی طرح اہل سنت والجماعت وہی شخص ہوگا جو صحیح معنوں میں رسول اللہ ﷺ کا مطیع فرمان اور صحابہ کے طرزِ حیات کو اپنائے ہوئے ہو' یعنی اہل سنت والجماعت کا دعویٰ کرنے والے شخص کو ثبوت میں اپنے کردار و عمل کو پیش کرنا ہوگا۔

سب سے پہلے عقائد ہیں اور پھر عمل۔ اہل سنت والجماعت وہ ہیں جو توحید و رسالت پر پختہ ایمان رکھتے ہوں۔ توحید یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ خالق کائنات ہے' وہ تنہا ہے' اس کا کوئی شریک نہیں' اس کا کوئی مثل نہیں۔ وہ اپنی ذات اور صفات میں ہر طرح کے شرک سے پاک ہے۔ اللہ تعالیٰ عالم الغیب ہے۔ وہ ہر جگہ موجود ہے۔ وہ بے نیاز ذات ہے' اس کو کسی کی احتیاج نہیں' جبکہ مخلوق کا ہر فرد اس کا محتاج ہے۔ یہ ہے توحید پر ایمان کا

عقیدہ۔ یہی قرآن کی تعلیم ہے اور یہی رسول اللہ ﷺ کے طرزِ عمل اور تعامل صحابہؓ سے ثابت ہے۔ اصحابِ رسولؐ توحید خالص کو مانتے تھے۔ وہ مخلوق کے کسی فرد کو نہ عالم الغیب مانتے تھے نہ حاضر و ناظر۔ ان کا پختہ یقین تھا کہ جس طرح عبادت اللّٰه وحدہٗ لا شریك لهٗ کی ہے اسی طرح استعانت بھی اُسی سے ہے' اور یہی مطلب ہے اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ کا۔ اب وہ کس طرح کا اہل سنت والجماعت ہے جس کے نزدیک اللہ کے کچھ بندے غیب دان ہوتے ہیں' کچھ ہر وقت ہر جگہ ہوتے ہیں اور ہر شے پر ہر وقت نظر رکھتے ہیں۔ جس کی توحید ہی خالص نہیں ہے وہ کیسا اہل سنت والجماعت ہے؟

پھر عملی اعتبار سے دعا صرف اللہ کا حق ہے۔ دعا عبادت کا مغز ہے۔ اللہ کے سوا کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا نہ سنت سے ثابت ہے نہ تعامل صحابہ سے۔ فوت شدہ بزرگوں کے سامنے اپنی حاجات بیان کرنا اور ان سے مدد چاہنا کیسا ہے؟ سنت تو یہ ہے کہ فوت ہونے والے کی نماز جنازہ پڑھی جائے' پھر دفن کیا جائے اور بار بار اللہ تعالیٰ سے اس کی بخشش کی دعا کی جائے۔ قبر کو پختہ نہ کیا جائے اور نہ ہی اس پر کوئی عمارت بنائی جائے۔ مسلمانوں کے قبرستان میں جا کر دیکھئے جا بجا پختہ قبریں نظر آئیں گی اور ان پر کتبے لگے ہوئے ہیں۔ کچھ پر عمارتیں بنائی گئی ہیں۔ کیا اللہ کے رسولؐ نے اس کی اجازت دی ہے یا یہ اُسوۂ حسنہ اور سنت صحابہؓ سے ثابت ہے؟ یاد رکھئے رسول اللہ ﷺ کا طریقہ ہی بہترین طریقہ ہے۔ جمعہ کے خطبہ میں اکثر آپ نے یہ الفاظ سنے ہوں گے: خَيْرُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ ﷺ ''بہترین طریقہ محمد ﷺ کا طریقہ ہے''۔ پس اسی بہترین طریقے کو اختیار کرنے کا حکم اللہ نے دیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے قبروں کو پختہ کرنے' ان پر عمارت بنانے یا ان پر بیٹھنے سے منع فرمایا ہے۔ (مسلم)

ایک حدیث میں قبروں پر چراغ جلانے والوں پر لعنت کی گئی ہے۔ رسول اللہ ﷺ کی تین بیٹیاں آپ کے سامنے فوت ہوئیں' اُن کا کفن دفن آپؐ نے کیا' آپ نے ان کی قبروں کو نہ پختہ کیا نہ ان پر عمارتیں بنائیں اور نہ نام کی تختی لگائی۔ اس کے بعد اصحابِ رسولؐ کا طریقہ بھی یہی رہا۔ جو مسلمان رسول اللہ ﷺ اور اصحابِ رسولؐ کے عمل کے

خلاف عمل کرتا ہے وہ کیسا اہل سنت والجماعت ہے؟ وہ تو سنت نبویؐ کو چھوڑ کر اپنی چاہت پوری کر رہا ہے۔

جس طرح عبادت اور استعانت صرف اللہ کی ہے اسی طرح نذر و نیاز بھی اللہ کے نام کی ہی ہے۔ فوت شدہ بزرگوں کے مزاروں پر منتیں ماننا اور نیازیں چڑھانا کس کا طریقہ ہے؟ رسول اللہ ﷺ نے تو قبر پختہ کرنے سے ہی منع فرما دیا ہے تو قبروں پر نذر و نیاز کیسی؟ ظاہر ہے کہ جب رسول اللہ ﷺ کے حکم اور عمل کو چھوڑ کر اپنی خواہش کے مطابق کام کیا جائے گا تو اس کا نتیجہ اچھا نہیں نکل سکتا۔ آج آپ دیکھتے ہیں کہ قبروں پر کیا کچھ ہو رہا ہے' ان کو غسل دیا جا رہا ہے' چادریں چڑھائی جا رہی ہیں' انہیں پختہ کیا جا رہا ہے' ان پر چڑھاوے چڑھائے جا رہے ہیں۔ کیا یہ اُسوۂ حسنہ سے ثابت ہے؟ کیا خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم نے ایسا کیا؟ ہرگز نہیں! تو وہ کیسے اہل سنت والجماعت ہیں جو قبروں پر میلے لگا رہے ہیں اور کئی طرح کے غیر مسنون کام کر رہے ہیں۔

رسول اللہ ﷺ نے نکاح کو اپنی سنت قرار دیا ہے۔ آپ نے خود نکاح کیے' اپنی بیٹیوں کی شادیاں کیں۔ آپؐ کا اُسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ آپؐ نے سادگی کے ساتھ خاتونِ جنت حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ کے ساتھ کیا اور اسی سادگی کے ساتھ گھر سے رخصت کیا۔ نہ کوئی برات تھی' نہ جہیز تھا نہ دعوت تھی۔ اسی طرح حضراتِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا عمل تھا۔ اب رسول اللہ ﷺ کے طریقے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل کو چھوڑ کر برات اور جہیز کو شادی کا لازمہ سمجھ لیا گیا ہے۔ بیٹی کو ہندوؤں کے طریقے کے مطابق جہیز تو دیا جاتا ہے مگر وراثت سے محروم رکھا جاتا ہے۔ اسی طرح کی دوسری بہت سی خود ساختہ یا ہندوانہ رسمیں شادی کے موقع پر ضروری سمجھی جاتی ہیں۔ عورتوں اور مردوں کا مخلوط اجتماع ہوتا ہے' بے پردگی ہوتی ہے' ستر و حجاب کی قرآنی تعلیم کی خلاف ورزی کی جاتی ہے' دلہن کو قرآن مجید کے نیچے سے گزارا جاتا ہے۔ کیا رسول اللہ ﷺ نے اپنی بیٹیوں کو رخصت کرتے وقت ایسا کیا تھا؟ کیا اس وقت قرآن مجید موجود نہ تھا؟ اللہ کے رسولؐ کے طریقے اور اصحابِ رسولؐ کے عمل کو چھوڑ کر خود ساختہ تکلفات کو ضروری سمجھنا

اور اسراف وتبذیر اور نمود ونمائش کو اختیار کرنا کیا یہ کسی اہل سنت والجماعت کو زیب دیتا ہے؟ ہماری بیٹیاں جن کے لیے ہم یہ بے جا تکلفات اختیار کرتے ہیں خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کے پاؤں کی خاک کے برابر بھی نہیں ہیں۔ نکاح اور شادی کا بہترین طریقہ وہی ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمایا۔ یہی مطلب ہے ''خَیْرُ الْهَدْیِ هَدْیُ مُحَمَّدٍ صلی اللہ علیہ وسلم'' کا اور اسی بہترین طریقے کو صحابہ کرامؓ نے اپنایا۔

کئی اہل سنت والجماعت کا دعویٰ رکھنے والے ایسے بھی ہیں جو تارکِ نماز ہیں مگر صرف زبانی طور پر عاشق رسول ہیں۔ کیا فرض نماز کو کبھی چھوڑا جا سکتا ہے؟ مسائل کی کتابوں میں دیکھئے' وہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ واضح کیا گیا ہے کہ آپؐ نے سفر میں بھی نماز ادا کی' بیماری میں بھی' حتیٰ کہ کفار کے ساتھ جنگ جاری ہو تو اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم کے مطابق نماز ادا کی ہے۔ ترکِ صلوٰۃ کو آپؐ نے کفر قرار دیا ہے۔ کتنے اہل سنت والجماعت ہیں جو اس کفر کو اختیار کیے بیٹھے ہیں اور مطمئن ہیں۔ پانچ وقت مسجد سے نماز کا بلاوا سنتے ہیں کہ نماز کی طرف آؤ' کامیابی کی طرف آؤ مگر ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ وہ بھی اپنے کو اہل سنت والجماعت قرار دے رہے ہیں۔ یہی حال باقی فرائض دینی کا ہے۔

یاد رکھیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کے مطابق یقیناً ناجی (نجات یافتہ) فرقہ اہل سنت والجماعت ہی ہے' لیکن اہل سنت والجماعت کو نجات یافتہ فرقہ سمجھنے والوں کو ان الفاظ کا مطلب بھی سمجھنا ہوگا۔ جب عمل اور کردار سنت رسول اور عمل صحابہؓ کے مطابق نہ ہوگا تو صرف نام سے نہ اللہ کو دھوکا دیا جا سکتا ہے اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو۔ ایسا معاملہ نہ ہو کہ برعکس نہند نام زنگی کافور۔ قرآن مجید میں ہے کہ اللہ کو دھوکہ دینے والے اللہ کو نہیں بلکہ خود اپنے آپ کو دھوکہ دیتے ہیں۔ جب مہلت عمر ختم ہوگئی تو صرف پچھتاوا ہی پچھتاوا رہ جائے گا اور کچھ بن نہ پڑے گا' کیونکہ نافرمانیوں کی تلافی کا وقت گزر چکا ہوگا۔ اوامر و نواہی میں غلطی ہو جانا یا کبھی کوتاہی ہو جانا اور بات ہے' جبکہ جان بوجھ کر خلاف سنت کاموں کو اپنائے رکھنا اور بات ہے۔ کبھی کسی عذر کی بنا پر نماز کا قضا ہو جانا ممکن ہے' مگر

کسی مسلمان کا بے نمازی ہو جانا ممکن نہیں ہے۔

کسی بڑے چھوٹے کے کہنے پر یا کسی کی پیروی کرتے ہوئے رسول اللہ ﷺ کے فرامین کی خلاف ورزی کسی مسلمان کو زیب نہیں دیتی چہ جائیکہ وہ اہل سنت والجماعت کا دعوے دار ہو۔ کیا کوئی اہل سنت والجماعت:

(۱) تارک نماز ہو سکتا ہے؟

(۲) اسلام کو مکمل دین سمجھنے کے باوجود بدعات اختیار کر سکتا ہے؟

(۳) شادی بیاہ کے موقع پر فضول خرچی، نمود و نمائش اور غیر مسنون رسمیں اختیار کر سکتا ہے؟

(۴) رسول اللہ ﷺ کے منع کرنے کے باوجود قبریں پختہ بنا سکتا ہے؟

(۵) اللہ کے سوا دوسروں سے استعانت کر سکتا ہے؟

(۶) قبروں پر چادریں چڑھانے اور غسل دینے کو ثواب کا باعث سمجھ سکتا ہے؟

(۷) بیٹیوں کو وراثت سے محروم کر سکتا ہے؟

ہرگز نہیں! تو جو مسلمان ایسا کرتا ہے اسے حق نہیں پہنچتا کہ وہ اہل سنت والجماعت ہونے کا دعویٰ کرے۔

کسی وقت غفلت کے نتیجہ میں کوئی نماز قضا ہو جائے یا خلافِ سنت کوئی کام سرزد ہو جائے تو وہ اور بات ہے، کیونکہ انسان خطا کا پتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا وعدہ ہے کہ ''اگر تم بڑے بڑے گناہوں سے بچتے رہو گے تو ہم معاف کر دیں گے تم سے تمہارے چھوٹے گناہ اور داخل کریں گے تم کو عزت کے مقام میں۔'' (النساء:۳۱) مگر مسلمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اللہ اور رسول کے احکام کو جانتے بوجھتے ترک کرے اور جن کاموں سے آپ نے روکا ہے ان کو بلا دھڑک اختیار کرے۔ ایک مسلمان کے لیے یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ رسول اللہ ﷺ کے اوامر و نواہی کی مستقل خلاف ورزی کر کے اللہ اور رسول کو ناراض کرے۔ اہل سنت والجماعت ہونے کے لیے سنت رسولؐ اور عمل صحابہؓ کو پورے ذوق شوق اور خوش دلی کے ساتھ قبول کرنا اور پورے خلوص کے ساتھ اس پر عمل کرنا ضروری ہے۔

۞ ۞ ۞

Hazrat Abu Huraira Trust
Ph&Fax:0923-630237--630094
Mob: 0333-9102770

حضرت ابو ہریرہ ٹرسٹ
زیر سرپرستی : حضرت مولانا عبدالقیوم حقانی

جامعہ ابو ہریرہ o مدرسۃ البنات o اسلامیہ ماڈل سکول o ابو ہریرہ اسلامی سکول o ابو ہریرہ ڈسپنسری o حمد اللہ جان ڈسپنسری o القاسم اکیڈمی o ماہنامہ القاسم

حوالہ نمبر

تاریخ

4/اپریل 2008ء

برادرِ مکرم و معظم جناب پروفیسر محمد یونس جنجوعہ زید مجدکم!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ!

مزاج شریف!

''انوارِ ہدایت'' کیا موصول ہوئی کہ دل کو سرور اور آنکھوں کو نور حاصل ہوا۔ کتاب میرے ہاتھ میں ہے اور جگہ جگہ سے کھول کھول کر پڑھ رہا ہوں۔ ہر مقام پر دل کہتا ہے کہ یہی پڑھنے کی جگہ ہے۔ اللہ کریم اجرِ عظیم سے نوازیں۔ ''میرے ابا جان'' نے تو بے اختیار مرحوم کے لیے دعاؤں پر مجبور کر دیا اور آپ کے لیے دل سے دعائیں نکل رہی ہیں۔ ''میرے ابا جان'' والا مضمون ایک مرتبہ پڑھا' اب دوبارہ پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔

والسلام

عبدالقیوم حقانی

مرکزی **انجمن خدّام القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

منبعِ ایمان — اور — سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم و حکمت** کی

وسیع پیمانے — اور — اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر و اشاعت ہے

تاکہ اُمّتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہو جائے

اور اس طرح

اسلام کی نشاۃِ ثانیہ — اور — غلبۂ دینِ حق کے دورِ ثانی

کی راہ ہموار ہو سکے

وَمَا النَّصۡرُ اِلَّا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ